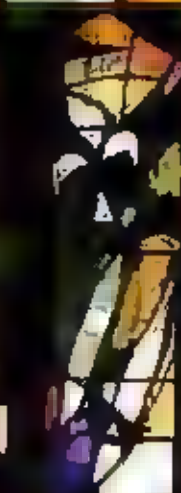


زیرِ پرچمِ آزادی

کاؤنسلر جنرل



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY

FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سُورَةُ الْحَجِّ

زیر پوائنٹ 3

زیر و پوائنٹ 3

ادبیاتی چرچہ

علم و فن سائنس پبلشرز

40- احمد مارکیٹ، آروم بازار، لاہور، پاکستان۔ فون: 7232336، 7352132
www.knowispublishers.com. Email: knowispublishers@bcsai.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ذریعہ پبلسٹس	نام کتاب
جاوید چودھری	مصنف
گلزار احمد	ناشر
علم دہقان پبلشرز، لاہور		
محمد صابر نواز	پروف ریڈنگ
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	مطبع
20-اکتوبر 2007ء	سن اشاعت
350/- روپے	قیمت

مشاق بک کارنر

الکريم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7230350

سیونٹھ سرکائی پبلیکیشنز

عزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار لاہور
فون: 7223584۔ موبائل: 4125230-0300

علم و فن پبلشرز

40-انفہد مارکیٹ، اردو بازار لاہور، فون: 7232330، 7252332
www.ilmwafanpublishers.com E-mail: ilmwfanpublishers@hotmail.com

w
w
w
.
p
o
k
s
o
c
i
e
t
y
.
c
o
m

w
w
w
.
p
o
k
s
o
c
i
e
t
y
.
c
o
m

روینہ

اپنی بیوی کے نام
for more in



کاشف آزاد

ترتیب

13	کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے	1
KashifAzad@OneUrdu.com		
21	84 حکمرانوں کے اختیارات	2
25	تین ہزار ایک سو چوبیس	3
29	بڑی سرکار	4
33	مصلحت	5
37	خوشحالی کا دیوتا	6
41	بڑا انسان	7
45	ہماری کہانی	8
48	مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات	9
51	لوہار کا بیٹا	10
55	آبر ہمیشہ ہوشیے کی موت مرتے ہیں	11

59	یونیفارم	12
63	بمیشہ عاجز اور دستیاب رہو	13
68	گڈ بائی مائی فرینڈز	14
72	شہباز شریف کی کہانی	15
76	شہباز شریف سے دوسری ملاقات	16
80	ایک صد روہ بھی تھا	17
84	عبرت ناک انجام	18
88	انسان آخر انسان ہے	19
92	آسوس میں مرد رہا ہوں	20
95	محبت تو چہ اور وقت	21
99	”میرا کیا قصور تھا“	22
103	جو چلنا جانتے ہیں	23
107	اسن و اماں	24
111	عصر کی قسم	25
115	سات جمع سات جمع ایک	26
119	باب و دولہر جیسا دل	27
123	ایک منٹ چودہ سیکنڈ	28
127	صرف ایک پلے کارڈ	29
131	رائٹ اپروچ	30
135	صرف چند لو جو ان چاہئیں	31
138	چنوں کا لٹافہ	32

Kashif Azad@OneJudi.com

142	طاقت	33
146	ناں کہنے کا ہنر	34
149	غربت انعام ہے	35
152	دو گھنٹے اپنے لئے	36
156	ترقی کا سٹیڈیم	37
160	کرے گا کون	38
164	مرہم کون لگائے گا	39
168	ترقی کی شاہراہ پر	40
172	ہم بھکاری ہیں	41
176	کوڑے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار	42
179	دو نشیں	43
182	لوگ بھی ضروری ہیں	44
185	بیڈ کوائٹی پر افس	45
189	ماہ نور بنام مملکت خدا داد	46
193	پروین بنام امیر الحق	47
198	رہ باب بنام پاکستان	48
204	برٹ آف دی گورنمنٹ	49
208	افسوس ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا	50
212	انڈھی آنکھوں کے خواب	51
216	بنیادی اصول	52
220	قانون	53

Kashif Azad@OneUrdu.com

224	کاش ملک کی ساری عدالتیں اسکی ہو جائیں	54
228	نہر قانون	55
232	چیف جسٹس صاحب کے حضور	56
236	انصاف	57
240	358 برس بعد	58
244	بڑی عدالت	59
248	لیگل پروفیشنلو	60
252	وہ کون ہے؟	61
256	ہم لوگوں نے تو	62
260	بچوں کی ذمہ داری باقی ہے	63
264	جس طرح	64
268	اکیسویں صدی کے شاخ چلی	65
271	ڈیڈ لائن	66
275	چند ماہ کی بات ہے	67
278	ٹائمن ایون	68
282	محبت اور امن	69
286	ملک بھی بھٹو ہوتے ہیں	70
290	کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا	71
294	بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے	72
297	پائپ لائن کی بجائے	73
301	جو لوگ اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے	74

Kashif Azad@OneUrdu.com

زیر پبائنت 3 O 11

305	صغیرہ اسلام کے خلاف غداری کا پرچہ درج کرائیں	75
309	صغیرہ اسلام جیسے رول ماڈل	76
313	ہم نے چین سے کیا پایا	77
317	دیوار چین	78
321	”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آتے“	79
325	ہم ایک زندہ دل قوم ہیں	80
328	ٹہری اگر یہاں ہوتی	81
331	گھانٹے کا سودا	82
335	بٹ آئی لائیک پوسٹ	83
339	معمول کی کارروائی	84
343	اپنے بچے	85
348	پہلا پڑاؤ	86
351	کانڈ کا گلاس	87
355	حرم کی مٹی	88
358	آدھا گلاس	89
362	خوشی	90
366	21 گرام	91
370	کنفن چور	92
374	وی آر سوری	93
379	سیلی ریشن	94
383	ترتیب	95

Kashif Azad@OneGru.com

زہرہ پوائنٹ 3 O 12

387	جاب اور کام	96
391	دن میں شو	97
395	وفادار	98
398	بس ایک قدم	99
402	ایڈجسٹمنٹ	100
406	بڑے گھروں والے	101
409	جسے اللہ عزت دے	102
413	آج سے	103



کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے (میری داستان تھوڑی تھوڑی)

میری عمر اس وقت تین سال تھی میرے والدین گاؤں سے تازہ تازہ کھاریاں آئے تھے کھاریاں میں سنی تھی جھاؤنی بنی تھی شہر میں سوئی گیس نہیں تھی چنانچہ میرے والد نے کولے کا کام شروع کر دیا وہ صوبہ سرحد پنجاب اور بلوچستان سے کولے منگواتے تھے اور یہ کولے جھاؤنی کو پلائی کر دیتے تھے اس کا وہ بارستا تھا نہ لائے لاکھوں روپے کماتے تھے لوگ کھاریاں میں جھانڈتے اور نہ جتے تھے یہ دیکھ کر نے کا ایک درمیانے درجے کا مکان تھا جس کا مچن بہت بڑا تھا اور مکان میں ایک چھوٹا سا کوال بھی تھا اس دور کی دیواریں ابھی تک میرے ذہن سے چٹکی ہوئی ہیں مجھے ان دونوں واقعات کی تمام جزئیات آج تک یاد ہیں یہ سرویلوں کا زمانہ تھا ہم ایک مچ اٹھے تو ہمارے دروازے کے سامنے کوئی فقیر لیٹا تھا اس نے بدبو دار رضائی اوڑھ رکھی تھی میرے والد کو بڑا افسوس آیا اور وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ بس سے مس نہ ہوا میری والدہ نرم دل خاتون ہیں وہ نماز اور روزے کی انتہائی پابند ہیں انہوں نے فوری طور پر مداخلت کی اور فقیر کی "جان بخشی" کر دی وہ فقیر بعد ازاں مستقل طور پر ہمارے گھر کے سامنے اقامت پذیر ہو گیا ہمارے گھر کے آگے ایک بڑھئی کی دکان تھی دو بڑھی رات کو دکان بند کرنا تھا تو فقیر دکان کے گھڑے پر ڈیرہ ڈال لیتا تھا اور مچ کے وقت گھڑے سے اتر کر ڈرا اور چٹائی بچھاتا تھا اور رضائی اوڑھ کر وہاں بیٹھ جاتا تھا فقیر کے کھانے پینے اور چائے کا بندوبست میری ماں نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور انہوں نے مجھے فقیر کا "وینر" بنا دیا تھا میری ماں دن میں تین مرتبہ بڑے مس سائلن دونیاں اور پانی کا بیال رکھتی اور میں بڑی مشکل سے بڑے اٹھا کر فقیر کے پاس پہنچاتا فقیر مجھے جوں ہی گھر کی دہلیز سے باہر نکلتے دیکھتا تو وہ بڑے تمام لیتا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا مجھے اس کی چٹائی میں کے کپڑوں اور اس کی رضائی سے شدید بدبو آتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں میں اس کے باوجود اس کے پاس بیٹھ جاتا تھا میری ماں نے اس کا نام باباجی رکھ دیا تھا لہذا میں آنے والی سطروں میں اسے باباجی ہی لکھوں گا باباجی میرے ساتھ کبھی کبھلکے ہو کر جاتے تھے وہ مجھے اکثر کہا کرتے تھے تم پڑھنا اچھے بچے بننا اور بڑے ہو کر کتابیں لکھنا اور میں تمہاری

سنا میں بڑھوں گا وغیرہ غیرہ میں بہت دن اٹھا کر رہا جس جانے لگا تو وہ اپنے سر ہانے کے نیچے سے اخبار کا کوئی بندہ کوئی مسئلہ پکڑا مضمون نکالنے دونوں ہاتھوں سے اسے سیدھا کرتے اور کہتے تم مجھے اخبار پڑھ کر سناؤ میں اس وقت تک اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اخبار تصما دینے تھے اور میں اخبار کا یہ مضمون ساتھ لے آتا تھا اور سارا سال ملنا اسے دیکھتا رہتا تھا۔

ایک دن بارش کا موسم تھا شہر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بارش کے باعث بڑھی ہوئی کان کھولنے نہیں آیا تھا چنانچہ اس دن بابائی کو کھڑے سے نہیں اترا تا تھا میری ماں نے مجھے بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں شدید سردی اور دھند میں ناشتہ لے کر بابائی کے پاس حاضر ہو گیا بابائی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اور سڑک پر بارش کے گرتے قطرہوں کو دیکھ رہے تھے وہ اس سطر میں بری طرح محو تھے میں نے ان کے سامنے لڑے رکھا تو وہ چونک پڑے اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے میں ڈر گیا بابائی چند لمبے تک مجھے دیکھتے رہے اور اس کے بعد مسکرا کر بولے "پلو اور بیٹھ جاؤ" میں ان کی چٹائی پر بیٹھ گیا باہر شدید سردی اور دھند تھی میں سردی سے کانپ رہا تھا بابائی نے پوچھا "سردی لگ رہی ہے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا بابائی مسکرائے میرا ہاتھ پکڑا اور منہ ہی منہ میں دیکھ پڑے تھے ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا ان کے ہاتھ سے حدت نکل رہی ہے اور وہ بڑی تیزی سے میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے چھٹے اور ہاتھ سے ملنے سے پیرے کے قطرے پھینکے گئے انہوں نے مسکرا کر پوچھا "تبت کئی سردی لگ رہی ہے" ہے" میں نے انکار میں سر ہلا دیا وہ مسکرائے اور دو بارہ بولے "سردی اور گرمی انسان کے اعدا ہوتی ہے اگر انسان اپنے باطنی رکھ لیز تک پہنچ جائے تو وہ بڑی آسانی سے اپنا درجہ حرارت کم اور زیادہ کر سکتا ہے" مجھے اس وقت ان کی بات سمجھ نہ آئی میرے لئے درجہ حرارت رکھ لیز اور باطنی جیسے الفاظ اجنبی تھے لیکن میں خاموشی سے ان کی بات سننا رہا انہوں نے اپنے سر ہانے کے نیچے سے جاپن کا ایک چھوٹے سے گھونکا کلا اور میرے سامنے فرش پر ایک دائرہ کھینچ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولے "تم سڑک کے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھو" میں نے باہر سڑک کی طرف دیکھا سڑک پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی آسمان سے پانی برس رہا تھا پانی چھوٹی چھوٹی نمبروں کی شکل اختیار کرنا تیزی سے آگے بہتا چلا جاتا تھا میں نے جہاں تک نظر جاتی تھی سڑک دیکھ لی وہ بولے "اب تم آنکھیں بند کر دو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں بند رکھنا" میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کر لیں وہ بچی آواز میں بولے "آنکھیں کھولو میں نے ہت سے آنکھیں کھول دیں انہوں نے انگلی کے اشارے سے دائرے کی طرف دیکھنے کا حکم دیا میں نے دائرے کی طرف نظر کھمائی تو میں حیران رہ گیا دائرے میں رقم چل رہی تھی یہ ایک بچی سڑک تھی جس پر نائے چل رہے تھے اور اس سڑک کے دونوں اطراف کچے مکان تھے مکانوں کے درمیان میں کھیت تھی اور کھیتوں میں لوگ بیٹوں سے مل چلا رہے تھے میں نے مکانوں کے درمیان میں تیلی کا ایک کولہ بھی دیکھا بوز جاتا تلی کھڑی

کے تحت پر بیٹھا تھا اس کے سامنے ایک کولو تھا اور ایک کزرو لاغرمائل کولو کھینچ رہا تھا کولو کے پرنا لے سے سروں کے تل کی باریک سی دھار نکل رہی تھی، کچی سڑک کے ایک سرے پر ٹھیلے والے کھڑے تھے ٹھیلوں پر لٹفیاں برف کے گولے اور تاشے بک رہے تھے اور بچے جیب سے نکلے نکال نکال کر یہ چیزیں خرید رہے تھے میں نے گھبرا کر بابائی کی طرف دیکھا بابائی دائرے پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے اور مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے میں نے دوبارہ دوسرے کی طرف دیکھا تو وہاں منظر بدل چکا تھا اب دائرے میں ایک ہلکی سڑک تھی سڑک پر سوڑ گاڑیاں، بسیں اور رکشے چل رہے تھے سڑک کے دونوں طرف اونٹنی اور ٹیٹھی عمارتیں اور خوبصورت دکائیں تھیں اور ان دکائوں سے لوگ خریداری کر رہے تھے مجھے سڑک پر ایک سکول بھی دکھائی دیا سکول کے سامنے بچوں کا رش لگا تھا میں نے گھبرا کر منظر سے آنکھیں پھیریں اور بابائی کی طرف دیکھنے لگا انہوں نے پڑھنا بند کیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے دائرے سے تصویر میں عائب ہو چکی تھیں وہ بیٹھے اور بولے "یہ اسی سڑک کا منظر تھا جس پر تم اس وقت بیٹھے ہو پہلا منظر اس سڑک کا تھا مگر یہاں اتنا منظر تھا اور دوسری ناظم نے آج سے تیس برس پہلے سڑک دیکھی تم آج سے تیس برس بعد جب اس جگہ سے گزرے تو یہ سڑک ایسی ہوگی" میں بابائی کی بات من کر پریشان ہو گیا اس کے بعد دو آگے بٹھکے اور انہوں نے اپنی انگلی میرے سر اور گردن کے درمیان میں موجود ریزر رکھ دی اور مسکرائے "ابنہ قرانی نے اس جگہ ایک کمرہ لگا رکھا ہے اگر کبھی انسان کا یہ کمرہ چل جائے تو وہ بابائی حال اور مستقبل کی ساری تصویریں دیکھ لیتا ہے" انہوں نے اپنی انگلی وہاں رکھی اور بولے "یہ وقت کی جگہ ہے تم سے پہلے کیا تھا اور تمہارے بعد کیا ہوگا یہ ساری باتیں یہ سارے منظر اس جگہ محفوظ ہیں انسان کی آنکھ اگر اس جگہ کے اندر چلی جائے تو وہ اپنا بابائی حال اور مستقبل دیکھ لیتا ہے اور اگر یہاں کچھ تیز ہو تو وہ دوسروں کا وقت بھی منوں لیتا ہے" میں خاموش بیٹھا رہا وہ دوبارہ بولے "میں تم پر وقت کا دروازہ کھول رہا ہوں اگر تم اچھے بچے ثابت ہوئے تو تم اپنی اور دوسروں کی تصویریں دیکھ سکو گے اور اگر بڑے ہو کر بدعاش بن گئے تو تم دنیا میں بڑی خرابی پھیلاؤ گے" میری دعا ہے تم اچھے بچے بنو" اس کے بعد بابائی نے میری گردن کے اس مقام پر اپنا انگوٹھا رکھا اور وہاں شروع کر دیا مجھے درد کا پکا پکا اثر محسوس ہونے لگا پھر اچانک میری رینہ کی ہڈی میں بجلی کا ایک کوندو سا مہر آیا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا مجھے جب ہوش آیا تو میں گھر میں پڑا تھا میرے اوپر رضائی تھی اور سارے گھر والے میرے ارد گرد بیٹھے تھے میرا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا جبکہ میری ماں ارد گرد سے میرے منہ میں عرق گلاب دیکھ رہی تھی میں نے سب سے پہلے دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے کانوں میں آوازیں آنے لگیں ان تمام آوازوں پر میرے والد کی آواز عادی تھی اور مجھ سے بابائی کو گالیاں دے رہے تھے چند دن بعد میری ماں نے مجھے بتایا بابائی نے اس دن ارواۃ عیالیٰ مجھے میری والدہ کو کچن کر بولے تھے "بچے کا سر چکرا گیا ہے آپ اس پر کھیل رہے ہیں" میری ماں نے مجھے بے ہوش دیکھ کر دانا شروع کر دیا تھا میرے والد نے انہیں روتا دیکھا پھر مجھے دیکھا تو وہ باہر کھڑے کی

طرف لپکے لیکن بابائی قلمزے سے عاقبت تھے میرے والد ملت تک قلمزے کے چکر لگاتے رہے مگر بابائی ماہیس نہا نے میں اور دن بخار میں جھلنے کے بعد باہر نکلا تو بابائی ابھی تک عاقب تھے قلمزے کے ایک کونے میں ان کی چٹائی ان کی جد بڑا اور رضائی اور لوٹا پڑا تھا یہ ساری چیزیں کئی بہتوں تک وہاں پڑی رہیں لیکن بابائی ماہیس نہا نے یہاں تک کہا ایک دن جرحی نے یہ ساری چیزیں اٹھا کر گندے سالے میں پھینک دیں میں نے زندگی میں دوبارہ بابائی نہ کیے مگر ان کی پراسرار باتیں آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں مجھے آج تک بابائی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور میں چونک کر آگے پیچھے کیجھتے لگا ہوں لیکن وہ مجھے نہیں نظر نہیں آتے۔

میں عملی طور پر ایک پریکٹیکل اور سائنسی ذہن کا شخص ہوں میں نے کبھی زندگی کو درمجموعہ اور نتیجہ کے تیرے قانون سے باہر نکل کر نہیں دیکھا میں مارے پر بھی مکمل یقین رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے اس پریکٹیکل لائف کے علاوہ کبھی کوئی زندگی ہے اور یہ زندگی ہر وقت ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلتی رہتی ہے مجھے سمجھنا سے باہر حال اور مستقبل کے محسوس ہوتے رہتے ہیں میں کبھی دو باروں پر تصویریں ہی چلتی دیکھتا ہوں اور یہ تصویریں بعد ازاں سچ ثابت ہو جاتی ہیں۔ مجھے لوگوں کی خطرات اور نفسیات جاننے میں بھی سیکنڈ گلتے ہیں اور میرے دوست مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں تم

میں سے یہی بات نہ نکالا کرتا وہ ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ میری اکثر بری باتیں اور بری سوچیں سچ ثابت ہو جاتی ہیں۔ میں نے کچھ فرزند بھی اپنے ایک اور دل میں دوست سے اس نئے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا "ہم لوگ اس خوبی کو جہاں کہتے ہیں یہ بعض لوگوں میں پیدا ہوتی ہے اور بعض کو ریاضت سے ملتی ہے تم میں یہ قدرتی ہے" میں نے ان سے بابائی کے بارے میں پوچھا تو وہ مسک کر بولے "وہ کشتی درویش تھا قدرت جن لوگوں کو جہاں کی نعمت سے نوازتی ہے ان کے دل مغ اور درندگی ہڈی کے تیز میں ایک پھوڑا سا ہوتا ہے مگر پانچ سال کی عمر سے پہلے یہ پھوڑا پھٹ جائے تو اس بچے کا دل مغ ترقی کرنے لگتا ہے بصورت دیگر وہ بچہ بھڑوب بن جاتا ہے۔ وہ کشتی درویش اس پھوڑے سے واقف تھا چنانچہ اس نے تمہاری گردن و باکرہ پھوڑا چھانڈ دیا اس کی بس اتنی ہی ذیولنی تھی وہ آیا اس نے اپنی ذیولنی کی اور چلا گیا اگر وہ میاں نہ کرتا تو تم آج دماغی امراض کے کسی ہسپتال میں ہوتے یا پھر بھڑوب بن کر مر لوگوں پر تنگ بھڑوب بھر رہے ہوتے" میرے یہ دوست ٹھیک ٹھاک جسم کے تقنی اور پرہیزگار شخص ہیں میں ان کی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے لیتا ہوں لیکن پتہ نہیں کہیں مجھے ان کی اس بات پر یقین نہیں آتا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعے کو نظر کا دھوکا دہا ہے "کشف" کو اور ان سمجھتا ہوں ہم آکسیوس صدی میں رہ رہے ہیں اور اس صدی کا سائنسی دماغ ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا کرتا اور سزا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے (باقی آئندہ)

جاوید چودھری

ہاؤس نمبر 490 سٹریٹ نمبر 17

شہزادہ ذوالاسلام آباد

برکت

خان عبدالصمد خان صاحب سے میرا رابطہ اچانک شروع ہوا اور اچانک ختم ہو گیا۔ آج سے چار دن پہلے ان صاحب نے مجھے فیصل آباد سے فون کیا ان کا نام تھا "عبدالصمد" آپ کے بہت بڑے بھتیجے ہیں، ہم انہیں آپ کا کالم پڑھ کر سنا تے ہیں تو وہ بڑی دیر تک سربلا تے رہتے ہیں "میں نے ان سے پوچھا "آپ کے بابا جی کون ہیں" انہوں نے بڑی عقیدت سے جواب دیا "فیصل آباد جھنگ روڈ پر صوفی برکت صاحب کا ڈیرہ ہے خان صاحب ان کے ڈیرے پر ہوتے ہیں ان کی عمر نوے سال سے زائد ہے وہ مشرقی پنجاب کے کسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، بچپن میں روحانیت کی طرف مائل ہو گئے اور گھریاں چھوڑ کر اللہ کی راہ پر نکل آئے، طبیعت میں مجذوبیت ہے لیکن جب نازل ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت گھنٹو کرتے ہیں" مجھے ان کی گھنٹوں میں ذرا سی دلچسپی محسوس ہوئی لیکن میں بابا جی سے زیادہ متاثر نہ ہو۔ کچھ دنوں بعد ان کا دوبارہ فون آ گیا "اس بار انہوں نے فرمایا "ہم نے آپ کی کتاب خرید لی ہے جس دن آپ کا کالم نہیں آنا ہم اس دن آپ کی کتاب میں سے کوئی کالم نکال کر بابا جی کو سنا دیتے ہیں وہ آپ کے لئے بہت دعا کریں گے" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بھول گیا "چند دن بعد ان کا ایک اور فون آیا اور انہوں نے پیو سے من فرمایا "بیٹے بابا جی سے بات شیخے یوں میں نے پہلی بار خان عبدالصمد خان صاحب کی آواز سنی خان صاحب کی آواز میں عاجزی اور نرمی تھی وہ مجھے جینا کہہ کر

فاطمہ بوئے اور میری تحریر کی تعریف کرنے لگے، گفتگو کے دوران کہیں کہیں ان کا لہجہ تبدیل ہو جاتا، اس میں خیال آجاتا اور بات بے ربط ہو جاتی، میں خاموشی اور ادب سے ان کی بات سن رہا تھا پھر اچانک فون بند ہو گیا، بیٹھے بعد ان کا ایک اور فون آ گیا، اس فون میں وہ بار بار ایک فقرہ دہراتے رہے، "مہلت کم ہے، مہلت کم ہے" اس دن ان کی گفتگو میں ربط و تفریق مفقود تھا، میں بڑے غور سے ان کی بات سن رہا لیکن سچی بات ہے ان کی کوئی بات میرے پلے نہ پڑی، وہ میری تکفیش بھانپ گئے لہذا انہوں نے فون اپنے "ترجمان" کو پکڑا دیا، وہ صاحب بڑی عاجزی سے بولے "بابا، خبردار ہے، میں ان کے پاس مہلت تم ہے لہذا آپ انہیں آ کر مل جائیں" میں نے سوچتے کیلئے چند دن مانتے اور فون بند کر دیا، مجھے اس سلسلے کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی، مجھے مجذوبیت اور پراسراریت دونوں ناپسند ہیں، میرا خیال ہے آج کے انسان کو نگر چاہیے، اسے تجویز اور پھونکس نہیں چاہئیں، چنانچہ جو شخص بول نہیں سکتا، جو گفتگو سے انسپا نہیں کرتا، میں اس کے قریب نہیں پہنکتا، یہی معاملہ پراسراریت کا ہے، جو شخص مجھے اپنا نام کام اور پتہ نہ بتائے، جو خط کے آخر میں آپ کا ایک کاری یا ممبرانی فرما کر میرا نام ظہر رکھا جائے، لکھ دے، مجھے اس پر طیش آ جاتا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے تحریر کے عزرائیل یا کولین کر دی ہو، مجھے خان صاحب بھی ایک پراسرار اور مجذوب قسم کی شخصیت تھے لہذا میں نے محضرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان دنوں مرگورہا میں میرے عزیزوں کے ہاں کسی کی فونگئی ہوگئی، مجھے وہاں جانا پڑ گیا، وہاں لوگوں کے ساتھ کپ شپ کے دوران ایک صاحب نے یہ صاحب فیصل آباد سے آئے تھے اور ان کا گاؤں صوفی برکت کے مزار کے قریب تھا، میں نے خان صاحب کا ذکر کیا تو وہ صاحب ان کے عقیدت مند نکلے انہوں نے بتایا خان صاحب ایک محیر العقول شخص ہیں، وہ سارا سارا دن سورج کو ٹنگی بانہہ کر دیکھتے رہتے ہیں، ان کی آنکھ کی پتلی میں اللہ لکھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رہنمائی کرتا وغیرہ، سچی بات ہے ان صاحب نے خان صاحب کا ایسا خاکہ کھینچا کہ میرے دل میں خان صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا لہذا میں اگلے دن ان کے ساتھ فیصل آباد چلا گیا، وہ مجھے صوفی برکت کے مزار کے پیچھے لے گئے، مزار کے پیچھے کھیت تھی اور کھیتوں کے مین درمیان ایک کچا کوٹھا بنا تھا، ہم کوٹھے کی طرف چل پڑے، کوٹھے کے گن میں کجور کی صف پر ایک ضعیف بزرگ بیٹھے تھے اور ان کے گرد چند نوجوان ادب سے بیٹھے تھے، میں قریب پہنچا تو بزرگ نے نوجوانوں کو اشارہ کیا، "نوجوانوں نے بابا، کو سہارا دیا، وہ بڑی مشکل اور تکلیف سے سیدھے

کھڑے ہوئے میں تو گے بڑھا انہوں نے دونوں بازو پھیلائے اور میرے ساتھ بغل گیر ہو گئے ان کے لمس میں ایک شہنشاہ اور خوشبو سچی انہوں نے مجھے پکڑ کر ساتھ بٹھالیا اور میرے ساتھ گفتگو کرنے لگے ان کی باتوں میں ربط نہیں تھا اور انہیں سمجھنے کیلئے بڑی کسوٹی درکار تھی وہ بار بار کہہ رہے تھے "جنگ ہوگی سب منافق مر جائیں گے نئے لوگ آئیں گے وہ کوٹ جتلون میں نماز پڑھائیں گے اور اللہ کے دین کو بچائیں گے" وہ کہہ رہے تھے "اللہ کا فر کو برہشت کر لیتا ہے لیکن منافق کو نہیں" وہ کہہ رہے تھے "یہ لوگ قرآن کو آدھا کر دیں گے یہ اپنے مطلب کی آیتیں پڑھیں گے اور ہائی کو چھپا دیں گے یہ جتلون پہن کر حج کریں گے اور رمضان میں شراب پیئیں گے یہ نمازوں پر پابندی لگائیں گے اور دارمیںوں کا مذاق اڑائیں گے یہ عورتوں کو باہر نکالیں گے اور مردوں کو گھروں میں بٹھا دیں گے یہ دشمنوں کو کھلا چھوڑ دیں گے اور دوستوں کو پکڑ لیں گے اور یہ مریانی اور بے ایمانی کو قانون بنا دیں گے" اس کے بعد وہ عربی فارسی اور سنسکرت کے طے جملے شعر پڑھتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے وہ رومال سے آنکھیں پونچھتے اور بھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا کرتے "تم مجھ سے کتنے بڑے منافق سمجھتے ہو" اس کے بعد وہ آسمان کی طرف سر دیکھے اور کہا "میں کو تو اپنے اسی کے مالک میں مانا کرتا ہوں جو تمہاری اس سے راہی ہو جائے"

میرے صاحب میں اسے اچھا سمجھتا ہوں تو اسے اچھا کر: "میرے رسول کے اللہ اسے اچھا بنا دے" وہ بولنے لگے جاتے جاتے اور رو رو کر کہتے جاتے اور میں ہولنتوں کی طرح انہیں دیکھتا جاتا وہ میرا بازو چھوڑتے اور اس کے بعد وہ بار بار بڑھ گھٹو شروع کر دیتے۔

میں خان صاحب کے ساتھ شام تک رہا اس دوران انہوں نے میرا سر پکڑ کر اپنے سر کے ساتھ ٹکرایا مجھے ان کے سر میں ہلکا سا کرنٹ محسوس ہوا اور میں چند لمحوں کیلئے مدہوش سا ہو گیا لیکن میں نے اسے ماحول کا اثر سمجھا اور فراموش کر دیا انہوں نے اپنی انگلی سے میرے ماتھے پر کلک لکھا اور ایک خربوزہ کا ٹکڑا میرے سامنے رکھ دیا "مجھے جھوک لگی تھی میں سارا کھا گیا" میں رخصت ہونے لگا تو میں نے ان سے سوال کیا "یہ صوفیہ کرام کیا ہوتے ہیں" وہ مسکرائے "صوفیہ کرام اللہ تعالیٰ کے ہر کار سے ہوتے ہیں یہ اس کے کلرک سپاہی اور چراسی ہوتے ہیں" میں نے پوچھا "یہ کرتے کیا ہیں؟" وہ مسکرائے "جو کام تمہاری دنیا کے چراسی سپاہی اور کلرک کرتے ہیں یہ پرست گمن اور شوکار جاہلی کرتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے انعام ایوارڈ اور تحفے لوگوں تک پہنچاتے ہیں" میں نے پوچھا "آپ کون ہیں" وہ مسکرائے "میں اللہ کا چراسی ہوں" میں نے

پوچھا "آپ کی کیا ذیونہی ہے" مسکرا کر بولے "میں لوگوں میں برکت تقسیم کرتا ہوں" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا "آپ نے مجھے کیوں بلایا" انہوں نے قہقہہ لگایا "تمہاری عرضی مشکور ہو گئی تھی تم نے برکت مانگی تھی مجھے حکم ہوا اسے برکت دے دے میں نے اس سے دے دی" میں نے عرض کیا "یہ برکت کیا ہوتی ہے" وہ مسکرا کر بولے "یہ جاگ ہوتی ہے یہ وہ ایک تولا دہی ہوتی ہے جو دودھ کے پورے سٹک کو دہی بنا دیتی ہے" میں نے پوچھا "مجھے کیسے پتہ چلے گا مجھے برکت مل چکی ہے" انہوں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر میرے چہرے پر نظر کر کے بولا "تم جہاں جاؤ گے وہاں رونق لگ جائے گی اور تم جہاں سے اٹھ کر آ جاؤ گے وہ جگہ اجازت ہو جائے گی لوگوں کے دل تمہاری طرف کھینچے چلے جائیں گے لوگوں کو تمہارے پاس بیٹھ کر خوشی اور سکون ملے گا تم سے دوستی کرنے والے لوگ خاندان میں رہیں گے اور نقصان پہنچانے والے خود نقصان اٹھائیں گے" میں نے پوچھا "یہ برکت کب تک میرے ساتھ رہے گی" انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور جھکی دے کر بولے "جب تک تمہاری سوجنا مثبت رہے گی جب تک تو جھکا رہے گا اور جب تک تو کھبر سے بچا

Kashif Azad@OneUrdu.com

میں نے خان صاحب کو سلام کیا اور راجس آگیا یہ میری خان عبدالصمد خان کے

ساتھ پہلی اور آخری ملاقات تھی وہ مجھے میرا حقد سے کراٹھے مار رخصت ہو گئے۔



84 حکمرانوں کے اختیارات

میں نے ایک دن خواجہ صاحب سے پوچھا "عام آدمی اور صوفی میں کیا فرق ہوتا

ہے؟" وہ نرم آواز میں توڑے "صوفی بریشان ہوتا ہے اور تیرے جیرائش" میں نے ان سے پوچھا

"آپ زندگی میں کبھی حیران اور پریشان ہوئے؟" وہ سکرانے "میں اس فیلڈ میں آنے کے بعد

صرف ایک بار پریشان ہوا تھا" میں انہیں اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ وہ بولے "جب کوئی شخص اللہ

تعالیٰ کو پسند آجاتا ہے اور اسے صوفیاء کی صف میں شامل کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو اسے کوئی نشانی دی

جاتی ہے، یہ نشانی صوفی کے حسب، اس کے درجے اور اس کے تہا کا تعین کرتی ہے کسی کو آئینہ

مٹا ہے، کسی کو خرقہ نصیب ہوتا ہے، کسی کو دستار مل جاتی ہے اور کسی کے سر پر تاج رکھا یا جاتا ہے، یہ

نشانیوں عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں، انہیں صرف دوسرا صوفی دیکھ سکتا ہے، صوفی ہزاروں، لاکھوں

لوگوں میں دوسرے صوفی کو انہی نشانیوں سے پہچانتے ہیں، میں ایک بار لندن گیا، میں سنٹرل لندن

میں پھر رہا تھا، اچانک ایک اسکول کلب کا دروازہ کھلا اور ایک شخص جھومتا اور جھومتا ہوا باہر نکلا اور

لڑکھڑا کر فٹ پاتھ پر گر گیا، میں نے اسے دیکھا، اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں ہنس پڑے، ہم

دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں کلاس فیلو تھے، وہ بھی حضرت شیخ عبد القادر

جیلانی کا شاگرد تھا اور میں بھی، اسے شیخ نے اپنا رومال دے رکھا تھا، تم غور کرو وہ گورا تھا، ادا دین

تھا، جواری اور شرابی تھا، لیکن اس کے باوجود، میرا بھائی اور کلاس فیلو تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے

کی طرف ہاتھ ہلانے اور چپ چاپ اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔ تو میں عرض کر رہا تھا یہ وہ نشانیاں ہوتی ہیں جن سے ایک صوفی دوسرے صوفی کو پہچانتا ہے اور ہم اب ان نشانوں کی وجہ سے دوسروں کے کاموں اور حالات میں مداخلت نہیں کرتے۔

وہ بے ارادہ دوبارہ بولے، ہمیں جب منتخب کیا جاتا ہے تو ہمارے پاس چند امانتیں رکھ دی جاتی ہیں، یہ امانتیں ولایت کی نشانیاں ہوتی ہیں اور ہم اس وقت تک ان سے رخصت نہیں ہوتے جب تک ہم یہ امانتیں حق داروں کو سونپ نہ دیں، میرے پاس بزرگوں نے ایک خرقہ خلافت رکھ لیا تھا، یہ وہی خرقہ تھا جو زوالدین زنگی کو عتایت ہوا تھا اور کئی مجاہد و خونخوار کو ہندوستان بھجوا دیا گیا تھا۔ یہ ولایت کی بڑی امانتوں میں سے ایک امانت تھی، میں اسے روز سرت سے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا، وکون خوش نصیب ہو گا جسے یہ نشانی نصیب ہوگی اور میں ساتھ ہی یہ دعا کیا کرتا تھا کاش وہ خوش نصیب میں ہوں۔

نوجوان صاحب نے سرت سے آدھری اور دوبارہ گویا ہوئے، ایک دن مجھے تہجد کی نماز کے بعد اونگھ آئی اور میں جاسے نماز پڑھی ٹیٹ گیا، مجھے نیند میں اٹھا کھینس تیس برس کا ایک نوجوان دکھایا گیا، اس کا پتہ معلوم کیا اور پتہ چلنے کے بعد پہنچ گیا اور وہ جوان دیکھا کہ کینٹ میں رہتا تھا، میں نے امانت کی پون اٹھائی اور وہاں ہی بس میں سوار ہو گیا وہ دوپوش ملانے میں رہتا تھا، میں مختلف لوگوں سے ایڈرنس پوچھتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا، میرے سامنے ایک بہت بڑی کوچی تھی، میں نے گھنٹی کا بھن بایا، ایک بوڑھی خاتون کینٹ پر آئی، میں نے اس سے زاہد صاحب کا پوچھا تو اس نے شدید نفرت سے میری طرف دیکھا اور پتہ کار کر بولی، اب تم آگے دو، تم لوگ واہمی رکھ کر بھی ایسے کام کرتے ہو، مجھے اس خاتون کا لہجہ اور ہاتھ عجیب لگیں، میں نے بڑی لباہت سے درخواست کی میرے پاس زاہد صاحب کی ایک امانت ہے میں انہیں یہ سونپنے بغیر واپس نہیں جاسکتا۔ مہربانی فرما کر ان سے میری طرف ایک منٹ ملاقات کرویں، بوڑھی خاتون کا بلند پھیڑ یک دم تیز ہو گیا اور وہ اونچی آواز میں بولی، میں نے گئی اور بد بخت بچہ میں، اب آتے ہی منٹ سے ملے گا، ان اور اس کے بعد وہ بوڑھی خاتون آسمان کی طرف دیکھ کر زاہد صاحب کو بددعا میں دیکھنے لگی، وہ بار بار کہتی تھی اس اوادے تو میں بالآخر ہی اچھی تھی، یہ بھی کہتی تھی یا اللہ تو اسے اٹھائے یا پھر مجھے اٹھا لے اس زندگی سے تو ہوزن میں سزا کا اچھا ہے مجھے اس ساری صورت حال نے تھکائیں آ رہی تھی، میں کینٹ ہی، ہینڈ پر کھڑا تھا اور بوڑھی خاتون میرا راستہ روک کر بددعا میں دے رہی تھی، ایک شخصوں، وہاں میں خانا پتے پر آ گیا، وہاں کی تصوف کے مسابوں کے مطابق وہی ایسا

شخص ولایت میں داخل نہیں ہو سکا جو اپنے والدین کا گستاخ ہو اور زاہ صاحبہ کی ماں، بیٹی پر کھڑی ہو کر انہیں بدو عا میں دے رہی تھی بہر حال قصہ مختصر یہ سلسلہ بڑی بریک چنار کا جب بڑھیا کو یقین ہو گیا میں زاہ صاحبہ سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا تو وہ مجھے پیچھے سروٹ کواڑ میں لے آئی۔

خوبصاحبہ دم لینے کیلئے رکے میں بے جا بی سے ان کے دو بارہ لٹے کا انتظار کرنے لگا وہ گویا ہوئے اندر کا سنٹر انتہائی پریشان کن تھا پورے کمرے میں شراب کی خانی بوتلیں بکھری تھیں اور ماں بوتلوں کے درمیان ایک فست حال نہ جوان آ زہا تر چھا پڑا تھا تو ان نیم برہنہ تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اس نے کئی دنوں سے غسل بھی نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم سے شراب اور پسینے کی مٹی ملی ہو آ رہی تھی بوزجی خاتون مجھے وہاں چھوڑ کر چلی گئی میں نے نوجوان کو ہلایا تھپکیاں دیں اور اس کے پاؤں پر گدگدی کی تو اس نے نیم آٹکھوں سے میری طرف دیکھا اور گہرا کر بیٹھ گیا وہ وحشی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا میں نے اس کے پاؤں چھوئے اور پوچھی اس کی گود میں رکھ دوئی وہ بڑی دیر تک پوچھی گویا کہتا رہا اس کی آنکھوں میں

سایاں تھا نہیں بار بار نا تھا اس لئے پوچھی کہ وہ کب سے یہاں سے ہے اس کا نام دیا مجھے اس کا نام لیکن بھروسہ بارہ بیٹھ گیا اس نے عورت سے میری طرف دیکھا اور یہی آواز میں دیا: "معلوم کر کے

کیا کر کے" میں نے عرض کیا "حضور میں اپنے سوال کی سزا سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا" وہ اٹھا اس نے کارنس سے ایک تصویر یا خانی اور اس پر اٹھی تو کہہ بولا "اس کی وجہ سے" میں تصویر پر جھک گیا تصویر میں ایک بزرگ ایل خیر پر بیٹھتے اور وہ ایل خیر کے پیچھے دروازے پر ملنے والی بوزجی خاتون اور زاہ صاحبہ تھڑ سے تھے زاہ صاحبہ نے بتایا یہ میرے والد ہیں، میں ان کی اکھوتی اور اور ہوں، میرے والد بہت رئیس انسان تھے لیکن مجھے دولت نے بگاڑ دیا تھا، میں شراب کی لت میں پڑ گیا تھا، میری صحبت خراب تھی میں اور میرے دوست ساری ساری رات شراب پیتے تھے، میری نوابی ٹی ہڈ سے والد کو کھٹ پانچ انٹس لانی ہو اور وہ وہل چھبڑ تک بھدو ہو گئے جس کے بعد میں با آواز لی کج اپنے والد اپنے ہاتھوں سے نہا ہوا تھا۔ یہ میرا معمول بن گیا تھا ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کاناں چائینا، ہم آؤں نے رات خوب شراب پیا، نیشے کے دوران مجھے اچانک یاد آیا غل اتوار ہے اور میں میرے والد یہ انتظار کرتے رہیں گے، میں فوراً اٹھا میں نے نازنی چھائی اور ہاتھوں کا اعابن کروا دیا، میرے دوستوں نے مجھے بہت آجھایا انہوں نے مجھے بتایا رات بہت اندھیری ہے اور تم نیشے میں دھست دو، تم اراغ تک نہیں کر سکو

کے لیکن میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، میں سارا راستہ اپنے سر پر برف رکھتا اور لمبوں چوستا رہا لیکن میں تھکا ہوا نہیں رہا۔ میرے والد کو دل چاہتا تھا کہ میرا انتقال کر رہے تھے میں نے فوراً صبح میں شہر گرم پانی ڈالا پانی میں ٹمک اور لمبوں ملایا اور نہیں پانی میں لگا کر فوراً سے ان کا مساج کرنے لگا، میرے والد اس دوران مجھے غور سے دیکھتے رہے میری آنکھیں بند تھیں اور تھکاوٹ سے جو جمل تھیں مجھے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن میں اپنے والد کو غسل دیتا رہا میں نے غسل کے بعد انہیں تونے سے خشک کیا، ان کے جسم پر پاؤڈر چھڑکا انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور ان کی دل چاہیوں کے ساتھ ٹیک لگا کر سہ گیا یہ میری زندگی کی قیمتی ترین نیند تھی اس نیند میں مجھے ایک بزرگ دکھائی دیئے انہوں نے اپنا فرقہ اتارا مجھے بہتایا اور آپ کی شکل دکھا کر رخصت ہو گئے۔

خوبصاحب صاحب کے اور ذرا دیر تک کر بولے، میں نے زابد صاحب سے پوچھا آپ

کے والد کہاں ہیں زابد صاحب نے جواب دیا وہ اپنے رب کے پاس لوٹ گئے ہیں میں نے ان

سے پوچھا اب آپ کیا کریں گے انہوں نے پوچھی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے میں اس پوچھی

کے بعد کیا کر سکتا ہوں میرے راستے طے ہو چکے ہیں مجھے شہر میں کوئی راستہ نہیں ملے گا اور پوچھی

سوں پوچھی نے میں اس شہر سے نکلوں گا اور شہر شہر کاؤں اپنے جیسے لوگوں کی اصلاح کروں گا۔

خوبصاحب صاحب کے اور دو بار بولے، میں نے زابد صاحب سے دعا کی درخواست کی اور انہی کر

دائیں آ گیا، خوبصاحب صاحب خاموش ہو گئے، میں نے ان سے پوچھا، زابد صاحب کے پاس کتنے

اختیارات ہیں، خوبصاحب صاحب نے ذرا دیر سوچا اور پھر پھر کے پھر سے لہجے میں بولے، اتنے جتنے 84

ملکوں کے حکمرانوں کے پاس ہیں۔ میں نے حیرت سے عرض کیا، صرف ایک غسل کے بدلے

اتنے اختیارات، خوبصاحب صاحب نے قہقہہ لگایا، جب اللہ دیتا ہے تو وہ سارے خزانوں کے

دروازے کھول دیتا ہے، میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر واپس آ گیا۔

تین ہزار ایک سو چوبیس

وہ بچے کے دن غائب ہو جاتے تھے، صبح سویرے اٹھتے تھے وہ گاڑی میں عجیب و غریب لباس پہنتے تھے اور کھڑے سے رکھتے ہو جاتے تھے اور جب شام ہوا تو اٹھتے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر ہار کول، سینٹ اور گارے کے داغ ہوتے تھے لیکن ان کے چہرے پر گہرا اطمینان ہوتا تھا، میں ان سے ہر بار اس پر امر اور سرگرمی کے بارے میں پوچھتا تھا مگر وہ مسکرا کر ہال دیتے تھے، ایک جمعرات، وہ میرے پاس آئے اور مسکرا کر بولے، اگر تم کل فارغ ہو تو میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنی مصروفیت میں شامل کرنا چاہتا ہوں، میں فوراً تیار ہو گیا، اگلی صبح میری زندگی کا اجنبی دلچسپ اور پر امر اور دن تھا، گیلائی صاحب نے سنو سے ایک ہتھوڑی، ایک کھر پے، ایلو سوئم کی ایک پرات، ٹیبلٹوں کا ایک ڈبہ، مین ہول کے روز مکن، چند چٹھیاں، چند کنڈیاں اور چند کھل نکالے، ڈوکی میں رکھے اور مجھے ساتھ بٹھالیا، ہم اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئے، راستے میں گیلائی صاحب خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے، ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پر اسراریت تھی، گیلائی صاحب راولپنڈی میں میرے پہلے میزبان تھے، میں 1992ء میں اسلام آباد منتقل ہوا اور میرے پاس اسلام آباد میں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، میں مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا گیلائی صاحب کے پاس پہنچ گیا، گیلائی صاحب واپس ماڈرن تھے اور خلافت ناؤن راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے مکان میں مجھ کو زمہ کی گزار رہے تھے، میں دو ماہ تک ان کے پاس

مہمان رہا۔

میں اس دن کی طرف ایسے آتا ہوں گیانی صاحبہ سے وہاں کہہ بیٹھے انہوں نے گاڑی سے ایک چٹائی بچھ کر ایک چھتھی اور تھوڑی نکالی اور مجھے لے کر وہاں کوہ کے ریستوران میں داخل ہو گئے اور سیدھے ٹوائٹ میں بیٹھے میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا ٹوائٹ کے دروازے کی چٹائی نولی ہوئی تھی انہوں نے پرانی چٹائی اجاڑی اور اس کی جگہ نئی لگا دی اسکرانے اور مجھے ٹھہرایا چلو میں چل پڑا انہوں نے راستے میں ایک جگہ گاڑی روکی ڈکی سے پرات نکالی پرات میں کھوکھری سینٹ ڈالا سینٹ میں پانی ملا یا اسٹین لیس سٹیل کے بڑے پتھروں سے سینٹ کس کیا اور پہاڑ کی طرف چل پڑے پہاڑ کی دیوار کا ایک پتھر کڑو تھا انہوں نے پتھر نکالا اس کے ساتھ سینٹ کا باور و پتھر دوہارہ اس جگہ جڑوا انہوں نے فارغ ہونے کے بعد باقی سینٹ دوسرے پتھروں پر لگا دیا انہوں نے ذرا سے فاصلے سے پہاڑ کو غور سے دیکھا اور

الطینان سے سر ہلا دیا ہم آگے چل پڑے وہ یز یا مگر کے قریب رکے انہوں نے ڈکی سے نیپوں کا

درمیان ایک قدرتی کیاری بنی تھی انہوں نے کھر پے سے کیاری کی مٹی نرم کی وہاں بچھ بچھ کے اور ان پر پانی کی چھوار ڈال کر واپس آ گئے ہم آگے چل پڑے وہ جی تھری کی ایک جمبولی تھی کلی میں داخل ہوئے یہ مکانات کی پھیلی گلی تھی اور اس میں کینوں نے جگہ جگہ کھرنے کی ٹوکریاں الٹی ہوئی تھیں پوری گلی میں حجاز جو کار اور کائی جی تھی گیانی صاحبہ کے ہاتھ میں مین بول کا ایک ڈھکن تھا ڈھنگی کے درمیان بیٹھو وہاں ایک مین بول کا ڈھکن غائب تھا گیانی صاحبہ نے مین بول پر ڈھکن لگا دیا دو کورڈ مارکیٹ کے قریب رکے انہوں نے گاڑی سے نکلی کا ایک سوچ نکالا اور بال مسجد کے استخانا نواں میں داخل ہو گئے استخانا خانے کا ایک سوچ لٹا ہوا تھا گیانی صاحبہ نے وہ سوچ تبدیل کر دیا دو بازار روڈ کے سکول میں داخل ہوئے ان کے ہاتھ میں نوپے کا ایک دست تھا اسکول کے برآمدے میں کھٹائی لگی تھی کھٹائی کے ساتھ دست پادھن انہوں نے پڑا دست اٹھایا اور اس کی جگہ یاد کھو یا ہم دونوں آگے چل پڑے راستے میں انہوں نے درخت کی ایک ڈنی سی شاخ توڑنی اور ایک گلی میں داخل ہو گئے ڈنی کے تین درمیان میں ایک بڑا سا کتہہ تھا جس کی جہ سے گاڑیوں کو خاص زحمت اٹھانا پڑتی تھی گیانی صاحبہ نے یہ شاخ کڑ سے میں اور وہی ہم آگے بڑھتے گئے وہ شام تک ٹنٹے جہاں پر اس ٹنٹے کی کارروائیاں کرتے رہے میں ناہوشی سے

ان کے ساتھ ساتھ چند ماہ با مغرب نبی اذان کے اہل انہوں نے کبر پر ہاتھ رکھا آمان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر وہی کا اعلان کر دیا۔

میں گاڑی میں بیٹھ کر بار بار پیلو بدل رہا تھا گھولانی صاحب میری بچھری سے کالٹ لے رہے تھے ہم چاندنی ہوٹل سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف مڑنے لگے تو وہ بولے "میں حضرت یہ فرمے گا پیر و کارہوں اور یہ سب میری ذہنی میری عبادت کا حصہ ہے" میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا وہ بولے اس فرمے کے ہائی حضرت حضرت ہیں ہم لوگ چھوٹی چھوٹی نیکوں کے قائل ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں نکل جی کی طرح ہوتی ہے آپ آدھے بولے کالج پڑتے ہیں اسے پانی دیتے ہیں اس نکل میں سے ایک کوبل نکلتی ہے اور یہ کوبل آگے چل کر سینکڑوں نکل کے برصت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہاں کوئی انسان زمین میں پھینکے گا برصت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر انسان ہا آسانی سینکڑوں ہزاروں اور سوئوں کے بیج کو سکتا ہے اور ہم لوگ نیکوں کے بیج پڑتے ہیں ہم لوگ خاموش رہتے ہیں ہم اپنے فرمے کا اعلان نہیں کرتے ہم اس کی بیخبر و اشناخت نہیں۔

KashmiriAzad@Oneltd.com

ہو جائے ہیں ہم لوگ بر مذہب ہر فرمے اور ہر قوم میں ہر دور ہیں ہم لوگ یہودیوں میں بھی ہیں عیسائیوں میں بھی مسلمانوں میں بھی ہر قوموں میں بھی اور شاید ہندوؤں میں بھی ہیں ہم وہی میں بھی ہیں امریکہ میں بھی یورپ میں بھی اور پاکستان میں بھی ہمارا ایک پورا ریکٹ ہے ہم پورنی زندگی خود کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے ہم لوگ ہر زندگی گزارتے ہیں اور زندگی میں چھوٹی چھوٹی نیکوں کے تین ہزار ایک سو چھ بیج میں نکل اور برصت ہو جاتے ہیں "وہ رے اور دوبارہ بولے" تم مجھ سے آج کے دن کی کاروباری پوچھنا چاہتے ہو میں تمہیں بتاؤں ہوں، ماہانہ کوہ کے اس نوائلٹ کی چھٹی نکل ڈاؤں سے شراب تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو پوچھنا ہی ہوئی تھی میں نے یہ چھٹی لگا کر سینکڑوں لوگوں کی پریشانی دور کر دی ہے پہاڑ کا دو پتھر گر جائے تو کئی پارٹوں میں وہاں لینڈ ملانے لگتے، وہ جانی میں نے لینڈ ملانے تک کہ رات بھر روک دیا، میں نے مارک کے اس ہول پر پوراؤں کے بیج لگا دیے ہیں دوا دوا ہندو نہیں اس بہ سے گزرتے گا وہ ہول، نیچے کہ خوش ہو گا، اس نکل کے میں ہول کے اعلیٰ خانہ تھا، وہاں سے ہر چھپنے والے بیچے ہمارے تھے اور ان کی جان کو ختم ہو کر بیٹھتا ہائی بیچ کے ٹوٹنے ہوئے سرج سے تیار ہوں گے اور نہ تو تیار ہوں گے اور نہ سے کبھی میں شائے کرتے اور ان کے ہاں کو اعلیٰ کی شہ نکلی ہو جاتی تھی اور میں نے اس سے یہودیوں کو

لفظاً ہوں "وہ ر کے اور سکرا کر بولے" اب تم پوچھو گے میں نے یہ ساری باتیں تمہیں کیوں بتائیں " میں نے اثبات میں سر بلا دیا وہ سکرائے " ہم میں سے ہر شخص رخصت ہونے سے پہلے یہ راز اپنے کسی قریبی شخص کو بتاتا ہے، یہ پانچ ہزار سال سے ہماری روایت ہے، میں رخصت ہو رہا ہوں لہذا اپنی امانت تمہیں سونپ رہا ہوں " ہمارا گھر آ گیا، گیلانی صاحب اترے، انہوں نے تالہ کھولا اور گھر میں داخل ہو گئے، میں پیسے میں شراہور تھا، انہوں نے انٹ جلائی اور بولے " لیکن تم یہ نہ سمجھتا تم تمہیں اپنے فرقے میں داخل کر رہے ہیں، ہم لوگ دنیا دار لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کرتے۔ میں تمہیں راز دار بنا رہا ہوں، تم کل اپنا بوریا بستر اٹھانا اور یہ گھر چھوڑ دینا، ہمارا ساتھ بس سب سے تک تھا " وہ تو یہ لے کر غسل خانے میں چلے گئے میں نے دوسرے دن گیلانی صاحب کا گھر چھوڑ دیا اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملے لیکن میں جب بھی کوئی میں ہوں دیکھتا ہوں، کوئی ٹوٹی ہوئی چٹنی دیکھتا ہوں یا مجھے کسی سڑک کے گڑھے میں درخت کی کوئی شاخ نظر آتی ہے تو مجھے بے اختیار گیلانی صاحب یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا یہ لوگ واقعی ہمارے لوگوں میں ہیں، کیا حضرت خضر کی جماعت حقیقتاً ہے اور نہ چوٹی چوٹی کی جماعت ہے؟

رہی ہے یہاں کئی کر میں ہمیشہ کو کوئی صورتحال کا شمار ہو جاتا ہوں۔



بڑی سرکار

”درمیان میں پانچ دن آگے یہ پانچ ملن کہاں سے آئے تھے اہوان کے آنے کی وجہ سے
 کیا کھلا مجھے ڈر تک بھگتیں آئی وہ ایک لمحے کے لئے نہ کے اور بھلا کر دوبارہ گویا ہوئے“ میں

ملک سے باہر تھا میری خواہش تھی میرا عازمت کے بعد باقی زندگی فرانس کے کسی گاؤں میں
 گزار دوں، میں نے سوکس فرانس سرحد پر چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا تھا لیکن پھر وزیر اعظم صاحب
 فرانس آگئے وہ میرے گھر تشریف لائے اور مجھے پاکستان آنے کی ترغیب دینے لگے، میں نے
 عرض کیا میں ملک کے حالات سے دلبرداشتہ ہو چکا ہوں لہذا میں نے اپنی خواہش سے اپنے لئے یہ
 گوشہ منتخب کیا ہے، میں اس فرابے میں واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہوں، وزیر اعظم صاحب میرے
 پرانے دوست تھے انہوں نے اصرار شروع کر دیا، میں ان کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گیا،
 وزیر اعظم صاحب میرے گھر سے اٹھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی مرضی کا ٹکڑا مانگ لیا، میرا کہنا
 تھا میں اس جگہ میں زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہوں، وزیر اعظم نے فوراً ہاں کر دی، ہم نے
 تاریخ طے کی اور وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

میں نے چند ماہ میں اپنی توکری سے اٹھ کر دیا سامان پیک کیا اور پاکستان آ گیا، میں
 نے وزیر اعظم صاحب سے ملاقات کی، وزیر اعظم نے میری پوشنگ کا حکم دے دیا، دو دن بعد مجھے
 تقرر نامہ مل گیا، میں نے تقرر نامہ کھولا تو میں حیران رہ گیا، میری تقرری ایک غیر متعلقہ جگہ کے

دور، اڈیشن پر کر دی گئی تھی، مجھے ایک ایسے ٹکے کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا گیا تھا جس کی میں الف ب تک سے واقف نہیں تھا، میں نے فوراً پرنٹل سیکرٹری سے رابطہ کیا، وہ پریشان ہو گئے، انہوں نے تحقیق کی تو یہ چلا اس دن ذریعہ عظم نے ڈائریکٹس کے تقرر کا حکم دیا تھا اور غلطی سے دوسرے افسر کا خط میرے نام سے جاری ہو گیا، خط جاری کرنے والا جوائنٹ سیکرٹری انتہائی پریشان تھا، اس نے مجھ سے درخواست کی آپ مہربانی فرما کر ذریعہ عظم صاحب کو اس غلطی کی اطلاع نہ دیں، ہم سب کی نوکری اور کیریئر برباد ہو جائے گا، میں نے اس کا حل پوچھا، اس نے ایک عجیب حل تجویز کیا، 'اس نے کہا، 'مرا آپ اس ٹکے کو جوائن کر لیں، ہم پانچ دن میں آپ کو دوسرے ٹکے میں ٹرانسفر کر دیں گے، میں نے احتجاج کیا لیکن وہ گریڈاری اور منٹوں پر اتر آیا چنانچہ میں اسے پریشان دیکھ کر نرم پڑ گیا، میں نے سوچا صرف پانچ دن کی تو بات ہے، میں یہ پانچ دن جیسے تیسے گزار لوں، میں نے ہاں کر دی، دوسرے دن میں نے جوائننگ سے وہی 'ڈور کے سانس لیا اور مسکرا کر بولے، "میں نے پانچ دن پورے کئے، چھنے اور ساتویں دن، چھٹی تھی، آٹھویں دن مجھے نیا تقرر مائل گیا، میں

یہ پانچ دن دانے لے کر کھکے، کھیر، آدھ اور سبھی، اتھو کی لٹری لکھوانا نہ ہو گیا، میں اسلام آباد چلا گیا، 2 اکتوبر کا دن تھا، میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا کہ شام کو اطلاع آئی، نونے نے ایک بار پھر اقتدار سنبھال لیا ہے، میں حیران رہ گیا، دوسرا اور تیسرا دن اسی حیرانی میں گزر گیا، چوتھے دن میں اپنے نئے دفتر گیا تو یہ جلا ذریعہ عظم کے تمام پرانے احکامات منسوخ ہو چکے ہیں، فہد میں اب ٹکے کا چارج نہیں لے سکتا، میرے مقدر کا فیصلہ اب نئی انتظامیہ کرے گی، میں نے کندھے اچکائے، کراچی، دہلی، آج، اپنا سامان بک کر آیا اور فرانس آ گیا، میرا دہلی کا ایڈیٹر ختم ہو گیا، وہ خاموش ہو گئے۔

میں ان کی انتہائی پورا اور غیر ضروری حد تک طویل داستان سن کر تھک چکا تھا، میرے چہرے پر ہزاری کے آثار نمایاں تھے اور سوچ رہا تھا، اس کہانی میں مقدر کا عنصر کہاں پوشیدہ ہے، ایسی ہزاروں کہانیاں ہمارے دائیں بائیں بکھری پڑی ہیں، وہ میری کیفیت بھانپ گئے، انہوں نے کافی کے گک پر ہاتھ پھیرا اور ذرا سی شوخ آواز میں بولے، "اب سوال پیدا ہوتا ہے، قدرت نے مجھے پاکستان کیوں بھجوا دیا تھا؟" میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا، وہ ہنسے، "قدرت نے مجھے صرف ایک ڈراما ہونے کے لئے پاکستان بھجوا دیا تھا، میں نے چونک کر سر اٹھایا، وہ شوخ آواز میں بولے، "میں نے جب اس غیر متعلقہ اور ناپسندیدہ ٹکے کا چارج لیا تھا تو اس سے پہلے کئی ایک یوزر ہاؤس بنا کر آیا، تو میرے پاس آیا، اس نے مجھ سے پوچھا، صاحب آپ دوسرے ملک سے آئے ہیں، میں

نے اسے گھور کر جواب دیا "ہاں فرانس سے" اذرا نیور نے کانپتے ہوئے عرض کیا "جناب آپ کو یہاں صرف میرے لئے بھجوایا گیا ہے" میں نے اس سے وجہ پوچھی وہ بولا "جناب پانچ دن بعد میری بیٹی کی شادی ہے اور میرے گھر میں پانی کے ایک گھڑے کے ساتھ تھوکس میں نے پھیلے صاحب کو امداد کی درخواست دی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا میں نے بڑی سرکار سے اس کی شکایت کر دی لہذا وہ یہاں سے زائر سفر ہو گیا جس کے بعد میں نے بڑی سرکار سے درخواست کی آپ کسی باہر کے بندے کو میری مدد کے لئے بھجوائیں اس ملک کے افسروں کے دل بہت تنگ ہیں بڑی سرکار نے مجھ سے وعدہ کیا وہ سیکنڈ کی بارات سے پہلے کسی نرم دل افسر کو یہاں بھجوا دیں گے" میں نے اس سے پوچھا "تمہاری بڑی سرکار کون ہے" اس نے اٹلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور گھوٹو کیر آواز میں بولا "دوہم سب کی بڑی سرکار ہیں" دوہم مجھے ایک پوٹسپ کو درکار لگا لہذا میں نے اس سے کہا "تم ثابت کرو مجھے یہاں صرف تمہارے لئے بھجوایا گیا ہے" وہ مسکرایا اور عاثرانہ آواز میں بولا "آپ مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دیں میں ثابت کروں گا" میں نے کہا "پوچھو وہ پوچھو لا" کیا آپ یہاں اپنی رہنمائی سے آئے ہیں؟ میں نے انکار میں نے انکار کیا وہ بولا "جناب آپ کا انکار میرے دعوے کا ثبوت ہے" میں نے ٹھوڑی دیر سوچا تو وہ اذرا نیور مجھے ذرا ذرا

سالمیک لگایا، میں نے اپنے پی اے کو بلایا اور اسی وقت اس ذرا نیور کو مجھے کے فذ سے تین لاکھ روپے دینے کا حکم دے دیا، میں نے چیک فون کر کے منبر سے فوری ادائیگی کی درخواست بھی کی، اس کے بعد میں نے سٹاف کو حکم دیا بارات کے استقبال کیلئے لان میں خوبصورت شامیانہ لگا یا جائے اور بارات کو کھانا منگنے کی طرف سے دیا جائے، میں نے انہیں حکم دیا ہم سب بارات کا استقبال کریں گے اور پورا گھنٹہ ل کر ذرا نیور کی بیٹی کو رخصت کرے گا۔ میرے احکامات پر عملدرآمد شروع ہو گیا، ذرا نیور کو جینز کے لیے رقم مل گئی، ہم لوگوں نے دفتر کے لان میں شامیانہ لگوائے، لان میں چراغیں لگایا۔ بارات کیلئے کھانا پکرایا، سب نے مل کر بارات کا استقبال کیا، پورے گھنٹے نے دو گھنٹے کو سلایا میں اور دو عاؤں اور چار کے ساتھ بیٹی کو رخصت کروایا۔ اگلی صبح وہاں میرا آخری دن تھا، میں دفتر آیا تو پتہ چلا فجر کی نماز کے دوران ذرا نیور کو ہارت ایک ہوا اور وہ بندے کے عالم میں فوت ہو گیا۔ میں نے اس کا جنازہ پڑھا اور کراچی واپس آیا۔ کراچی سے میں اسلام آباد گیا اور اسلام آباد سے پانچ دن بعد میری واپسی کا عمل شروع ہو گیا یوں میری زیونی ختم ہو گئی وہ خاموش ہو گئے۔

میں ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا، دو بولے "مجھے صرف اس ڈرائیور کے لیے پاکستان بھجوا دیا گیا تھا، میری جاب صرف پانچ دن تک محدود تھی لہذا جوں ہی میرا کام ختم ہوا میں واپس فرانس آ گیا" دور کے اور وہ بارہ بولے "ہم سب بڑی سرکار کے مہربان ہیں، ہمیں بڑی سرکار بھی کسی ڈرائیور، کبھی کسی مالی، کبھی کسی چوکیدار، کبھی کسی چیز ای اور کبھی کسی خانہ سارے کیلئے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کرتی رہتی ہے اور ہم نا جانتے ہوئے نا چاہتے ہوئے اپنے ہتھیار کی خدمت میں انجام دیتے رہتے ہیں۔ جب ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے تو ہمیں بڑی سرکار کو مبارکباد دینی ہے اور ہم واپس اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں" وہ خاموش ہو گئے، میں نے ان سے آہستہ سے پوچھا "وہ ڈرائیور کہاں کا رہنے والا تھا" وہ مسکراتے اور میری طرف دیکھ کر بولے "وہ کھراکار رہنے والا تھا" میں نے ان سے عرض کیا "وہ ایک صاحب دسترس شخص تھا، ہمیں اس کی قبر پر حاضر ہونی چاہیے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا "جس شخص کو بڑی سرکار عرضی ڈالنے کی اجازت دے دے، جس کی مدد کے لیے اللہ آپ جیسے لوگوں کو فردوس سے بھجوادے وہ شخص کوئی عام انسان نہیں ہو سکتا، وہ یقیناً بڑی سرکار کے نظام کا کوئی بڑا آدمی تھا" انہوں نے ذرا دیر بعد کہا "ہاں میں سر بلا دیا، دو گزشتہ روز وہ بارہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے ڈرائیور کی قبر کے بارے میں پوچھا، وہ بڑی دیر تک افسردہ انداز سے میری طرف دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ آواز میں بولے "وہ قبر قبروں کے جہنم میں گم ہو چکی ہے، میں قبرستان میں مسلسل دو دن قبر تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے نہیں ملی" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پورے یقین سے عرض کیا "وقت نے ثابت کر دیا وہ واقعی کوئی بڑا شخص تھا"۔



مصلحت

ان کی آنکھوں میں پانی اکھینا انہوں نے آنسو روکنے کیلئے تیز تیز جھپکیں ماریں اور

آرام سے لے لیجی اور ہزاروں آنکھوں اور گوں کی طرح ہندھوں میں فوٹ ہو جائیں اللہ تعالیٰ کو انہیں یوں چہرہ ہی تک پہنچانوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی ان کے ان کی تکلیف نہیں جہاتی میں آنکھیں بند کرنا ہوں تو میرے وہاں میں ان کی جھپکیں کو بجھے نطق ہے اس میں تاپ کہ اندھ جاؤ ہوں اور اس کے بعد بیٹھے ساری رات خیز نہیں آتی انہوں نے وہاں سے آنکھیں صاف کیں انھندہ اسائن بھر اور غاوش ہو گئے۔

وہ پاکستان کے صوب سے اسے صنعت کاہ ہیں ان کی فیاضیاں میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں ان تے تے چیک اکاؤنٹس ہیں اور ان اکاؤنٹس میں روزانہ کئی رقم جمع ہوتی ہے اور نہیں جانتے وہ چیکلے 20 برس سے پاکستان کی 20 امیر ترین شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس حقیقتاً دنیا کی ہر نعمت ہے انہوں نے زندگی میں خوشی کا سیلاب اور آسائشیں کو بڑے قریب سے دیکھا۔ وہ ایک ایسے شخص ہیں جن پر لوگ رشک کرتے ہیں انہوں ان جیسا کہ سیلاب شخص بنا چاہتے ہیں لیکن پھر ان کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا ان کی بیوی کو کہہ کر ہو گیا ان کے پاس ہے تمام دولت تھی لہذا ان کا خیال تھا ان کی دولت کے سامنے یہ عرض بہت چھوٹا ہے اور دنیا کے

نہترین ہسپتالوں اور ماہر ترین ڈاکٹروں سے ٹیکم کا علاج کرا نہیں گئے اور ٹیکم صحت مند ہو کر لوٹ کر آ جا نہیں گی۔ انہوں نے دنیا کے ایک سرب سے علاج شروع کیا اور دس برس تک چلے گئے وہ ٹیکم کو لے کر دنیا کے تمام بڑے ڈاکٹروں سے پاس گئے انہوں نے ٹیکم کے سر ہائے طبیقی ذہن اور بات کا ڈیگری دیا انہوں نے کوئی بچہ فقیہ کوئی حکیم کوئی ہائینڈ پیڈز انجین ٹیکم کی تکلیف میں اضافہ ہو چکا کیا اور پندرہ سال تک ہسپتالوں میں رکھے رکھتے رہے مگر ٹیکم کے درد میں کمی نہ آئی۔ یہاں تک کہ ٹیکم سلاہ کو مارلین کے ٹیکے لگنے شروع ہو گئے۔ پچھلے سال ٹیکم سلاہ کا انتقال ہو گیا تھا تعزیت نینے ان کے پاس حاضر کیا اور دینی دینک ٹیکم سلاہ کا ذکر کرتے رہے اور کہتے تھے ”گھنٹے ان کے انتقال کا کچھ نہیں دیا گئے ہر شخص نے فوت ہو جاتا ہے لیکن صرف ان کی تکلیف بود کہ ہے ان کا آٹھویں وقت بہت کم ہے بہت تکلیف میں گزارنا تھا جس وجہ سے ان دنوں کو بارہ سالوں تو میں اندر سے فری ہو جاتا ہوں میں اپنے دو ساتھیوں سے ڈر کر کہتی ہوں تو سب است اللہ کی رضا اسے قدرت کی مصلحت تھی ہیں لیکن میرا دل نہیں ماننا میں اپنے آپ سے بچ رہتا ہوں ایک شخص کو پندرہ سال تک سلاہ لگائی تھی لیکن اسے کبھی جی نہیں گیا اس لیے اسے کبھی نہیں لگایا۔”

ہے انک اپنی ٹیکم کو جانتا ہوں اور بے انتہا پسینہ کا ذرا بھی اور گئی خاتون تھیں اور ہر سال کو وروں روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کرتی تھیں انہوں نے سلاہوں کو غریب بھونوں کو تعلیم دلائی اور ہزاروں بیبیوں کی شادیوں کرائیں اور دوا چیرلی ہسپتال چلاتی تھیں ایسی خاتون تو ان کی ازلیت رہا یہ بات میرنی سمجھتے ہا اترتے۔

میں ان کا سوال سمجھ گیا میں نے ان سے عرض کیا ”سر شاید آپ کو معلوم نہیں دنیا کے تمام خاتون صاحبہ اذہار مصلحت کا راز مرہایہ کار لوگ اور ان کے اہل خانہ کوئی ٹی تھیں ان گن اور شدہ بیماروں کا شکار ہوتے ہیں یہ لوگ موما مئی ایسے مرض کے ہاتھوں فوت ہوتے ہیں جو میڈیکل سائنس کے لئے نیا ہوتا ہے یا پھر اس مرض کی یہ نوعیت اونچی ہوتی ہے آپ کیونکا۔ پاکستان کے امراء میں شمار ہوتے ہیں لہذا آپ کی ٹیکم سلاہ بھی قدرت سے اس قانون کا شکار ہوا تھیں” مجھے ان کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دیے ”مجھے محسوس ہوا وہ میرنی بات پر یقین کرنے کیسے چاہتے ہیں میں سے رٹن کیا ”مرا آپ دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی تاروں نکال کر دیکھ لیں آپ کو وہ لوگ اپنی محبوبہ ہستیوں کو ہسپتالوں میں اٹھانے اٹھانے پھرتے نظر آئیں گے” انہوں نے پہلو ہڈا اور مخمندی لہجے میں بولے ”لیکن کیوں میں قدرت کی یہ مصلحت جانتا ہوتا

ہوں! میں نے سگوارا عرض کیا "سراسر میں قدرت کی تین صلیبتیں ہوتی ہیں اول بڑے لوگوں کی تکلیف بنیادق طور پر صحت چاہیہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی خیر ان کن بیماری کا شکار ہوتے ہیں تو دنیا بھر کے سائنس دان، ڈاکٹر اس بیماری پر ریسرچ شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین اس بیماری کا علاج تلاش کرتے ہیں اس کی دوا بناتے ہیں اور یہ دوا یہ علاج اور یہ تحقیق آگے چل کر عام انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے آپ ڈسپرین سے انسولین تک دنیا کی تمام ادویات کی بسٹری دیکھ لیں ان تمام ادویات کا محرک آپ جیسے بڑے لوگ تھے یہ ادویات بنیادی طور پر امراء کے لئے ایجاد ہوئی تھیں لیکن پھر ان کا فیض عام انسان کو پہنچا دوس بڑے لوگوں کی تکلیفوں سے دنیا میں بے شمار نئے ہسپتال بنے تھے۔ آپ دنیا کے تمام بڑے ہسپتالوں کی تاریخ کال کر، دیکھ لیں یہ تمام ہسپتال آپ جیسے لوگوں نے اپنے اپنے بیماریوں کی یاد میں بنائے تھے۔ آخر آپ جیسے لوگوں کے پیار سے کسی مہلک بیماری کا شکار نہ ہوتے آپ لوگ انہیں انھا کر شیبیوں اور ہسپتالوں میں نہ بچرتے تو یہ ہسپتال یہ لیبارٹریاں اور یہ کیمرسٹری بننے اور آت ان اداروں سے عام لوگ فائدہ نہ اٹھارتے

ہوتے۔ ذرا غامض سے مزین کتابت سننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

انہی عمر ان خان کی والدہ دیکھ سزا داتا شاید عمر ان خان کو اس مرض کا پتہ نہ چلتا انہیں یہ معلوم تھا نہ ہوتا کہ پاکستان میں کوئی کیمسر ہسپتال نہیں یہ عمران خان کی والدہ کی بیماری کا صحت چاہیہ ہے کہ آج پاکستان میں نہ صرف شوکت خانم میورل ہسپتال ہے بلکہ اس میں ہر مہینے سینکڑوں ہزاروں غریبوں کا علاج ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کو دیکھیے انہیں کبھی کا مالک انڈر جوگنڈ "پرنسپل کیمسر" کا مریض ہے اس نے اس مرض کے علاج سے لئے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ وقف کر رکھا ہے اس وقت دنیا کی 11 بڑی لیبارٹریاں اینڈ رورٹرو کینک علاج بریڈت کر رہی ہیں ذرا سوچئے جب یہ علاج دریافت ہوگا تو کتنے عام لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اسی طرح دنیا کا امیر ترین شخص بل ٹینس بھی ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہے وہ دودھ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا بل ٹینس ہر وقت دودھ پیتا رہتا ہے اس کی میڑا اس کی گاندھی اس کے بریف کیمس حتی کہ اس کی جیب تک میں نہ دودھ کا پیکٹ ہوتا ہے۔ سائنس دان اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں اس تحقیق کے تمام تر اخراجات بل ٹینس برداشت کرتا ہے اسی طرح بل ٹینس کا ایک قریبی دوست ایڈن کا شکار ہو گیا بل ٹینس نے اس کا نام کرایا لیکن دانت ہو گیا اس وقت بل ٹینس کو اس مرض کی شدت کا اندازہ دیا انڈر نیاس اس وقت ایڈز

تے بارے میں جتنی ریسرچ ہو رہی ہے اس کے تمام اثراجات اس نئیس ادا کر رہا ہے اور نیا کا پانچواں امیر ترین شخص شہزادہ ولید بن طلال النطقی کے مرض کا شکار بنے اس کی آنکھوں کی پتلیاں توکت نہیں کرتیں اور ہسپتال میں عدا کی مکتا ہے اس وقت اس مرض پر تحقیق ہو رہی ہے اور ان تحقیق کے اثراجات بھی شہزادہ طلال ہواشت گھر رہا ہے آپ ذرا سوچئے جب اس مرض کا علاج دریافت ہوا تو اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کتنے لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی ہو جائے گی۔

دو ماہی سے میری بات بنتے رہے میں نے عرض کیا "سہ بیگم صاحبہ کی اس بیماری میں اللہ کی ایک تیسری مصلحت بھی پوشیدہ تھی آپ نے اس مصلحت پر غور نہیں کیا ہوگا آپ ذرا یاد کیجئے جب آپ بیگم صاحبہ کو لاکھڑی ڈاکٹر نئیس ہسپتال میں جاتے تھے تو وہاں آپ اور بیگم صاحبہ کو کتنے ضرورت مند لوگ ملنے لگے یہ وہ لوگ تھے جن کے پیارے ہسپتالوں میں داخل تھے لیکن ان کے پاس دواہاں اور خون کے لئے پیسے نہیں تھے ان دنوں آپ کا دل نرم تھا پھر مجھے یقین ہے آپ نے بے شمار ضرورت مندوں کی مدد کی ہوگی" میں خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں

نے ان لوگوں میں نظر پڑا اور میں نے عرض کیا "ان لوگوں کو سہ بیگم صاحبہ نے مدد کی ہے اور انہیں فائدہ پہنچا ہے آپ ان ہسپتالوں کو پھر زندہ کرنے آپ ان سرسبز ممالک سے ملنے آئے آپ ان کی دعاؤں کرتے اور ان لوگوں کو ان کے عزیزوں کو صحت مند بنائی لہذا ضرورت بیگم صاحبہ کی تکلیف کے ذریعے آپ کو ان لوگوں تک پہنچا دیا جانتی تھی آپ ان لوگوں تک پہنچنے آپ نے پسند کیا اور آپ نے فریضہ ادا کیا اور آپ کے پیسے کو زندگی و صحت کے لئے بے شمار لوگوں کو زندگی و صحت کے لئے بے شمار لوگوں کو شفا ملی آپ ان لوگوں کو یاد کیجئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے" میں خاموش ہو گیا۔

انہوں نے سر اٹھا دیا اور مسکرا کر بولے "واقعی میں نے ان پہلوؤں پر بھی غور نہیں کیا تھا" جب آپ گفتگو کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا مجھے دو کام کرنے چاہئیں "مجھے بیگم صاحبہ کے نام سے کینسر کا ایک ایسا ہسپتال بنانا چاہیے جس میں غریبوں کا مفت علاج ہو اور مجھے ایک ایسا امیڈیکل کالج بھی بنانا چاہیے جس میں ڈاکٹروں کو کینسر کی سوشلائزیشن کرائی جائے یہ سوشلائزیشن بھی فریبن ہوزس ڈاکٹروں سے یہ وعدہ دیا جائے کہ زندگی بھر غریبوں کا مفت علاج کریں گے" ان کے الفاظ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی میں نے ان سے عرض کیا "سہ بیگم صاحبہ اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحت جس سے لے جانے کیلئے قدرت کو آپ پر چار سال منت کرنا پڑی۔"

خوشحالی کا دیوتا

72 سالہ رضیہ عین رائوں سے دروازے پر چھٹی تھی اس کے ہاتھ میں تہہ تہہ اور گا سہ

ہر ہو جاتی تھی اور وہ لوگوں سے لپٹنے اور ہاتھ ملانے ہوئے رخصت ہو جاتے تھے رضیہ دوبارہ بیٹھ جاتی تھی تیسرے دن پوکھرا کو گرم آگیا اور اس نے رضیہ کو ہلیز پر کھڑا کر دیا رضیہ دروازے کے فریم کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اندر حرکت ہوئی اور دروازہ کھلا اور وہ مسکراتا ہوا چہرہ باہر آ گیا رضیہ آگے بڑھی وہ رضیہ کے سامنے بھکا اور رضیہ نے اس کے گلے میں ہونے کے سر جھائے ہوئے ہار ڈال دیئے ٹھیک اس لمحے رضیہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے آنسو اس کی جبریں سے اٹھنے لگے کمرے ہوئے ٹھوڑی پر پہنچے اور ٹھٹک کر روک گئے آنسوؤں میں صبح کا سورج لرز رہا تھا جب ٹھوڑی ملی تھی تو آنسوؤں کے سورج بھی آہستہ آہستہ ڈالنے لگے اس نے بوڑھی ٹھوڑی پر نظریں منادیں آنسوؤں کے کیلے نیچے ہٹکے لکیر بنے اور انہوں نے ٹھوڑی کا ساتھ چھوڑ دیا غریبوں کے دیوانے فوراً اپنی ہتھیلی آگے کر دی پانی کے دو شانالہ ٹھہرے عین اس جگہ آ کر سے جہاں سے اس کے مقدر کی لکیر شروع ہوتی تھی اس نے ہتھیلی تبدیل کی منہ کی بنائی مسکرایا اور ہلیز سے پیسے اتر گیا اسے 100 روپے کی منت کا معاہدہ ہو گیا۔

ڈاکٹر یونس 1974 تک چنا گنگ کے ایک ٹیل گاؤں سے تار کا بیٹا تھا اور اس کی والدہ

بیچان اس کی پناہ لی۔ ایسی ہی ذمہ داری تھی وہ امریکہ میں پڑھتا تھا اسے وہاں اطلاع ملی ان کا ملک
 مشرقی پاکستان سے بلکہ انڈیا میں گیا ہے اور وہ اپنا چھٹا کالک واپس آیا اور اس نے یونیورسٹی میں
 نوکری کرنی اور غالب علموں کو اکتانہ میں پڑھتا تھا پانچ ماہ تک وہ بی بی کے اور مردوہ بیات تھے ان
 بیات میں ان دنوں صرف تین چیزیں تھیں 'خط' غربت اور قرض' وہ روزنامہ کی سیر پر لگتا تھا
 و بیات میں جاتا تھا اور معیشت کو اصل حالت میں دیکھتا تھا اس کو مجھ میں ہوتا تھا ان دنوں میں نکھی
 غربت اور غمبوں میں تحریر منگلی میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک دن اس نے پردیس سے کارکن
 بننے کا فیصلہ کیا 'دو چاندروسی سے نکا اور' جو برا' گاؤں چلا گیا' گاؤں میں ایک 42 سالہ بی بی تھی
 'وہ کھدی پر رومال بناتی تھی' شام کو شہر سے ایک بی بی پارٹی آتا تھا یہ رومال لیتا تھا اور اس کی جھولی
 میں دو منگلی چاول ڈال دیتا تھا 'رضیہ کا خاندان ان چاولوں پر بی بیوں کو کھانا دیتا تھا 'ڈاکٹر یونس
 اس کے پاس بی بیوں کو پتہ چلا گاؤں کے تمام لوگ سارا دن موڑھے بناتے 'رومال کاتے اور کپڑے
 سیتے ہیں اور شام کو بی بیوں کی ان کی جھولی میں دو دو منگلی چاول ڈال کر سارا سامان شہر لے جاتے ہیں

اس کی بی بیوں میں 42 گھڑتھے اور وہ روزانہ دو روٹے لگاتے اس کے سب کی کھاناں منگلی کے لئے تھیں

ان کو کوئی شخص ان لوگوں کو صرف 27 ڈالر دے دے تو نہ صرف یہ 42 گھرانے قرض سے آزاد

ہو سکتے ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے پائوں پر بھی کھڑے ہو سکتے ہیں 'ڈاکٹر نے اپنے 41 لڑکے کا اعزاز لگایا'

اس کے پاس 30 ڈالر تھے اس نے تین ڈالر اپنے پاس رکھے اور باقی 27 ڈالر ان لوگوں میں تقسیم

کر دیے 'یہ 27 ڈالر آگے چل کر کراچی میں چیک بن گئے 'ڈاکٹر یونس نے اپنے طالب علموں کو ساتھ

لایا اور ان لوگوں نے معیشت کے ایک نئے فارمولے کی بنیاد رکھی 'اس فارمولے کی بنیاد اعتماد

تھا 'ڈاکٹر یونس کا خیال تھا عورت خاندان میں سب سے زیادہ ذمہ دار فرد ہوتی ہے 'ایک گھریلو

عورت دنیا کے ہزار معیشت دانوں سے زیادہ سمجھدار ذمہ دار اور ایماندار ہوتی ہے لیکن بد قسمتی سے

آج تک دنیا کے کسی مفکر نے ایسی ٹیوت لے عورت کے اس ٹیلنٹ کو نہیں آزمایا 'ڈاکٹر یونس کا کہنا

تھا قرض کے معاملے میں مرد غیر ذمہ دار ہوتے ہیں اس لئے وہ 98 فیصد مردوہ بیات کرتے

ہیں جبکہ عورتوں کی شرح محض دو فیصد ہے 'ڈاکٹر یونس کا خیال تھا اگر ہم عورتوں پر اعتماد کریں تو وہ

بلکہ انڈیا کے صدر بن سکتی ہیں 'ڈاکٹر یونس کا ایک دوست بھدر میں سے تھا جس میں ملازم تھا

ڈاکٹر نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اپنی ذاتی تنہانت پر جو برا گاؤں کی تمام عورتوں کو قرض لے

دیا 'قرض کی کل رقم تین سو ڈالر تھی ان تین سو ڈالروں سے پورے گاؤں کی حالت بدل دی لوگوں

نے بینک کو تمام قسطیں بھی وقت پر ادا کرویں۔ انٹرنیشنل کا اسراف نہیں کامیاب ہو گیا۔ اس دوہرتے تجربے نے آٹے ایلے دنوں میں دنیا کے دن کروڑا تہائی غریبوں کی حالت بدل دی۔

گراہمن بینک کا ماڈل بہت دلچسپ تھا۔ یہ بینک غریب خیراتوں کو عنایت کے بغیر چھوٹے قرضے دیتا تھا۔ یہ قرضے باسوا ہوتے تھے اور قرض دار انہیں چھوٹی چھوٹی قسطوں میں واپس کرتے تھے گراہمن 1976ء دسمبر میں شروع ہوا، اس نے 1979ء میں حکومت کی تہیہ حاصل کر لی، حکومت نے ڈائریکٹریٹس اور گراہمن بینک کی سپورٹ شروع کر دی، حکومت نے 1983ء میں اسے باقاعدہ بینک کی شکل دے دی، ڈائریکٹریٹس نے اسے دیہات میں پھیلائے شروع کر دیا۔ اکتوبر 2006ء تک اس کی دو ہزار دوسرے 26 شاخیں کھلی تھیں، گراہمن نے 30 سال میں 71 ہزار 371 دیہات کو غربت کے چنگل سے آزاد کرایا۔ عالمی بینک کے مطابق اس بینک سے اب تک 165 لاکھ بنگالی قرض لے چکے ہیں، بینک کے اثاثے 7 ارب ڈالر ہیں جبکہ بگھرویش کے علاوہ دنیا کے 45 ممالک میں گراہمن طرز پر بینک شروع ہو چکے ہیں۔ بینک کی

ہمکارتی بگھرویش کے دیگر گراہمن بینکوں کے لوگوں تک پہنچا چکی ہیں جبکہ پوری دنیا کے 10 کروڑ لوگ اس ماڈل سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اس بینک کے قرض خواہوں میں 98 فیصد خواتین ہیں جبکہ اس کی

ریکوری 98 فیصد ہے، گراہمن صرف بینک نہیں بلکہ ایک سماجی ادارہ بھی ہے اس سے قرض لینے والے تمام خانہ دہانوں کے بچے سکول جاتے ہیں، گھر کے تمام افراد امن وقت کھانا کھاتے ہیں، تمام گھروں میں ٹرائٹ ہیں، تمام گھروں کی چھتیں چکی ہیں، تمام لوگ صاف پانی پیتے ہیں، بینک سے قرض لینے والوں کیلئے انکیشن میں ووٹ دینا اور خاندانی منصوبہ بندی لازم ہے اور ان سب کو ایسٹبل انشورنس کی سموت بھی حاصل ہے جبکہ ان تمام سموتوں کے ساتھ یہ لوگ ہر ہفتے 8 ڈالر کی قسط بھی ادا کرتے ہیں۔ گراہمن بینک اب تک بگھرویش کے 45 ہزار بھکاریوں کو بھی مفید شہری بنا چکا ہے، بینک بھکاریوں کو سولے (ڈیڑھ ڈالر) قرض دیتا ہے، بھکاری اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور بینک کو ہر ہفتے دو گئے واپس کرتے ہیں، گراہمن بینک نے گراہمن فون اور گراہمن ٹیلی کام کے نام سے موبائل اور وائرلیس فون کی کمپنیاں بھی بنائیں، ان کمپنیوں نے ایک لاکھ 39 ہزار خواتین کو ریہت میں اپنی دلورنگ کر دیے اور ان کے پیسے میں بگھرویش کے 65 ہزار دیہات عالمی رابطوں کی دنیا میں داخل ہو گئے، گراہمن بینک اب بنگالی محنت کشوں کو پچھلی کے 13 ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ 13 ارب آنے والے دنوں میں بگھرویش کو پچھلی کا سب سے بڑا اسپونسر بناتا ہے۔

ڈائریکٹریٹس کو 13 اکتوبر 2006 کو نوٹس بنا کر دیا گیا ڈائریکٹریٹس نتیجے میں اس اجلاس میں مستحق تھے۔ ڈائریکٹریٹس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ ان کا انحصار ٹھکانے لے تو دوسری 27 مارچ سے غربت کو جانوں سے بلا سکتا ہے اور 46 ٹھکانوں کے وہ کمزور لوگوں کا فائدہ پہل سکتا ہے۔ آج بلا کے 65 لاکھ گھرانوں اور 2 کروڑ 22 لاکھ لوگوں کی آنکھوں میں تشکر سے روزانہ سو ہیں جو کبھی ڈائریکٹریٹس کی آرزو تھے۔ آج انکوں ہنگامی محنتوں کی آنکھوں سے تشکر کے روزوں میں آسٹریٹس رہے ہیں۔ یہ آسٹریٹس کی بھریوں سے الجھائی کہ جھڑپوں تک پہنچ رہے ہیں اور ان جھڑپوں پر آنے والے دنوں کے متکڑوں ہزاروں سواری چمک رہے ہیں یہ سواری آج ایمان کہہ رہے ہیں اگر ظلمت نکالیں 1971ء میں ظلمت نہ رہے تو آج بلکہ دیش دوتہ ڈائریکٹریٹس دوتہ گورنمنٹ بینک ہوتا اور نہ ہی بلکہ دیش کے دو کروڑ 22 لاکھ لوگ ڈوشمانی کے دروازے تک پہنچ پاتے آج ڈائریکٹریٹس کا نوٹس پر اسے پہنچ چکا کہ کہہ رہا ہے جب تک ڈائریکٹریٹس پاکستان کا شہری تھا اس وقت تک وہ محض ایک شیجرار تھا لیکن جب وہ بلکہ دیش کا شہری بنا تو اس نے اپنی قوم کے مذہبوں میں فخر اور سزا دیا اور دنیا کا سب سے بڑا لوگ اور سب سے گناہگار بن گیا۔ ان کے دن ہمیں اور ہمارے ہمارے پاؤں باندھ رکھے ہیں جو ہمیں پاکستان میں گرامین جیسے ادارے نہیں بنانے دے رہی اور جو پاکستان میں ڈوشمانی کا کوئی دیوتا پیدا نہیں ہونے دے رہی جو ہمیں آگے نہیں بڑھنے دے رہی اس پر قسمتی کا نام کیا ہے؟ میں اس سوال کا جواب اب آپ پر چھوڑتا ہوں۔



بڑا انسان

استاد نے اسے گھور کر دیکھا اور شہدِ بد غیبے میں بڑا اعلیٰ تم میری بات کان کھول کر سن لو۔
 تم نے میری بات زیادہ سے زیادہ سنا کر برا بھلا بن گئے ہو، پوری کتاب لے کر آؤ اور اسے پڑھو۔
 قلموں سے باہر نکل گیا یہ ہارورڈ یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا وہ اس یونیورسٹی میں ریاضی کا
 طالب علم تھا اسے کلاس روم کا ماحول کان فیلاوز کی گفتگو اساتذہ کا پڑھانے کا طریقہ اور یونیورسٹی
 کی نئی پرانی روایات پر دلچسپی تھی وہ کئی کئی دن کیسپس سے غائب رہتا تھا اس کا زیادہ تر وقت سیٹل
 جمیل کے کنارے پال ایلمن کے ساتھ گزارتا تھا پال بھی اس کی طرح لمبی منسوبہ بندی کا ماہر تھا وہ
 دونوں گھنٹوں کسی ایسی دنیا کے بارے میں سوچتے رہتے تھے جو ابھی تخلیق کے مراحل میں داخل
 نہیں ہوئی تھی وہ دونوں دن میں خواب دیکھتے تھے ان خوابوں کے دوران ایک دن ہارورڈ
 یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا تھا وہ یہ خط لے کر ایلمن کے پاس گیا اور اسے خط دکھا کر بولا
 "آؤ پال ہم اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک صرف ہمارے ذہن میں تھی" پال ایلمن نے اس
 کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

28 اکتوبر 1955ء کو وہ انگلینڈ ریاست کے شہر سیٹل میں پیدا ہوا ان کے والد
 دکن کے سردار گھر سے پرہیزگار اور سردھارین میں پڑھائی میں ذرا پیچھے تھا اس میں شہسوئی نہیں
 تھی اس کی دو بیٹیاں منسٹر ہو جاتی تھیں اور اس کے والدین اس کی وجہ سے پریشان رہتے تھے اس

کے والد کی خواہش تھی وہ بارڈر یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ ڈگری لینے لیکن یونیورسٹی نے اس کا ہم فارغ کر دیا اس کے والد کو شدید صدمہ پہنچا لیکن ہلکے ہلکے ہٹن تھا اس کا خیال تھا بارڈر یونیورسٹی کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اس طالب علم پر غور کرے گی۔ آنے والے دنوں میں اس کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور بارڈر یونیورسٹی نے کیس پر اس کے نام کی ترقی لکھ لی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ہم ابھی 1975ء میں ہیں 1975ء میں اس نے اپنے دوست پال ایلن کے ساتھ مل کر دنیا کی پہلی سائنس و نیر کھنی بنائی اس کھنی کا نام "مائیکروسافٹ" رکھا گیا لوگ اس کے آئیڈیاز اور کھنی کے نام و دنوں پر ہنستے تھے لیکن اس نے بہت نہ ہاری اور کام کرنا چاہا گیا یہاں تک کہ 1979ء تک کھنی نے نہ پڑنے نہ نال لئے اور دو ٹھیک ٹھاک اسیر ہو گیا لیکن ابھی وہ اس کامیابی سے دور تھا جو بچپن سے اس کے ذہن پر ہتکتہ رہی آ رہی تھی 1980ء میں سلیو بائرن نے کھنی جو ان کی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے مائیکروسافٹ و اسٹیشن ریاست کی سب سے بڑی کھنی بن گئی اس کے پاس روزانہ اتنے چیک آتے تھے کہ بینک نے اس کے دفتر میں اپنی شاخ کھول لی آنے والے دنوں میں دنیا کے 51 برسے بینکوں نے مائیکروسافٹ میں اپنی شاخیں کھولیں اور کھنی کو دنیا کے حصول کیلئے مائیکروسافٹ کو ہارنا کا درد و غم دیکھتے دیکھتے گئے 1990ء تک مائیکروسافٹ دنیا کی سب سے مشہور کمپنی تھی اور دنیا کا سورت ترین شخص تھا اور اس قدر مشہور ہوا کہ ٹل کھنٹن نے 1998ء میں اعلان کیا "وی آر وی نیشن آف بل ٹیلٹس" یہ بارڈر یونیورسٹی کے اس طالب علم کا پہلا اعزاز تھا۔

جی ہاں اس شخص کا نام بل ٹیلٹس ہے اور یہ پچھلے بارہ سال سے دنیا کا امیر ترین شخص ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا واحد شخص ہے جو 38 برس کی عمر میں دنیا کا امیر ترین شخص بنا اور اس نے مسلسل 12 سال تک یہ اعزاز برقرار رکھا مائیکروسافٹ میں اس وقت 63 ہزار 564 لوگ ملازم ہیں اس کا کاروبار 102 ممالک تک پھیلا ہے جبکہ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک ایکھ 28 ہزار لوگوں کو راب پتی بنا چکی ہے مائیکروسافٹ کے ملازمین اوسطاً 89 ہزار 6 سو اڑھار سالانہ تنخواہ لیتے ہیں مائیکروسافٹ کے پانچ ڈائریکٹرز ہیں اور بل ٹیلٹس کے پاس سب سے زیادہ شیئرز ہیں وہ 97 کروڑ 174 لاکھ 99 ہزار 363 شیئرز کا مالک ہے امریکی سٹاک ایکسچینج میں مائیکروسافٹ کے شیئرز کی قیمت اس وقت 23 ڈالر ہے پچھلے 15 برسوں میں میڈیا نے بل ٹیلٹس کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ کو رہنے والی اور دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں شمار کیا ہے لوگ اس کے ساتھ ہاتھ

ملانا اور اس کے ساتھ تصویر کھینچوانا اعزاز رکھتے ہیں جبکہ اسے دنیا کے 35 ممالک میں سربراہان مملکت کا پوزٹوکل حاصل ہے۔

مئی تیس 15 جون 2006 تک محض دنیا کا سیرترین شخص تھا لیکن اس کے ایک اعلان نے اسے دنیا کا سب سے بڑا انسان بنا دیا۔ اہل تیس نے 15 جون کو اعلان کیا کہ جو ائی 2008ء کو مانگیر دسٹ جھوزوئے گا اور وہ اپنی باقی زندگی فلاح عامہ کے کاموں کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو ائی 2008ء سے اپنا سارا وقت فاؤنڈیشن کو دے گا اس اعلان کے بعد وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص بن گیا۔ اس سے پہلے دنیا میں عورتوں کیلئے تختہ اور تاج جھوزنے والے بے شمار لوگ تھے دنیا میں مہاترا جده جیسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سکون کیلئے اقدام اتریا گئے اور تھا لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے عام لوگوں کیلئے دنیا کی سب سے بڑی کھپنی جھوزنے کا اعلان کیا جس نے لوگوں کے دکھ درد کیلئے بادشاہت جھوز دی۔ اہل تیس نے اپنی بیوی سیلیڈا کے ساتھ مل کر جنوری 2000ء میں فلاح عامہ کی ایک فاؤنڈیشن بنائی تھی اس کا نام "اہل

تیس فاؤنڈیشن" رکھا گیا۔ اس وقت یہ دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور

فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس میں 29 بلین ڈالر ہیں یہ بھی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے بجٹ سے لگا لیجئے پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر ہوتا ہے اہل تیس کی یہ فاؤنڈیشن پوری دنیا میں صحت، تعلیم، لائبریریوں اور کمپیوٹر کی تربیت کے لئے کام کرتی ہے۔ یہ فاؤنڈیشن ہر سال غریب ممالک کے ذہین طالب علموں کو ایک ارب ڈالر کے وظائف دیتی ہے۔ یہ غیر امریکی لائبریریوں کو ایک بلین ڈالر کا ایوارڈ دیتی ہے۔ فاؤنڈیشن ہر سال تیسری دنیا کے سو ذہین طالب علموں کو اپنے خرچ پر کمبیرج یونیورسٹی میں تعلیم دلاتی ہے۔ فاؤنڈیشن ڈیوڈ کی یونیورسٹی کی ہر کلاس کے دس ذہین طالب علموں کو وظیفہ دیتی ہے۔ اہل تیس نے چندر پلین ڈالر سے کمپیوٹر سسٹمز سوزیم بنایا۔ اس نے چاول کی نئی قسم دریافت کرائی۔ وہ ہر سال دنیا کے کروڑوں بچوں کو پولیو کیسین پاتا ہے اور اس کی فاؤنڈیشن ایڈز کا علاج دریافت کر رہی ہے اور اہل تیس کی یہ فاؤنڈیشن پانچ سال سے پوری دنیا میں کام کر رہی ہے۔ اہل تیس نے اعلان کیا کہ جو ائی 2008ء کو مانگیر دسٹ سے 100 ملین سے زائد سہت ہو جائے گا اور اپنی باقی زندگی لوگوں کی صحت اور ہم کے لئے وقف کر دے گا اس کا کہنا ہے کہ اپنے بچوں کو صرف ایک ایک بلین ڈالر دے گا اور اپنی باقی ساری دولت دنیا کے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے گا اس کا کہنا ہے یہ دولت ضرورت مندوں کی امانت

سے اور وہ یہ امانت ان لوگوں کو دانا کر دینا چاہئے۔

میں نے جب اس کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا میں تینیں کلاس تک دنیا کا سب سے امیر شخص تھا لیکن آج سے وہ دنیا کا سب سے بے انسان ہے وہ ڈائیگر سائنٹ کی وجہ سے 12 سال تک دنیا کا امیر ترین شخص رہا لیکن اب شاید وہ "بل اینڈ میلیٹری اکیڈمی فاؤنڈیشن" کی وجہ سے فحاشت تک دنیا کا سب سے بے انسان رہے گا اور میں نے سوچا: کیا کے ہیں، دولت مند ترین لوگوں میں تین مسلمان بھی شامل ہیں لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے بل تینیں کو عطا فرمائی تھی نے سوچا: کیا کاپیچوان امیر ترین شخص ایک عرب مسلمان شہزادہ ولید بن خالد ہے اس کی دولت جو خانوں میں شہرت چاہی ہے جبکہ بل تینیں اپنی دولت الیز کے علاوہ پروجیکٹ کر رہا ہے وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دے رہا ہے اور وہ دنیا میں کیوں عام کر رہا ہے؟ میں نے سوچا بل تینیں جیسے لوگ ہیں جنہیں حقیقتاً رول ماڈل کہا جاسکتا ہے، میں نے سوچا پوری اسلامی دنیا میں لوگوں سے

مہری پڑی ہے اسلامی دنیا میں ایسا ایسے لوگ ہیں جو بیرونی کی کئی کئی کانوں کے مالک ہیں جن کی

مذکورہ روپے دینے کی توفیق نہیں ہوتی جبکہ بل تینیں اپنی ساری دولت لوگوں کیلئے چھوڑ جائے گا میں نے سوچا 62 اسلامی ممالک کی اس دنیا میں ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہیں لیکن ان اربوں ارب لوگوں میں ایک بھی بل تینیں نہیں، ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو پچاس سال کی عمر میں اپنی کھیتی کا دروازہ کھولے اور اپنا سارا مال اپنی ساری زندگی اللہ کے بندوں کے لئے وقف کر دے جو لوگوں میں وہ اور کتاب ہائے جو لوگوں کے زخم دھوئے جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور جو لوگوں کے آنسو پونچھے، میں ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا: عالم اسلام پر یورپ اور امریکہ کیوں غالب ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا تھا (نہو ذہان) یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے لیکن مجھے آج معلوم ہوا امریکہ اور یورپ بل تینیں جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر غالب ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے پاس بڑے انسان ہیں جبکہ ہم لوگ تاجروں، بیوپاریوں اور صنعت کاروں کی غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا ان تھے پاس انسان ہیں جبکہ ہم لوگ آدمیوں کی چاکری میں سانس لے رہے ہیں۔



ہماری کہانی

میدان میں بہت لمبی قحطی پے فٹ ہال کو ٹھوکر مارنے پر بیٹ پے ہاتھ رکھتے اور آسمان کی طرف نرس دیکھتے وہ بالکل مایوس تھے۔ یہ سن کر مجھے کچھ اور امیدوں کے ایک سر کے لئے کھڑا ہو کر یہ سب جان کر دیکھ رہا تھا اس نے بیٹ میں ہاتھ ڈالا اور کہنے لگا: "میرے بیٹے اور میدان سے باہر آ گیا باہر اس کے دادا کی دکان تھی اس نے 25 سینٹ دادا کے سامنے رکھے کوکا کولا کی چھ بوتلیں خریدیں بھانسا ہوا میدان میں آیا اور یہ چھ بوتلیں بچوں میں فروخت کر دیں اسے اس سہ سے بیٹے پانچ سینٹ چھ گئے اس نے پانچ سینٹ کا سکہ جو اس میں اچھا لکچھ کیا اور "ٹاٹ بیٹ" کا ٹیوٹ لکھا یہ اس کا پہلا کاروبار تھا اور اس کی عمر اس وقت محض چھ سال تھی۔

لوگ اسے "پیداؤنی سرمایہ کار" کہتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ نے ایک ڈالر کو پلین میں بدلنے کا ہنر دے رکھا ہے وہ ہوا کو ہونگو کر سرمائے اور نتائج کا رخ پیمان جاتا ہے وہ سناک اچھنچ کا شہنشاہ کہلاتا ہے وہ دریا کا واحد شخص ہے جس نے بغیر ہاتھ پاؤں کے لوگوں کو کائے جس نے دنیا میں سب سے زیادہ ادب پتہ پتہ اپنے انٹیلیجنس یہ ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے وہ 30 اگست 1930ء کو ریاست اوہائیو میں پیدا ہوا اس کا والد سناک اچھنچ کو برادر تھا وہ درمیان کا بچہ تھا اس کی ایک بہن بڑی اور ایک چھوٹی تھی اس کے والدین اسے پڑھا لکھا کچھ بڑا آدمی بنا چاہتے تھے لیکن اس کا رجحان کچھ دہاری کی طرف تھا اس نے گیارہ سال کی عمر میں "سنس سربراہ" کے تین شہنشاہ

خریدنے سے اس وقت ایک شیئرز کی قیمت 138 روپے تھی اس کی بہن ڈاؤن اس کا روہا میں اس کی پارٹنر تھی یہ قسمتی سے شیئرز کی قیمت نمبر 27 مارچ 2007ء کو گئی، وہ گھبرا گیا، چند دن بعد شیئرز کی قیمت بڑھ کر 40 مارچ کو آئی تو اس نے فوراً شیئرز بیچ دینے سے یہ ادا ہوا، اس نے بوائے اسٹریٹ پنڈروہ بعد ان شیئرز کی قیمت بڑھتے بڑھتے 200 مارچ کو آئی، اس وقت اس نے سرمایہ کاروں کا سب سے بڑا اصول سیکھا اس نے سیکھا جس شخص میں سبر نہیں ہو، اس کی سرمایہ کار نہیں بن سکتا اس کے بعد باقی زندگی اس نے سبر نہ کرنا سب سے بڑا سبق یاد کیا اس کا، اس اصول بھلا کر اور ڈیڈ اری تھا اس کا کہنہ تھا آپ کے سٹانڈنگ کا فیصلہ آپ کی شہیاداری کرتی ہے اگر آپ نے کسی چیز سستی خریدی ہے تو آپ زیادہ سٹانڈنگ حاصل کریں گے، کہتا تھا ڈاکٹر عزیز کو بیچنے میں جتنی محنت کرتے ہیں انہوں نے اس سے اتنی محنت خریداری کے دوران کریں، تو یہ سستی گنا سٹانڈنگ کمائیں اور اس کا تیسرا اصول ساکھتا تھا اس کا کہنہ تھا جب تک لوگ آپ پر بائبل بتاتا سب تو نہیں کہتے آپ سرمایہ کار نہیں بن سکتے، شاید یہی وجہ ہے لوگ جینک آف امریکہ پر اتنا اعتماد نہیں کرتے جتنا اعتبار اس پر کرتے ہیں لیکن یہ ہماری کہانی نہیں، ہماری کہانی دوسری ہے۔

اس سے چند سالوں کی عمر میں ماہی گیری شروع کی، زیادہ تر اس کے گھروں میں رہتا تھا، اس نے 175 روپے ماہانہ سے اس کے ہاگرنی سے 1200 روپے ماہانہ

تک اور 140 ٹن کے ایک فارم پر لگا دیئے، دو سال بعد وہ اس فارم کا مالک تھا 17 سال کی عمر میں اس نے "پین ہال" اسٹیشن کافی اسٹیشن سے اس نے پانچ ہزار ڈالر کمائے 22 سال کی عمر میں اس نے اپنی پہلی ہونو بسنس کھولی، کافی اسٹیشن نے اپنے خاندان اور دوستوں کو سرمایہ کاری کی دعوت دی، سب نے مل کر ایک لاکھ پانچ ہزار ڈالرز جمع کئے، اس نے یہ رقم سٹاک مارکیٹ میں لگا دی، دو سال بعد یہ رقم کروڑوں ڈالرز بنتی ہوئی آئی، اس کے بعد اس کی ترقی کو پر لگ گئے، آج 2006ء میں وہ دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ کار ہے، آج اس کے پاس امریکہ کی سب سے بڑی ٹیکنالوجی کمپنی مائیکروسافٹ کے سٹارڈ جسٹو سے ڈالٹ ارنی اور امریکن ایئر لائنز کے سب سے بڑے شیئرز ہیں، آج جب بھی امریکہ کی کوئی بڑی کمپنی ڈیفالٹ کرنے لگتی ہے تو کمپنی کے مالکان اس کے پانچ پتے لیتے ہیں، وہ کمپنی کے چند شیئرز خرید لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کمپنی اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاتی ہے، لوگ اپنی تمام منج پونجی اس کے قدموں پر چھاد کر دیتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں، اس ڈالر کو چھو دیتا ہے، وہ لیٹن ڈالر بن جاتا ہے لیکن یہ ہماری کہانی نہیں، ہماری کہانی دوسری ہے۔

دو دنیا کا دوسرا سبر تو یہ شخص ہے اور اس کا نام وارن ہٹ ہے، وہ 44 بلین ڈالر کا

مالک بے نظیر وہ عام زندگی میں بہت سادہ اور روٹین صفت انسان ہے وہ آج بھی اس مکان میں رہتا ہے جو اس نے 30 برس پہلے 31 بزار میں 5 سو بزار میں خرید لیا تھا وہ آج بھی پرانی کار چلاتا ہے جو اس نے 25 برس پہلے خریدی تھی اور وہ آج بھی اپنے دن کا آغاز ٹوکا کوٹا کے کارنرین اٹھانے سے لگتا ہے لیکن وہ بھی ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے اس دوران بھٹ نے 26 جون 2006 کو اپنی دولت کا 87 فیصد حصہ مل ٹیکس کی ٹرانس فیر ہو کر فائڈیشن کو دینے کا اعلان کر دیا اس کے اعلان کے مطابق اس کی کمپنی ہر سال مل اینڈ مینینٹ اٹھیس فائڈیشن کو دینے کا پلین ڈال رہا ہے کہ جس کی مل ٹیکس سے رقم یاد دہانی دینا میں محنت اور تعلیم پر خرچ کرے گا جو ان بھٹ کا یہ عقیدہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ 37 بلین ڈالر کی حد تک نہیں پہنچ جائے اور ان بھٹ نے جو اعلان کرتے ہوئے کہا "میں نے مل ٹیکس کی فائڈیشن کو اس لئے منتخب کیا کہ یہ امریکہ کا واحد ادارہ ہے جو اپنے فنڈز کا 70 فیصد حصہ امریکہ سے باہر دوسرے ممالک میں خرچ کرتا ہے" اس کا کہنا تھا "اگلے سات مل ٹیکس کو سرری طرف سے امداد کا پہلا چیک مل جائے گا اور سرری کو شش

ہوگی جس مہرے سے پہلا اپنا حصہ مل ٹیکس کے لئے دے کر جائیں اس کا کہنا تھا "میں چھ برس کی عمر سے

بچے ہیں میں نے آج سے 30 برس پہلے جس شخص سے سو ڈالر لئے تھے وہ شخص آج سو بلین ڈالر کا مالک بن چکا ہے لوگ مجھے جاؤ نہ سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے میں کاندھ کے ٹخروں کو سونے میں احوال دیتا ہوں میں جس کمپنی کی ڈیویڈنڈ پر ٹیکس دیتا ہوں وہ کمپنی ڈیٹا لٹ سے نکل کر عروج کو چھوئے تھی ہے میں جس کارپوریشن کا ایک شیئر خرید لیا ہے وہ لوگ اس کے کارڈوں میں خریدنے لیتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں وہ ان بھٹ جینک آف امریکہ سے زیادہ اہم ہادی اور زیادہ بااعتماد ہے لیکن میں آج یہ اعلان کرتا ہوں میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سرمایہ کاری کا آغاز 26 جون 2006 سے کر رہا ہوں میں آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا کاروبار شروع کر رہا ہوں لیکن یہ بھی ہماری کہانی نہیں ہماری کہانی دوسری ہے۔

ہماری کہانی اسلامی دنیا سے شروع ہوئی ہے اور اسلامی دنیا ہی آ کر ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اسلامی دنیا پر وہ سرمایہ کاروں اور دولت مندوں سے بھری پڑتی ہے لیکن دنیا کی خدمت کا امراد پہلے اس شخص سے حاصل کیا اور اس کے صرف دو بھتیجے بعد وہ ان بھٹ اس اعزاز میں شریک ہو گیا جبکہ برادری تک ہمارے امراء اپنی حرم سراؤں میں اپنی چالیس چالیس اونٹوں کے ساتھ آرام فرما رہے ہیں وہ اونٹوں پر ڈانڈنگا رہے ہیں اور وہ شراہیں پی رہے ہیں یہ ہے ہماری کہانی۔

مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات

کھانے کی اس میز پر ہم آٹھ لوگ بیٹھتے تھے۔ ہمارے بائیں سامنے مہاتیر محمد بیٹھے مہاتیر محمد نے کوالا لپور کا واقعہ سنایا انہوں نے بتایا وہ پہلے دنوں ملائیشیا کے دورے پر تھیں، ہاں انہوں نے ایک ہندو ٹیکس ڈرائیور سے پوچھا تم انڈین ہو اس نے ہفتے سے ان کی طرف دیکھا اور ہنسا کر بولے "تو آئی ایم ملائیشین" مہاتیر محمد مسکرائے اور جیسی آواز میں بولے "یہ طرہ بگڑتا ہی ترقی اور استحکام کا نتیجہ ہے، جب کوئی ملک ترقی کرتا ہے، تب کوئی ملک دنیا میں عزت اور آہو پاتا ہے تو اس کے باشندے اپنے ملک پر فخر کرتے ہیں اس کے برعکس جب کوئی ملک فریب ہوتا ہے اس کی معیشت اوسٹا یا بھولک پر چلتی ہے تو اس کے باشندے اپنے ملک کا تعارف کراتے توئے شرمندہ ہوتے ہیں آپ ذاتی ایراد انداز کے کسی باشندے سے پوچھیں، وہ کبھی مردانہ بین ازار ٹیکس ہونے پانڈر نہیں لہے ہوا دو آئی ایم فریقین کہہ کر اپنا تعارف کراتے تھے۔ ہم نے دنیا میں ملائیشیا کی عزت اور آہو ویس اخذ کیا لہذا آج ملائیشیا کے ہر فرد کو آئی ایم فرام سے نہیں کہتے انڈین انڈین اور اسکا پورین اسکا پورین نہیں کہتے حتیٰ کہ ملائیشیا میں آہو پاکستانی تک فخر کو پاکستانی ملائیشین کہتے ہیں"

مہاتیر سے ایک صاحب ملے پوچھا آپ سے یہ آئی تھا فریسیے حاصل کیا مہاتیر محمد اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے "ہماری ترقی کے بے شمار اصول ہیں لیکن ان میں تمہیں کوئی نیا

حیثیت حاصل ہے ہم نے تاریخ کے مطالعے سے اندازہ لگایا دنیا میں تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں لہذا ہم نے اپنے کل بجٹ کا 25 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا شروع کر دیا، ذرا سے رے کے اور منگرا کر بولے "ہم لوگ دفاع پر اپنے بجٹ کا صرف چھ سے آٹھ فیصد خرچ کرتے ہیں، دوسرا ہم نے قومی ترقی کیلئے مذہب کا سہارا لیا، ہم نے تحقیق کی مسلمانوں کی وہ کون سی عادتیں ہیں جو ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں، ہمیں محسوس ہوا فرقہ پرستی اور نسلی اختلافات عالم اسلام کو اٹھنے نہیں دے رہے، ہم نے ملائیشیا میں فرقہ بازی اور نسلی اختلافات پر پابندی لگادی، آج ملائیشیا میں کوئی مسلمان کسی بودھ سے یہ نہیں کہتا اسلام بودھ سے بہتر مذہب ہے یا میں ملائی ہوں اور تم ایک کٹر ہندو ہو یا میں شیعہ ہوں اور تم سنی، وہاں اس قسم کے فرقے یا دماغی قانون غلام ہے، ہم لوگوں نے مسجد کو شہت ریحانات کی ترویج کیلئے استعمال کیا، جاری مسجد میں ملائے کرام معاشرتی بہبود اور اجتماعی کوشش کی تلقین کرتے ہیں وہاں کسی منبر، کسی پیپر سے اختلافی بات نشر نہیں ہوتی اور دوسری بات ہم نے دیکھا کسی ملک کے شہریوں کے دل میں اپنے ملک کی محبت اپنے ملک پر فخر

وہاں کا حکمران ملایا، اکرنا ہے اگر چہ وہ بڑے بڑے امریکہ میں تعلیم حاصل کریں گے تو ملائیشیا کے لوگ ملائیشیا کے فلسفی اور ادوں پر اعتماد نہیں کریں گے، اگر میں اپنا سرمایہ برطانیہ کی کمپنیوں میں

لگاؤں گا یا میں اپنی رقم سوئس بینکوں میں جمع کرواؤں گا تو ہمارے سرمایہ کار ہمارے عام لوگ ملائیشیا کے بینکوں ملائیشیا کی کمپنیوں پر اعتماد نہیں کریں گے لہذا ہماری پوری حکومت پوری بیوروکریسی کے بچے ملائیشیا کے سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہم میں سے کسی نے فارن اکاؤنٹ نہیں کھلویا، میں اس ضمن میں ایک مثال پیش کرتا ہوں 1989ء میں مجھے دہلی کا دورہ پڑا، میرے سٹاف نے مجھے امریکہ سے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا لیکن میں نے انکار کر دیا اور اپنی وزارت صحت کو تحریری حکم دیا، میرا آپریشن ملائیشیا کے ہسپتال میں ہوگا اور ملائیشیا کے لوکل ڈاکٹر کریں گے، اس حکم کا یہ نتیجہ نکلا 1989ء سے پہلے ہر سال ایک سے دو ملین ملائیشین علاج کیلئے ملک سے باہر جاتے تھے لیکن اس کے بعد ہر سال چوبیس ملین لوگ علاج کیلئے ملائیشیا آنے لگے۔

ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا، جب کوئی لیڈر اپنے ملک کو ترقی دیتا ہے تو لوگ اسے تا کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں، وہ یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں، سر اگر آپ نہ رہے تو یہ سارا سسٹم ختم ہو جائے گا، کیا آپ کو لوگوں نے یہ نہیں کہا تھا، اگر کہا تھا تو آپ نے اقتدار کیوں چھوڑ دیا، مہاتیر نے تبہ لگایا اور نرم آواز میں بولے، مجھے بھی لوگوں نے کہا تھا لیکن میں تاریخ کا

طالب علم ہوں میں نے تاریخ میں پڑھا وہ تمام حکمران جو خود کو کسی ملک کیلئے ناگزیر سمجھتے تھے وہ رخصت ہوئے تو ان کے بعد بھی وہ ملک کا نم رہے دنیا ان کے بغیر بھی چلتی رہی وقت ان کے بغیر بھی آگے بڑھتا رہا دوسرا میں نے محسوس کیا دنیا کے تمام لیڈر ایک وقت میں بہت پاپولر ہوتے ہیں لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں لیکن جب وہ لمبے عرصے تک اقتدار میں رہتے ہیں تو لوگ ان سے اکتا جاتے ہیں عوام کو ان کی ذات میں کیزے نظر آنے لگتے ہیں میں نے دیکھا دنیا کے تمام پاپولر لیڈر جب اقتدار سے رخصت ہوئے تو وہ ان پاپولر ہو چکے تھے تیسرا میں نے محسوس کیا اگر میں آج فوت ہو جاؤں تو کوئی مذکوئی شخص میری جگہ لے گا لہذا پھر کیوں ناں میں زندگی ہی میں اپنی جگہ کسی دوسرے کو پیش کر دوں اور ساتھی بن کر اس کی مدد کروں " ہم میں سے ایک صاحب نے پوچھا " آپ کی زندگی کا کوئی دن لائن ظلف " مہاتیر نے ہنس کر جواب دیا " وہ جمہوریت جو تعلیم کے بغیر ہو وہ ملک کو نقصان پہنچاتی ہے " ہم نے عرض کیا " ہم سمجھ نہیں سکے " مہاتیر نے اٹھتے اٹھتے جواب دیا " صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی اچھے لیڈر منتخب کر سکتے ہیں " میں نے ان سے عرض کیا " آپ پاکستان اور ملائیشیا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں " انہوں نے تھوڑی دیر سوچا اور فرمائش کی کہ میں میں بولے " ہم اپنے جی ڈی پی کا 25 فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں اور چھ فیصد دفاع پر جبکہ آپ لوگ تعلیم پر دو فیصد خرچ کر رہے ہیں اور دفاع پر 48 فیصد " میں نے مزید عرض کرنے کیلئے منہ کھولا لیکن وہ ہنس کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

(نوٹ: مہاتیر محمد کے ساتھ اس نشست کا اہتمام انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے کیا تھا۔)



لوہار کا بیٹا

اس کا والد ایک لوہار تھا، گامسر میں اس کی چھوٹی سی بھٹی تھی جس میں وہ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے آلات بناتا تھا۔ محمود اور اس کا بچہ بیٹا تھا۔ 1957ء میں کسی سے کہتے تھے تیار تیار تیار اور لوہاروں کی بہت مانگ ہے، لوہار نے بھی بھائی اپنے چار بچوں اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تہران آ گیا، تہران شہر میں اللہ نے اسے مزید تین بچے عنایت کئے، یہ ہجرت اس کیلئے سو مند رہی، اس نے تہران کی ایک مکی ہسپتالی میں لوہا کوٹنے کا کام شروع کیا، یہ کام چل نکلا، اور وہ لوہار سے تاجر بن گیا۔

محمود احمدی اس کے چوتھے بیٹے میں تین خوبیاں تھیں، وہ پڑھائی میں دلچسپی لیتا تھا، وہ ایک فعال اور مہلک بچہ تھا، وہ دوسروں کو کام کا حکم دینے کی بجائے خود کام شروع کر دیتا تھا اور تیسرا وہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کا قائل تھا، وہ چھوٹی عمر میں کہا کرتا تھا، "جس بڑائی کو آپ قوت سے نہیں روک سکتے، وہ بڑائی آپ کے احتجاج سے نہیں رکے گی" محمود کے والد نے اسے سکول میں داخل کر دیا، محمود ایک اچھا طالب علم ثابت ہوا، وہ پڑھتا چلا گیا، اس نے سکول سے تعلیم حاصل کی، وہ کالج میں گیا اور وہاں سے بی بی سی اس نے سول انجینئرنگ میں داخلہ لیا، اس نے ایم ایس سی کی اور اس کے بعد ٹریڈک ایڈمز ٹرانسپورٹ بلائنگ میں پی ایچ ڈی کر لی، یہ مضمون بھی اس کی ذات کی طرح اٹھکا تھا، اس کے ممتحن نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا تھا، "ٹرانسپورٹ

اور نریٹنگ آئیٹیموں کی پینسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا وہ ڈاکٹر محمود احمدی نزار ہو گیا ڈاکٹر محمود احمدی کے والد اسے سرکار میں لے کر جانا چاہتے تھے لیکن اس کے رجحانات میں توازن نہیں تھا وہ ایک طرف تعلیم و تدریس کے ہنر میں مبتلا تھا اور دوسری طرف عملی جہاد کا شیدا تھا 1980ء میں جب ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو وہ سپاہ پاسداران انقلاب میں شامل ہو گیا وہ ایران کی سفری سرحد پر لڑنے لگا اس دور میں اس نے ریکارڈ کا سیاہیاں حاصل کیں اس جنگ کے بعد اس نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر کرالینڈ عبدالرحمن کو دیا تاہم کوئی بارہی اس قتل کی ساری منصوب بندی محمود احمدی نے کی تھی اس نے شام رسول سلیمان رشیدی کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن وہ بچ گیا۔

محمود احمدی نزار ان تمام کامیابیوں کے باوجود 2003ء تک گوشہ گمانی میں رہا تو ہی سطح پر لوگ اس کے نام سے واقف نہیں تھے لیکن پھر 2003ء کا مکی آگیا اور وہ اچانک تہران شہر کا سترہواں گیمپس کے بعد اس نے اخباری تمام اداروں کو جھانپ کر دیا وہ ان کے وقتوں اس کے لئے کا آئینہ دار تھا اس نے کہا "میں لوہار کا بیٹا ہوں میرے پاس لوگوں کو دینے کیلئے خدمت کے سوا کچھ نہیں میرا اکل اثاثہ خدمت ہے اور تہران کے لوگ مجھے بھی یہ خزانہ لاتے ہوئے بخیل نہیں پائیں گے" وہ لوہار کا پہلا بیٹا تھا جسے کسی ادارہ حکومت کی نظامت ملی تھی اس دور میں تہران میں امریکی فاسٹ فوڈ کے نئے نئے ریستوران کھلے تھے یہ ریستوران ایران کی نئی حکومت کی روشن خیالی اور امتداد پسندی کے مظہر تھے محمود احمدی نزار نے ان ریستورانوں پر پابندی لگا دی اس کا کہنا تھا "مگر مغرب کے دل میں ہماری تہذیب کیلئے جگہ نہیں تو ہم بھی ان کے ٹیچر سے انکار کرتے ہیں" اس نے تہران کے تمام ثقافتی مراکز کو اسلامی قوانین کا پابند بنا دیا اس نے میوٹل کارپوریشن کی آجی لٹیس خواتین کیلئے شخص کر دیں اس نے کارپوریشن کے تمام ملازمین کو رازمی رکھنے اور سکلی آئٹیم کی نمائش سے منع کیا اس نے وقت کی پابندی کو شعور بنایا اور سارے محلے کو حکم دیا وہ اس وقت تک گھر نہیں جائیں گے جب تک وہ اس دن کا کام ختم نہ کر لیں اس کا کہنا تھا "جو شکایت آج درج ہوئی ہے اس کی تلافی بھی آج ہی ہونی چاہیے" اس نے تہران کی ساری نریٹنگ کو نظم و ضبط کا پابند بنا دیا ایک سال میں تہران دنیا کا واحد شہر بن گیا جس میں پارکنگ اور نریٹنگ کے قوانین پر سرفیصلہ عملدرآمد ہوتا تھا اس نے تہران کی ساری شکستہ سڑکیں دوبارہ

نجانے کا اعلان کیا، شاہراہ سازی کے اس عمل میں بھی اس نے ایک الٹا سول وضع کیا، اس نے اعلان کیا، ہم غریب ہستیوں سے سزا کس بنا شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ بی بی بی شاہراہ کی طرف آئیں گے، محمود احمدی نژاد، تہران کا چہا، نیز تھا جس نے تہران کے مصافحات کی ساری سزا کس وسیع اور پختہ کر دیں، جس نے تمام سزا کوئی پرائس لگا دیں، اس نے نو یا بتا جوڑوں کیلئے قرضوں کا پروگرام شروع کیا، وہ کہتا تھا، "جو شخص شادیاں کرنے وہ دوسرے دن کارپوریشن سے قرضہ لے اور آواز زندگی شروع کر دے، اس کی ذاتی زندگی کو بہتر کر دے، پھر اس نے سزا کی سرکاری رہائش گاہ دستمال کرنے سے انکار کر دیا، اس نے سرکاری گاڑی اور پٹرول بھی مسترد کر دیا، وہ تہران سے 20 میل، ہر ایک پسماندہ ہستی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا، وہ گھر سے لٹن لے کر دفتر آتا تھا، یہ اس کا بیٹا تھا، وہ تہران کے میٹر کی حیثیت سے کاہینڈ کے اجلاس میں شرکت کرتا تھا، کاہینڈ میں اس کے خیالات "باہیمانڈ" ہوتے تھے، وہ کہتا تھا "ہمارے وزرا، ماہوگوں کے اصل مسائل سے واقف نہیں ہیں، ہمیں بیرونی دنیا کے بجائے اندرونی دنیا پر توجہ دینی چاہیے" اس کے خیالات کے باعث کاہینڈ کے اجلاس میں اس کی شرکت پر پابندی لگا دی گئی۔

2005ء میں 65 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

شامل تھا، یہ بدست و دنیا کے 550 میٹروں کی پر قارئین دیکھ کر بتائی گئی تھی اور اس میں ایشیا کے صرف 9 میٹر شامل تھے، محمود احمد نژاد اور ایران کا پہلا میٹر تھا جس نے یہ اعزاز حاصل کیا۔

محمود احمدی نژاد، 2005ء کے الیکشن میں صدارتی امیدوار بن گیا، اس نے الیکشن میں کے بھیرا الیکشن لڑنے کا اعلان کیا، اس کے مقابلے میں علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے الیکشن میں 5 ملین ڈالر خرچ کئے، محمود احمدی نژاد اپنی الیکشن میں کے دوران صرف ایک نعرہ لگا، "تاربا" میں لوہار کا بیٹا تھا، میں میٹرزپ کے دوران بھی لوہار کا بیٹا رہا اور میں صدر بن کر بھی لوہار کا بیٹا رہوں گا، وہ کہتا تھا، "میں تمہیں امریکہ کی غلامی سے نجات دلاؤں گا، مغربی میڈیا کا کہنا تھا، "نژاد، گیارہ ستمبر کے بعد دنیا کا واحد صدارتی امیدوار تھا، جو اپنی تقریروں میں امریکی تعلقات کو لگا رہا تھا، "لوہار کا بیٹا تھا، 25 جون 2005ء کو ایران کا صدر منتخب ہو گیا، اس نے ایران کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ لئے، اس کی کامیابی پر امریکہ کے ایک نیٹو ایجنٹ نے تبصرہ کیا، "یہ 1979ء کے بعد ایران میں امریکہ کی دوسری شکست ہے،" جب نتائج کا اعلان ہوا تو میرے ایک دوست نے تبصرہ کیا، "نژاد نے امریکی غربت کو تیش کر لیا،" میں نے اسے نوک دیا، "یہ امریکی شناخت کی ٹھکتے نہیں، یہ نژاد کی

خدمتِ سادگی اور اخلاص کی فتح ہے" اس نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "ٹھانڈی کی یہ فتح ثابت کرتی ہے" عوام ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنا حکران دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے مسائل سمجھتے ہوں اور جو ان سے ان جیسے ہوں اور جو ان کے درمیان رہتے ہوں" میرے دوست نے پوچھا "لیکن ہمارے ملک میں ایسا کیوں نہیں ہوتا" میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "اس لئے کہ پاکستان میں اقتدار سونے کی کان ہے اور اس کان کے منہ پر لوہار کی بجائے سونا کے بیٹے بیٹھے ہیں"



Kashif Azad@OneUrdu.com

آمر ہمیشہ پنوشے کی موت مرتے ہیں

والدہ نے اس کا نام آگستور کھا تھا لیکن دنیا میں دو جنرل پنوشے کے نام سے مشہور ہوا

وہ جنرل امریکہ کے ملک چلی کا رہنے والا تھا۔ چلی دنیا کا سب سے چلا والا ملک ہے، امریکی اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں اس کے والد منسٹر اسکیزھے، پھر میں عربیت کی لیکن والدہ اپنے سینے سے گھر چلا گئی تھی وہ انجینئر بنا چاہتا تھا لیکن والدہ کی خواہش تھی وہ فوج میں افسر بنے، اس نے والدہ کی خواہش مان لی، پنوشے نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا، 1970ء کے ایکشن ہوئے اور ان ایکشنوں میں عوام نے سوشلسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر سلواڈور آلند سے کو صدر منتخب کر لیا، آلند نے ایک کمیونسٹ شاعر تھا، اس نے ملک کی تمام صنعتیں کاٹیں، بینک اور موصلاتی کمپنیاں سرکاری حویل میں لے لیں، یہ اقدامات امریکہ کے لئے تشویشناک تھے، امریکہ کو خدشہ تھا کہیں چلی بھی کیوبا کی طرح کمیونسٹ ملک نہ بن جائے، چنانچہ امریکہ نے صدر آلند سے اور کمیونسٹوں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا، امریکہ نے حزب اختلاف، اخبارات، سیاستدانوں، تاجروں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں پر کروڑوں ڈالر کی "سربایہ کاری" کی جس کے آخر میں امریکہ کو فوج میں ایسے افسر کی ضرورت پڑی جو چلی کی حکومت پر قبضہ کرے اور پھر برسوں امریکی مفادات کی ناکاہت اور گریسٹ ہیرل ہوئے، لیکن یہ سب ان نوبیاں کو جو وہیں جنرل پنوشے سے صدر آلند سے کے دور میں کوڈ تھا، رتھا، صدر آلند سے کو ایک ایسا جنرل اور کار تھا جس کا خاندانی پس منظر زیادہ

منفیہ نہ ہو اور جس میں وفا داری اور غلبہ میں موجود ہو اور جنرل پنشن کی بجلی اور عجز و انکسار سے دھوکہ کھا گیا پتا نچھاس نے اسے مسلح افواج کا تباہی راجیٹ بنا دیا، امریکی حکومت جنرل پنشن کی تازہ میں تھی امریکہ نے جنرل پنشن کو ہائی کمانڈ کی اور جنرل پنشن نے 11 ستمبر 1973 کو صدر آئندے کا تختہ الٹ دیا جس کے بعد صدر آئندے نے صدارتی کتل میں خودکشی کر لی، یوں اس شام جنرل آگسٹو پنشنے یوگارتے پٹی کا بااثر تہ غیرے مالک و مختار بن گیا۔

جنرل پنشنے میں چار خصوصیات تھیں، وہ طاقت استعمال کرتا جانتا تھا، وہ سمارٹ اور ہپاٹاک تھا، وہ شطرنج کی طرح لوگوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور وہ سازش کرنے میں ماہر تھا، اس نے اقتدار میں آتے ہی تمام کیونسلوں کو گھنٹا کر لیا، اس نے 28 ہزار لوگوں کو تارچہ کیا جن میں سے تین ہزار سیاستدان قتل ہو گئے، وہ مخالفین کو گرفتار کرتا اور اگلے دن ان کی ٹشیں دریا میں تیرتی ہوئی ہتھیں یا جنگل میں کسی درخت سے لٹک رہی ہوتیں، وہ سوسائٹوں کو ایک گڑھے میں دفن کرویتا تھا، وہ ایک جاہل تہ تین تین مردے بھی ڈال دیتا تھا، اس نے تین برسوں میں چلی سے کیونسل

ختم کر دیے، وہ آئین اور قانون توڑنے اور ناپائیدار بننے پر یقین رکھتا تھا، اس کا کہنا تھا وہ وی اس کی اصل ہمت ہے اور جب تک وہ مسلح افواج کا مالک ہے، اسے اپنی طاقت کا کوئی خوف نہیں

وہ کہتا تھا، چلی میں صرف وہی ہائل سکتا ہے جسے میں جٹنے کی اجازت دوں گا، اس نے 1974ء میں ریفرنڈم کرایا اور 75 فیصد عوام نے اس کے حق میں "دوت" دے دیا، اس نے مارچ 1981ء میں اپنی مرضی کا آئین بنایا اور ڈوکو آنڈر بس کیلئے باوروی صدر منتخب کر لیا، وہ یو پیٹارم کے بغیر کسی سیاستدان سے ملاقات نہیں کرتا تھا، اس نے 1982ء میں جمہوریت نافذ کرنے کا اعلان کیا لیکن وہ 1982ء آتے ہی اپنے وعدے سے کھر گیا، وہ خود کو عوام میں انتہائی پاپولر تصور کرتا تھا، 1988ء میں اس نے عوام کو تھوڑی سی آزادی دی اور اس کے بدلے میں ریفرنڈم کرایا، اس کا خیال تھا عوام اسے مزید دس برسوں کیلئے صدر منتخب کر لیں گے لیکن وہ ہار گیا، ملک میں صدارتی الیکشن ہوا اور عوام نے ایچ بی این لیڈر اور کر جین ڈیکو کر یک پارٹی کے پیڑشینا یلیون ایڈوکار کو صدر منتخب کر لیا، جس کے بعد اسے صدارتی عہدہ تھوڑا سا پڑا لیکن اس نے یو پیٹارم اتارنے سے انکار کر دیا، اس نے خود کو دس سال کے لئے ایٹور کمانڈر راجیٹ تو سبج دست دی، اس نے خود کو تاحیات سینیٹر بھی بنالیا۔

جنرل پنشنے پٹی کو رہن خیال اور استدال پسند جاتا جانتا تھا، "سب سے پہلے چلی"

اس کا فلسفہ حیات تھا لہذا وہ امریکہ کا ہر جائزہ اجازت حکم نورمان لینا تھا اس نے امریکی شہریوں کو ہتلی میں خصوصی حقوق دے رکھے تھے امریکہ نے ہتلی میں ایف بی آئی اور سی آئی اے کے باقاعدہ دفتر بنا رکھے تھے اور یہ لوگ ان دفاتروں کے ذریعے پورے بین الاقوامی امریکہ کو مانیز کرتے تھے اس نے کیوسٹوں کے ساتھ ساتھ تمام مذہب پسند عناصر بھی ہتلی سے فارغ کر دیئے کسی نے ایک بار اس سے پوچھا تھا "تم ایک تابوت میں دو دو تین تین مردوں کو کیوں دفن کرتے ہو اس نے بس کر جواب دیا "میں قبرستانوں کی جگہ چناتا ہوں" اس نے عدالتوں پر بھی قبضہ کر رکھا تھا وہ فرمان جوں کو عہدے سے ہٹا دیتا تھا یا پھر انہیں "روڈ ایکسیڈنٹ" میں مردود چھوڑتا تھا اسے سیاستدان ایسے نہیں نکتے تھے وہ نہیں ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا چنانچہ اس کے دور میں زیادہ تر سیاستدانوں نے جلا وطنی اختیار کی یا پھر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اسے کرنی نوٹ بدلنے کا بھی شوق تھا اس نے اپنے دور میں ہتلی کے تمام نوٹ تبدیل کر دیئے اسے شراب پیچے اور پلانے کا بھی شوق تھا لہذا اس نے اپنے دور میں ہتلی میں بے تحاشا شراب خانے اور ڈسکو کلب

بنائے وہ خوش لباس تھا ان کے سوٹ الٹی سے بن کر آتے تھے اور نیو یارک کے میں ڈزائی کلین

دور سے اپنے رقص و گیت کا ہتلی شوق تھا چنانچہ اس کے دور میں دنیا بھر کی ڈوکارا غریب سان تیار کر آتی تھیں اور اس سے خوب داد پاتی تھیں وہ سکیورٹی کے بخار میں بھی جھلا تھا لہذا وہ جب صدارتی عمل سے نکلتا تھا تو سان تیار کو کی ساری سڑکیں دیران ہو جاتی تھیں اور اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں بیسیوں بلسٹ پر دف گاڑیاں چلتی تھیں اس کے ہینڈروم کے باہر تو جیس اور میزائل نصب ہوتے تھے لیکن پھر اس کی زندگی میں ایک دن طلوع ہوا اور وہ سان تیار کو کی گلیوں میں رسوا ہو کر رو گیا اس کی اپنی ہتلی ہوئی عدالتوں نے اس کے خلاف انکو الزامیں شروع کر دیں اس کا اپنا بنایا ہوا قانون اس کے پاؤں کی جڑیاں اٹا گیا وہ دن دس مارچ 1998ء تھا اس دن جنرل ہوش نے یونیفارم ۳۱ لٹی لٹیٹنسٹ لی اور زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گزارنے کا اعلان کر دیا لیکن اگلے ہی دن اس کا احتساب شروع ہو گیا وہ علاج کیلئے لندن گیا اور برطانوی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا برطانوی حکومت نے 2000ء میں اسے سان تیار کو بھیجا تو عدالت نے اسے طلب کر لیا اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی تین ہزار لوگوں کے قتل اور وسیع کربش کا الزام تھا 2004ء میں اس کا دورہ 70 اٹکھڑا ایروں کا ایک اکاؤنٹ بھی پکڑا گیا وہ شدید اپریشن اور پریشانی کو ۲۰۰۴ء میں دیکھا اسے سمجھیں آتی تھیں لوگ اس سے اتنی نفرت نہیں کرتے جیسا اس سے

ایک دن اپنے خادم خاص سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا 'سراپ خود کہا کرتے تھے پوینٹا مر
آپ کی اصل طاقت ہے آج آپ اس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں' اس نے مر جھکا لیا۔ جنرل
بنوشے کو تین دسمبر 2006ء کو ہارٹ اٹیک ہوا اس کی اسٹو پلائی ہوئی لیکن وہ دس دسمبر کو دم توڑ
گیا، دس دسمبر انسانی حقوق کا عالمی دن تھا اس دن بنوشے کی موت قدرت کا اس سے انتقام تھا
اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی 'میری لاش کو جلا دیا جائے، مجھے خطرہ ہے لوگ میری قبر کی
بے حرمتی کریں گے' اس کا خدشہ درست تھا بنوشے کی موت پر ہزاروں لوگ گھروں سے نکلے
اور انہوں نے سان تیا کو میں دھس شروع کر دیا تھا۔ وہ آتش بازی بھی کر رہے تھے، پولیس کو ان
لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے لاشی چارج اور آئسوگیس استعمال کرنا پڑی۔

جنرل بنوشے کی موت ایک اور آمر کا انجام تھی، اس موت نے ثابت کر دیا۔ زمین کا ہر
آمر دنیا سے رخصت ہوتا ہے، وہ اپنی آنکھوں سے اقتدار اور طاقت کو اپنے ہاتھوں سے
نکلنے دیکھتا ہے اور پھر بے ہائے اور اوائے اوائے کے نعروں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے
اور دنیا میں شاید ہی کوئی آجر گزارا ہو جسے قبر اور مٹی نصیب ہوئی ہوں اور جسے جہنم کے بعد بھی
لوگوں سے یاد رکھا جائے۔ بنوشے کی موت نے ثابت کر دیا لیڈر اور آمر میں صرف انجام کاروں ہوتا
ہے، لیڈر دنیا سے ہمیشہ عزت کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد لوگ ان کی قبر پر دیا
جاتے ہیں جبکہ آمر ہمیشہ بنوشے کی موت مرتے ہیں اور لوگ ان کی قبر کی طرف پشت کر کے کھڑے
ہوتے ہیں لوگ مرنے کے بعد بھی ان سے نفرت کرتے ہیں لہذا میں صدر جنرل پرویز مشرف سے
درخواست کرتا ہوں اور اپنی میز پر جنرل بنوشے کی تصویر لگائیں اور اٹھتے بیٹھتے اس پر ایک نظر ضرور
ڈال لیا کریں اور اللہ سے دعا کیا کریں اللہ تعالیٰ انہیں صدر بنوشے کے انجام سے بچائے۔



یونینفارم

وہ دنیا کا ایسا سکران بنا چاہتا تھا جو مرنے کے بعد بھی یونینفارم میں رہے اسے رعناؤ کے لفظ سے نفرت تھی جسے اس کا اقتدار سوا نیوز سے بر تھا تو اس نے دو کام رکھے اس نے خود کو فیلڈ مارشل کو بیکر کر دیا اور ڈومسٹک اس کے اہلیت کی وجہ اس کا انتقال ہو ڈا سے یونینفارم میں پورے فوجی اعزازات کے ساتھ دفن کیا جائے اور اس کے بعد اسے فیلڈ مارشل صدام حسین کے نام سے لکھا اور پکارا جائے۔

وہ 16 جولائی 1979ء کو عراق کا صدر بنا اس وقت وہ عراقی فوج میں سیکر جنرل تھا وہ 24 برس تک مسلسل عراق کا سکران رہا اس کی ذات ایک ایسا گھنڈ گھر تھی جس کے گرد اختیار و اقتدار طواف کرتے تھے وہ کہتا تھا میرا جوتا میرا آئین اور میرا قانون ہے عراق میں چھ بڑے عہدے تھے صدر، وزیر اعظم، فوج کا سپریم کمانڈر، وزیر دفاع، چیئر مین انقلابی کمانڈ کونسل (آر سی اے) اور بھٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل یہ سارے عہدے صدام حسین کے پاس تھے وہ عراق کا مضبوط ترین شخص تھا لیکن وہ ووردی کو اپنی اصل طاقت کہتا تھا اس کا کہنا تھا اگر انتظامی اور سیاسی طاقت کو ووردی کی قوت مل جائے تو وہ ناقابل ترمیم اقتدار میں جاتی ہے وہ یونینفارم اتارنے کیلئے تیار نہیں تھا اس کا کہنا تھا جس جرنیل کو یونینفارم کے ساتھ اقتدار ملے اسے زندگی میں اقتدار اور یونینفارم میں سے کوئی چیز ترک نہیں کرنی چاہیے اس کا کہنا تھا یونینفارم اس کو ادب پر اللہ تعالیٰ کی

سب سے بڑی نعمت ہے اور جو لوگ اس نعمت کا کفران کرتے ہیں وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں اس کی بات درست تھی ایہ نظام نے اسے وہ طاقت بخشی تھی جو اس سے پہلے عراق کے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی تھی اس نے یو نیٹام کی طاقت سے پورا آئین بدل دیا تھا۔ اس نے عراق کا سارا قانون تبدیل کر دیا تھا اس یو نیٹام کی مہرانی سے اس کا ہر حکم قانون اور ہر خواہش آئین کا ہوجا سکتی تھی وہ انٹر کبڈو تھا کما سے عراق کے تمام شہریوں کی صبح نہ بچے سے شروع ہوگی تو اگلے دن یہ حکم قانون کا درجہ اختیار کر جاتا تھا پورا ملک صبح نہ بچے آنکھ کھولتا تھا وہ وہو جسم کی ذہنوں کا سربراہ تھا ایک ملک کی فوج جس کی تعداد پانچ لاکھ تھی جس کے پاس طیارے تو ہیں اور میزائل تھے اور دوسری اس کی ذاتی فوج یہ فوج صدام حسین اور اس کے نظام کی ذاتی محافظ تھی ان فوج کے پاس جبکہ وقت فوج پولیس اور عدلیہ کے اختیارات تھے یہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتی تھی اسے سزا سنا سکتی تھی اور کسی سے اجازت لئے بغیر اس سزا پر عملدرآمد کر سکتی تھی پورے عراق میں صدام کے ہزاروں لاکھوں مجسمے تھے اور ہر جگہ میں اس نے لینڈ مارشل کی دروی پکین رکھی تھی عراق میں کہا جاتا تھا آپ اپنے گھر کی کبڑی کھولیں آپ اپنے گھر کے کورڈاز سے

Kashaf Zangoni Urdu Library

سے پہلے صدام حسین کی تصویر یا نقشے پر پڑے گی۔ کہا جاتا تھا آپ بغداد میں رہ کر صدام حسین کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتے کہا جاتا تھا بغداد کو کاہرہ کی آنکھوں لے کے بعد سب سے پہلے صدام حسین کا شاندار اور بارعب چہرہ دیکھتا تھا اور یہ چہرہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوتا تھا صدام حسین اور اس کی یو نیٹام عراق کی ہواؤں میں رچی بسی تھی وہ روز روزی پکین کو فٹز جاتا تھا وہ انہی پر وہ سوٹ پہنتا تھا لیکن اس کی یو نیٹام اس کی میزائل پر ف کاڑی میں اس کے ساتھ سفر کرتی تھی وہ اس یو نیٹام کو اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا صدام حسین کے ماتحت اس کی اس نفسیاتی کمزوری سے واقف تھے چنانچہ اس کے صحابی یو نیٹام دھومنے سے پہلے یو نیٹام کو سیلت کرتے تھے اسٹری کرنے والے اسٹری پھیرنے سے پہلے یو نیٹام کو سیلت کرتے تھے اور اس یو نیٹام کو آگے پیچھے لے جانے والے اسے اٹھانے سے پہلے سیلت کرتے تھے اس کا حکم تھا کرنل سے کم رینک کا کوئی افسر اس کی یو نیٹام کو ہاتھ نہ لگائے اس نے یو نیٹام کا تقدس برقرار رکھنے کیلئے اپنے دھوڑوں اسٹری کرنے والے ماڈرنوں اور یو نیٹام کی "جبکہ کیلئے" کرنے والے خادموں کو عراقیوں کیلئے بے حد اہم سمجھا کرتا تھا۔

صدام حسین اور اس کی یونیٹارم کا سپاہی سے جمل رونی تھی لیکن نومبر 2003ء میں امریکہ نے اتحادیوں کی فوجیں جمع کیں اور عراق پر حملہ کر دیا۔ صدام حسین اور اس کی یونیٹارم نے ہت کر مقابلہ کیا لیکن جلد ہی، دونوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ صدام حسین رہ پش ہو گیا اور بغداد فتح ہو گیا۔ سقوط بغداد کے بعد امریکی فوج کی تھرو ڈانسٹری ڈویژن کا ایک سپاہی ایئر پورٹ کی تلاشی لے رہا تھا تو اسے وہاں ایک شاچنگ بیگ ملا اس بیگ میں ایک یونیٹارم بھی اس نے یونیٹارم سیدھی کی تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ صدام حسین کی روٹی تھی یونیٹارم کے سینے پر صدام حسین کے تمام فوجی اعزازات اور تحفے سجے تھے سپاہی نے یہ یونیٹارم پھپالی 2003ء کے آخر میں یہ سپاہی واپس امریکہ آیا تو اس نے یہ یونیٹارم امریکہ کے مشہور نیٹام گھر "ٹائمن انٹرنیشنل آکشن ہاؤس" کے حوالے کر دی۔ ٹائمن کا شمار امریکہ کے چند بڑے نیٹام گھروں میں ہوتا ہے یہ نیٹام گھر پچھلے 30 برس سے کام کر رہا ہے اور اسے فوجی اعزازات اور عسکری باقیات فروخت کرنے کا خصوصی تجربہ ہے۔

یہ نیٹام گھر نے نومبر 2005ء کو یہ یونیٹارم آکشن پر رکھ دیا۔ نیٹام گھر نے اس یونیٹارم کی

کھپنی کی قیمت 5 لاکھ ڈالروں کی تھی۔ کھپنی نے اس نیٹام گھر کو ایک خوب عمارت لگانے اور اس ویب سائٹ کے ذریعے دنیا بھر میں موجود شائقین کو بولی کی دعوت دی۔ کھپنی کا خیال تھا عراق کے سب سے طویل عہدہ اور سب سے بڑے عہدیدار کی یونیٹارم کی لاکھ ڈالروں میں فروخت ہوگی۔ کھپنی کا کہنا تھا وہ یونیٹارم کی آکشن سے حاصل ہونے والی رقم کا ایک حصہ کسی خیراتی ادارے کو دے گی لیکن کھپنی کو اس وقت حیرت کا شدید جھکا لگا جب گا کہوں نے صدام حسین کی یونیٹارم خریدنے میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ یہ کھپنی اس سے قبل ملٹری یونیٹارم بھی بیچ چکی تھی اور اسے اس سوڈے میں کروڑوں ڈالروں کا ملے تھے لیکن اس مرتبہ انہیں کاروبار میں گھٹانا پڑا۔ دکھائی دیا صدام حسین کی یونیٹارم کی بولی نومبر 2005ء میں پانچ ہزار چالیس ڈالر سے شروع ہوئی اور فروری 2006ء میں سولہ ہزار ڈالر پر آ کر رک گئی۔ آکشن ہاؤس نے بولی آگے لے جانے کی کوشش کی لیکن چھارہ لوگوں کی اس دنیا میں انہیں سوا سولہ ہزار ڈالر دینے والا کوئی شخص نہیں ملا۔ لہذا کھپنی کو مجبوراً یہ یونیٹارم 16 ہزار ڈالر میں بیچنا پڑی۔

اگر ہم اس یونیٹارم کی مالیت کا اندازہ لگائیں تو میرا خیال ہے صدام حسین کے فوجی اعزازات پر سولہ ہزار ڈالر سے زیادہ کی پالش لگی ہوگی۔ سولہ ہزار ڈالر تو اس یونیٹارم کا دھولے لے لیا کرتا تھا۔ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یونیٹارم کی اس ناقدری پر دلی دکھ ہوا آپ مکاتات مل

دیکھئے جس صدام حسین کو پوری دنیا جانتی ہے اس صدام حسین کی یونیفارم کے بارے میں کوئی نہیں جانتا وہ اس وقت کس کے پاس ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا ایک طرف یہ یونیفارم ہے اور دوسری طرف اس یونیفارم کا مالک ہے جو کپڑوں کے دوسرے جوزے کو کرتا ترستا رہ گیا جسے پلیٹروں کے نئے جوزے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ میرا مکی چاہتا ہے۔ میں مائین انٹرنیشنل کی ویب سائٹ دنیا کے تمام ہاوردی حکمرانوں کی ٹیمپل پر لگوادوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں "سراخلاق اور اخلاص دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے اور جو حکمران اس طاقت سے مالا مال ہوتا ہے اس کا نام ہزاروں دروہوں سے زیادہ دیر پا اور مضبوط ہوتا ہے" میں ان سے عرض کروں "سر یونیفارم چھوٹے کپڑے سونٹ دھاگے اور آدھا میلہ کبرم کا نام نہیں یہ اخلاق، سچائی اور ایمان کا نام ہوتا ہے اور جس شخص کے پاس یہ تینوں چیزیں ہوتی ہیں سر ان کے رد مال بھی یونیفارم سے نکلے ہوتے ہیں، سر ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور ان کی سوچ کا ہر مد و جزو آئین ہوتا ہے اور سر ہمارا کام ہمارا اخلاص اور ہماری کوششیں ہمیں بڑھانے ہیں ہمارے پیرائے ہمارے جوشے اور ہماری بلات کرنا گاریاں ہیں سر حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ ماؤز سے ننگ تک کسی کے تن پر یونیفارم نہیں آتی لیکن آج وقت ان کی چوکھٹ کو سیلوٹ کر رہا ہے کیوں؟ کیونکہ سر یہ لوگ اپنے ایمان کو اپنی طاقت سمجھتے تھے یہ لوگ یونیفارم کی بجائے عوام کو اپنی قوت سمجھتے تھے اور سر یہ حقیقت ہے عوام وہ طاقت ہوتے ہیں جو لیڈروں کو اپنے دل اپنے دماغ میں زندہ رکھتے ہیں جو انہیں صدیوں تک پہلی محبت اور عقیدت دیتے ہیں"



”ہمیشہ عاجز اور دستیاب رہو“

مرنے سے چند لمحے پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اس نے جیول کی طرف
 دیکھا، بیو نے اس کا دوسرا ہاتھ بکڑ لیا، ایک والد کی آنکھوں میں مسنونیت کا احساس ابھرا، اس نے
 آنکھیں بند کیں، ایک لمبا اور مطمئن سانس لیا اور اپنی روح خالق کائنات کے حوالے کر دی، اس
 کے ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے لگے، جیول اور جیول کی بیوی نے اس کے ہاتھ سیدھے کئے
 اور اس پر گردن تک چا اور سے وی جس کے بند ایک مہد قسم ہو گیا، ساتھ برس تک کروڑوں دلوں
 پر ٹھکانی کرنے والا آرت بک والڈ ٹوٹ ہو گیا۔

آرت بک والڈ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا اس کا کالم بیک
 وقت 600 اخبارات میں شائع ہوتا تھا آرت بک والڈ کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی، وہ 1925ء
 میں نیویارک میں پیدا ہوا، دو مرتبہ بائی سکول میں داخلہ لیا لیکن پڑھ نہ سکا، نئی یورپی میں بھرتی ہوا تین
 سال نوکری کی سارجنٹ بنا اور استعفیٰ دے کر واپس آ گیا، یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلینفورنیا میں
 داخلہ لیا، تین سال یونیورسٹی میں پڑھا لیکن ناکام ہو گیا، 1948ء میں 250 ڈالر کا بندوبست کیا
 اور وہیں آ گیا، تینوں میں ”ڈرائنگ ٹرین“ سے وابستہ، وہیں تینوں کی سہارہ دہی پر چلنا چلنا نام
 لکھا، لوگوں نے پسند کیا اور آرت بک والڈ کالم نگار بن گیا، 1952ء میں نیویارک ہیرالڈ ٹریبون

نے 'کالم کو' سینڈ کیٹ' کر دیا۔ آرٹ بک والد کا کالم امریکہ کے 130 اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ 1962ء میں وہ واپس امریکہ آ گیا۔ 1970ء میں اس کا کالم انٹرنیشنل سطح پر سینڈ کیٹ برادر دنیا کے پیدائشی اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا۔ اس نے 36 ماہرین کی ٹیم بنا رکھی تھی یہ سب لوگ مل کر اس کا کالم پلان کرتے تھے۔ زبان کے ماہرین زبان کی باہر کیسٹیاں ٹھیک کرتے تھے۔ قانونی ماہرین کالم کی قانونی جھجھکیاں کا جائزہ لیتے تھے اور انسانی نفسیات کے ماہر کالم کی نفسیاتی جہتوں کا تجزیہ کرتے تھے۔ آرٹ بک والد کا کالم ایک مختصر سی مزاحیہ تحریر ہوتی تھی لیکن اس کے اثرات کئی مہینوں تک جاری رہتے تھے۔ اس کے فخر سے اور خیالات عام لکھاریوں سے مختلف تھے۔ مثلاً اس نے ایک کالم لکھا تھا "ہم مجیب لوگ ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارا گزارا ہوا کل ہمارے آج سے بہتر تھا۔ میں ان تمام لوگوں سے مختلف ہوں۔ میں آج کی خوبیاں جاننے کیلئے جس سال انتظار نہیں کر سکتا لہذا میں اپنے آج کو گزارا ہوا کل سمجھتا ہوں اور ہمیشہ آج سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے

آج 2004ء کو 994 آج کے عجب کے عجب کے دن اس نے کئی کئی بار نظر آنے لگا۔
 کیا اس نے لکھا "میری بیوی ایک بار لکھ کر لکھنے کے باعث گرنی اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا یہ نوے کے زاویے پر تری اگر یہ 45 کے زاویے پر گرتی تو اس کی کلائی بچ سکتی تھی اس دن سے میں نے گرنے کا یہ نسخہ پلے باندھ لیا ہے لہذا میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا ہوں اگر تم گرنے کا منصوبہ بناؤ تو تم مہربانی فرما کر 45 کے زاویے پر گرو تاکہ تمہاری کلائی بچ جائے"

میں آرٹ بک والد سے بہت متاثر تھا۔ میں 2001ء میں امریکہ گیا تو میں نے اسے فون کیا اس کی سیکرٹری سے بات ہوئی اس نے مجھے شام پانچ بجے کا وقت دے دیا۔ آرٹ بک والد ایک خوبصورت گھر میں شاہانہ زندگی گزار رہا تھا اس کی سیکرٹری مجھے اس کی سنڈی میں لے گئی۔ 'بک والد' کتابوں کے ریٹس کے درمیان بیٹھا تھا اس کے پیچھے شیشے کی دیوار تھی اور دیوار کی دوسری طرف نصف درجن لوگ کیپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ میں نے شیشے سے جھانکا تو بک والد نے آجیہاں کر کہا "ہائی ساف" میں شرمندہ ہو گیا اس نے ہاتھ دگرے اور سر اٹھا لیا۔ میں اسے سٹر شوری تم زیر پبوائنٹ کے ٹائٹل سے کالم لکھتے ہو تمہارے پتے میں تمیں کالم آتے ہیں تمہارے کالموں کا سائل ڈرامائی ہے اور لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں" میں نے حیران ہو کر اس

کی طرف دیکھا اس نے میر پر بڑی فائل کھولی اس میں سے میر سے چند کالم نکالے اور میر سے سامنے رکھ دیئے ایک کاغذ خردا اٹھایا اور میر پر فائل پر ہنا شروع کر دیا دو پڑھتا رہا پڑھتا رہا جب کاغذ ختم ہوا تو مزاجیہ انداز میں بولا "میں نے یہ ساری معلومات انٹرنیٹ سے نکالی ہیں مجھے جب پتہ چا میرا ایک پاکستانی دوست آرہا ہے تو میں نے فوراً یہ معلومات جمع کر لیں تاکہ جب تم آؤ تو میں پاکستان اور تمہارے بارے میں سوال پوچھ کر تمہارا وقت ضائع نہ کروں" ہم اس ملاقات میں زیادہ بہتر گفتگو کر سکیں لہذا انہی سی تم تک اباؤت شرف "مجھے اس کا سائل بڑا اچھا لگا وہ حقیقتاً ایک دلچسپ انسان تھا اس نے مجھے بتایا وہ روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتا ہے کالم لکھتا ہے، شام کو نینس لیتا ہے اسے صبح جمع کرنے اور کھینے کا شوق ہے اس کے پاس سینکڑوں قسم کی شکر نہیں تھیں وہ ریسرچس پر جاگت کرتا تھا اور مزاجیہ فلمیں دیکھتا تھا اس نے مجھے بتایا اسے صدر ریش اور اساتذہ بن لادن ایسے کتے ہیں زودیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے ان دونوں نے کس طرح چوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے ہم ایک گھنٹہ گفتگو کرتے رہے پھر جب میرا وقت ختم ہو گیا اس کی سیکرٹری اندر آئی میں نے جاننے کیلئے اجازت مانگی وہ اٹھا لیکن کچھ سوچ کر بولا "میں نے تمہیں چاہی نہیں تو تم کس حریف اور صاحب سے میرے پاس بیٹھ سکتے ہو" میں نے یہ سیکرٹری کو اشارہ کیا وہ باہر گئی اور چند منٹ بعد ایک فائل لے کر آگئی "سسر بک والغذیہ ویتام کا ایک طالب علم ہے اس نے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب یہ جینز ٹیکنالوجی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے اسے سکا لرشپ چاہئے" بک والد نے اثبات میں سر ہلادیا سیکرٹری نے دوسرا بیچ پڑھنا شروع کر دیا "یہ ساؤتھ افریقہ کی بچی ہے کینسر کی مریض ہے پچیس ہزار ڈالر میں اس کا علاج ہو سکتا ہے" اس نے اس پر بھی اثبات میں گردن ہلادوی سیکرٹری نے دونوں کاغذ اٹھائے اور باہر چلی گئی بک والد نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ رگڑا کر بولا "یہ میری عبادت تھی" میں نے اس سبب و غریب عبادت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا "انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جسم ذہن اور روح ہم جسم کو تندرست رکھنے کیلئے ورزش کرتے ہیں اور ذہن کو چست و چالاک رکھنے کیلئے مطالعہ لیکن ہم اپنی روح کو ہمیشہ بھلا دیتے ہیں ہم اسے زندہ اور چست و چالاک رکھنے کیلئے کچھ نہیں کرتے جبکہ ہمارے جسم اور ہمارے ذہن کی تمام چیزیں ہماری روح میں چوست ہوتی ہیں ہمیں ایک غیر مذہبی انسان ہوں لیکن میں ورزش کو جسمانی عبادت، مطالعے کو ذہنی عبادت اور قرائح عامہ کو روحانی عبادت سمجھتا ہوں میں سارے چار سو اخبارات سے حاصل ہونے والی

آمدنی واقع زندگی پر شرح کرتا ہوں جبکہ ڈیڑھ سو اخبارات سے آنے والے پیک اپنے چیرنی اکاؤنٹ میں ڈال دیتا ہوں میں روز شام چوبیس بجے سے ساڑھے چوبیس بجے تک چیرنی کا کام کرتا ہوں میں طالب علموں کو دیکھنے دیتا ہوں سرینسوں کے علاج کا بندوبست کرتا ہوں ہوم لیس لوگوں کی مدد کرتا ہوں اور میں سیلاب اور زلزلوں کے شکار لوگوں کی خدمت کرتا ہوں میں اسے اپنی عبادت سمجھتا ہوں میری یہ پریز میرے دماغ میرے جسم کو بھی صحت مند رکھتی ہے اور میری روح کو بھی "میں نے اسے سلوٹ کیا اور واپس آ گیا۔"

آرٹ بک والڈ کی موت اس کی زندگی سے زیادہ دلچسپ تھی فروری 2006ء میں اس کے دونوں کمرے محل اوگے اور وہ بیٹے میں تین دن ڈیپ لیسس کرانے لگا وہ ڈیپ لیسس سے بور ہو گیا لہذا اس نے مرنے کا فیصلہ کیا امریکہ میں دو قسم کے طبی مراکز ہوتے ہیں پہلی قسم کے مرکز کو ہسپتال کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ہو پیس کہلاتی ہے ہو پیس میں علاج سے واپس مریض داخل ہوتے ہیں ہو پیس میں داخل مریضوں کا علاج نہیں کیا جاتا ڈاکٹر مریض کو ایک شاندار کمرے میں لٹاتے ہیں اور اس پر خراج ہونے کے دوران کے مریضوں کو یہ جہاز لے کر آتا ہے جس سے چاہتا ہے ملتا ہے کوئی شخص اسے متح نہیں کرتا چون مریض ساری خواہشیں پوری کر کے فوت ہو جاتا ہے آرٹ بک والڈ نے فروری 2006ء میں ڈیپ لیسس بند کر لیا اور ہو پیس چلا گیا اس کے اس اقدام نے اس کی شہرت میں اضافہ کر دیا امریکہ کے تقریباً تمام اخبارات رسالے اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اسے خصوصی جگہ دی ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ دو تین ہفتوں میں انتقال کر جائے گا لیکن قدرت کا کمال دیکھتے تو نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس کے گرووں نے بھی اپنا تک کام کرتا شروع کر دیا وہ تین ماہ بعد ہو پیس سے نکلا اور معمول کے مطابق کالم لکھنے لگا امریکہ کے ڈاکٹر اس عاجز سے پر حیران تھے لیکن میرا خیال تھا آرٹ بک والڈ کو اس کی "عبادت" نے زندہ رکھا تھا وہ ان غریبوں ناداروں اور مریضوں کی وجہ سے زندہ رہا جن کی خدمت کو وہ عبادت سمجھتا تھا یہ آرٹ بک والڈ 18 جنوری 2007ء کو فوت ہو گیا اس کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا جیول اور اس کی بیوا کے پاس تھے جیول بک والڈ نے میڈیا کو بتایا میرے والد نے مرنے سے پہلے اپنے چاہنے والوں کو پیغام دیا "ہمیشہ عاجز اور دستیار رہو" میں نے آرٹ بک والڈ کا یہ پیغام پڑھا تو میں بے اختیار نمس پڑا یہ فقرہ میرے باپ نے آرٹ بک والڈ کو دیا تھا میں نے 2001ء میں آرٹ بک والڈ کو بتایا تھا ہمارے ایک پرنسپل سکاٹر جین ہاباشی آپ اور باباشی کے خیالات

ذریعہ پوائنٹ 3.....0.....67

بہت ملتے ہیں نو دکھا کرتے ہیں "اللہ کی عبادت انسانوں کی خدمت سے شروع ہوتی ہے" آرت بک والد نے قہقہہ لگا یا اور ہاتھ رگڑ کر بولا "باباجی اور کیا کہتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "وہ کہتے ہیں صوفی کی روشتائیاں ہوتی ہیں وہ ذمہ کی طرح عاجز اور ہوا کی طرح دستیاب ہوتا ہے" آرت بک والد یہ سن کر خاموش ہوا اور تھوڑی دیر سوچ کر بولا "ہاں انسان کو ہمیشہ عاجز اور دستیاب ہونا چاہیے"



کاشفِ آزاد
Kashif Azad@OneUrdu.com

گڈ بائی مائی فرینڈز

آرٹ بک والدہ نے 2006ء کے وسط میں آخری کالم تحریر کیا تھا اس کالم کا عنوان "گڈ بائی مائی فرینڈز" تھا۔ میں نے مصحفی محی ریحہ کالم کی بے انتہال شے بعد شائع کیا ہے۔ وہ اس کالم کے بعد بھی کالم تحریر کرتا رہا اور یہ کالم معمول کے مطابق اخبارات میں شائع ہوتے رہے لیکن اس کا آخری کالم اس کے جانے کا انتظار کرتا رہا یہ کالم اس کے انتقال کے بعد 19 جنوری 2007ء کو دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوا آرٹ بک والدہ کے کالموں میں ہمیشہ طنزی کات اور مزاح کے رنگ رہے ہیں اس نے اپنی 82 سالہ زندگی اور 60 سالہ صحافت میں کبھی سنجیدہ کالم نہیں لکھا اس نے اپنی یہ روایت آخری کالم میں بھی نبھائی۔ آرٹ بک والدہ کے آخری کالم کے تجزیے سے پہلے میری خواہش ہے آپ ایک نظر اس کالم پر ضرور ڈال لیں میں اس کے بعد آرٹ بک والدہ کے فن پر گفتگو کروں گا آرٹ بک والدہ لکھتا ہے۔ "میرے دوستوں نے مجھے یہ آخری کالم لکھنے کا حکم دیا ان کا کہنا تھا مجھے اس کالم کے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہئے لہذا میں آج ان کا یہ حکم بھلا تاہوں دوستوں انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی زندگی کا حساب کرتا ہے جب وہ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے میں بھی جب اس سے اپنی زندگی کا حساب کر رہا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اس میری زندگی کا اہم پہلو تھا مجھے اس وقت اپنی زندگی کے تمام بچے اور وہ تمام عکلاڑی یاد آ رہے ہیں جنہیں میں نے اپنی خاص "لاب"

کے ذریعے ٹھکست دی تھی، مجھے اپنی 'لاب' پر یقین تھا لہذا میں بہت قدامت سے صرف دنیا کے تمام کھلاڑیوں سے اچھی نہیں کھیل سکتا ہوں بلکہ میں نینس کا ایک عظیم کھلاڑی بھی ہوں، میرا دوست کے۔ گراہم میرے اس خیال سے متفق نہیں تھا، وہ ہمیشہ میرے ساتھ کھیلا، میں نے اسے ہمیشہ ٹھکست دی لیکن اس نے کبھی مجھے عظیم کھلاڑی تسلیم نہیں کیا۔ میں آج یہ سمجھتا ہوں کہ گراہم ٹھیک تھا اور میں غلط، میں گراہم سے معافی مانگ چکا ہوں اور وہ مجھے معاف بھی کر چکا ہے۔

میں اس کالم میں وہ تمام باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو میں زندگی بھر نہیں لکھ سکا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے میں اب بھی ایسا نہیں کر پاؤں گا، تاہم میرے لئے آپ تمام لوگوں کا ساتھ دنیا کی عظیم ترین مسرت تھا، میرے لئے یہ کافی تھا میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ نے مجھے عمر بھر اپنی زندگی کا حصہ بنائے رکھا، میں آج اعتراف کرتا ہوں آپ میں سے ہر شخص نے میری زندگی پر اثر چھوڑا، میرے ہر کارکن نے میری زندگی میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ میں اب اپنے آپ کو سمیٹ رہا ہوں، میں رخصتی کیلئے سامان باندھ رہا ہوں، مجھے اطمینان ہے میں نے جس طرح اپنی شرائط پر

زندگی بسر کی تھی میں اسی طرح موت بھی اپنی مرضی کی منت کر رہا ہوں، پچھلے سال جب میرے دو دوستوں نے مجھے بلوائے تھے تو میرے تمام دوستوں اور عزیزوں کا خیال تھا، مجھے اس بیماری کا

بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے مجھے بار بار ڈایا لیسس کی اجازت سے گزرا چاہئے لیکن میں نے ہسپتال کی بجائے ہوس کا انتخاب کیا، میں نے اپنے لیے بیمار زندگی کی بجائے صحت مند موت پسند کی، میرے تمام دوستوں کو میرے اس فیصلے سے اختلاف تھا لیکن میں سمجھتا ہوں انسان کو دنیا سے رخصتی کی آزادی ہونی چاہئے، انسان کو اپنے لئے بہتر موت کے انتخاب کی اجازت ہونی چاہئے، میں نے اپنے لئے آرام دہ موت کا انتخاب کیا، میں نے آخری دن ہوس میں گزارنے کا اعلان کیا، میرے خاندان اور میرے ڈاکٹر دوست، ٹیک غنیمین نے میری حمایت کی، مجھے معلوم ہے ڈاکٹر مائیک غنیمین اور میرے خاندان کیلئے میرے اس فیصلے کی حمایت کتنی مشکل تھی لیکن یہ لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے لہذا انہوں نے میری آخری خواہش کا احترام کیا، میں آج ہوس میں بیٹھ کر یہ سطر لکھ رہا ہوں، میں اعتراف کرتا ہوں ہوس میں آنا میرا ذاتی فیصلہ تھا کیونکہ مجھے ہوس کی موت سب سے بے ضرر اور آرام دہ محسوس ہوتی ہے لہذا میں ہوس میں رہ کر زندگی سے رخصت ہونا ہوا، اچھا محسوس کروں گا۔

زندگی کی ان آخری ساعتوں میں میرا مانع نہ جانے کیوں کھانے پینے کی چیزوں کی

طرف مائل ہے۔ مجھے روہرہ کو چاکلیٹ کی دوساری ٹافیاں یاد آ رہی ہیں جو میں زندگی میں نہیں کھا سکا، میں پچھلے چند ماہ سے جب بھی "چیز ایک فیکٹری" کے پاس سے گزرتا ہوں تو میں بے اختیار پرائف رول اور بناناہٹل خرید لیتا ہوں، میرے لئے اب ان نعتوں سے محروم رہنا ممکن نہیں، میں جانتا ہوں زندگی کی آخری ساعتوں میں کھانے پینے کے بارے میں سوچنا اور بناناہٹل پرائف رول اور چاکلیٹ ٹافیاں کھانا نہایت احمقانہ فعل ہے، یہ چیزیں مٹی کی نظر سے درست نہیں ہیں لیکن میں آخری وقت خود کو سزا دینا چاہتا ہوں، میں اپنے جسم کو بتانا چاہتا ہوں میں نے زندگی کے اچھے لمحوں میں خود کو ایسی شاندار اور مزیدار چیزوں سے محروم کر کے اپنے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں اپنے آپ کو بتانا چاہتا ہوں زندگی کے سفر میں مزیدار چیزوں سے محروم رہنا اپنے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔

دوستو! زندگی کی ان آخری ساعتوں میں مجھے ایک گیت کا مصرعہ بار بار یاد آ رہا ہے "What's It all About, alfie" "بھئی، یہ سب کیا ہے" میں نہیں جانتا میں نے زندگی میں

جو کچھ کیا اس کی کیا اہمیت ہے، دنیا کے تخلیقی مواد میں میرے کالموں کی کیا حیثیت ہوگی لیکن اس کے

باوجود مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے میں نے زندگی میں جو تخلیق کیا وہ کم از کم تین ماہ تک ضرور محفوظ

رہے گا، اگر نہ مجھے کم از کم تین ماہ ضرور یاد آئیں گے۔ آپ کے زندگی میں یہ شعر باہر آتا

ہوگا "اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بڑے مقصد کیلئے زمین پر بھیجا تھا، میں یہ سمجھتا ہوں ہمارا یہ خیال ہماری

انسانی تسکین کا بہانہ ہے۔ ہم اور ہمارا کام سب کچھ فضول ہے لیکن اس کے باوجود مجھے نہ جانے

کیوں یہ محسوس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی خاص کام کیلئے دنیا میں بھیجا تھا، مجھے معلوم ہے میرا

یہ آخری کالم بھی خوراک کے کسی ڈبے پر پینٹ دیا جائے گا یا لوگ اسے THANKS

GIVING DAY کے موقع پر ایک دوسرے کو شکریں گے اور اس کے بعد مجھے اور میرے

کالم دونوں کو فراموش کر دیں گے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں میں کسی خاص کام کیلئے

دنیا میں آیا تھا۔

میں آج جب آپ سے رخصت ہو رہا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں آپ سے

What's it all about alfie کہوں اور آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو

جاؤں۔"

یہ بظاہر ایک سٹی اور عامیانه سا کالم لگتا ہے، آپ کو اس میں سوائے آرٹ بک والد

کے آخری کالم کے کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ کالموں کی تاریخ کی انتہائی

شاعر اور نا کاٹل فراموشی تحریر ہے۔ یہ ہماز کے چھلکے کی طرح تہہ در تہہ کھلے والا کالم ہے آپ اس کالم کا پس منظر ملاحظہ کیجئے یہ کالم ایک ایسے کالم نگار نے تحریر کیا ہے جو نہ صرف صوت کے دروازے پر بیٹھا تھا بلکہ وہ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے صوت کی چاب سن رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اس کالم میں اپنی روایت اور اپنے آرٹ کو محروم نہیں ہونے دیا آرٹ بک والڈ نے پوری زندگی طنزیہ کالم لکھا تھا اس کالم میں بھی طنز کے تمام رنگ موجود ہیں آرٹ بک والڈ نے ہمیشہ مختصر کالم لکھا تھا یہ کالم بھی اس کے دیگر کالموں کی طرح مختصر ہے وہ زندگی بھر مایوسی سے دو رہا اس کا یہ کالم بھی مایوسی سے پاک ہے اور اس کے تمام کالم اچانک ختم ہو جاتے تھے اس کا یہ کالم بھی کسی منطقی نتیجے پر پہنچے بغیر اچانک ختم ہو گیا لہذا آرٹ بک والڈ کی یہ آخری تحریر دنیا کے دوسرے لکھاریوں کی آخری تحریروں سے یکسر مختلف ہے دنیا کے تمام مزاح نگار آخری تحریروں میں سنجیدہ ہو گئے تھے اور دنیا کے تمام مختصر نویس آخری وقت میں طوالت کا شکار ہو گئے تھے لیکن آرٹ بک والڈ شاید دنیا کا واحد لکھاری تھا جس کی پہلی اور آخری تحریر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس کے قلم نے آخری وقت تک طوالت اور سنجیدگی کو قریب نہیں سمجھنے دیا اور جس نے اپنے آخری کالم کو مصیبت نہیں پہنچا۔

Kashif Azad@OnlineLibrary.com



شہباز شریف کی کہانی

میں دو مارچ 2007ء کو لندن پہنچا تھا اور تین مارچ کو میری میاں شہباز شریف سے

پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں 1999ء تک نواز شریف خاندان کا مخالف رہا تھا۔ اس مخالفت کی وجوہات میں بعض صحافیوں سے لے کر لاکھوں لوگوں نے وہ بات اور خواہے بھی مثال سے جنموں سے نواز

شریف کو گھبر دکھا تھا اور جن کے بارے میں میرا خیال تھا یہ انسانی شکل میں فصلی بیڑے ہیں جس دن فصل کٹے گی۔ اسی دن دوسرے کھیت میں جا بیٹھیں گے۔ 12 اکتوبر کے بعد بھی ہوا نواز شریف کے سارے بیڑے از گئے اور انہوں نے دوسرے کھیت اجاڑنے شروع کر دیئے۔ نواز شریف کے پروردہ صحافی ان کے خلاف لکھنے لگے۔ نواز شریف کے قریبی ساتھی ان کی پارٹی کو ٹھگ گئے اور نواز شریف کے ذاتی دوست اسٹیٹسٹ کے بھرہن گئے اور ان کے پاس صرف چودھری نثار مسد رفق جاوید ہاشمی، تمبند، دولتان اور احسن اقبال رہ گئے جبکہ ساتھیوں میں صرف عطاء الحق قاسمی نے کیریکٹر کا مظاہرہ کیا وہ آج تک نواز شریف کے لئے اکیلے لڑ رہے ہیں۔ 2000ء کے بعد میں نے نواز شریف خاندان کا مطالعہ شروع کیا تو 2006ء تک میرے دل میں ان کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک وہ نواز شریف تھے، مجھے اس عرصے میں نواز شریف بے گناہ دکھائی دینے لگے تھے، مجھے محسوس ہوا نواز شریف سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی، انہیں جلا وطنی قبول نہیں کرنی چاہیے تھی، انہیں ہتار کے ساتھ جیل کا نانا چاہیے تھی، دوسری وجہ میاں

شہباز شریف تھے '1999ء کے بعد میں پنجاب کے جس بیورو کریٹ سے ملا میری جس سیاستدان برٹس میں اور دانشور سے ملاقات ہوئی اس نے میاں شہباز شریف کے اخلاص انتہائی صلاحیتوں اور ایمانداری کی تعریف کی 'میاں شہباز شریف نے اذہائی برسوں میں پنجاب میں عکرائی کا ایک ایسا معیار قائم کروا تھا جس نے آنے والے دنوں میں تاریخی حیثیت اختیار کر لی ' آج یہ عالم ہے جنرل خالد مقبول ہوں یا چودھری پرویز الہا پنجاب کے تمام عکرائی نفسیاتی طور پر میاں شہباز شریف کا مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں 'میں مجھے جنرل ریٹائرڈ محمد صفدر حسین کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے 'جنرل محمد صفدر 1999ء کے بعد پنجاب کے گورنر بنے تھے 'انہوں نے ایک بار مشہور بیورو کریٹ ناصر کھوسہ سے کہا تھا "میں پنجاب کے جس اچھے منصوبے کو ہاتھ لگا تا ہوں معلوم ہوتا ہے وہ شہباز شریف نے شروع کیا تھا 'یاد یہ شہباز شریف انسان تھا یا جن 'میں پچھلے سات برس سے شہباز شریف کے ساتھ کام کرنے والے بیورو کریٹس سے ملتا آ رہا ہوں 'ان میں ڈاکٹر توقیر شاہ 'ڈاکٹر امجد ثاقب اور شہباز شریف کے سیکرٹری جاوید محمود بھی شامل ہیں 'میں اس دوران میاں صاحب کے ساتھ تھوڑے عرصے کیلئے کام کرنے والے انسروں سے بھی ملا اور ان سے شہباز شریف کے بارے میں پوچھا 'ان برصا میں ایک شخص کے خواگسا سے شہباز شریف کے خلاف بات نہیں کی 'شہباز شریف کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ان کی انتہائی صلاحیتوں کی تعریف کی 'یہاں تک کہ فوجی انٹیلیجنٹ میں بھی شہباز شریف کے لئے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہ وہ ساری باتیں اور پس منظر تھا جس کی وجہ سے میں نے لندن پہنچنے ہی میاں شہباز شریف کو فون کیا اور دوسرے دن ہماری ملاقات طے ہو گئی۔

ہم پارک لین کے ایک ریسٹوران میں بیٹھ گئے 'میاں شہباز شریف صحت مند اور فریش لگ رہے تھے 'شہباز شریف نے اپنے خاندانی پس منظر سے بات شروع کی 'ان کا کہنا تھا "ہمارے دادا صرف پانچ انکرز میں کے مالک تھے 'میرے والد نے 1930ء میں اپنے خاندان کی عمان سنبھالی تھی 'ہم نے پوری دنیا میں کسی شخص کو اپنے والد سے زیادہ محنتی مخلص اچھا ایڈمنسٹریٹور سا دیکھا نہیں 'کیسا 'انہوں نے 1930ء میں لوہا پھلانے کی سٹیبل بسلی لگائی اور اس کے بعد وہ زندگی بھر کام کرتے رہے 'ہم نے انہیں کبھی آرام کرتے ہوئے یا نارغ بیٹھے نہیں دیکھا 'جدہ کی سٹیبل ان کا آخری پراجیکٹ تھا اور اس وقت شدید ملیل تھے لیکن وہ اس کے باوجود مل چیمبر پر سامیت پر جاتے تھے اور اپنی نگرانی میں سٹیبل کا کام کر داتے تھے 'وہ ذاتی زندگی میں انتہائی سادہ تھے 'ان

کے پاس صرف اوسوت ہوتے تھے لیکن وہ انہیں ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے تھے انہوں نے پوری زندگی تبدیلی کا زری استعمال کی اور وہ وقت کے انتہائی پابند تھے ہم تین بھائیوں نے اپنے بزرگوں کے برعکس خوشحالی میں آگے کھینچی تھی ہم لوگ ہائے پر سکول جاتے تھے ہم پورے سکول میں واحد بچے تھے جن کے پاس ذاتی تاکہ ہوتا تھا ہم جوانی میں شبیر اودوں کی طرح زندگی گزارا تھا ہم نے باہر سے انتہائی مہنگی اور خوبصورت گاڑی منگوائی تھی پورے ملک میں اس جیسی دوسری گاڑی نہیں تھی ہم ٹیکسری جاتا تھا اور ٹیکسری میں اس طرح کام کرتا تھا جس طرح بزنس میں اور مل اور کیا کرتے ہیں لیکن پھر ایک واقعہ پیش آیا اور میری زندگی کا رخ بدل گیا "دور کے اور انہوں نے تیرے کی پیالی منہ سے لگائی دو ذرا دیر بعد بولے "میں نے 1985ء میں نواز شریف کی الیکشن میں شروٹ کی " میں اچھو کی تنگ و تاریک گلیوں میں جاتا تھا اور لوگوں کو نواز شریف کی تصویر دکھا کر دوست مانتا تھا نواز شریف یہ الیکشن جیت گئے اور اس کے بعد وزارت میں معروف ہو گئے اس دوران حلقے کے لوگوں نے میرے پاس آنا شروع کر دیا حلقے کے لوگوں کا کہنا تھا ہم نے آپ کے کہنے پر نواز شریف کو روٹ دے تھے وہ ہمیں ملے نہیں ہیں لہذا اب ہمارا مسئلہ آپ حل کریں" حلقے شروع ہونے کے لوگوں کو ملنے میں اور حلقے کے لوگوں کو ملنے میں دو دو کھانے اپنے کا اور اس کے بعد سارا دن اور پھر میں نے اپنے دو دن حلقے کے لوگوں کیلئے وقف کر دیے ہم بھلی تین منٹوں سے رمضان میں ضرورت مندوں میں آنا بھی اور دالیں تقسیم کرتے آ رہے ہیں اس سال میں نے حلقے کے لوگوں کو مار گستاخ کیا اور میں اور خواجہ ریاض حق داروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ایک شام ہم نسبت روز کی ایک گلی میں داخل ہوئے اور ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے یہ ایک کمرے کا انتہائی خستہ حال مکان تھا، اندر ایک بوڑھی مائی دال صاف کر رہی تھی، چار پائی پر ایک نوجوان لڑکی لیٹی تھی، لڑکی کو بی بی تھی اور فرش پر اس لڑکی کا تھوکا ہوا خون پڑا تھا دوسری بھی اس کمرے کے ایک کونے میں اپنے بچے بول و براز میں لتھڑی پڑی تھی، کمرے کے اندر اندر حیر اور بو تھی، مجھے مائی نے بتایا وہ لوگ اس کمرے میں رہتے ہیں، لکھنا بھی اسی میں پکاتے ہیں، منہاتے بھی اسی میں ہیں اور اسی کمرے کے ایک کونے کو دالاش روم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں، ان لوگوں کی حالت دیکھی کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں باہر آیا اور مجھے اپنے کپڑوں، اپنے جوتوں اور اپنے انٹس سٹائل سے نفرت: ہونے لگی، میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا مجرم سمجھنے لگا، میں نے اس دن اپنی گاڑی واہس کی، اپنے سارے سوت، سارے جوتے لوگوں میں تقسیم کیے اور اپنے آپ کو

لوگوں کیلئے وقف کر دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے کبھی بڑی گاڑی استعمال نہیں کی، میں نے بیٹھ چھوٹی گاڑی میں سفر کیا اور صرف ضرورت کے دو جوڑے کپڑے بنائے، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا میں جب تک ان جیسے لوگوں کو ایک پر وقار زندگی نہیں دوں گا میں جین سے نہیں بنوں گا۔ میں اپنے ملک کو تبدیل کئے بغیر، دنیا سے نہیں جاؤں گا میں اللہ تعالیٰ سے روز دہا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمت اور موقع دے اور میں ان لوگوں کیلئے دو سب کچھ کروں گا جس کیلئے یہ لوگ ترس رہے ہیں۔

میں نے پوچھا "آپ نے چیف منسٹر کی حیثیت سے پہلے دن کیا کیا" وہ مسکرائے "میں سب سے پہلے اپنے والد کے پاس گیا اور میرے والد نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی دلچسپ نصیحت کی، انہوں نے فرمایا "اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تم پنجاب کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اتفاق کر رہے کے ساتھ کرتے تھے" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" وہ بولے "یاد کرو تم اتفاق ناؤ ندی کیلئے راتوں کو جاتے تھے تم نے اس کہنی کیلئے پوری دنیا سے بہترین مشینری خریدی تم نے اس کیلئے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کی تھی، تم نے ٹیکسٹائل کے لیے بہترین ڈیزائنرز کو بلاؤ، تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور بہترین وقت ٹیکسٹائل کو دیا تھا اور تم سال کے آخر میں یہ دیکھا کرتے تھے تم نے اس سال کیا کھویا اور کیا پایا لہذا آج اتفاق کا شمار پاکستان کے بڑے گروپوں میں ہوتا ہے میری نصیحت ہے اگر تم اس محنت، لگن اور اظہار کے ساتھ پنجاب کیلئے کام کرو گے تو تم یہاں بھی وہی نتائج حاصل کرو گے، تم پاکستان کی تاریخ کے سب سے اچھے چیف منسٹر ثابت ہو گے"



شہباز شریف سے دوسری ملاقات

میاں شہباز شریف کے ساتھ میری دوسری ملاقات سات مارچ کو انجیو رورڈ کے ایک
 ایٹارنی ریستوران میں ہوئی۔ لیسانس صاحب نے مجھے دوسری دعوت دی تھی، اس موقع کے دوران دو
 ساڑھے تین گھنٹے بولتے رہے تھے اور میں بڑے غور سے ان کی بات سنتا رہتا تھا۔ مجھے ان کے بچے
 میں سچائی اور خلوص دکھائی دے رہا تھا، ان کا کہنا تھا "ہمارا چار نقابلی ایجنڈا تھا، اخلاص، سیرت،
 بھرپور مانیٹرنگ اور عام شہری کو فائدہ پہنچانا، ہم نے پورے پاکستان سے جن جن کراہیاں اڑا دی ہیں
 اور قلمی افسروں کو اہم عہدوں پر تعینات کیا، ان افسروں کی مانیٹرنگ کیلئے ایک فول پروف سسٹم
 بنایا اور پھر ایسی پالیسیاں بنانا شروع کیں، جن سے عام شہریوں کو فائدہ ہو سکتا تھا، میرا ایمان ہے
 سمجھوتے اور کرپشن کا آغاز ہمیشہ بالائی سطح سے ہوتا ہے اگر چیف منسٹر کرپٹ ہو گا تو دوسرے سے
 کبھی کرپشن ختم نہیں کر سکے گا، میں نے سب سے پہلے خود کو قلمی وقت کا پابند، سیرٹ پر کاربند اور
 غیر جانبدار ثابت کیا، آپ یقین کیجئے سارا سرکاری نظام ٹھیک ہو گیا، میرے ازحالی برسوں میں
 میرے بچے چیف منسٹر ہاؤس نہیں آئے، ایک بار حزرہ کو ایمر جنسی میں وہاں آنا پڑا تھا لیکن میں نے
 اسے اسی وقت باہر نکال دیا، اس کے بعد اس نے کبھی دہاں قدم نہیں رکھا، میری گاڑی ہمیشہ سیکورٹی پر
 مبنی تھی، میں نے کسی دو سے راہداریاں استعمال نہیں کیں، میرے خاندان کے کسی فرد نے ان
 ازحالی برسوں میں کوئی سرکاری گاڑی نہیں لی، ہمارے دور میں پورے پنجاب میں کوئی نئی گاڑی

میں خریدی گئی مائیزنگ کا یہ عالم تھا میرے بیٹے سلیمان نے میٹرز کا استعان دینا تھا ہم نے ان دنوں بوٹی باغی کے خلاف آپریشن شروع کر رکھا تھا' میں نے لاہور کے ذہنی کشنر کو ہدایت کی وہ تاشی کا سلسلہ میرے بیٹے سے شروع کرے' سلیمان کی تاشی ہوئی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ناراض ہو گیا لیکن میں نے پردہ نہ کی' میٹرز میں سلیمان کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی' میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ابو میں نقل کے بغیر پاس ہو جاؤں' ہم میرٹ میں اتنے سخت تھے کہ وزیر اعظم نواز شریف کی ہوم میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹ تھی میرے اوپر اس کی مائیزنگ کیلئے دباؤ آیا لیکن میں نے انکار کر دیا میرے پورے دور میں اس کی مائیزنگ نہیں ہوئی' ہم نے لاہور اور اولڈنڈی کی پبلک ٹرانسپورٹ کیلئے ٹینڈر مانگے' دونوں شہروں کے ٹینڈر ہمارے سیاسی مخالفین نے جیتے' لاہور کا فیکہ نیو خان کو ملا اور اولڈنڈی کیلئے جنرل حیدر گل کی بیٹی عظمیٰ گل نے کو ایفائی کیا' ہماری پارٹی نے اعتراض کیا لیکن میں نے میرٹ کے اصول کو مجروح نہ ہونے دیا' ہم نے لاہور شہر سے تجاویزات ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو سب سے پہلے اپنی پارٹی اور اپنے

خانہ بان کی تجاویزات صاف کیے' جنرل حیدر گل کو قریبی رشتہ دار کا چہرہ دل بہت تھا' ہم نے اپنی کمرالی میں یہ پب کرایا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سفارش کے بغیر نوجوانوں کو پولیس میں نوکری ملی تھی' مجھے معلوم ہوا عبدالستار لالیکا مرحوم نے اپنے عزیز کے ذریعے ایک امیدوار کو قہ کی حد میں رعایت دلائی تھی' میں نے نہ صرف مہرتی ہونے والے نوجوان کو فارغ کر دیا بلکہ لالیکا صاحب کے اس عزیز کو بھی سوہ بدر کر دیا' عبدالستار لالیکا اس وجہ سے آخری وقت تک میرے ساتھ تاریخ رائے رہے' جب یوردرکسی نے دیکھا میرے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں تو اس نے بھی اپنا قبلہ درست کر لیا چنانچہ ہم نے اڑھائی سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی دور میں نہیں ہو سکا' میری کامیابی کی دوسری وجہ فالو اپ تھا' میں رات کو اٹھ کر کسی سامیٹ پر چلا جاتا تھا اور کام کی کوائٹی اور رفتار کا خود جائزہ لیتا تھا' شروع شروع میں انفرادی نے اسے میرا اتنی ایال سمجھا لیکن جب یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے' میں فجر کی نماز کے بعد کام شروع کرتا تھا اور رات دو بجے تک دفتر میں رہتا تھا' میں سمجھتا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں نے اس وقت میں وہ سب چھ کرنا ہے جو پہلے نہیں ہو سکا

میں نے پوچھا "آپ نے پنجاب کا سیاسی پلجر بدلنے کی کوشش بھی کی" وہ ذرا دیر کے اور آہستہ آہستہ بولے "ہم نے سیاست سے چالپوسی اور خوشامد ختم کرنے کی کوشش کی تھی' ہم

رمضان کے دوران آنا سستا کر دیتے تھے، ایک رمضان میں ہم نے آٹھ سات روپے سے پانچ روپے نکل کر دیا، میں دورے پر تھا، میں دایس آیا تو میں نے اپنے دفتر کے راستے میں کابل ٹی آٹا اور لاہور کے میٹرز حسان کی طرف سے ایک خیر مقدمی بیسز دیکھا، اس بیسز پر لکھا تھا ہم آٹا سستا کرنے پر وزیر اعلیٰ پنجاب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، میں نے گاڑی روکوائی، نیچے اترا اور اپنی عمرانی میں یہ بیسز اترا دیا اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا اگر آٹا سستا نہ ہو تو ہم اس قسم کا کوئی بیسز لگا تو تم لوگوں کی خیر نہیں، میں جب تک چیف منسٹر ہالاہور میں کسی کو دوبارہ ایسا بیسز لگانے کی جرأت نہ دے، میں نے اڑھائی سال میں کسی ایم این اے یا ایم پی اے کا کوئی ٹیٹا کام کیا اور نہ ہی ہونے دیا، میں پاریٹی کے کسی ایڈر کو چند منٹوں سے زیادہ اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا، ہم نے پیٹھک اور گپ شپ کا کچھ شرم کر دیا تھا، ہم صرف اور صرف کام پر توجہ دیتے تھے، ہم نے سرکاری خزانے کا فیسر سرکاری استعمال بھی بند کر دیا، میں نے اڑھائی برسوں میں اپنے تمام اخراجات اپنی جیب سے کئے تھے، میں نے اڑھائی سال میں چیف منسٹر ہاؤس کا تالین تک نہیں بدلے دیا تھا، وہ خاصا شرم ہو گئے، میں نے

عرض کیا، فوج کو خیر بھی باقی اسات میں کھینٹنے کی غلطی نہیں آتی، یہی سب کی قسمی، وہ بڑا باؤلر کے اور

ہاں میں سر ہلا کر بولے، یہ درست ہے، ہم نے گھوسٹ سکولوں کے لئے فوج کو استعمال کیا تھا اور اس کے بعد فوج کے لئے راستہ کھل گیا تھا، میں نے گھوسٹ سکولوں کا پاسک شروع میں پنجاب کے وزیر تعلیم چودھری اقبال کو دیا تھا، چودھری صاحب ہمارے پرانے ساتھی اور بھیلے انسان تھے، وہ ہمیں چھوڑ گئے لیکن میں آج بھی ان کا احترام کرتا ہوں، چودھری صاحب نے دو بار تک کوشش کی لیکن ناکام ہو گئے، اس کے بعد میں نے جنرل جہانگیر کرامت سے مدد مانگی، جنرل جہانگیر کرامت انتہائی شاعر اور سلیبھے ہوئے انسان تھے، انہوں نے میرے اصرار پر یہ ذمہ داری اٹھائی، میں اس کے زمانے میں فوج کے سول استعمال کا حامی ہوں، امریکا کا سادارو ڈیٹ ورک فوج نے بنا با تھا، چنانچہ اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے گھوسٹ سکولوں کے بعد سڑکوں کی تعمیر اور واپڈا کا کام بھی فوج کو دے دیا لیکن یہ ہماری غلطی تھی اور اس کا ہم نے بعد ازاں نقصان اٹھایا، میں نے پوچھا، آپ پنجاب کو کئی شناخت دینا چاہتے تھے، وہ مسکرائے، ہاں، میں پنجاب کو پسماندگی جہات اور یکادنا سے اراڈرنا چاہتا تھا، 16 ستمبر 1999ء کو جب ہماری حکومت ختم ہوئی تو اس وقت کراچی پورٹ پر ہماری بسوں کی کبلی کھپ اتری تھی، یہ بیس ہم نے لاہور میں چلائی تھیں اور ہمارا منصوبہ تھا کبلی بس میں چیف منسٹر کا بیس کے اراکان آئی جی اور چیف سیکرٹری سڑکیں اور اس

کے بعد روز کوئی نہ کوئی دزیر کسی بس کے ذریعے دفتر جائے گا ان سے لاہور کی فرانسپورٹ کا سارا نقشہ بدل جاتا 'فرانسپورٹ کا یہ سسٹم ہم نے پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں بھی شروع کرنا تھا' میں نے ایک ایسے پنجاب کا خواب دیکھا تھا جس میں 'امن و امان ہوتا' 'انصاف ہوتا' 'میرٹ ہوتا' 'تعلیم اور صحت ہوتی' اور جس میں خوشحالی ہوتی 'ہم نے اڑھائی برسوں میں ان سب چیزوں کی بنیاد رکھی تھی اگر مجھے مزید اڑھائی سال مل جاتے تو آج پنجاب ایسا پنجاب نہ ہوتا"

وہ رے کے 'ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' انہوں نے نشو سے آنکھیں صاف کیں اور روندی ہوئی آواز میں بولے 'میں جب تک ایک ریس زراہہ' ایک بزنس مین اور دنیا دار قسم کا صنعت کار تھا اس وقت تک سسٹم نے مجھے قبول کئے رکھا لیکن جس دن میں بدل گیا جس دن میں نے اپنی ساری صلاحیتیں عام شہری کے لئے وقف کر دیں اس دن اس سسٹم نے مجھے اٹھا کر سمندر پار پینک دیا "وہ رے کے اور دوبارہ بولے "لیکن آپ لکھ لیں 'میں واپس آؤں گا اور ملک کو ایک آئیڈیل شکل دینے کے سارے خواب پورے کروں گا اللہ نے چاہا تو میں اپنا رول ادا کئے بغیر دنیا

سے نکل جاؤں گا یہ میرا ایمان ہے اور ایمان ہی ہے

Kashif Azad@OneOrdu.com



ایک صد روہ بھی تھا

سر دار محمد چودھری مرحوم پنجاب کے سابق آئی جی تھے پنجاب کے موجودہ آئی جی چودھری احمد نسیم اور چوہدری صاحب مرحوم میں دو ہاتھیں قدر و منزلت ہیں دونوں کا تعلق ایک ہی گھرانے سے ہے اور دونوں انتہائی سیلف میڈ انتہائی پروفیشنل اور ٹیک ڈاٹ افسر ہیں میرا دونوں کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رہا چوہدری سردار کے ساتھ میری سنوڈنٹ لائف میں ملاقاتیں شروع ہوئیں اور یہ ملاقاتیں ان کے انتقال تک جاری رہیں جبکہ چودھری احمد نسیم کے ساتھ پہلی ملاقات 1996ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے سردار محمد چودھری نے ریٹائرمنٹ کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا انہوں نے چند برسوں میں پانچ چھ انتہائی معیاری کتابیں لکھیں یہ کتابیں جہاں ادبی لحاظ سے شاندار ہیں وہاں یہ پاکستان کی تاریخ بھی ہیں میں پچھلے چند دنوں سے چودھری صاحب کی سوانح عمری پڑھ رہا ہوں یہ ایک چشم کشا کتاب ہے اس کتاب کے ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ درج ہے جو پڑھنے والے کو اندر سے بلا دیتا ہے میں جب اس کتاب کے مشرقی پاکستان کے باب پر پہنچا تو چوہدری صاحب کے انکشافات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے افسردگی میں کتاب بند کر دی۔

چوہدری صاحب 1971ء میں جے ٹی کے ایس بی تھے صدر رنجی خان اور ایوان صدر کی سیکرٹری ان کی ذمہ داری تھی وہ صدر کے مسلح محافظوں کے انچارج بھی تھے لہذا انہیں صدر

اور ایوان صدر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، انہوں نے اپنی آبِ ہتی کے صفحہ 127 پر لکھا "پولیس کے سپاہی ان دنوں ایوان صدر کو نگر خانہ جی ایچ کیو کو ڈنگر خانہ اور اپنی پولیس لائنوں کو نگر خانہ کہتے تھے" چودھری صاحب کا فرمانا تھا "صدر پر سارے درجے کا شرابی اور عورتوں کا رسیا تھا، اس کا سکیورٹی انچارج کر ل، ہم جنس پرست تھا، ایوان صدر میں دلال اور طوائفیں تھیں اور ان میں سے بعض کو انتہائی اہم مرتبہ حاصل تھا، ان میں اعلیٰ مرتبہ رانی، مسز کے این حسین اور یحییٰ مظفر سرفہرست تھیں، یہ خواتین سارا دن جمبا کو نوشی، شراب نوشی اور تاپنے کو اپنے میں مصروف رہتی تھیں، پاکستان ٹونے کے بعد چودھری سردار کو اعلیٰ مرتبہ عرف جنرل رانی کے خلاف تفتیش کا موقع ملا، انہوں نے 23 روز تک اس سے پوچھ گچھ کی، اس تفتیش کے دوران بڑے ہوش رہا انکشافات ہوئے مثلاً چودھری سردار نے اپنی آبِ ہتی کے صفحہ 128 پر تحریر کیا "مجھے جنرل رانی نے بتایا، میجر جنرل خداداد لاہور کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے، جنرل رانی اور میجر جنرل خداداد نے دولت بیع کرنے کا منصوبہ بنایا، ان دنوں رشتی سہگل، سہگل گروپ آف انڈسٹریز کے سربراہ تھے، ان دنوں نے اپنے ایک سوانح نگار کے نام سے لکھی کہ رانی سے علیحدگی میں بلا کر اسے 10 لاکھ روپے اور ایک نئی ٹیوٹا کار پیش کی، سہگل کے روانہ ہوتے ہی جنرل خداداد کمرے میں داخل ہوا، اس نے کار رانی کو دے دی اور رقم خود لے کر چپیت ہو گیا، جنرل رانی نے چودھری سردار کو بتایا، رشتی سہگل بہت خوبصورت تھا اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی مگر سہگل نے اسے مثبت جواب نہ دیا، اس انکار کی اس بے چارے کو بڑی دلچسپ سزا جھنڈا پڑی، ایک دن گورنر ہاؤس پشاور میں پارٹی تھی وہاں جنرل رانی نے یحییٰ خان سے شکایت کی "آ عالمی رشتی سہگل میرے نال محبت نہیں کر دیا، یحییٰ خان نے گورنر ہاؤس کے نگران کو طلب کیا اور اس سے پوچھا، جب ملکہ اثر جتہ یہاں آئی تھی تو وہ کس کمرے میں سوئی تھی؟ نگران نے کمرے کی نشاندہی کر دی، جنرل یحییٰ نے رشتی سہگل کو حکم دیا "آج رات تم مارشل لاء حکم کے تحت اسی کمرے میں سوؤ گے، رشتی اس حکم کی تعمیل سے انکار کی جرات نہ کرے گا، اس کے بعد یحییٰ خان رانی سے مخاطب ہوئے "سوئی تم اس کے پیچھے جاؤ۔ خدا حافظ" رانی رشتی کے پیچھے روانہ ہو گئی، دونوں کے داخل ہوتے ہی کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا" (صفحہ 129) رانی نے پوچھ گچھ کے دوران ایک اور واقعہ بھی سنایا، اس نے بتایا شاہ ایران پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے، انہوں نے کراچی سے واپس روانہ ہوتا تھا، جنرل یحییٰ نے انہیں الوداع کہا تھا، شاہ کے جانے کا وقت ہو گیا لیکن جنرل یحییٰ ابھی تک خواب

گاؤ سے نہیں نکلے تھے شاہ لیت ہونا شروع ہو گئے مگر کسی کو صدر کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرات نہیں تھی اس کڑے وقت میں جنرل رانی کام آئی 'صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے رانی سے درخواست کی تم اندر جاؤ اور صدر کو باہر لاؤ' وہ اندر گئی اس روز ملک کی ایک مشہور ترین گلوکارہ صدر کی خواب گاہ میں تھی اندر کا منظر اس قدر کرہت انگیز تھا کہ رانی تک کی طبیعت خراب ہو گئی اس نے بڑی مشکل سے صدر کو باہر آنے کے قائل بنایا۔

چودھری صاحب کا کہنا تھا رانی نے جرنیلوں، سیاستدانوں اور سینئر افسروں کے ساتھ میل ملاپ کے نتیجے میں بے پناہ دولت اکٹھی کر لی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہجرات کے ایک مشہور سیاستدان نے اسے چھ ہزار روپے ماہوار الاؤنس دینا شروع کر دیا تھا۔ چودھری صاحب نے انکشاف کیا جب جنرل رانی کے چانات کی روشنی میں جنرل یحییٰ سے جواب مانگا گیا تو انہوں نے جواب دیا "میں اس خاندان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے والد العاقا

معاذ علی کی بطور ایس بی ہجرات میں پوشنگ ہوئی تھی یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے رانی میری

میں کی ملٹری بیٹے چودھری صاحب نے انکشاف کیا جنرل یحییٰ ہجرات میں پہلے سے موجود تھے۔

سے کسی ایک کو ساتھ لے کر اوپینڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کے لئے نکل جاتا تھا۔

ان سڑکوں پر سیکورٹی کے افراد پہلے سے متعین کر دیے جاتے تھے۔ بعض اوقات صدر اپنی کار میں

جس کی چمٹ نہیں تھی سیدھا کھڑا ہو جاتا اور محافظ دستے کے سامنے اپنی داشت کے ساتھ چھینر

خانیاں کرنے لگتا۔ مسلح محافظوں کو ایک مسلم ریاست کے سربراہ کی ایسی حرکتوں پر زبردست غصہ

آتا تھا میں نے سیکورٹی کے اس مسئلہ کا ذکر اپنے پاس ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم سے کیا تو وہ صدر

کے خلاف باتیں کرنے پر ناراض ہو گئے ان کا کہنا تھا "صدر کو سٹین جسم کے مسائل کا سامنا ہے

انہیں اس کے بعد آرام اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔" چودھری صاحب نے تحریر کیا یحییٰ خان

کے پاس ہمیشہ عشرت کے لئے بہت سی داشتائیں اور کئی ٹھکانے تھے۔ دو جہاں کہیں بھی جاتا اس

کی حفاظت کرنا ہمارا فرض تھا۔ ایک شام دو سز کے امین حسین کے گھر گیا یہ خاتون عرفہ عام میں

"بلیک بیٹی" کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے شوہر مشرقی پاکستان پولیس اکیڈمی میں ہمارے

پرنسپل رہ چکے تھے اور ان دنوں پینل پولیس اکیڈمی کے آئی جی تھے۔ صدر نے تین دن اور تین

راتیں وہاں گزاریں اور اس دوران کوئی بھی ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ چوتھے روز وہ سز حسین کو

سٹیٹ گیٹ ہاؤس لے گیا جہاں اسے اندرونی آرائش کرنے والی کے طور پر مستقل ملازم رکھا گیا

زیر پوائنٹ 3.....0.....83

گیا اور اس کے شوہر کو سوتزر لینڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔ بیچنی خان کے مستغلی ہونے پر مسز حسین نیٹ گیسٹ ہاؤس سے اعلام آباد منتقل ہو گئی اور اپنے بہنوئی کمال حسین کے ساتھ رہنے لگی کمال حسین وزارت خارجہ میں افسر تھا۔ بیچنی خان کی معطلی کے بعد میں اس خاتون کو انٹر پورٹ چھوڑنے گیا۔ راستہ میں میں نے اس سے پوچھ لیا فلاں موقع پر بیچنی خان مسلسل تین دن اور تین راتیں تہار سے پاس کیوں ٹھہرا تھا؟ اس نے جواب دیا وہ صدر کو بنگالی میوزک سکھاری تھی۔

یہاں پہنچ کر میرا پیمانہ لبریز ہو گیا میں نے کتاب بند کی اور سوچا کیا 1971ء اور 2006ء میں صرف سن کا فرق نہیں کیا ہم آج بھی بیچنی خان کے دور سے نہیں گزر رہے ہیں۔ پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں تھا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

عبرت ناک انجام

سردار محمد چودھری نے اپنی کتاب میں یحییٰ خان کے خلاف ہونے والے الزامات پر بھی
 "پاپولیرٹی" کے خطا میں جھکا تھا "اس کا خیال تھا" عوام اسے بے انتہا پسند کرتے ہیں" وہ اقتدار
 سے فراغت کے بعد اس غلط فہمی کا شکار تھا لوگ اس کی محبت میں سڑکوں پر آجائیں گے اور موجودہ
 حکمران اسے ایک بار پھر تخت پر بٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے اس کا خیال تھا اس کا دور پاکستان کی
 تاریخ کا سنہرہ ترین دور تھا اور تاریخ کبھی اس کے کارنامے نہیں بھلا پائے گی" چودھری صاحب
 نے یحییٰ خان کی اس غلط فہمی کے بارے میں بڑا عبرت ناک واقعہ بیان کیا۔

"یحییٰ خان کو کیشن کے سامنے پیش کرنے کی فرض سے لانے اور لے جانے کے لئے
 مجھے دو کاریں اور ایک نیلی کا پٹر دیا گیا تھا۔ ہم اسے صبح سویرے نئی بنگلہ (کھاریاں) سے بذریعہ
 نیلی کا پٹر پنڈی لاتے تھے اور شام کو واپس لے جاتے تھے۔ آخری دن اس نے نیلی کا پٹر میں سفر
 کرنے سے انکار کر دیا اور وہ بذریعہ سڑک جانے پر اصرار کرنے لگا۔ مجھے نہ تو ایسا کرنے کا اختیار
 تھا اور نہ ہی میں اس کے لئے تیار تھا کیونکہ ایسا کرنے میں سکیورٹی کا زبردست خطرہ تھا لیکن وہ
 سہارہ ریست ہاؤس کی سیرھیوں پر بیٹھ گیا اور اسے بٹھے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے نیلی کا پٹر
 میں جبراً سوار کرانے سے گریز کیا اور اسے سمجھانے لگا کہ قابل اعتماد رپورٹس سکیورٹی اور حفاظتی

دست و غیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں ہیں لہذا ایلی کا پتہ پر ہی چلے جائیں مگر اس نے ایک نہ سنی اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ شور سن کر چیف جسٹس اور کمیشن کے دیگر ارکان باہر آ گئے۔ چیف جسٹس نے یحییٰ خان کے ساتھ طویل بحث کے بعد مجھے حکم دیا اسے سرک کے راستے کھاریاں لے جاؤ۔ میں عدالت کا حکم بجالانے پر مجبور تھا میں اسے کار میں لے کر نکل کھڑا ہوا یحییٰ خان راستے میں کہنے لگا۔ "مجھے راولپنڈی لے چلو"۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" اس نے جواب دیا "میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں"۔ اس کا لہجہ قطعی تھا "یہ ناممکن ہے" میں نے دو لوگ الفاظ میں کہا۔ "کیوں؟" اس نے بڑے تند لہجے میں سوال کیا۔ یحییٰ خان کا رد عمل ایسے شخص کا تھا جس نے زندگی میں کبھی حرف انکار نہ سنا ہو۔ اس لئے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا تو وہ آپ کی تکابوئی کر دیں گے"۔ "لوگ میرے خلاف کیوں ہوں گے؟" اس نے پوچھا "شرقی پاکستان میں شکست اور سقوط ڈھاکہ کے باعث وہ بہت برہم ہیں"۔ میں نے وضاحت سے بتایا۔ "اس انسوسٹاک واقعہ کے ذمہ دار سیاستدان تھے میں نہیں"۔ اب اس کے لہجہ میں احتجاج کا عنصر نمایاں تھا۔ "عوام ایسی باذکیوں کو نہیں سمجھتے وہ عام طور پر بے خبر ہوتے ہیں"۔ میں نے دو بار ورنزی سے جواب دیا "کیا میں زیرِ سرِ است ہوں؟" اس نے چار خانہ لہجہ میں بولا "نہیں آپ میری بھانجی کو لیں میں ہیں" اس نے انکا دس سر ہلایا "مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں" میں راولپنڈی جانا چاہتا ہوں"۔ وہ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔ "سر میں آپ کو لوگوں کے غیظ و غضب سے بچانا چاہتا ہوں"۔ میں نے قدرے سختی سے کہا۔ "کیا میں اچھوت ہوں"۔ یحییٰ خان نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔ اس کے بعد اس نے پنجابی میں وہی جہاں بکنا شروع کر دی اور بولا "کیا میں نے کسی کی گدھی کو چھیڑا ہے"

چوہدری صاحب تحریر کرتے ہیں یہ خرافات سن کر مجھے بے حد فصد آیا تاہم میں نے ضبط سے کام لیا اور خاموشی اختیار کر لی کیونکہ میرے ساتھ ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جو پاکستان کا صدر اور پاک فوج کا کمانڈر انچیف وہ چکا تھا۔ وہ ملک کی تباہی کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا لیکن اسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واضح فوجی شکست کے باوجود وہ سیاستدانوں کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ مجھے اس وقت اس کی حکومت کے وہ تمام منصوبے یاد آ گئے جن میں اس نے سیاستدان کو لہذا راستہ فریتم کرنے کا پروگرام بنایا تھا کہ وہ نئے آئین کی تیاری کی جان جو حکم "شخص میں لہجہ کر فوہ کو بلا کہ کر لیں بعد ازاں اس نے اس کام کو کھربنا ممکن بنانے کیلئے "ایک شخص"

ایک دوٹ "کا حربہ بھی استعمال کیا تھا اور اس نے دن پونٹ کو بھی توڑ دیا تھا۔ مجھے یوسف چائیلو کے ساتھ اس کی دو گفتگو بھی یاد آگئی جس میں اس نے بھنو کو مجیب کے خلاف صف آراء کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ بچی خان مجھے سچ شیطان ٹکنے لگا۔ میں انہی خیالات میں غلطاں دیکھا تھا جب ہمارے سامنے سے گزرنے والی ٹرین کے شور نے مجھے چونکا دیا اور پتہ چلا ہم سہالہ کے ریلوے پھاٹک پر رک گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس ویران جگہ میں بھی بچی خان کو پہچان لیا اس کے بعد میں نے دیکھا ہماری کار کو پتھر مار سے جا رہے ہیں۔ بچی خان کی خوش قسمتی سے پھاٹک جلد ہی کھل گیا اور ہم نے بھگوزوں کی طرح رفتار تیز کر دی۔ بچی خان کا رنگ خن ہو گیا اور وہ بری طرح کانپنے لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں خاصی دیر تک اس کی اس حالت سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس موقع پر میں نے اس سے کہا "سر راولپنڈی چلیں۔" اس نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں نہیں بنی جگہ جانا چاہئے" تم ایک سرکاری ملازم ہو اور میں تمہارے لئے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا" وہ مجھ پر احسان جتانے کی کوشش کر رہا تھا اس چیز نے میرے دل میں اس کے خلاف مزید نفرت پیدا کر دی تھی میں نے بدتمیزی سے جواب دیا "میں نہ صرف سر راولپنڈی کے جاؤں گا بلکہ اپنی ملازمتی راجہ باڈا کے کچھ سے گزاروں گا" میری بات سن کر وہ اب تھر تھر کاہنے لگا اس نام نہاد "غز سپاہی" کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ شخص جو پوری دنیا بلکہ بڑی طاقتوں کے خلاف بھی انتہائی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا۔ وہ صرف چند پتھروں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ آخر میں میری قسمیں کرنے لگا۔ "مجھے بنی جگہ لے چلو۔" ظاہر ہے میں اسے کسی صورت راولپنڈی نہیں لے جا سکتا تھا۔ بنی ریٹ ہاؤس پہنچنے پر اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ایٹ آباد منتقل کر دیا جائے۔ "کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا "براؤ کم کسی سے کہیں میں اس جگہ کو بالکل پسند نہیں کرتا یہاں گیدڑوں کی بھر مار ہے جو رات کو بہت زیادہ شور مچاتے ہیں۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا "میں نے جواب دیا "سر آپ کو بہت اچھے ساتھی میسر ہیں" وہ میرے ریمارکس پر چہیں بھیجی تو ہوا لیکن اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ جب میں راولپنڈی واپس پہنچا تو میں انتہائی غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا میں اس کا کمرہ وہ چہرہ وہ بارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا میں اس کی حفاظت کیلئے آئندہ اپنے کسی ماتحت کو بھیج دیا کروں گا" میں ایسا ہی کرتا رہا جب اس سے بھی شک آ گیا تو میں نے آخر کار اس کی خواہش اٹھائی جس سے وہ کے ڈائریکٹر تک پہنچا دی"

میں نے چودھری سردار صاحب مرحوم کی کتاب میں یہ سارے واقعات پڑھے تو میرے دل میں ایک نہیں سی اٹھی اور میں نے سوچا اگر آجروں کی زندگی سے عبرت تاک انجام نکال دیا جائے تو دنیا میں ان سے زیادہ آئیدیل حالات کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھتا۔ بچی خان ایک شاندار حکمران تھا اگر اس کی زندگی میں 1971ء آتا تو شاید وہ اب تک ملک پر حکمران ہوتا اور ملک دن و گنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہوتا اور ہمارے سیاستدان اسے اب تک دس بار یونفارم میں صدر منتخب کرا چکے ہوتے۔ میں نے سوچا ہم کیسے شاندار لوگ ہیں، ہم تاریخ تک سے سبق نہیں سیکھتے، ہم دیوار پر لکھی تحریریں تک نہیں پڑھتے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

انسان آخر انسان ہے

ڈاکٹر الازہر عراق کے مشہور فزیشن اور سرجن تھے، وہ بغداد یونیورسٹی کے پلاسٹک سرجری اور ری کنسٹرکٹو سرجری کے شعبے کے سربراہ بھی رہے تھے۔ انہوں نے 20 برس تک صدام حسین اور مل کے ساتھ ان کے ذاتی منہاج کی شہیت سے کام لیا۔ ان 20 برسوں میں انہیں صدام فیملی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ستوط بغداد کے بعد انہوں نے صدام کے بارے میں ایک چشم کشا کتاب لکھی اس کتاب میں انہوں نے صدام حسین کی ذاتی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر الازہر نے انکشاف کیا صدام حسین اپنی موٹھوں کے بارے میں بہت حساس تھے، وہ ان کا خصوصی خیال رکھتے تھے، وہ اپنی موٹھیں دیکھتے تھے لیکن ان کی پوری کوشش ہوتی تھی لوگ ان کی موٹھوں کے رنگ کو قدرتی سمجھیں، ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین ایک بار اپنے بیٹے اور سے حسین سے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اور سے کی ساری کاریں چھج کر انہیں خود کرسی پر بیٹھے اور ان کا رویہ کو آگ لگانے کا حکم دے دیا، خادین نے کاروں آگ لگا دی اور یوں کروڑوں ڈالر کی کاریں جل کر رکھ ہو گئیں۔ چینی اور کاریں ہلتی رہیں صدام حسین اطمینان سے سگار پیتے رہے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین کا بیٹا اور سے حسین نفسیاتی مرٹینس تھا، وہ خواتین کو سگریٹ سے دانا تھا، ان کے جسم کو چاقو سے چھید ڈالتا تھا اور اس کے بعد ان خواتین کا علاج ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ صدام حسین داہمی اور

ضعیف الاعتقاد بھی تھے اگر انہیں راستے میں کالی بلی نظر آ جاتی تھی تو وہ اپنے کانوں سے کاہلے کاہلے راستے بدل دیتے تھے وہ پلاسٹک کے سیاہ شاپنگ بیگوں سے بھی خائف تھے۔ اگر انہیں راستے میں سیاہ بلی نظر آ جاتے تھے تو بھی وہ راستے بدل لیتے تھے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین اور ان کا خاندان خوبصورت نظر آنے کے جذبہ میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک بار صدام حسین کی دوسری بیگم سیرہ شاد بندر کی "فیس ملنگ" کا حکم ملا یہ ایک خفیہ آپریشن تھا صدام حسین اور ان کی بیگم اس آپریشن کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی لہذا جتنے دن یہ کام ہوتا رہا ڈاکٹر اتنے دن منظر سے غائب رہا۔ صدام حسین کی ایک نواسی اپنی ناک کو ستواں بنانے کے شوق میں مبتلا تھی وہ روز میں پچیس لاکھوں کے ساتھ کلینک آ جاتی اور ڈاکٹر سے پوچھتی ان میں سے کس کی ناک اچھی ہے۔ ڈاکٹر جس کی طرف اشارہ کرو تا وہ کہتی میری ناک ایسی بناویں ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ لاکھوں کی قطار میں ایسے قطعی تھی جیسے وہ مقابلہ حسن میں شرکت کیلئے آئی ہو۔ صدام حسین عوام میں اپنے بیٹے کے بارے میں بھی بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ 1991ء میں وہ حادثے کا شکار ہو گئے ان کے چہرے پر

چھینٹ آئی جس کے بعد ڈاکٹر ان کے چہرے پر پٹیاں لگانے لگا تو صدام حسین نے منع کر دیا ان کا خیال تھا وہ اس حالت میں سڑو اور لاٹر نظر آئیں گے اور وہ اسے دن میں دویرن پر چھینٹیں

سکیں گے اس حادثے میں ان کی بیوی انگلی پر جھٹ لگ گئی وہ کئی دنوں تک اس چوٹ کے بارے میں متفکر اور پریشان رہے اور ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین نے پورے ملک میں اپنے پوسٹر اپنے پور ٹریٹ اپنی بیٹنگز اور اپنے جیسے لگوار کئے تھے عراق کی کرنسی تک پر صدام حسین کی تصویر تھی آپ جس سرکاری سکول کالج انڈر پورٹ پر جاتے تھے جس سڑک جس شاپنگ سنٹر اور جس بازار میں آتے تھے آپ کو ہر طرف صدام حسین کی تصویر جیسے اور پور ٹریٹس نظر آتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا عراق کا کوئی شہری صدام حسین کی نظروں سے اوجھل نہیں۔

میں نے جب صدام حسین کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کے بارے میں یہ ساری باتیں پڑھیں تو میرے ذہن میں صدام حسین کی ایک ایسی تصویر بنی جس میں وہ نازک مزاج سیلف سینئر اور شاہانہ عادات کے مالک ایک آزاد مٹش انسان تھے۔ اس کے بعد میں نے صدام حسین کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے کوہن کوہن کی تحریریں پڑھیں، کوہن کوہن صدام حسین کا سرکاری سوانح نگار تھا۔ وہ بڑا محرصہ صدام حسین کے قریب رہا تھا اس سال جون میں لندن کے ایک اخبار نے صدام حسین کی چند

برہنہ تصاویر شائع کی تھیں۔ یہ تصاویر صدام حسین کے "سیل" سے کھینچی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں وہ اپنا "انٹرویو" تلاش کرتے دکھائے گئے تھے، کوہن کوہلین نے اس واقعے سے متاثر ہو کر برطانیہ کے اخبار "ڈیلی میل" میں بڑا شاندار مضمون لکھا، اس مضمون میں اس نے لکھا، صدام حسین ایک ایسا شخص تھا جس کی خوش لباسی کے چہ پہ پوری دنیا میں ہوتے تھے۔ ان کے سوٹ لندن کے مشہور اور معروف ٹیلر سے تھے ایک وقت تھا جب دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی سوٹ صدام حسین کے پاس تھے ان کی وارڈ روپ میں 300 قیمتی سوٹ اور دو اڑھائی ہزار جوتے ہوتے تھے ان کے 48 محلات تھے جن کی دیواریں سنگ مرمر کی تھیں، ہاتھ روہڑی فونٹینوں اور دروازوں کے ہینڈلوں پر سونے کا پانی چڑھا تھا اور محلات کے اندر آبیاریں کرتی تھیں۔ ان کی سرکاری رہائش گاہوں کی تعداد بھی 70 سے 80 تھی اور وہ بھی اتنی ہی شاندار اور افسانوی تھیں، صدام حسین کی تین بیویاں تھیں اور وہ اور ان کی اولاد میں بھی اسی شاندار انداز سے زندگی گزارتی تھیں۔ کوہن کوہلین کی تحریروں سے صدام حسین کے بارے میں میرا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔

صدام حسین کی زندگی کا ایک فیہ تھا، بن فینر کوگز سے اس کا اعلیٰ بوس ہو سکے جہاں سے صدام حسین اپنے دو بیٹوں سے اپنے کل کے لائن میں چھڑا دیتے تھے، میں بند ہیں وہ اس سیل

کو خود صاف کرتے ہیں، ہاتھ روہڑی خود دھوتے ہیں، انہیں کپڑوں کے دو جوڑے پلاسٹک کے سلپرو اور ایک عربی چھتر فراہم کیا گیا ہے اور کمرے کے مرکزی دروازے کے نالے کا سوراخ ان کا بیرونی دنیا سے واحد رابطہ ہے، وہ جب کمرے کی زندگی سے اکتا جاتے ہیں تو وہ نالے کے سوراخ پر جھک کر باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ صدام حسین کی زندگی کا دوسرا فیہ ہے جو انتہائی افسوسناک اور قابل رحم ہے، لیکن آپ افسوس کے اوپر ایک اور افسوس ملاحظہ کیجئے میں نے 14 دسمبر 2005ء کے اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی یہ خبر پاکستان کی سرکاری نیوز ایجنسی نے جاری کی تھی اس خبر میں انکشاف ہوا، صدام حسین کو دو برسوں میں جوتوں کا صرف ایک جوڑا فراہم کیا گیا اور صدام حسین نے پچھلی جوتی کے دوران عدالت سے مطالبہ کیا انہیں اور ان کے ساتھیوں کو نئے جوتے فراہم کئے جائیں۔ عدالت نے سرکاری وکیل کا موافق پوچھا، سرکاری وکیل نے عدالت کو یقین دلایا صدام حسین کو چند دنوں میں جوتوں کا ایک نیا جوڑا فراہم کر دیا جائے گا۔ صدام حسین نے عدالت کو بتایا انہیں کپڑے دھونے اور سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں تاہم ان معاملات کے بارے میں عدالت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یقین نہ آیا جوتوں کے

ایک جہزے کا مطالبہ کرنے والا صدام حسین عراق کا وہی حکمران ہے جو وہ برس پہلے تک 48 کالٹ تین سو قسٹی سولوں اڑھائی ہزار جہزوں خوشبو کی آئندہ دس ہزار بوتلوں اور گیارہ سو قسٹی کاروں کا مالک تھا جس نے اپنی سونجھیں رکھنے کیلئے بارہ ماہرین کی ٹیم رکھی ہوئی تھی جس کے رکار ہواتا سے آتے تھے جس کیلئے مشروبات فرانس کی کمپنیاں بناتی تھیں اور جس کے سولوں کیلئے ٹیکسٹریوں میں خصوصی کپڑا بناتا تھا جس کا ماپ لینے کیلئے ٹیلر لندن سے آتے تھے جس کے کپڑے دھونے کیلئے بغداد میں "رائل واشنگ سینٹر" بنایا گیا تھا جس کے ایک سوٹ کی باری ایک سال بعد آتی تھی اور جس کے لباس جوتوں اور خوشبوؤں کی حفاظت کیلئے ایک پورا سیکرٹریٹ تھا۔ مجھے یقین نہ آیا وہ صدام حسین آج جوتوں کے ایک جہزے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہے۔ افسوس کیا بلندی تھی اور صدام افسوس اب کیا ہستی ہے۔ میں نے برسوں پہلے کسی کتاب میں پڑھا تھا اقتدار ایک ایسا نشہ ہوتا ہے جو انسان کو اندھا کرتا ہے اور بہرہ بھی جو انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے تم اس کائنات کے لئے ناگزیر ہو۔ عجیب بات ہے دنیا کا ہر حکمران زندگی میں کبھی نہ کبھی اس مقالے کا ضرور شکار ہوتا ہے۔

Kashif Azad@Onelldu.com

عسکرانوں کے بیڈرومز میں لگا دوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں "حضور انسان آخر انسان ہے وہ کبھی خدا نہیں بن سکتا اور دنیا میں اللہ کے سوا ہر صاحب اقتدار کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے حضور دنیا کا ہر حکمران ایک بار اپنی کرسی سے چپے ضرور اترتا ہے اور وہ اپنے گلے سے پاہر ضرور آتا ہے کبھی اپنے قدموں پر اور کبھی دوسروں کے کندھوں پر"۔



”افسوس میں مر رہا ہوں“

کبریٰ گاریا مارکیز کولمبیا میں پیدا ہوا کولمبیا میں رہا اور اب وہ کولمبیا ہی میں مر رہا ہے۔ چالیس کی دہائی میں اس نے اپنے کیریئر کا آغاز لکھنے سے کیا تھا لیکن پھر جلد ہی پیشہ وارانہ زندگی سے اذیت کی راہی پر حمار میں داخل ہو گیا۔ ابتداً اس کے چند افسانے اس کی وجہ تو قلم بنے لیکن اسے اصل شہرت اس کے عظیم ناول ”ہنڈرڈ اینڈ آف سالٹی چیوز“ سے ملی تھی وہ ناول تھا جسے نقاد تاریخ کا عظیم ترین ناول کہتے ہیں اور اسی ناول کی بنیاد پر مارکیز کو 1982ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔

بڑھے کبریٰ گاریا مارکیز کا شمار دنیا کے ان خوش نصیب لکھاریوں میں ہوتا ہے جنہیں قدرت نے زندگی ہی میں عالمگیر شہرت بھی بخشی دولت بھی دی آسائش سے بھی نوازا اور محبت بھی اور ایست کی مارکیز بلاشبہ ایک ایسا خوش بخت انسان تھا جس کے ہونٹوں پر پہنچ کر خواہش قبولیت کا روپ دھار لیتی تھی جس نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں نازک ہتھیلیوں پر آنو گراف ویئے تھے اور جس کی ایک ایک کتاب کے ملین ملین ایڈیشن فروخت ہوئے تھے لیکن آج بھی مارکیز اپنے اداس خاموش اور دیران بیذروم میں موت کی چاہ سن رہا ہے اس کا کینسر بگڑ چکا ہے اس کا جسم بے حس اور دماغ سن ہو چکا ہے اور اس کے پاؤں ساکت اور ہاتھ بے حرکت ہو چکے ہیں اور یہی بیانی تو وہ ادب اپنی خرابی تک آنکھوں سے صرف و جوہ اور چھانٹا میں قیہ کر سکتا

ہے آپ اس کی بے بسی کی انتہا دیکھئے وہ آنکھیں جو کبھی چہروں کی جھریوں میں لکھی کہانیاں پڑھا لیتی تھیں اور جو آنکھوں میں چھپے نکس و کچھ لیتی تھیں وہ آنکھیں اب کھڑکی سے اندر جھانکتی نہیں اور سوپ کے پیالے سے اڑتی بھاپ تک نہیں دیکھ سکتیں آپ ستم دیکھئے دنیا کا عظیم نگہداری اب برسوں پرانے ملازمین کو بیچانے کیلئے ان کی آوازوں کا محتاج ہو چکا ہے گھبریل گارسیا مارگیز زندگی اور زندگی کی گرم جوشیوں سے رہنا نہ ہو چکا ہے اس نے جنوری 2007ء میں اپنے سیکرٹری کو اپنا آخری پیغام لکھوایا یہ پیغام مارگیز کے کمپیوٹر سے جاری ہونے والی اس کی آخری تحریر ہے یہ پیغام یہ خط مارگیز کی اپنے چاہنے والوں کے نام وصیت بھی ہے ایک مرتے ہوئے انسان کا نوحہ بھی اور انسانی زندگی کا مرثیہ بھی یہ ایک زندہ انسان کا اعتراف شکست بھی ہے اور ایک مرتے ہوئے انسان کی حسرت بھی تجھے یہ خط برادر بزرگ اختر عارف نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے بھجوا یا تھا جسے میں پورے ایک مہینے سے روز اندازت ہونے سے پہلے پڑھ رہا ہوں اور اور پھر دیر تک جاگتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کیا زندگی کے کھٹول میں حسرتوں کے سوا بھی کچھ

Kashif_Azad@OneUrdu.com

میں یہ پیغام یہ خط یہ وصیت آپ کی یاد کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ نظم اور ستر کے اس عظیم شاہکار کو اپنی میز کے شیشے کے نیچے رکھ لیں گے اور پھر اسے روز ایک بار جی ہاں صرف ایک بار ضرور پڑھیں گے۔

"اے میرے خدا مجھے ایک لمحے کیلئے بے حس و حرکت گڈے سے انسان بنانے ایک جیتا جاگتا انسان مجھے قسم ہے تمہاری میں پھر کبھی وہ نہیں کہوں گا جو میں سوچتا ہوں میں صرف اور صرف سوچوں گا اس کے بارے میں سوچوں گا جو میں کہتا رہتا ہوں یا پھر میں کہتا چاہتا ہوں۔

اے میرے خدا تو مجھے ایک بار پھر حرکت دے دے مجھے تمہاری قسم میں زندگی میں کبھی چیزوں کی قیمت نہیں دیکھوں گا میں ان کی اہمیت دیکھوں گا میں ان کی قدر کروں گا اے میرے خدا میں کم سوؤں گا اور زیادہ خواب دیکھوں گا کہ میں جان چکا ہوں ایک منٹ کیلئے آنکھیں بند ہوں تو ہم روشنی کے کتنے سیکند کھودتے ہیں۔

اے میرے خدا تو رات ایک لمحے کی زندگی میں دے تو میں اس وقت ہوں گا جب لوگ رگ جائیں گے میں اس وقت جاؤں گا جب لوگ سو جائیں گے اور میں اس وقت خاموش رہوں گا جب لوگ بولیں گے اے میرے خدا میں چاکلیٹ کھاؤں گا آئس کریم کھاؤں گا تو

پورے لطف پورے مزے کے ساتھ کھاؤں گا اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں ہمیشہ سادہ کپڑے پہنوں گا اور اپنا جسم اور اپنی روح سورج کے سامنے کھول دوں گا اے میرے خدا اگر مجھے تھوڑی دیر کیلئے اپنا دل واپس مل جائے تو میں اپنی نفرت برف پر لکھ دوں گا اور پھر اسے سورج کی تمناؤں میں کھینٹنے 'کھیل کر بھاپ بننے اور بھاپ بن کر اڑتے دیکھوں گا اے میرے خدا میں ستاروں پر "دین گاف" کے خواب چنٹ کر دوں گا چاند کیلئے ایک بنی ڈینی نظم ایک "سیرات" "انفہ تکفوں" میں سرخ گلاب چوسوں گا اور اپنی آنکھوں اور اپنے آنسوؤں سے پھولوں کے دو تمام درود چن لوں گا جو کائناتوں نے انیس دیئے تھے۔

اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں کوئی ایسا دن نہیں گزارنے دوں گا جب میں لوگوں کو اپنی محبت کا یقین نہ دلا دوں میں دنیا کے ہر مرد و ہر عورت کو سمجھاؤں گا مجھے ان سے محبت ہے میں محبت میں محبت کے ساتھ رہوں گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا جو لوگ سمجھتے ہیں بوزھے ہو کر وہ محبت کے قابل نہیں رہتے وہ بڑے بے وقوف ہیں انسان تو بوزھ جیسا اس وقت ہوتا ہے جب سب سے زیادہ محبت کرتا ہے میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ میں اپنی ازاں خود لینے کا سونچ دوں گا میں بوزھوں کو بتاؤں گا موت بڑھا پے سے نہیں آتی نرمانوشی سے آتی ہے بے حس سے آتی ہے

اور اے انسان اے میرے پڑھنے والے انسان یہ سب کچھ میں نے تم سے سیکھا تھا میں نے تم سے سیکھا تھا دنیا کا ہر شخص چوٹی پر پہنچنا چاہتا ہے یہ جانے بغیر کہ چوٹی کچھ نہیں اہل چیز تو مسافت ہے وہ مشقت ہے جو یہاں سر کرنے کیلئے کی جاتی ہے میں نے سیکھا جو بچہ باپ کی اٹلی تمام لے وہ سب ادا کا عادی ہو جاتا ہے میں نے سیکھا 'نفرت کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جس نے زندگی بھر لوگوں کو سہارا دیا ہو اور جس نے لوگوں کو کھرا ہونے میں مدد دی ہو۔

اے لوگو! میں نے آپ سے اور بھی بہت کچھ سیکھا لیکن اس وقت جب موت میری پانچٹی پر کھڑی ہے تو میرا دل ادا ہے میں ادا ہوں کہ میں وہ سب کچھ آپ کو نہیں سونپ پایا جو مجھے سونپنا چاہیے تھا اور افسوس میں زندگی کی اصل حقیقتیں اپنے سینے میں لے کر جا رہا ہوں افسوس میں وہ سب کچھ نہیں کہہ پایا جو مجھے کہنا تھا جو مجھے آپ کو بتانا چاہیے تھا۔

"افسوس میں مر رہا ہوں"



محبت، توجہ اور وقت

کرشنیا سنڈ ہوٹل کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہ قصبہ کوہ پٹیکن سے ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لہذا لوگ یہاں پہنچنے کے لیے عموماً ٹرکوں کے بجائے گاڑیوں کا استعمال کرتے ہیں میرے دوست محمد دم عباس نے تین سال پہلے چودھری جہانزیب کے ساتھ مل کر یہاں چاولوں کی معالی اور بیکنگ کی فیکٹری لگائی یہ تجربہ کامیاب ہو گیا چنانچہ میرے دوست پورے یورپ کو باسٹی چاول سپلائی کرنے کے لیے لوگ اب پولینڈ میں کئی گنا بڑا کارخانہ لگا رہے ہیں میں شیخ مشر کے ساتھ 12 مارچ 2007ء کو وہاں پہنچا کر سنیا سنڈ میں ابھی تک سردی کے آثار باقی تھے سڑکوں کے کناروں پر برف کی اکاڑ کا ڈھیراں بھی مل جاتی تھیں قصبے کی گلیاں بازار اور کافی شاہیں سرشام بند ہو جاتی تھیں اور لوگ اندھیرا پھیلنے سے پہلے گھروں میں محبوس ہو جاتے تھے ہم لوگ ایک ویٹا سٹول میں ٹھہرے تھے سٹول میں بھی ہمارے سوا کوئی گاہک نہیں تھا جبکہ کرشنیا سنڈ اور اس کا ساحل بھی دیران اور سنسان تھا ہم لوگ لندن اور پیرس کی روتھوں سے وہاں پہنچے تھے لہذا ہمیں پہلے دن کرشنیا سنڈ کے ٹھہراؤ اور سستی نے پریشان کر دیا لیکن دوسرے دن ہم اس شہر کے عادی ہو گئے اور سب محسوس ہوا کہ سنیا سنڈ کا ٹھہراؤ اور سستی بنیادی طور پر اس کا سکون تھا یہ ایک دھیرا اور پرسکون قصبہ ہے یہاں کے لوگ بے گلے اور شورش راہے کی بجائے پرسکون فیملی لائف گزارتے ہیں میرا دوست محمد دم عباس قدرتی اور فطرانی نرس میں ہے اسے اللہ تعالیٰ نے بے

تماشہ: ایریس سنس "ڈوے رکھی ہے، وہ مجھ سے دو برس چھوٹا ہے لیکن اس نے چند برس میں اپنی لمبیں ڈالرز کی بزنس ایسپائر کھڑی کر دی تھی اس کی گروتھ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے وہ چند برس بعد بیسٹ وے کے انور پرویز ڈائریکٹ کام کے طارق بھی اور برطانوی رکن اسمبلی چودھری سردر کے لیول تک پہنچ جائے گا۔

مخدوم عباس امبشر شیخ اور میں 13 مارچ کی شام کرمیٹا سنڈ کے ایک ریسٹوران میں کافی پینے کیلئے گئے مخدوم نے ایک برطانوی جڑے کو بھی وہاں بلا لیا 'فریک اور اس کی پولش بیوی ملر کیننگ کسٹنٹ تھے اور دونوں کی عزتیں ساتھ برس سے زیادہ تھیں 'ہم لوگ ٹھنڈے بھرکے شپ کرتے رہے 'شام کے چہرے گئے تو فریک کی بیوی نے گھڑی دیکھی اور اپنے شوہر کو اٹھنے کا اشارہ کر دیا 'فریک نے معذرت خواہانہ انداز سے ہماری طرف دیکھا اور مسکرایا کہ 'یو! ہم دونوں نے چیرنی کیلئے جانا ہے آپ لوگ ہمیں اجازت دے دیں 'میں نے مسکرا کر پوچھا 'آپ لوگ کیا چیرنی کرتے ہیں 'فریک کی بیوی نے بولی 'ہم ہفتے میں دو دن چرچ کے اولڈ ہتھیل ہوم جاتے ہیں

اس ہوم میں ادارت اور لڑکا ہاؤس سے رہتے ہیں 'ہم دونوں ان کے ساتھ بیچ کر دیکھنے لگے

ہمارے ساتھ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے ان کے جانے کے بعد مخدوم نے مجھ سے پوچھا 'کیا یہ لوگ دوزخ میں جاسکتے ہیں 'میں مخدوم کے سوال پر خاموش رہا 'مخدوم کے سوال کا جواب کوئی عالم دین ہی دے سکتا تھا لیکن جہاں تک چیرنی کا تعلق ہے میں ان دونوں میاں بیوی کی اپروچ پر حیران رہ گیا تھا 'دنیا کا ہر شخص پیسے کی خیرات کرتا ہے 'ہم سب لوگ کسی نہ کسی شکل میں محرموں 'علاجوں اور ضرورت مندوں کی مالی مدد کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ کسی کو وقت دیتے ہوں گے 'ہم کسی کے پاس بیٹھے ہوں گے 'ہم کسی کی بات غور سے سنتے ہوں گے اور ہم کسی کو بڑی محبت سے تازہ ترین حالات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوں گے 'مجھے لیدی فریک کی بات سن کر اندازہ ہوا دنیا کی سب سے بڑی خیرات 'صدقہ اور چیرنی کسی کا ساتھ دینا کسی سے کہنی کرنا اور کسی کو اپنے قیمتی وقت میں شامل کرنا ہوتا ہے اور انسان کو برا بھلا پیمانہ باری اور بے چارگی میں روٹی اور کپڑے سے زیادہ کچھ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگوں نے چیرنی یا خیرات کو صرف روپے پیسے تک محدود کر دیا ہے 'مجھے محسوس ہوا چیرنی کے معاملے میں بھی ہماری اپروچ غلط ہے 'ہم پوری دنیا کو وقت دیتے ہیں 'ہم صدر ہل کی تقریر تک کو بے تحاشہ وقت دیتے ہیں لیکن اگر ہمارے پاس

وقت نہیں ادا تو اپنے بوز سے ماں باپ چاچا چچا خال خال بھو بھو بھو پھوپھو اور تائی تائے کیلئے نہیں ہوتا ان لوگوں کے ساتھ ہماری محبت صرف دوہلی پالی کپڑے اور دو دار دیک بھد دو دتی ہے ہم انہیں اپنے وقت اپنی توجہ اور اپنی محبت میں شریک نہیں کرتے جبکہ فریک اور اس کی بیوی بنتے میں دو دن کر سفیا سنڈ کے بوزھوں کے ساتھ اپنی محبت توجہ اور وقت شیئر کرتے ہیں چنانچہ میں بھدوم کے سوال پر تو خاموش رہا لیکن میں نے دل میں سوچا "کیا یہ لوگ ہم سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں؟"

یورپ کی چیرٹی کا ایک منظر میں نے جبرس میں بھی دیکھا تھا "مبشر شیخ مجھے دیوائے سین کے کنا دے لے گیا اور یا کے کنا دے دور دو دیک خوبصورت خیمے لگے تھے اور مختلف عمروں کے سینکڑوں لوگ ان خیموں کے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہے تھے "مبشر نے بتایا یہ تمام لوگ شرابی اور نشئی ہیں یہ دن رات نشے میں دھت رہتے ہیں ان لوگوں کی شراب ختم ہو جائے تو یہ لوگ بوتل لے کر شہر میں نکل آتے ہیں یہ لوگ ریستورانوں، باروں اور دوکانوں میں چلے جاتے ہیں اور جبرس کے زیادہ تر دوکاندار انہیں مفت شراب دے دیتے ہیں یہ لوگ بوتل لے کر واپس آتے ہیں اور آجس میں ایک ایک کھونٹ شراب تقسیم کر لیتے ہیں "فریج حکومت کے مطابق اس وقت فرانس میں ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے یہ لوگ علیحدگی پسند ہیں اور سب کا دھوئے ہیں اور ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے شراب اور صرف شراب یہ لوگ گرمیاں فٹ پاتھوں، میٹرو سٹیشنوں اور پارکوں میں گزاردیتے ہیں ان لوگوں کیلئے سردیاں بڑی ٹھنڈی اور مشکل ہوتی ہیں حکومت نے ان کے مسائل کو سمجھتے ہوئے اس سال ان کیلئے دریائے سین کے کنارے خیمے لگا دیئے ہیں ان خیموں میں بڑے شاعرانہ گدے اور کھل ہیں یہ لوگ سارا دن سرکوں پر پھرتے ہیں لیکن رات کو ان خیموں میں آ جاتے ہیں حکومت نے ہر دوں پندرہ خیموں کے بعد ایک "ڈاننگ ٹینٹ" لگا دیا ہے اس ٹینٹ میں کھانے پینے کا سامان پڑا رہتا ہے ان لوگوں کو جب بھوک لگتی ہے تو یہ لوگ ڈاننگ ٹینٹ سے اپنی مرضی کی چیزیں اٹھا کر کھا لیتے ہیں جبرس میں اس وقت 13 این جی اور ان لوگوں کیلئے کام کر رہی ہیں یہ این جی اور انہیں کھل گدے اور سلیپنگ بیگز فراہم کرتی ہیں اور ان کے کھانے پینے کو دیکڑوں کا بھی خیال رکھتی ہیں "سید سہیل کا پورٹیشن کی کاریاں دن میں چار بار ان خیموں کا پتہ لگاتی ہیں اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان پھونز جاتی ہیں سردیوں کی راتوں میں کارپوریشن اور پولیس کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کی ضروریات کا بندوبست کرتے رہتے ہیں میں نے مبشر سے پوچھا "یہ

لوگ معاشرے کیلئے بیمار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت اور عوام ان کا کیوں خیال رکھتے ہیں، میشر کا کہنا تھا "فرانس کے لوگ سمجھتے ہیں نشہ کرنے کے باوجود انسان انسان رہتا ہے اور شراب نوشی کسی انسان سے اس کے انسان ہونے کا حق نہیں چھینتی، یہ لوگ نشہ کو گناہ یا جرم کی بجائے بیماری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے بیمار کو نگہداشت، حفاظت اور فرسنگ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ حکومت سے ملے کر تمام شخص تک فرانس کا ہر شہری ان لوگوں کی فرسنگ کرتا ہے"

مجھے میشر کی بات پر بھی حیرت آئی کیونکہ میں کروڑوں پاکستانیوں کی طرح شخصوں سے نفرت کرتا تھا اور میں نے آج تک کسی نشئی کی طرف ہمدردی سے نہیں دیکھا تھا میں ان لوگوں کو گناہ گار مجرم اور حیوان سمجھتا تھا لیکن دریاے سین کے کنارے نصب یہ خیمے دیکھ کر مجھے پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے سوچا پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے اور ہر گاؤں میں ایسے بے شمار لوگ بکھرے پڑے ہیں یہ لوگ گرمیوں سردیوں اور بارشوں میں کھلے آسمان تلے پڑے رہتے ہیں ان کے جسم سے بدبو کے پھپھکے اٹھتے ہیں اور انہیں دس دس دن تک روٹی نصیب نہیں ہوتی

لیکن ہم میں سے کسی شخص نے آج تک ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچا ہم نے آج تک کوئی راہی نہیں ڈھونڈا اور پانچ لاکھ ٹھونڈے لیکن وہیے ہم نے آج تک ان کے خیر و شرفقت

سے ہاتھ نہیں رکھا اور ہم نے انہیں اپنی دعا تک کے قابل نہیں سمجھا، مجھے اس وقت یورپ کے لوگوں پر خدا کے کرم اور پاکستان کی بحردمی کی اصل وجہ سمجھ آئی اور مجھے محسوس ہوا اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں پر کرم کرتا ہے جو اس کے بندوں پر مہربانی کرتے ہیں، جو بوڑھے اور نشئی کو بھی انسان سمجھتے ہیں جو انسانوں سے نفرت نہیں کرتے اور جو لوگوں کو محبت، توجہ اور وقت دیتے ہیں میں نے سوچا کیا ہم 16 کروڑ مسلمانوں کے ملک میں ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کر سکتے جو فریبک اور اس کی بیوی کی طرح بوزموں کو وقت دے اور جو پاکستان کے کسی ایک شہر میں شخصوں کیلئے کھانے کا بندوبست کر سکے، آپ انہوں کا مقام دیکھئے، ہم اس بے حسی کے باوجود خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم بھی۔



”میرا کیا قصور تھا“

”آپ کا سفر کیا رہا“ میں آواز نہیں پہچان سکا، میں نے پوچھا ”کون صاحب بول رہا ہے؟“ ”میرا نام پرویز رشید ہے اور وہ بھاری آواز میں جواب دیا ”آپ کا کیا نام ہے؟“ ”6 مارچ کو کون میں ایک شخص نے دوسرے شخص کو یاد دلایا اور اسے یاد دلا دیا کہ اس سے مخاطب ہوا“ میں حیرت سے پریشانی کے فیز میں داخل ہو گیا، میں نے عرض کیا ”سراسر اس کے باوجود اگر آپ نام بتاویں گے تو مجھے بات کرنے میں سہولت ہوگی“ دوسری طرف چند سیکنڈ کا وقفہ ہوا، مخاطب نے لیا سانس بھرا جذباتی لہجے میں بولا ”جاوید، میں پرویز رشید بول رہا ہوں“ میرے منہ سے جوش میں ایک طویل ”جناب عالی“ نکلا اور لندن کی اجنبی نضا چاکم مہربان ہو گئی۔

پرویز رشید سے میری پہلی ملاقات 1997ء میں ظلیل ملک صاحب کے دفتر میں ہوئی تھی، پرویز رشید جس جمال اور حس مزاح سے لہریز ایک خوبصورت شخص تھے وہ ان دنوں تازہ تازہ سینئر بنے تھے اور میاں نواز شریف نے انہیں پی ٹی وی کا حیرت مین لگا دیا تھا، پرویز صاحب سے میری ملاقاتیں 1998ء تک جاری رہی تھیں، 1998ء میں پرویز صاحب مجھے سینئر سیف الرحمن کے پاس لے گئے، سیف الرحمن کے ساتھ میری کئی ہو گئی اور اس کے بعد پرویز صاحب سے میری ملاقاتوں میں وقفہ آنے لگا، 12 اکتوبر 1999ء کے ”نٹری کو“ کے بعد خبر آئی، پرویز رشید پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر سے گرفتار ہو گئے ہیں، پھر خبر ملی وہ قید تہائی میں ہیں، پھر ان کی رہائی کی تصویریں شائع

ہوئیں یہ چلا وہ لاہور چلے گئے ہیں وہاں انہوں نے 12 اکتوبر کے قبضے کے خلاف پریس کانفرنس بلانی اس کے بعد یہ چلا وہ ایک بار پھر گرفتار ہو گئے ہیں اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی وہ آٹھ برس تک گوشہ گمنانی میں رہے لیکن پھر چاک 3 مارچ 2007ء کو مجھے لندن میں ان کا فون آیا اور ٹونا ہوا اور اب ایک بار پھر بحال ہو گیا پرویز رشید نے مجھے چار مارچ کی شام ملنا تھا اور میں اس شام کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

لندن میں چار مارچ کو شدید بارش ہو رہی تھی سرد ہوائیں چل رہی تھیں میرا خیال تھا شاید وہ نہ آسکیں لیکن ٹھیک آٹھ بجے تل ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو باہر پرویز رشید کھڑے تھے میں انہیں دیکھ کر سکتے میں آ گیا 1999ء اور 2007ء کے پرویز رشید میں زمین آسمان کا فرق تھا میں نے 99-1998ء میں جس پرویز رشید کو چھوڑا تھا وہ شاندار سوٹ پہنے تھے تھیں خوشبو لگانے اور پائپ پیسے والا "سیالکوٹی منڈا" تھا لیکن اس وقت میرے سامنے ایک ضعیف مفلوک الحال اور بیمار پرویز رشید کھڑا تھا میرے دل میں درد کی ایک لکیری اٹھی میں نے انہیں اندر

لایا انہیں بٹھا اور بڑی دیر تک خاموش بیٹھا ہاتھ دیکھا جب چاہ بچے سے جھانسنے چاہئے گئے ہم خاموش رہے وہ کراٹھک مجھے خود مسکرا کر بڑے جلا کھانا کھانے کیلئے پہلے ہیں میرے ساتھ محمد

رفیق کھاسا تھا ہم دونوں ان کے ساتھ جیل پڑے وہ ہمیں انجیر روڈ کے ایک لبنانی ریسٹوران میں لے گئے پرویز صاحب نے کھانے کا آرڈر دیا پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگے ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا انہیں تمباکو بھرنے میں دقت ہو رہی تھی وہ پائپ جلا چکے تو میں نے عرض کیا "میں 1999ء سے 2007ء تک کی کہانی سنا چاہتا ہوں" پرویز رشید مضطرب ہو گئے انہوں نے آنکھوں پر نشور کھلایا اور نرم آواز میں بولے "جاوید میں کھانے کے قابل نہیں رہوں گا" مجھے ان پر بہت ترس آیا لیکن میرے اندر کا سحانی ماننے کیلئے تیار نہیں تھا میں انہیں بار بار کہہ رہا تھا یہاں تک کہ انہوں نے پیٹ سرکائی اور آہستہ آواز میں بولے "آپ کو لاہور میں میری دوسری گرفتاری تک کے واقعات تو معلوم ہیں" میں نے ہاں میں گردن ہلا دی وہ بولے "مجھے پریس کانفرنس کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا مجھے ایک عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا اور اس کے بعد مجھے شدید روحانی نفسیاتی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا میرے جسم کا ایک ایک پور ہلا دیا گیا میرے سر سے خون چلتا تھا اور ایڑیوں تک آتا تھا یہ دس دن تھے یا پندرہ دن مجھے کچھ یا نہیں نہیں صرف اٹھا جاتا ہوں مجھے انسانیت کے مقام سے کہیں نیچے گرا دیا گیا تھا دنیا کا ہر انسان ایک حد

تک جسمانی تشدد سبب جاتا ہے لیکن اخلاقی تشدد برداشت کرنا کسی شخص کیلئے ممکن نہیں ہوتا انسان اپنے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہے مجھے اس کے بعد جیل میں پینک دیا گیا میری دو بیٹیاں جیسا میری بیٹی مجھے جیل میں ملنے آئی ان ظالم لوگوں نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا اس وقت میرے کپڑے پھینے ہوئے تھے سر میں ناک تھی اور منہ میں پندرہ دنوں سے نہیں دھلا تھا میں جب بیٹی کے سامنے بیٹھا تو میری شلوار پنڈلیوں سے ادا پر اٹھ گئی بیٹی نے میری ایڑیوں تک خون کی لکیریں دیکھیں تو اس نے رو تا شروع کر دیا اس منظر نے اس کی نفسیات بدل دی دو دن ہے اور آج کا دن ہے اسے رات کو میڈ نہیں آتی "دور رک گئے" ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی باہر شدید بارش ہو رہی تھی لیکن اندر کا موسم انتہائی گرم تھا میں خاموشی سے ان کی داستان سن رہا تھا۔

وہ دو بار دو گویا ہوئے "میں نے 1979ء میں لاہور میں پانچ ہفتے کا ایک چھوٹا سا یونٹ لگایا تھا یہ یونٹ آہستہ آہستہ کارخانہ بن گیا تھا یہ میرا واحد اثاثہ تھا حکومت نے پہلے اس کی بجلی کٹائی اور اس کے بعد میرے ہول سیلز کو مال نہ خریدنے کا حکم دے دیا میں جیل سے باہر آیا تو

پہلا کاروبار تیار ہو چکا تھا میں گوزی گوزی کا تجارت تھا پھر سے پانچ لاکھ روپے لایا اور آج تک کامیاب

کرایہ نہیں ہوتا تھا میں نے پاسپورٹ بنوایا اور امریکہ چلا گیا میں امریکہ میں ایک نفسیات دان سے علاج کرانے کا میرے اعصاب تارل ہوئے تو اس نے ایک دن مجھے نذر پر بلایا اور مجھ سے کہنے لگا "سنو رشید میں سننا یہودی ہوں میرا والد نظر کے کپ میں نازی تشدد کا شکار ہوا تھا میں نے یہ منظر نہیں دیکھا لیکن جب میں نے تمہاری کہانی سنی تو مجھے محسوس ہوا میرے بزرگوں پر بھی اسی نوعیت کا ظلم ہوا ہوگا" اس کے بعد اس نے جیب سے ایک لٹافٹ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھا کہ بولا "تم نے آج تک مجھے جتنی فیس دی میں تمہیں دو واٹس لوٹا ہا ہوں" میں نے اصرار کیا تو وہ بولا "میں نے اگر تم سے فیس لی تو مجھے محسوس ہوگا میں نے اپنے مظلوم باپ سے فیس لی تھی؟" پھر پزیرشید کی آواز بھرا گئی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے شیشے سے باہر دیکھنا شروع کر دیا وہ بولے "میں امریکہ سے لندن آ گیا میرا علاج ابھی جاری ہے میں بڑی حد تک بہتر ہوں لیکن اب بھی روزانہ پردنک ہوتی ہے تو میں خوف کا شکار ہو جاتا ہوں میں بند کرے بس نہیں رہ سکتا اور میں سینما رنی دی نہیں دیکھ سکتا میں فلموں کا بہت شوقین تھا لیکن میں اب چھوٹا منہ سے زیادہ سکرین کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا میں اپنے ڈاکٹر سے کہتا ہوں اگر تم مجھے میری فلمیں دکھائیں کرو تو یہ بہتر بہت ہے! اسان دیکھا" دور کے اور دو بار دو بولے "مجھے لندن بہت اچھا لگتا تھا

لیکن میں یہاں بھی تین چار دن سے زیادہ نہیں رہا، مجھے اپنا ملک بہت عزیز تھا لیکن آج جب کوئی شخص میرے سامنے پاکستان کا نام لیتا ہے تو مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی، میں محبت وطن تھا لیکن ان تیس دنوں نے میری وطن پرستی ختم کر دی، میں اب دنیا کے کسی ملک کا شہری نہیں رہا، میں دن کو میاں صاحب کے دفتر چلا جاتا ہوں، شام تک کام کرتا ہوں، شام کے بعد سڑکوں پر مارا مارا بھرتا ہوں، ٹھک ہار جاتا ہوں تو کمرے میں آ کر تباہوں، میری ایک بیٹی پاکستان میں ہے، وہ رات کو لیڈ نہیں آتی، دوسری بیٹی مائٹرس میں پڑھتی ہے وہ میرے پاس آتی ہے تو مجھے کچھ کروانا شروع کر دیتی ہے اور میں ہفتے میں دو دن ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں، ڈاکٹر مجھے کہتا ہے تم لوگوں کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بتاؤ، تمہارا دل ہکا ہو جائے گا لیکن میں سوچتا ہوں، میں کس کو بتاؤں اور اس بتانے کا کیا فائدہ ہوگا، گھر میں اگر دروازے پر دستک ہو جائے تو منہ سے چیخ نکلی جاتی ہے اور باقی رات کھڑکی میں کھڑے ہو کر گزار دیتا ہوں، پر وزیر رشید نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

روڈ ٹکڑا اور میری آنکھوں میں آنسو تھے، رستوران میں بلا ٹکڑا کی تھی، لوگ چیخ رہے تھے، کچھ تیار ہے تھے لیکن اس میں کسے ستارے ایک دوسرے سے آنکھیں تیار ہے تھے، ہمارا کمانڈر تھا، چوڑھا تھا، لہائی ویٹس بار بار آتی تھی، ہمیں دیکھتی تھی اور واپس چلی جاتی تھی، میں نے پر وزیر رشید صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ان کا ہاتھ دبا کر عرض کیا، "میں آپ سے محبت کرتا تھا لیکن اب مجھے آپ پر پتھر ہے، چوڑھا صاحب نے دوسرے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور سسکی لے کر بولے، "کیا تمہاری محبت تمہارا فخر میری پاکستانیت واپس کر سکتا ہے، کیا میری خود اعتمادی، میرا فخر اور میری حسب الہی واپس آ سکتی ہے، کیا یہ مجھے میرا پرانا پر وزیر رشید واپس کر سکتا ہے، کیا یہ میری بیٹی کی نیند واپس آ سکتا ہے، کیا یہ میری بیٹیوں کے آنسوؤں کے داغ مٹا سکتا ہے اور کیا یہ میری ہنسی، میری مسکراہٹ واپس کر سکتا ہے، میں خاموش رہا، وہ بولے، "میں ہر بات بھولنے کیلئے تیار ہوں لیکن جب میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، میرا قصور کیا تھا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، اور میں اپنے آپ سے جانچنے لگتا ہوں، دور کے اور میری طرف دیکھ کر بولے، "تم بتاؤ، میرا کیا قصور تھا،" میں نے ہاں میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا، "آپ نے مجھ سے انکار کر دیا تھا اور کامیاب خریداروں کے سامنے جب کوئی مجھ سے انکار کرتا ہے تو وہ اسے توڑ دیا کرتے ہیں یا اسے روند دیا کرتے ہیں"

جو چلنا جانتے ہیں

وہ مزدور کا مقدر لے کر پیدا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے وژن، محنت اور ایمان غاری سے
 Kashif Azad@Qalbi.com

وہ 1926ء میں سویڈن کے ایک گاؤں Agonnaryd میں پیدا ہوا اس کے والدین ایک فارم ہاؤس ایلمٹاریڈ (Elmtaryd) میں مزدوری کرتے تھے اس کے والدین نے پانچ برس کی عمر میں اسے بھی مزدوری پر لگا دیا لیکن اس نے مزدور کی بجائے کاروبار کا فیصلہ کیا اس کا نام تین سال کی عمر میں رکھا گیا اس کے نام کے دو حصے تھے انگوار اور کیمپارڈ اس نے گیارہ سال کی عمر میں پچاس ٹروے کپڑے کیس، اہمپنسوں کے ڈبے لیتا اور سائیکل پر گئی گلی ماچیس پچا رہتا دو یہ کام چھ ماہ تک کرتا پھر اسے ایک دن معلوم ہوا کہ وہ شہر سے تھوک میں ماچس خریدنے اور یہ ماچس گھاؤں کے دکانداروں اور بھیری بازوں کو بیچ دے تو وہ زیادہ منافع کما سکتا ہے انگوار اگلے دن سٹاک ہوم چلا گیا اور وہاں سے تھوک میں ماچس خریدے لایا اس نے یہ ماچس تھوڑے سا منافع رکھ کر بیچ دیں اس نے اگلے سال تک ماچسوں کے کاروبار کو چھٹی کرکس ٹریڈنگ کمپنی کا ریزنڈنٹ پھولوں کے بیج، ہال پوائنٹس اور پینسلوں تک پھیلا دیا وہ یہ ساری اشیاء تھوک میں خریدتا تھا اور بعد ازاں گاؤں کے دکانداروں کو روکتا تھا وہ 6 سال کا ہوا اس کے والد نے اسے تھوڑے سے پیسے دیئے اس نے اسے مسولی سی رقم سے ایک ایسی کمپنی کی بنیاد رکھ دی جس نے

آنے والے دنوں میں پوری دنیا کا لائف سٹائل تبدیل کر دیا انکواری نے اس رقم سے وزن میں ہلکا لیکن رنگوں میں تیز فرنیچر بنا شروع کر دیا لوگوں کا خیال تھا اس کا آئیڈیا ناکام ہو جائے گا کیونکہ اس وقت نگزی کے بھاری بھر کم فرنیچر کاروان تھا لوگ ایک مرتبہ فرنیچر بنواتے تھے اور یہ فرنیچر تین نسلوں تک ان کا ساتھ دیتا تھا چنانچہ اس وقت یورپ میں فرنیچر ایک ایسی پراڈکٹ سمجھا جاتا تھا جس کی مانگ نہ ہونے کے برابر تھی اس وقت تک فرنیچر کے سنوراز اور شوروز بھی شروع نہیں ہوئے تھے لوگ ترکھانوں سے اپنی ضرورت کا فرنیچر بنالیتے تھے لیکن انکواری نے فرنیچر کو کاروباری شکل دینے کا فیصلہ کیا اس کا خیال تھا آنے والے دنوں میں پوری دنیا میں نقل مکانی شروع ہو جائے گی لوگ روزگار کیلئے آبائی شہروں سے باہر نکلیں گے لہذا اس نقل مکانی کے دوران بھاری فرنیچر کی نقل و حمل مشکل ہو جائے گی اس کا خیال تھا مستقبل قریب میں بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں مکانوں اور فلپوں کا ساتھ چھوٹا ہو جائے گا چنانچہ لوگوں کو چھوٹے ساتھ کے مکانوں کیلئے فرنیچر بھی چھوٹے ساتھ کا جائیے اس کا خیال تھا مستقبل رنگوں کا ورور ہوگا تاکہ نئے نئے رنگوں سے رنگین ہو جائے گی چنانچہ اس کے ان تمام نکات کو مدنظر میں رکھتے ہوئے ایسا (ikea) کے نام سے یورپ میں فرنیچر سازی کی پہلی کمپنی کی بنیاد رکھی۔

"اکیا" ایک لاطینی لفظ تھا یہ چار حرف آئی کے امی اور اے کا مجموعہ تھا اس نے چار حرف اپنے نام اور اپنے گاؤں سے لئے تھے آئی اس کے نام انکواری کو ظاہر کرتا تھا کے سے مراد کیمپا رو تھی امی کا تعلق اس نام ہاؤس ایٹلر یا ڈ سے تھا جس میں اس نے پرورش پائی تھی اور اے اس کے آبائی گاؤں Agunnaryd کا پہلا حرف تھا انکواری نے جب اپنی کمپنی کا نام "اکیا" رکھا تو لوگوں کا خیال تھا اس کے بزنس کی طرح اس کی کمپنی کا نام بھی لاطینی ہے لہذا یہ کاروبار اور یہ کمپنی دونوں چند ماہ میں نامی کا قصہ بن جائیں گے لیکن انکواری نے آنے والے دنوں میں لوگوں کے سارے خدشات باطل ثابت کر دیئے اس نے ساتھ میں چھوٹا وزن میں ہلکا اور رنگوں میں تیز فرنیچر بنوایا اور فرنیچر آنے والے دنوں میں دنیا کا لائف سٹائل بن گیا اس نے دنیا کی نفسیات اور طرز رہائش بدل کر رکھی "اکیا" میں برس بعد یورپ کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی اس کی یہ کامیابی اس کے وزن، محنت اور ایمانداری کا نتیجہ تھا اس نے وقت کی تبدیلی کو بھانپ لیا تھا وہ سمجھ گیا تھا چھوٹی اور کارآمد چیزوں کا دور آنے والا ہے لہذا مستقبل میں صرف وہی چیزیں کامیاب ہوں گی جو ساتھ میں چھوٹی وزن میں ہلکی اور استعمال میں آسان ہوں گی 1980ء میں اس نے بزنس کو ایک

اور کروٹ دی اس نے گھر میں استعمال ہونے والی ہر قسم کی مشینری بنانا شروع کر دی وہ اس وقت تکن میں استعمال ہونے والی چھوٹی میچ سے لے کر گھر میں استعمال ہونے والے ہاتھ نپ تک ہر چیز بنا رہا ہے اس کا کاروبار یورپ سے لے کر امریکہ تک اور وہی سے لے کر نیوزی لینڈ تک دنیا کے 34 بڑے نمائندگان میں پھیلا ہوا ہے اس کے سنورز پر وژنڈہ 900 ملین ڈالر کی سیل ہوتی ہے اور کہا جا تا ہے یورپ میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں "اکیا" کی کوئی نہ کوئی چیز نہ ہو مارچ 2007 کے تیسرے ہفتے میں فوربس انٹرنیشنل نے حور کے دس بیٹے کو دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص ایسٹیمیٹ کر دیا اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں 33 ملین ڈالر جمع تھے جبکہ اس کی دولت میں روزانہ ایک ملین ڈالر اضافہ ہو رہا تھا۔

انگوار کیمپارڈ ایک انتہائی دلچسپ شخص ہے وہ دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزارتا ہے وہ چند روزہ سال پرانی والو گاڑی استعمال کرتا ہے اپنی گاڑی خود چلاتا ہے ہمیشہ جہاز کی اکانومی کلاس میں سفر کرتا ہے اور اس نے سات سال کی عمر میں کرسس بیچے گا کا کام شروع کیا تھا وہ اب تک یہ کاروبار کر رہا ہے اور ہر سال ہر کسٹمر کو بیچتا ہے اور کسٹمر کے بعد ان کی بیچاری سیل لگاتا ہے اس کے لئے اس کے تمام ملازمین کو گاندھی دوکوں میں استعمال کرنے کا حکم دے رکھا ہے اس کے کسی دفتر میں اگر کوئی شخص ایک ست استعمال کر کے کاغذ روٹی کی نوکری میں پھینک دے تو وہ لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ سستے ریسٹورانوں میں کھانا کھاتا ہے اس نے چائیس برس قبل "اکیا" کے دفاتر اور فیکٹریوں میں ملازموں کیلئے سستا کھانا شروع کر لیا تھا وہ اگر کھانے کے وقت اپنی کسی فیکٹری یا دفتر کے نزدیک ہو تو وہ ہمیشہ "اکیا" کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھاتا ہے اور دو تین ڈالر یا ڈیڑھ ڈالر تک یا کراؤن بچا کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی فراخ دل شخص بھی ہے اس نے INGKA Fondation کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بنا رکھا ہے وہ اس ادارے کے ذریعے اب تک 36 ملین ڈالر کی چیرٹی کر چکا ہے دنیا کے نامور میگزین اکانوسٹ کے مطابق انگوار فلاح عامہ میں مل گینس کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقم خرچ کرتا ہے لیکن وہ اپنی چیرٹی کے کاموں کی تشہیر نہیں کرتا، لہذا وہ انیس کی خیرات اور فلاحی کاموں سے پوری طرح واقف نہیں اگر انگوار کیمپارڈ کی ذات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک "کبوتر بنی" محسوس ہوتا ہے وہ ایک طرف اپنے کسی دور کو ایک نیشنل ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ کاغذ کی دوسری پرت ضائع کرنے کے ترم میں اپنے ایجو ڈی تک کو فارغ کر دیتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ ایرون کٹہ ہیں ڈالر خیرات کر دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ تک کو شہر نہیں ہوتی اور

شاید اس وقت دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص ہوگا۔

مجھے انگوٹھ کا ایک انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس انٹرویو میں اس نے دو دلچسپ باتیں کی تھیں اس نے بنایا "دنیا میں نوکری کرنے والا کوئی شخص خوشحال نہیں ہو سکتا انسان کی معاشی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے کام کا آغاز کرتا ہے" اس کی دوسری بات اس سے بھی دلچسپ تھی اس کا کہنا تھا "کامیابی اور ترقی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کا کہنا تھا "اگر تعلیم سے روٹی کمائی جاسکتی تو آج دنیا کے تمام پرو فیسرا ب جی ہوتے" اس کا کہنا تھا "اس وقت دنیا میں ساڑھے نو سو ارب جی بی بی لیکن ان میں ایک بھی پرو فیسر یا کزن یا ماہر تعلیم شامل نہیں" اس کا کہنا تھا "دنیا میں ہمیشہ درمیانے پڑھے لکھے لوگوں نے ترقی کی یہ لوگ وقت کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے کی بجائے طالب علمی کے وہاں ہی میں کاروبار شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ان کی کامیابی انہیں کٹ یا یونیورسٹی سے سنوڈ کارخانے یا منڈی میں ملے جاتی ہے" اس کا کہنا تھا وہ زندگی میں کبھی کالج نہیں گیا لیکن اس وقت اس کی کمپنی میں 30 ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین دستورات کام کر رہی ہیں یہ تعلیم یافتہ لوگ ڈیڑھ لاکھ اور ماٹھ میں اس سے کہیں بڑھتی ہیں میں ان میں ایک خالی جگہ بھی ان میں نوکری پھیلنے کا حوصلہ نہیں تھا انہیں اپنے اور اپنی

ملا جیتوں پر اصرار نہیں تھا "اس کا کہنا تھا "اگر کوئی شخص انگوٹھ کیلئے مزدوری کر سکتا ہے تو وہ خود اپنے لئے بھی کام کر سکتا ہے میں اس کیلئے ذرا سا حوصلہ چاہیے" اس نے دنیا بھر کے نوجوانوں کو پیغام دیا "ترقی حیثیت کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے لیکن جوان ہونے تک اس کے پاؤں ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں" اس کا کہنا تھا "دنیا میں ہر چیز کا متبادل موجود ہے لیکن محنت کا کوئی شارت کٹ نہیں" اس نے کہا "دنیا کا کوئی کیسیائی عمل لوہے کو سونا نہیں بنا سکتا لیکن انسانی ہاتھ وہ طاقت ہیں جو دنیا کی ہر وحشت کو ہونے میں بدل سکتے ہیں" اس نے کہا "دنیا میں کئے لوگوں کیلئے کوئی جائے پناہ نہیں جبکہ کام کرنے والوں کیلئے پوری دنیا کھلی پڑی ہے" اس نے کہا "ہنرمند شخص کا ہنر اس کا پاسپورٹ ہوتا ہے" میں نے جب انگوٹھ کے یہ خیالات سنے تو میں نے سوچا کاش میں یہ خیالات پاکستان کے ان تمام بے روزگار نوجوانوں تک پہنچا سکوں جو دن رات بے روزگاری کا رونا روٹے رہتے ہیں کاش میں ان نوجوانوں کو متا سکوں اگر کارم ہاؤس کا ایک مزدور مسلسل محنت سے انگوٹھ بن سکتا ہے تو پاکستانی نوجوانوں کے ماستے میں کیا رکاوٹ ہے؟ یہ لوگ کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے انگوٹھ نے کہا تھا "آگے بڑھنے کا راستہ انہیں ملتا ہے جو چلنا جانتے ہیں" میرا خیال ہے ہمارے نوجوانوں کو چلنے کا ہنر نہیں آتا۔

اسن و امان

میں جوں ہی اندر داخل ہوا، مجھے محسوس ہوا میں ایک نامہ بان دنیا سے مہربان دنیا میں
 آئے ہیں وہ عالمی کے اعلیٰ سکون، اطمینان، خوشحالی اور امان اور شاندار دنیا میں نہیں رہے
 چہرے پر سکون اور آواز میں اطمینان تھا، تمام لوگ ترتیب دہلیقے اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے
 تھے۔ پورے دفتر میں مسادات تھی، چیف ایگزیکٹو سے چپڑا ہی تک اور ڈائریکٹر سے سوپر تک
 سب لوگوں کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ دفتر میں کوئی شخص کسی کو حکم دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی ملازم
 ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا، چیف ایگزیکٹو سے چپڑا ہی تک سب ایک ہی کیفے لیریا سے کھانا کھا رہے
 تھے، تمام لوگ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی بڑے خود اٹھاتے تھے اور سب کا کھانا یکساں تھا۔ تمام
 لوگوں کے پاس اپنی اپنی ذمہ داریاں تھیں اور ہر شخص اپنے کام کا ذمہ دار تھا۔ اس پوری عمارت میں
 اونٹنی آواز میں بات کرنا، تھنسی بجا کر دوسرے کو بلانا اور شوکا زفونس جاری کرنا ممنوع تھا، تمام لوگوں
 کے پاس چھٹیوں کے یکساں حقوق تھے لیکن جھمنی سے پہلے کام مکمل کرنا ضروری تھا۔ اس دفتر کا
 پہلا اور آخری اصولی بیج تھا، کوئی شخص کسی سے جھوٹ نہیں بولتا تھا، وہ بڑی سے بڑی غلطی کا
 اعتراف کرتا تھا اور اس کی اصلاح کا وعدہ کر کے دوبارہ کام پر لگ جاتا تھا۔ میں ساری عمارت میں
 گھوما، میں نے گینت سے پھرت تک ہر جگہ دیکھی اور مجھے تمام جگہوں پر مصفائی و خوبصورتی اور ذہن
 ملا۔ میں اپنے دوست کے کمرے میں آ گیا۔

میرا دوست کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا، اس کی میز پر پانی کا گلاس پڑا تھا، وہ گلاس سے ایک گھونٹ پانی پیتا تھا اور پھر دوبارہ کمپیوٹر پر مصروف ہو جاتا تھا۔ میرا دوست دس برس پہلے بے روزگار تھا، یہ اچھی ڈگریاں اٹھا کر نوکری کیلئے دھکے کھاتا تھا لیکن اسے کوئی کمپنی، کوئی فرم گھاس نہیں ڈالتی تھی، پھر اس نے اپنی فرم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس صرف دس ہزار روپے تھے، اس نے دس ہزار روپے لگا کر کمپنی رجسٹر کرائی اور اپنے بھوس بھوس کے دفتر میں میز لگا کر بیٹھ گیا لیکن صرف دس سال بعد اس کا "ٹرن اوور" دس ارب روپے سالانہ تھا، وہ دنیا میں اس کے 25 دفتر ہیں اور اس کے ہیڈ کوارٹر میں اڑھائی سو لوگ کام کرتے ہیں، گراچی میں اس کا بہت بڑا کمپلیکس ہے، اس کا کاروبار پاکستان سے افریقہ، چین، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ تک پھیل چکا ہے اور وہ بحری جہاز خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا اور میں اس کی کمپنی پر اتنی سفیدی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بالوں میں ذرا ذرا سی برف اترنا شروع ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک تازگی اور تڑپ تھی اور وہ کسی بھی طرح اسے بڑے کاروبار کا مالک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ لے کر دیکھے، وہ اتنے سوجھا ہوا ہے کہ میں نے اس کا ہاتھ لے کر دیکھا ہے۔

وہ میرے اوپر توجہ دینے لگا، کمپیوٹر کے ہٹوں سے کھیل رہا تھا۔ میں اس کی اس نے توجہ کی وجہ جانتا تھا، میں اپنے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ان دنوں منٹوں میں اپنا کام مکمل کرے گا اور اس کے بعد اپنا آؤٹ کھنڈہ میرے ساتھ گپ لگائے گا۔ میں نے یہ دس منٹ اس کے دفتر کے جائزے میں صرف کرنا تھے، میں نے ایک بار پھر صدارت کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ دس بائی بارہ کا ایک درمیانے درجے کا دفتر تھا جس میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی لیکن وہاں بے تحاشا سٹاف اور روشنی تھی۔

دس منٹ بعد وہ میری طرف مڑا، مجھے مسکرا کر دیکھا، میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے، اس نے کافی مشین سے کافی کے دو گگ بنائے، دونوں گگ میرے سامنے رکھے اور ہماری گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اس سے اس ترقی کا راز پوچھا، وہ انٹرا کمپیوٹر کے پاس پڑنی ایک تصویر اٹھائی اور لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ یہ چند ٹیلوں کی تصویر تھی، وہ دوبارہ واپس گیا اور ایک اور تصویر اٹھالایا۔ یہ تنگ پہاڑوں کے درمیان گھرے ایک پسماندہ گاؤں کا کچھ تھا۔ وہ واپس گیا اور تیسری تصویر اٹھالایا یہ گھر کا انسانی دیوتا تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ ہزاروں نیلے سفرت اور انہم کی جائے بیٹھائے ہیں۔ ان ٹیلوں کی

جگہ بھی دو شہر آباد تھا جس میں حضرت ابراہیم نے پرورش پائی تھی۔ اس نے دوسری تصویر پر انکی رنگی یہ دو تصویر ہی ہستی ہے جس جگہ آج دنیا کا سب سے بڑا روحانی مرکز قائم ہے۔ یہ مکہ کا پندرہ سو سال پرانا مکان ہے اور دو تیسری تصویر کی طرف مزایہ آج کا مکہ شہر ہے، یہ شہر آج دنیا کے خوشحال ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے پوچھا "لیکن ان تینوں تصویروں کا تمہاری کامیابی کے ساتھ کیا تعلق؟" وہ مسکرایا اور بولا "بہت گہرا تعلق ہے، میں نے جب یہ کہنی شروع کی تھی تو میرے پاس صرف ایک ملازم تھا، اس دور میں مجھے حضرت ابراہیم کی دعا پڑھنے کا اتفاق ہوا، حضرت ابراہیم جب حضرت باجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ کی بے آب و گیاہ اور ویران زمین پر چھوڑ کر واپس جا رہے تھے تو انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی تھی "اے پروردگار تو اس جگہ کو امن و امان کا شہر بنا، اے اور اپنے فضل و کرم سے اس شہر میں بسنے والے ان تمام لوگوں کو ہر قسم کا رزق عطا فرما، اے جو تجھ پر اور آخرت پر ایمان لے آئیں، وہ رکا اور دوبارہ گویا ہوا" میں نے جب یہ دعا پڑھی تو مجھے محسوس ہوا حضرت ابراہیم نے مکہ کی خوشحالی سے

پہلے امن و امان کی دعا مانگی تھی لہذا خوشحالی اور ترقی امن و امان کی دوسری بیجا ہے جس نے فوراً اپنی

توجہ امن و امان قائم کرنے کا حوصلہ کیا۔ میں جب کہ امن و امان کا ذکر مولا علیؑ نے کیا تو مجھے محسوس ہوا کہی بھی اوار سے، شہر اور کہنی میں اس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہو سکا جب تک وہاں میرٹ نہ ہو، جب تک وہاں مساوات نہ ہو، جب تک وہاں یکساں مواقع اور یکساں سہولتیں نہ ہوں، جب تک وہاں مالک اور ملازم کے حقوق برابر نہ ہوں اور جب تک وہاں گورے اور کالے، اونٹنی اور اٹلی کے لیے ایک قانون نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا جب تک لوگوں کو روزگار، تربیت، صحت اور انصاف نہیں ملتا اس وقت تک لوگ خود کو محفوظ نہیں سمجھتے اور جب تک لوگوں کو تحفظ کا احساس نہیں ہوتا اس وقت تک امن و امان قائم نہیں رہتا اور جب تک امن و امان قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اس اوار سے میں خوشحالی نہیں آ سکتی، میں نے اپنے اوار سے میں امن و امان قائم کرو یا چنانچہ آج تمہیں اس دفتر میں خوشحالی بھی نظر آ رہی ہے اور ترقی بھی۔"

وہ ذرا دیر تک کر بولا "آج سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم نے دنیا میں خوشحالی ترقی اور رزق کی فراوانی کا فارمولا طے کر دیا تھا چنانچہ جب تک کسی ملک میں امن و امان نہیں ہوتا اس وقت تک وہ ملک خوشحالی اور ترقی یافتہ نہیں ہو سکا۔ تم امریکہ سے لے کر جاپان اور ملائیشیا سے دوہنی تک دنیا کے تمام خوشحال ملکوں کا پر و خاں دیکھ لو جنہیں ان سب میں امن و امان

مشترک ملے گا اور تم روناٹھ اسے افغانستان اور برازیل سے پاکستان تک تمام غیر ترقی یافتہ ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں یہ تمام ملک "لائینڈ آرڈر" کے مسائل کا شکار ہیں گے لہذا فرد ہو یا ملک ہوں وہ دنیا میں اس وقت تک خوشحالی اور ترقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک وہ امن و امان قائم نہیں کرتے "وہ رکاوٹیں کر بولا" ہم ترقی اور خوشحالی کے لیے دنیا بھر کے ماڈل کاپی کر رہے ہیں لیکن ہم نے آج تک قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 126 نہیں پڑھی جس میں حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے کہہ کے شہر یوں کے لیے رزق سے پہلے امن و امان کی دعا کی تھی، ہم کتنے بے وقوف ہیں ہم قرآن مجید کو چھوڑ کر اس حد درجہ کے پیچھے پھر رہے ہیں جس کی اپنی ترقی امن و امان کی مرہون منت ہے، ہم نے ملحدی سائنس بھری اس کے خوشبو دار اور روشن دفتر کی طرف دیکھا اور باہر آ گیا، باہر بد بو بھی تھی اندھیرا بھی اور افراتفری بھی اس نے محسوس کیا، اگر ایک شخص امن کی بنیاد پر اتنی بڑی تبدیلی آسکتا ہے تو حکومت اس اصول کو قانون بنا کر پورا معاشرہ کیوں نہیں بدل سکتی مجھے سمجھ نہیں آئی لہذا میں آگے بڑھ گیا۔

Kashif Azad@OneUrdu.com



عصر کی قسم

میں نے عرض کیا "خواجہ صاحب سائنس نے کمال کر دیا، قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے رویوں سے بنتے تھے لیکن سائنس ان دونوں کے مل کے قریب پہنچ گئی ہے اب آج وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور غذاؤں کے ہاتھ سے نکل آئے گا، دو خشک زمیں کی طرف دیکھتے رہے، وہ نرم آواز میں بولے "مثلاً سائنس نے کیا کر دیا" میں نے عرض کیا "سر زلزلے، آتش فشاں، آنسو، طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں، سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سہم بنا لیا ہے، سائنس دانوں نے ایک ایسا کیمبرہ بنا لیا ہے جو آتش فشاں کے پھندے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی جہد لیاں نوٹ کر لیتا ہے، ماہرین یہ جہد لیاں دیکھ کر آئندہ پیش گوئی کر سکیں گے، فلاں آتش فشاں فلاں دن اور فلاں وقت اہل پڑے گا، اس سہم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں گے، یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی" خواجہ صاحب سکون سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی صلاح بھی بتائی ہے جو زمین کی تہ میں پچاس سانچہ کلومیٹر تک چلی جائے گی اور یہ زمین کے اندر موجود پلیٹوں کی حرکت نوٹ کرے گی، لہذا جو بھی کسی پلیٹ میں کسی قسم کی حرکت ہوگی، ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے، ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے اور وہ لوگ

زلزلے سے پہلے گھروں اور دفینوں سے باہر آ جائیں گے، یوں ہزاروں لوگوں زندگیاں بچ جائیں گی، ماہرین نے عمارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنائے ہیں جو سائز سے نوور ہے کی شدت سے آنے والے زلزلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچتے وہیں گے چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب زلزلے آئیں گے لیکن لوگ اطمینان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے، خوب صاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے، میں نے عرض کیا، 'بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں، سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے، ہمارے جینز میں سائز سے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں، بیماری کا ایک الگ جین ہوتا ہے، سائنس دانوں نے ازحالیٰ ہزار مہلک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں، لہذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا سائنس کریں گے، اس میں پروان چڑھنے والے جینز، بیکس گے اور ان جینز کو صحت مند جینز کے ساتھ بدل دیں گے، یوں مریش مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا، انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے، اگلے دس بیس برس میں انسان مرنے سے پہلے دوبارہ جنم لینا شروع کر دے گا،' خوب صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، 'میں نے عرض کیا، 'اس طرح سائنس دانوں نے انسان کو بیماریوں اور سٹرابوں کی بیماریوں سے آزاد کرانے میں کامیاب کر لیا، یہاں تک کہ وہ ان کا بہنا ہے، اگر ان آفتوں کے مراکز بنا کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہوں گی، سائنس دان ایسے آئے بھی بنا رہے ہیں جو ان ہواؤں، ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو انہیں ہو کر آندھی، سیلاب اور طوفان بنتی ہیں، چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پالے گا، لہذا خوب صاحب آنے والا وقت انسان کے لئے بڑا آئیڈیل ہوگا، دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیلنج نہیں ہوگا، لوگ مطمئن آرام و دوام و دوسری زندگی گزاریں گے،'

خوب صاحب نے تہہ بہہ لگایا اور مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے، 'تم بڑے بے وقوف ہو، یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا انسان انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا نقصان کبھی نہ پہنچے، وہ ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر انسان کو نہیں پہنچا سکیں، تم یہ دیکھ لو، 18 اکتوبر کے زلزلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے، اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سڑکوں پر حادثوں میں مارے جاتے ہیں، ہر سال مساپوں کے ہاتھوں جتنے مسافر قتل ہوتے ہیں، جتنے بیٹے اپنے باپ قتل کرتے ہیں، آتشاؤں کے ہاتھوں جتنے خاندان مارے جاتے ہیں، جتنے خاندان اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں، ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راگیر مارے جاتے

ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں یہ ساری بلائیں قدرتی آفتوں میں مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں۔ بیش جیسے لوگ اپنی اتا کی نسلیں کے لئے کتنے لوگ مارے جاتے ہیں اور بہت گرووں کے ہاتھوں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں، کشمیر، فلسطین، افغانستان، سری لنکا، عراق اور چینیا میں انسانوں کے ہاتھوں کتنے انسان مارے گئے، گورے کے ہاتھوں کتنے کالے مارے گئے اور سرخ رو انسان کتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، ناگاساگی پر بم کس نے پھینکا تھا، ایک انسان نے! اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان، دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی، ایک انسان نے، اس جنگ کا لقمہ کون بنے، دوسرے انسان، گوریا کی جنگ کس نے پھینکی تھی، ویتنام پر حملہ کس نے کیا تھا، روس افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی، افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے، اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا، انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست سب جا رہے ہیں، انسان کو انسان اور انسان اور انسان کے ساتھ نہیں، انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شہرت میں تہدلی نہیں آتی، یہ دنیا وارمن نہیں بن سکتی، اس زمین پر تخت کب تک عمل نہیں رکھ سکتا۔"

میں خوب صاحب کی بات غور سے سنتا ہوں، انہوں نے فرمایا، "انسان انسان سے خائف ہے، وہ جب بھی ذرا سا خوفشمال ہوتا ہے، اسے جب بھی ذرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے، وہ جب بھی ذرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے، وہ آہ کھا کر گھٹلیاں مسائے کے گھر پھینک دے گا، وہ دو لاکھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر بانٹھ دے گا، وہ ایٹم بم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے اور وہ بادشاہ کا صاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں، سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں، اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے، اس کے اندر بھی وہی خون، وہی اتا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے، لہذا انسان انسان کے ساتھ نگرا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں، چنانچہ انسان کی انسان کے ساتھ جنگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی، دونوں خسارے میں رہتے ہیں، یہ اس زمین کا قانون ہے، لہذا انسان جب تک مقدونہ، سرقد اور دانشمن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا، وہ جب تک دوسرے انسان پر مکرانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب

تک دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا اس وقت تک اس زمین پر امن نہیں ہوگا۔ میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا انہوں نے فرمایا "سائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرمت کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہیے انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہیے جسے کھانے کے بعد صدر بٹش اور صدرام حسین کی انا پر سکون ہو جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتا بند کر دیں جسے کھانے سے صدر پر ایڑ شرف اور نواز شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور وہ دونوں خود کو کزور اور چند سانسوں کے سہان انسان سمجھ لیں جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں جسے کھانے سے افغان انسان کو معاف کرے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکراتا بند کر دے"

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا انہوں نے فرمایا "یقین کر جا ایک جنگل میں دو شیر

سکون اور آرام سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک پھت کے نیچے دو انسان لڑے لگتے اور مرے انہیں

دو کی نہیں گزار سکتے۔ یہاں ایسے ہی ہندوستان کے انسان اور انسان کے درمیان ہے۔



سات جمع سات جمع ایک

بادشاہ نے عجیب خواب دیکھا، اس نے دیکھا "سات سوئی تازی گا، جس سات دہلی
 چنگ کا بیٹا اور کھارنی ہیں اور کھم کی سات ہری بھری بالیاں ہیں اور ماں کے فریب سات سوئی

بالیاں ہیں" بادشاہ نے اپنے درباریوں کو تعبیر لانے کا حکم دیا اور بارہوں نے بے شمار تعبیریں پیش
 کیں لیکن بادشاہ مطمئن نہ ہوا آخر میں بادشاہ کے ایک ساتی نے عرض کیا "حضور میں ایک قیدی کو
 جانا ہوں وہ تعبیروں کا ماہر ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے خواب کی شرح پوچھ لوں"
 بادشاہ نے اجازت دے دی ساتی قید خانے میں چلا گیا اللہ کے بندے نے خواب سننے ہی فرمایا
 "ملک پر سات سال خوش حالی کے بعد خشک سالی کا ایک خوفناک دور آئے گا یہ دو سات سال
 جاری رہے گا ان سات برسوں کے بعد بارشوں کا ایک سال آئے گا اس سال خوب بارشیں ہوں
 گی تم بادشاہ سے کہو وہ سات برس تک مسلسل کھیتی باڑی کرائے اس سے جو فصل حاصل ہوا اسے
 بالیوں سمیت ذخیرہ کر لے جب خشک سالی کے سات سال آئیں تو وہ یہ ذخیرہ شدہ اناج عوام میں
 تقسیم کر دے اس حکمت سے لوگ قحط سے بچ جائیں گے" ساتی یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس
 چلا گیا اس کے بعد کہانی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مگر یہ دور ہمارا موضوع نہیں ہمارا موضوع
 سات جمع سات جمع ایک سال ہے۔

یہ واقعہ حضرت یوسف سے متعلق ہے اور قرآن مجید سمیت تمام آسمانی کتب اس کی

حقانیت کی گواہی دیتی ہیں اس واقعے میں سائنس، ٹیکنالوجی، علم اور عبرت کی بے شمار نشانیاں پوشیدہ ہیں ان نشانیوں میں سے ایک نشانی "ویدر سائیکل" یا موسمیاتی دور ہے سائنس دانوں نے اس واقعے سے ہزاروں سال بعد یہ اندازہ لگایا دنیا کے مختلف خطوں میں سات سے پندرہ سال پر محیط دو قسم کے موسمیاتی سائیکل ہوتے ہیں پہلی قسم کے سائیکل کو دھت سائیکل یا مرطوب موسم کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ڈرائی سائیکل یا خشک موسم کہلاتی ہے یہ دونوں سائیکل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں دھت سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں خوب بارشیں ہوتی ہیں اس کے بعد بارشوں کی شرح کم ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے اور اس کے آخر میں ڈرائی سائیکل شروع ہو جاتا ہے اس سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں بارشیں تقریباً ختم ہو جاتی ہیں اور اس خطے میں قحط سالی اور خشک سالی کا آغاز ہو جاتا ہے یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے ان سات برسوں کے آخر میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اگلے سات برسوں میں بارشوں کی رفتار اور سائز میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جاتا ہے جب یہ سات سال پورے ہوتے ہیں تو دوبارہ دھت سائیکل شروع ہو جاتی ہے موسموں کے یہ سائیکل جو تینوں کا مستقل طے کرتے ہیں جو قومیں ان سائیکلوں کو مد نظر رکھ کر آبی ذخائر کا بندوبست کرتی ہیں جو قومیں دھت سائیکل میں اپنے ذخیم اور تحصیلیں بھرتی ہیں جو قومیں آنے والے موسموں کو سامنے رکھ کر فصلیں بولتی اور کاشتی ہیں اور جو قومیں قدرت کے اس فارمولے کو سامنے رکھ کر خوراک کے ذخیرے تیار کر لیتی ہیں وہ قومیں پوری آبرو کے ساتھ مشکل وقت سے عہدہ برآ ہو جاتی ہیں وہ خشک سالیوں اور قحط سے بچ جاتی ہیں لیکن جو قومیں قدرت کے اس نظام کے تیور نہیں سمجھتیں اور جو قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی تیار نہیں کرتیں وہ خشک سالی اور قحط کا شکار ہو جاتی ہیں وہ مسائل میں گھر جاتی ہیں اور ان کا حال مستقبل کے اندیشوں میں پھنکے لینے لگتا ہے۔

پاکستان میں 1998ء تک دھت سائیکل تھا اس دور میں پاکستان میں بے تہاشہ بارشیں ہوئیں ہم نے اس وقت سے پہلے قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر آبی ذخائر تشکیل نہیں دیئے تھے بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت ہماری زمین پر نازل ہوئی تو ہماری بے وقوفی کے باعث اس رحمت نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی اس دور میں پاکستان میں بے شمار سیلاب آئے ہمارے کئی شہر، قصبے اور دیہات اس سیلاب میں بہہ گئے ہم دنیا میں آفت زدہ علاقہ قرار پائے اس دور کے آخر میں 1999ء سے ہمارا ڈرائی سائیکل یا خشک دور شروع ہو گیا ہمارا یہ سائیکل پندرہ سال

جاری رہے گا 1999ء سے ہمارے ملک میں بارشوں میں کمی آنا شروع ہوئی 2006ء سے اس ڈرائی بیزن کی ایک شروع ہو رہی ہے یعنی 2006ء سے ہماری خشک سالی کے سات سال شروع ہو رہے ہیں ان سات برسوں میں ہمارا بلوچستان سندھ اور پنجاب خشک سالی سے بری طرح متاثر ہوگا یہ سلسلہ 2014ء تک جاری رہے گا اس کے بعد ہم ایک بار پھر دہشت بیزن میں داخل ہو جائیں گے 2014ء سے بارشوں کا ہلکا پھلکا سلسلہ شروع ہوگا یہ سلسلہ 2021ء تک چلتا رہے گا 2021ء سے ہماری بارشیں شروع ہوں گی اور اس کے بعد 2028ء تک اس خطے میں انتہائی خوفناک بارشیں ہوں گی ہمارے ملک میں اس قدر سیلاب اور طوفان آئیں گے کہ ہمیں پاؤں تک رکھنے کیلئے خشک زمین نہیں ملے گی لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں ہمارا فوری مسئلہ انتہائی خوفناک ڈرائی سائیکل ہے اور ہم اس سائیکل کے دبانے پر کھڑے ہیں ابھی کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کو اس سائیکل کا احساس ہے لہذا حکومت نے آنے والے برسوں میں صرف ان فصلوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جنہیں کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس دور میں زیادہ پانی پونے والی فصلوں کی حوصلہ دہنی کی جانے کی حکومت اس سال کپاس کے علاقے کو پانی دے گی

کوئٹہ اور گلگت بلتستان اور ایبٹ آباد و گمانے کی کھجوریں اور سیلابی نذرانہ

شاید آنے والے برسوں میں چینی اور چاول کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جائے، مجھے مزید محسوس ہوا یہ ڈرائی سائیکل جی جی کر رہا ہے ہمیں ملک میں نئے ڈیز اور جھیلوں کی اشد ضرورت ہے اگر ہم نے فوری طور پر بڑے پیمانے نہ کئے تو ہم آنے والے چند برسوں میں پانی کی ایک ایک بوہ اور رونی کے ایک ایک نوالے کو ترس جائیں گے جن لوگوں کو یقین نہ آئے وہ راول ڈیم کا ایک پیکر کالیں انہیں راول ڈیم کی خشک سطح سے ہمارے مستقبل کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا یقین کیجئے اگر ہم نے قدرت کا نظام نہ سمجھا تو یہ صورتحال پورے ملک میں پھیل جائے گی ہمارا پورا ملک راول ڈیم بن جائے گا۔

میں واپس حضرت یوسف کے واقعے کی طرف آتا ہوں جب انہیں قید سے نکال کر بادشاہ کے دربار میں لے جایا گیا تھا اور بادشاہ نے انہیں وزارت کی پیش کش کی تھی تو حضرت یوسف نے اپنے لیے پیداوار اور خزانے کی وزارت پسند فرمائی تھی بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو حضرت یوسف نے فرمایا "کیونکہ میں دیانت دار بھی ہوں اور صاحب علم بھی" اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آسوں کی ترقی کی بنیاد وضع کر دی ہے یہ بنیاد دیانت اور علم پر استوار ہے اللہ تعالیٰ کی نظر

میں جب کسی قوم کی پیداوار اور خزانے کی وزارت دیانت دار اور صاحب علم لوگوں کے پاس ہو تو وہ قوم ترقی کی معراج کو چھو لیتی ہے۔ کاشمیر میں بھی خزانے اور پیداوار کے شعبوں میں ایسے لوگ مل جائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم اور دیانت کی دولت سے نوازا رکھا ہو جو قدرت کا ساتھی جمع ساتھی جمع ایک کا نام سولا سمجھتے ہوں، جبر اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس ملک کے وسائل کی تشکیل کریں جو دینی پتلی گائیوں کو سوئی تازی گائیوں سے بچائیں جو ساتھی ہری بالیوں اور ساتھی خشک بالیوں کا فرق سمجھتے ہوں اور جو اس ملک کے ساتھ غلطیوں ہوں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

باب دولر جیسا دل

راہنما انڈر ریویو دولر عرف باب دولر اور پاکستانی قوم میں ایک واضح فرق تھا اور یہ فرق

قائم تک برقرار رہے گا۔
Kashif Azad@OneUrdu.com

باب دولر نے پچیس سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر 24 اگست 1972ء کو ٹیسٹ کرکٹ کرنا

اور 17 مارچ 2007ء تک کرکٹ کی دنیا میں رہا۔ باب دولر کا کرکٹ کیریئر عملی طور پر 1984ء میں ختم ہو گیا جس کے بعد اس نے ساؤتھ افریقہ میں ہائی اسکول کی کوچنگ شروع کر دی۔ وہ 1991ء میں وارک شائر کا کوچ بن گیا۔ وارک شائر نے اس کی کوچنگ میں چار ٹورنامنٹ کھیلے اور ان میں سے تین ٹورنامنٹ جیت لئے۔ وہ 1994ء میں ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا کوچ بن گیا۔ باب نے آٹھ سالوں میں ساؤتھ افریقہ کو کرکٹ کنٹری بنا دیا۔ 1994ء سے 1999ء ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا سنہری دور تھا۔ اس دور میں کرکٹ کے نئے نئے روڈ ز اور شان پولاک ایسے بہترین کھلاڑی پیدا ہوئے۔ یہ کھلاڑی باب دولر کی محنت کا نتیجہ تھے۔ باب دولر کی کوچنگ میں ساؤتھ افریقہ نے 73 فیصد ون ڈے انٹرنیشنل اور 10 ٹیسٹ سیریز جیتیں۔ 1999ء کے ورلڈ کپ میں باب دولر ساؤتھ افریقہ کا کوچ تھا۔ اس نے ورلڈ کپ کو اپنے لئے ہدف مقرر کر رکھا تھا لیکن بد قسمتی سے ساؤتھ افریقہ اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلے ہوئے اور ساؤتھ افریقہ جی ٹائٹل ہار گیا۔ باب دولر نے اسے اپنی ناکامی سمجھا لیا۔ اس نے کوچنگ سے استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان نے 2004ء میں باب

دولمر کی خدمات حاصل کیں اور پاکستان آبا اور اس نے ہماری حرکت ٹیم کی کوچنگ سنبھال لی۔ باب کا خیال تھا پاکستانی ٹیم اس کی قیادت میں 2007ء کا ورلڈ کپ جیت لے گی لیکن مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہوا تو پاکستانی ٹیم نے باب دولمر کو بلا کر رکھ دیا۔ 13 مارچ کو پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان پہلا میچ تھا پاکستان یہ میچ 54 سکور سے ہار گیا۔ دوسرا میچ 17 مارچ کو آئر لینڈ کے ساتھ ہوا آئر لینڈ تاریخ میں پہلی بار ورلڈ کپ کے میدان میں اترتا تھا لہذا ماہرین آئر لینڈ کی ٹیم کو "بی بی ٹیم" کہتے تھے میچ شروع ہوا تو آئر لینڈ کی بی بی ٹیم نے دنیا کی بہترین کرکٹ ٹیم کو 132 سکور پر آراڑا یا پاکستان نے باؤلنگ شروع کی تو آئر لینڈ نے 41 اوورز میں 132 سکور بنائے یوں پاکستان بچوں کے ہاتھوں ورلڈ کپ سے باہر ہو گیا۔ مبصرین نے پاکستان کی ناکامی کو "میچ گلنگ" قرار دے دیا۔ ماہرین کا خیال تھا آئر لینڈ "کرکٹ نورازم" کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب آئرلینڈ پاکستان جیسے کسی بڑے ملک کو شکست دے دیتی چنانچہ آئر لینڈ نے خزانے کے منہ کھول دیے۔ باب دولمر نے اس ناکامی کو سنبھالنے سے لے لیا وہ ہونٹل کے کمرے میں گیا، کرسی پر بیٹھا اس نے ناکامی کی وجوہات پر سوچنا شروع کیا اور اسے

پاکستان کی ناکامی اور وہ جتنا افسوس کرتا ہے اسے یہ یاد ہے کہ اس وقت وہ ایک اور ناکامی کا شکار تھا۔

جب ہماری کرکٹ ٹیم اپنی ناکامی کو اللہ تعالیٰ کا امتحان قرار دے رہی تھی اور قوم کو سیاہ کمرے ذبح کرنے اور گناہ روا کرنے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔

میں نے جب سے باب دولمر کے انتقال کی خبر پڑھی ہے، میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں پاکستان کی شکست پر ایک برطانوی کوچ کیوں مر گیا اور اس تاریخی ہزیمت پر جناب ذاکر نسیم اشرف اور سولانا انعام الحق کیوں زندہ ہیں؟ یہ سوال وہ فرق ہے جو پاکستانی قوم کو باب دولمر جیسے لوگوں سے الگ کرتا ہے۔ ہم لوگ بنیادی طور پر شیخ رشید کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اچھے ذہن ترین کے ایک حادثے کے بعد لوگوں نے شیخ رشید سے ریلے کی وزارت سے استنبیہ کا مطالبہ کیا تھا تو ہمارے سدا بہادر وزیر نے فرمایا تھا "میں وزیر ہوں، نہیں کاؤرٹور نہیں" شیخ رشید صاحب کے یہ خیالات پاکستانی قوم کا ڈٹن اور فلسفہ حیات ہیں اور یہ فلسفہ حیات ہماری جتا کی وجہ بھی ہے لہذا آپ دیکھ لیجئے 1976ء کے سامنے سے چیف جسٹس کی باعزت حراست تک ہم لوگ ہر قسم کے بحران میں نہ صرف زندہ رہے بلکہ شیخ رشید کی طرح عین تان کر دنیا میں چلتے پھرتے بھی ہیں یہ باب دولمر کی بد قسمتی تھی وہ پاکستان میں رہنے کے باوجود ہم سے عین تانے کا ٹھن نہ سکے سکا اگر وہ

یہ فن سیکھ لیتا تو وہ بھول کے تباہ کرے میں یوں نہ ادا جاتا، وہ نیکول چیف منصور الحق کی طرح وکٹری کا نشان بناتا ہوا اسلام آباد ایئر پورٹ پر اتارے، کیمروں کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور زیادہ بہتر مراعات پر زندگی گزارتا رہتا لیکن میں نے عرض کیا ناں باب دولہرا اور پاکستانی قوم میں ایک فرق تھا اور باب دولہر کی جان اس فرق نے لی تھی یہ فرق اخلاقیات کی لغت میں نہیں کہلاتا ہے، باب دولہر کا نہیں زندہ تھا وہ اپنے دل کے "نیب" کا سامنا نہ کر سکا لہذا اس نے جان دے دی۔

آپ باب دولہرا اور پاکستانی معاشرے کو مارچ کے مہینے میں رکھا کر دیکھئے '13 اور 17 مارچ کے بچوں سے پہلے پاکستان میں 9 مارچ کا "ورلڈ کپ" ہوا تھا اس ورلڈ کپ میں یونیٹارم میں طوبی جھبوریٹ جنرل پردین شرف نے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار رحیم چوہدری کو گھبرا کر غیر فعال کر دیا تھا نو مارچ تک دنیامیں 245 ممالک تھے۔ ان میں سے 202 ممالک آزاد ہیں اور ان میں سے 193 ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں، دنیا کے ان 245 ممالک 202 آزاد ملکوں اور اقوام متحدہ کی 193 ریاستوں میں پاکستان واحد ملک تھا جس کی تاریخ میں 9 مارچ

کا دن آیا تھا لیکن اس 9 مارچ کو پاکستان کے 16 کروڑ موم شیخ رشید بن گئے اور انہوں نے مسکرائے اور کہا کہ میں اس دن کے دن راہیروں میں چلتا ہوں، ہم ایسا کر سکتے ہیں، آپ حریف اور چیلنجر ہوتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے اس وقت پاکستان میں تیرہ ہزار شیخے 7 کروڑ 67 لاکھ 41 ہزار 3 سو چار شہری اور 16 کروڑ 4 لاکھ 21 ہزار 5 سو 12 لوگ ہیں لیکن ان لوگوں ان جموں اور ان تیرہ ہزار شیخوں میں صرف دیکھو، بچوں اور میڈیا کے کارکنوں نے 9 مارچ کے ظلم پر احتجاج کیا جبکہ باقی تمام لوگ گھر میں بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے، طاقت عباس اسلام آباد کے نامور وکیل اور میرے دوست ہیں، اگلے شام ان کا فون آیا تو میں نے ان سے عرض کیا "مارچ باب دولہرا اور دکھا، کامیاب ہے، آپ لوگوں نے پوری قوم کا فرض کفایا ادا کر دیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "اگر ہمارے ساتھ چند ہزار عام لوگ بھی شامل ہو جاتے تو ہم ملک میں انقلاب لے آتے۔" طاقت عباس کی بات درست تھی، 21 مارچ تک چیف جسٹس کی معطلی پر صرف 18 بچوں نے استعفیٰ دینے سے اود دکھا، نے صرف پانچ بڑے ججوں کے لئے لیکن اس کے باوجود ان استعفوں اور ان مارچوں پر نہ صرف حکومت کی ٹائٹلس کانپ گئیں بلکہ حکومت کو ٹیلی ویژن پر جھوٹ بولنے کے لئے کوئی وزیر نہیں مل رہا تھا، ذرا تصور کیجئے، اگر پوری مدیہ استعفیٰ دے دیتی یا پاکستان کے تمام جہاں لوگ سڑکوں پر نکل آتے تو حکومت کا کیا بننا؟ حکومت کہاں جاتی؟ لیکن بات

پھر باب دولر اور پاکستانی قوم کے فرق پر آ کر رک جاتی ہے اب دولر نے نیم کی ٹکست پر جان دے دی لیکن ہم لوگ جمہوریت اخلاقیات اور ضمیر کے سارے صحیح بارے کے باوجود صرف زندہ ہیں بلکہ اپنے کندھوں پر جرات اور بہادری کے تمغے بھی سجا رہے ہیں۔

میرا بس چلے تو میں پاکستان کے ہر شہر میں باب دولر کا مجسمہ بناؤں اور لوگوں سے درخواست کروں دو روزانہ گھر سے نکلنے کے بعد ایک منٹ کے لئے اس مجسمے کے قریب رک جایا کریں اور اس مجسمے کو دیکھ کر سوچا کریں کیا قوموں کے لئے ذری سبکی زندگی قیمتی ہوتی ہے یا ایک عزت و ارموت؟ لیکن شاید یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ زندہ ضمیر لوگوں کے مجسمے صرف ان ملکوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں لوگوں کے دلی زندہ ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم لوگ ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں 16 کروڑ لوگ تو ہیں لیکن کسی شخص کے جسم میں باب دولر جیسا دل نہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

ایک منٹ چودہ سیکنڈ

ولیم بیلیم امریکہ کا ایک ناکام گھاری تھا۔ اس کے والدین پولینڈ سے امریکہ آئے اور پوری زندگی خوش حال ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی تعلیم نہ ہو سکی، وہ صرف پانچویں گریڈ تک پڑھا۔

خواہش کہ وہ بیلیم کوڑے میں دے گئے، ولیم بیلیم نے آکاؤٹنگ کی تعلیم حاصل کی، اسے کارڈ سے واجبی ہی ڈگری ملی، وہ مختلف فنروں میں دھکے کھاتا رہا لیکن اسے اپنی خفاہ کے مطابق نوکری نہ مل سکی، اس نے ٹک آ کر امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی، وہ دفتر خارجہ کے کمپیوٹر سیکشن میں نچلے اور بے کاکٹرک بھرتی ہو گیا، ویت نام کی جنگ شروع ہوئی تو اسے امریکی حکومت کا ملازم ہونے پر شرمندگی ہونے لگی، اس نے استعفیٰ دے دیا، اس کے بعد اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ اخبار "ڈاشنگن فری پریس" نکالا، یہ ایک باغی اخبار تھا، لہذا یہ اخبار اس کا ذریعہ روزگار نہ بن سکا، یہ مشغلہ ختم ہوا تو اس نے لکھنے لکھانے کا پیشہ اختیار کیا، امریکی حکومت کی استعماری پالیسیاں اس کا موضوع تھیں، اس نے "ٹنگ ہوپ" کے نام سے کتاب لکھی لیکن یہ کتاب کامیاب نہ ہو سکی، اس کے بعد وہ مختلف اخبارات، رسالوں اور میگزینز میں مضامین لکھتا رہا لیکن اسے زیادہ قارئین نہ ملے، تاہم لیون کے بعد اس نے "روڈ سٹریٹ" کے نام سے ایک اور کتاب لکھی مگر یہ کتاب بھی اس کی پچھلی کتابوں کی طرح ناکام ہو گئی، وہ تھک گیا، اس کی عمر 74 سال ہو گئی تھی لہذا اس نے ریٹائر ہو جانے کا فیصلہ کیا، اس نے ڈاشنگن ڈی سی میں ایک کمرے کا سٹوڈیو

فلٹ لیا اور اس فلٹ میں بجائی کی زندگی گزارنے لگا اور سارا دن ٹیلی ویژن دیکھتا اخبارات پور کتابیں پڑھتا اور سوجاتا اس کی واحد تفریح مع لکھی کت ایجوکیشن کا پتہ لگانا تھا ذرا اپنے فلٹ سے اترتا اور جگہ جگہ قدموں سے اس ایجنٹ کے ایک سرے سے دوسری سمت تک جاتا اور وہاں سے واپس آ جاتا اس کی خوراک انتہائی کم اور ضروریات زندگی نہ ہونے کے برابر تھیں ہنذا پیش اور کچھ ناکام کتابوں کی کمائی سے اس کا گزارہ ہو جاتا تھا لیکن بھرچا تک اس کے مقصد کا سہہ پونکا اور وہ امریکہ کا مشہور ترین شخص ہو گیا ایک دن میں اس کے لئے دو ہزار ایک سو اسی نئی فون کا ٹرا آئیں یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ نئی فون کپٹی کی لائیں جام ہو گئیں فروری کے مہینے میں امریکی اخبارات میں اس کے فلٹ کی اتنی تصویریں شائع ہوئیں کہ لکھی کت ایجو پر پراپنی کی قیمتیں اور گناہوں گئیں ولیم ہیلیم اس کے مقصد کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ہاتھ تھا۔ جی ہاں یہ اسامہ بن لادن تھا جس نے یوز صمد ولیم ہیلیم کی قسمت بدل دی۔

جنوری کے آخری ہفتے میں اسامہ بن لادن نے اپنی نئی کیسٹ جاری کی تھی اس کیسٹ میں انہوں نے بٹن سمیت تمام امریکیوں کو مخاطب کیا اس خطاب میں انہوں نے ولیم ہیلیم اور اس کی کتاب "ورگٹ نیٹ" کا ذکر کیا اور پوری امریکی قوم کو مشورہ دیا "لکھ آج ایک امریکہ کو بھاننا چاہتے ہیں تو آپ ولیم ہیلیم کی کتاب پڑھیں یہ شخص تمام امریکیوں سے زیادہ ذہین اور سمجھدار ہے اسامہ بن لادن نے ولیم ہیلیم کا لکھا ہوا ایک بیروگراف بھی پڑھا اس بیروگراف میں ولیم ہیلیم نے لکھا تھا "اگر میں امریکہ کا صدر ہوتا تو میں چند دنوں میں امریکہ پر ہونے والے خطرے کو اسکتا تھا" میں سب سے پہلے ان تمام بیوہ خواتین اور یتیم بچوں سے معافی مانگتا جو امریکی حملوں کا شکار ہوئے اس کے بعد میں امریکی بربریت اور تشدد کے شکار لوگوں سے معافی مانگتا اور اس کے بعد میں ان کرداروں لوگوں سے معذرت کرتا جو امریکہ کی نوا دیا جاتی سوچ کا نشانہ بن رہے ہیں یوں میں چند دنوں میں امریکہ کے خلاف موجود نفرت مٹا دیتا" اسامہ بن لادن کے ان الفاظ کی دہر تھی ولیم ہیلیم چند گفتگوں میں امریکہ کا "باٹ ایک" بن گیا اسامہ بن لادن کی اس مہربانی سے پہلے ولیم ہیلیم کی کتاب "ایمازائل ذات کام" پر دو لاکھ 5 ہزار 7 سو 65 ویں نمبر پر تھی لیکن جوں ہی اسامہ بن لادن کے مدد سے ولیم ہیلیم کا نام لگا تو 24 گھنٹے میں ولیم ہیلیم کی کتاب 26 ویں نمبر پر آئی امریکہ کے گیارہ بڑے پرنٹنگ پریسوں نے دو دو سٹیشن میں کام کیا اور تب جا کر اس کتاب کی مانگ پوری ہوئی ولیم ہیلیم نے صرف ایک مہینے میں ایک سو لاکھ ڈالر کمائے وہ شخص جو چند روز جنوری تک دوسری ڈش روٹی کا کاروبار نہیں تھا وہ چند روزی تک ارب پتی بن چکا تھا اور اس کے گھر کے

سامنے ہائٹس کی لائن لگی تھی یہ تمام لوگ اس کے ساتھ نئی کتابوں کا معاہدہ کرتا چاہتے تھے لیکن ولیم ہیلیم ان لوگوں کو اپنے نئے سیکرٹریوں کے حوالے کر کے گالف کھیلنے چلا جاتا تھا، ولیم ہیلیم کو اس وقت تک امریکہ کی 18 اور یورپ کی 21 یونیورسٹیوں سے خطاب کی دعوت مل چکی ہے جبکہ سو کے قریب نوخیز خواتین اس کے ساتھ شادی کی تمنیٰ ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے وہ شہرت، وہ نیک نامی اور وہ دولت جو اسے چالیس برس کی مسلسل محنت سے نل سکی وہ دولت اور وہ شہرت اسے اسامہ بن لادن کے ایک منٹ چہرہ سیکنڈ کے ذکر سے دی، ولیم ہیلیم دنیا کی مشہور شخصیت بن گیا۔

میں نے جب ولیم ہیلیم کا یہ واقعہ پڑھا تو یقین کریں مجھے بڑی گلن ہوئی، مجھے ولیم ہیلیم اپنا ڈائن محسوس ہوا اور میں نے سوچا میں بھی دو کتابوں کا مصنف ہوں اور یہ کتابیں پچھلے پانچ برس سے ٹھیک ٹھاک برنس کر رہی ہیں لیکن انیسویں اسامہ بن لادن کو یہ کتابیں دیکھنے کی تو فیس نہ ہوئی، اگر وہ ان پر ایک نظر ڈال لیتے اور اپنی اس کیسٹ میں آدھا منٹ میرا ذکر کر دیتے تو آج میں بھی ارب بتی ہوتا، میرے گھر کے سامنے بھی گھرے نصب ہوتے اور دنیا جہان کے رپورٹرز میرے

تعارف میں ہوتے اور میں اپنے نئے سیکرٹریوں کے حوالے کر کے گالف کھیلنے چلے جاتا۔

میں بھی کیوں بے انتہائی مہنت، کارڈز، یہ تا اور یہ سگار سٹاک کر پوری دنیا کو شہرہ رسید کی طرح نفرت سے دیکھتا، مجھے محسوس ہوا اگر اسامہ بن لادن کے دل میں اپنے پاکستانی بھائیوں کے لئے ذرا سی بھی ہمدردی ہوتی تو آج میں بھی امیر ہوتا لیکن انیسویں انہوں نے جب کسی غریب مصنف کو ٹاکوہ پہنچانے کا فیصلہ کیا تو ان کی نظر انتخاب بھی امریکی رائیٹر پر ہی پڑی، انیسویں بھی امریکی ہی پسند آیا، گواس سارے کھیل میں مجھے اربوں روپے کا نقصان پہنچ چکا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے خوشی ہے عالمی مارکیٹ کے ہاتھ اپنی مصنوعات کی پلٹنی کے لئے ایک نیا طریقہ آ گیا ہے، اب اگر کوئی جو نئے بنانے والی کھنی ذیجات کے قریب پہنچے گی تو اس کی کوشش ہوگی وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسامہ بن لادن کو قائل کر لے اور وہ اپنے خطاب میں امریکیوں کو اس کھنی کے جوتے استعمال کرنے کا مشورہ دے ویں، اسی طرح وہ جو کمپیوزر استعمال کرتے ہیں، وہ جس کھنی کے مشروبات اور تھوہہ پیتے، وہ جس کھنی کا ٹوتھ برش اور پیسٹ استعمال کرتے ہیں، وہ جس کھنی کا تولیہ، انڈر وئیر، بنیان اور کھنی استعمال کرتے ہیں، وہ جس کھنی کا آئینہ آئین لگاتے ہیں، وہ جس کھنی کا شہد اور گھجور میں کھاتے ہیں، جس نسل کی بکری کا دودھ پیتے ہیں، جس ٹیکسٹائل کا کھدہ پہنتے ہیں، جس برائے کا کرنگ آئل استعمال کرتے ہیں، جس کھنی کا موبائل اور ریڈیو خریدتے ہیں اور وہ جس

کبھی کا سائیکل اور موٹر سائیکل استعمال کرتے ہیں یہ تمام کمپنیاں بھی کسی نہ کسی طرح اسامہ بن لاڈن کو اپنے اپنے برادر کا نام لینے پر قائل کر لیں گی اور اس کے بعد ان کے شورز کے سامنے خریداروں کی قطاریں لگ جائیں گی، مجھے یقین ہے اگر ایک ہارڈ ویئرینڈ چل نکلا تو مستقبل میں ایڈور ٹائزنگ کا سارا اسٹاکس بدل جائے گا، کمپنیاں، چھوٹی، موٹی اور کالی مائزنگی بجائے اشتہارات میں اسامہ بن لاڈن کی تصویر شائع کریں گی اور اس کے بعد اعلان کریں گی یہ وہ صابن ہے جس نے اسامہ بن لاڈن کو چستی دی اور وہ جس برس تک امریکہ کے قابو میں نہ آئے یہ وہ اگر تھی ہے جسے سلا کر وہ تو رابورا کے پہاڑوں میں سکون کی نیند سوتے تھے یہ وہ درمی ہے جسے نے کر وہ کاٹل سے فرار ہوئے تھے اور یہ وہ تیل ہے جس کی ماش نے انہیں ہر قسم کی شرمندگی سے بچائے رکھا اور اس پوسٹل میں وہ بیٹا ستر ہیں جو ان کی اصل طاقت ہیں وغیرہ اور لوگ ان چیزوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میں اس ٹیم میں اربوں روپے کا "لووزر" ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے فخر ہے کہ وہ اسامہ بن لاڈن جنہیں اس وقت امریکہ سمیت پوری دنیا دہشت گرد کہتی ہے ان کے اٹھاروں میں آئی طاقت اتنی قوت ہو چکا ہے کہ وہ امریکہ کے 74 سال کے ایک عربیہ ناکام اور گرفتار مصنف کو ایک منٹ 14 سیکنڈ میں ارب بقی مانا سکتے ہیں، وہ ایک گم نام شخص کو شہرت کی بلند یوں تک پہنچا سکتے ہیں، وہ ایک گشودہ پسماندہ اور محروم شخص کو ٹیلی ویژن سکرین پر لے آتے ہیں اور وہ دوا لاکھ 5 ہزار 65 سو 7 روپے پر پڑی کتاب کو چوبیس گھنٹوں میں 26 دین پوزیشن پر لا سکتے ہیں، وہ رووی کی دکانوں میں کپے والی کتاب کو کاؤنٹر اور بک شیلڈ میں لا سکتے ہیں۔ میرا جوئی ہے یہ وہ طاقت ہے جس سے ہٹ سمیت دنیا کے تمام حکمران محروم ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت صرف اسامہ بن لاڈن کو بخشی ہے۔

صرف ایک پلے کارڈ

جبران ہاشمی پاکستانی برطانوی شہری تھا وہ 20 برس کی عمر میں برطانوی فوج میں شہری ہوا وہ 2004ء میں افغانستان میں تعینات ہوا اور 2006ء میں طالبان کے خلاف لڑتے ہوئے

جاں بحق ہو گیا 'جبران ہاشمی کی ہلاکت کی خبریں برطانوی میڈیا میں آئیں تو برطانیہ کی پاکستانی کیونٹی میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی پاکستانیوں کا خیال تھا امریکہ اور برطانیہ افغانستان میں مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں لہذا کسی مسلمان کو ظلموں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے 2006ء کے آخر میں کسی رکن اسمبلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں حکومت سے پوچھ لیا 'برطانوی فوج میں کتنے مسلمان افسر ہیں؟' حکومت نے انکشاف کیا کہ برطانوی فوج میں 330 مسلمان سپاہی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لوگ پاکستانی برطانوی شہری ہیں پاکستان کیونٹی نے اس انکشاف پر بھی برا سنا یا پاکستانیوں نے میڈیا، مساجد اور کیونٹی فنکشنرز کے ذریعے برطانیہ کی فوج میں موجود مسلمان فوجیوں کے خلاف تحریک شروع کر دی وہ پاکستانی برطانوی فوجیوں کو افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے مسلمانوں کی یہ مہم بہت جلد برطانوی پولیس اور ایجنسیوں کی نظر میں آ گئی یہاں تک کہ 31 جنوری 2007ء کو میڈی لینڈز کا ڈسٹریکٹ نیر ازم یونٹ نے ویسٹ میڈی لینڈ پولیس اور لندن میٹرو پولیٹن پولیس کی مدد سے ہرنگھم شہر میں پاکستانیوں کے 12 گھروں پر ریزہ کیا اور 8 پاکستانی نوجوان گرفتار کر لئے برطانوی پولیس کا کہنا تھا یہ نوجوان برطانوی فوج میں

موجود کسی مسلمان فوتی کو اغواء کرنے ان کا سرا جہ کرنے اور اس کی ویڈیو شیپ نشر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے یہ نوجوان اس عمل سے برطانوی فوج میں موجود مسلمان سپاہیوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس ابتدائی تفتیش میں نوجوانوں کے خلاف الزامات ثابت نہ کر سکی مقامی آبادی نے بھی نوجوانوں کے کردار اور اچھی عادات کی گواہی دے دی برطانوی تجزیہ نگاروں کا بھی کہنا ہے فوجی پلیئر کی حکومت اپنی ناکامیوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے اس قسم کے جھکنڈے استعمال کر رہی ہے وہ امریکہ کی طرح برطانوی عوام کو بھی یہ سکورتی کے بخار میں مبتلا کرنا چاہتی ہے اور وہ برطانیہ میں مسیاتیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنا چاہتی ہے یہ ایک صورتحال تھی اب دوسری صورتحال ملاحظہ کیجئے۔

31 جنوری کو جب پولیس نے پاکستانی مسلمانوں کے گھروں پر ریڈ کیا اور پوری دنیا کے سینڈیا پراس کی کوریج شروع ہوئی تو برصغیر کے گوروں نے پولیس کی اس حرکت پر شدید غصے کا اظہار شروع کر دیا برصغیر کی چار بڑی تنظیموں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف ملے کارڈز لکھے اور یہ کارڈز لکھنے والے گروں نے ایک اور کارڈ لکھا کہ "I am Offended" یہ خاتون کا کھڑے ہوئے ان لوگوں کا کہنا تھا حکومت نہ صرف ان کے شہر کو بدنام کر رہی ہے بلکہ وہ برصغیر کے مسلمانوں اور مسیاتیوں میں کشیدگی بھی پیدا کر رہی ہے میں نے دوفروری کے ایک پاکستانی انگریزی اخبار میں اس نوعیت کی ایک تصویر دیکھی یہ برصغیر شہر کے ایک فٹ پاتھ کی تصویر تھی تصویر میں چند طالب علم فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے جبکہ ان کے سامنے ایک بزرگ خاتون ہاتھ میں سفید رنگ کا پلے کارڈ اٹھا کر کھڑی تھی پلے کارڈ پر لکھا تھا "I am Offended" یہ خاتون انگریزی اور یقیناً عیسائی بھی ہوگی میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے وہ منظر وہ پلے کارڈ اور وہ بزرگ خاتون میرے دماغ میں چبھ گئی ہے میں بری طرح اس منظر کا حصہ بن گیا ہوں میں پچھلے چار پانچ دنوں سے جہاں بھی جاتا ہوں یہ تصویر اور یہ منظر میرے ساتھ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں معاشرے اور ملک میں بزرگ خاتون جیسے لوگوں کی وجہ سے زندہ اور تابندہ رہتے ہیں جن لوگوں جن معاشرہ میں اوگ زیادتی پر احتجاج کرتے ہیں جن میں لوگوں کا ضمیر اور احساس زندہ ہوتا ہے صرف انہیں معاشرہ کو حساس اور متحرک قرار دیا جاسکتا ہے ہم برطانیہ اور امریکہ کے اقدامات کو برا کہتے ہیں ہم امریکی اسرائیلی اور برطانوی سازشوں کی مذمت بھی کرتے ہیں لیکن ہم اس بزرگ خاتون جیسے لوگوں کو بھلا دیتے ہیں ہم بھول جاتے ہیں امریکہ اور برطانیہ کی

حکومتوں اور عوام کی سونچ میں بڑا فرق ہے صدر ریش اور لوٹی بلینر خالم ہیں ان کی پالیسیاں زیادتی پر مبنی ہیں لیکن برطانیہ اور امریکہ کے عوام کا رویہ مختلف ہے 2003ء امریکہ اور برطانیہ میں عراق پر حملے کے خلاف تاریخی جلسوں نکلے لندن میں 12 لاکھ لوگوں نے جلوس نکالا جبکہ واشنگٹن اور نیو یارک میں 25 لاکھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے امریکہ میں ووکر صدر ریش کے پتے جلانے 'مجھے اچھی طرح یاد ہے برطانیہ میں نکلنے والے جلوسوں میں لوگوں نے ایسے پلے کا وہاں اٹھارے کھے تھے جن پر صدر ریش اور لوٹی بلینر کی تصویر تھی صدر ریش کے پاؤں میں ایک کتابچہ تھا صدر ریش نے اس کی ذمہ داری سنبھالی تھی اور اسے کی شکل برطانوی وزیراعظم سے ملتی تھی۔

ہم اس کے مقابلے میں اگر مسلمان بالخصوص پاکستانی عوام کے احتجاج کا ڈیٹا جمع کریں تو ہمیں معلوم ہوگا ہماری نفرت صرف زبان تک محدود رہتی ہے ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر حکومتی اقدامات کی مذمت کرتے ہیں ہم صرف ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرتے ہیں اور اس سرگوشی کو اپنا فرض سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں پچھلے پانچ برسوں میں پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ لیکن اس پر عوام کا رد عمل کیا تھا؟ مکمل خاموشی پاکستان میں 26 لوگ گھردن سے غائب ہیں ان لوگوں کا کیا جرم تھا؟ ان کا جرم تار و دروازہ اور واٹس ایپ تھی لہذا یہ لوگ گھروں سے غائب کر دیئے گئے ان لوگوں کی تشددی پرامریکہ اور برطانیہ کے اخبارات شورو کر رہے ہیں غیر ملکی ٹیلی ویژن چینل ان پر ٹکس چلا رہے ہیں لیکن ہمارے اپنے لوگوں نے اس پر مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے آپ کراچی سے لے کر طورخم تک پاکستانی عوام کا رد عمل دیکھ لیجئے کیا کسی طرف سے کوئی آواز کوئی چیخ اٹھ رہی ہے بد قسمتی سے کوئی نہیں! ہم لوگوں سے تو اتنا بھی نہیں ہو پایا کہ ہم دس روپے کا پلے کارڈ لیں اس پر سیاہ مار کر سے "I am Offended" لکھیں اور اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہو جائیں، ہم مقامی سیاستدانوں کے دفتروں پولیس سٹیشنوں اور ایس سٹاپوں کے باہر کھڑے ہو جاتے ہم اس طرح اپنا احتجاج دیکھا دڑا کر سکتے تھے ہمارے وزیرستان میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں وہشت گردی کی مذمت میں وہشت گردی ہو رہی ہے وانا میں وضو کرتے بچوں پر میزائلوں کی بو چھاڑ کر دی جاتی ہے اور اس بو چھاڑ میں نوے نوے لوگ شہید ہو جاتے ہیں لیکن اس ظلم اس زیادتی پر ہمارا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم نے آج تک ان لوگوں کیلئے کسی قسم کا احتجاج کیا؟ کیا ہم نے انہیں اپنی بھاری اور محبت کا یقین دلایا؟ کشمیر پر پاکستانی حکومت کیا قدم اٹھانے والی ہے پوری دنیا اب تک اس قدم سے واقف ہو چکی ہے لیکن ہم نے عوامی سطح پر اس کا

کتنا نوٹس لیا؟ ملک میں ہنگامی اور بے روزگاری کا کیا عالم ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس پر احتجاج کیا؟ حق تو یہ ہے ہم میں سے کسی نے آج تک سراخا کر نہیں دیکھا؟ ہم نے کبھی سوچا اور دی کا مسئلہ کس سطح پر پہنچ چکا ہے اور ہر سال بسنت کے موقع پر لاہور میں کتنے بچے ذبح ہو جاتے ہیں؟ اور کیا ہم نے آج تک بسنت کے خلاف کوئی جلوس نکالا؟ آج تو یہ ہے ہم بنیادی طور پر بے حسنی کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں غیرت، ضمیر اور احساس جیسے لفظ دم توڑ جاتے ہیں، جہاں انسان گوشت کا ایک بے حس عکرا بن کر رہ جاتا ہے۔

مجھے برصغیر شہر کے فٹ پاتھ پر کھڑی اس بڑی گوری نے احتجاج کا ایک نیا طریقہ سکھا دیا، میں نے سوچا کاش ہم لوگ اس عورت کی بھڑکی کریں، ہم آج سے انفرادی سطح پر یہ فیصلہ کر لیں، ہم جب بھی کسی ظلم کسی زیادتی سے متاثر ہوں گے، جب بھی ہمارا دل ٹوٹے گا تو ہم ایک پلے کارڈ لیں گے، اس پر مجھے یہ فیصلہ منظر نہیں یا میں اس سے اتفاق نہیں کرتا یا یہ زیادتی بند کریں جیسے الفاظ لکھیں گے اور ایک آدھ گھنٹے کیلئے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جائیں گے، ہم سند سے کچھ نہیں بولیں گے، کوئی نعرہ نہیں لگا، نہیں گے، کوئی گائی نہیں دیں گے، ہم کوئی پتھر نہیں پھینکیں گے اور ہم کسی کو دھکی نہیں دیں گے، لیکن ایک آدھ گھنٹے کے کارڈ دکھانے کے بعد ہمیں گے اور وہاں پہلے جائیں گے، مجھے یقین ہے ہمارا یہ خاموش احتجاج ظلم کی بنیادیں تک بلا دے گا، یقین کیجئے جو کام دس لاکھ بدعائیں مل کر نہیں کر سکتیں وہ کام ایک پلے کارڈ ایک گھنٹے میں سرانجام دے دیتا ہے۔



رائٹ اپروچ

استحاج کا ایک طریقہ انڈونیشیا کے لوگوں نے اپنایا، انڈونیشیا میں پنڈویرتاس نام کی ایک گیس کھنی کا ذکر کرتی تھی۔ یہ کھنی ہڈیڑ سا مگیا، جسے انڈونیشیا میں ایک بڑی بلیکٹ تھی، ان کے قریبی رشتے دار اس کھنی کا انتظام دائرہ انصرام چلا رہے تھے، پنڈویرتاس نے جاوا میں گیس کے کنوئیں کھود رکھے تھے، پچھلے سال جولائی میں جاوا کا ایک کنواں پھٹ گیا اور کنوئیں سے مٹی اڑنے لگی، یہ مٹی مٹی تھی اور یہ گارے کی صورت میں فضاء میں تیرنے لگی تھی، یہ مٹی جاوا کے پانچ سو دیہات میں پھیل گئی، لوگوں کے کھیت، دکانیں، گاڑیاں اور گھر برباد ہو گئے، فضاء میں گیس اور مٹی کی آلودگی سے آکسیجن کے مسائل پیدا ہوئے اور لوگوں کے لئے سانس لینا دو بھر ہو گیا، فضاء کی آلودگی کی وجہ سے دس ہزار دیہاتی جاوا سے نقل مکانی کر گئے، یہ ایک سنگین مسئلہ تھا، مٹارٹین نے کھنی کے خلاف جٹوں نکالنے، اخبارات میں بیان دیے اور جلسے کئے، حکومت نے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے متاثرہ علاقوں میں ماہرین کی ایک ٹیم بھجوا دی، پنڈویرتاس کو ایک آدھ ٹونس بھی جاری کر دیا گیا لیکن مسئلہ حل نہ ہوا، لوگوں نے جب حکومت کی سر دھری دیکھی تو انہوں نے احتجاج کا یہ انوکھا طریقہ وضع کر لیا۔

انڈونیشیا کے وفاقی دارالحکومت میں متاثرہ علاقوں کے بے شمار لوگ راجے تھے، ان لوگوں نے ایک یونین بنائی، 26 ستمبر 2006ء کا دن متعین کیا، اس دن جاوا کے ہزاروں لوگ

گھروں سے نکلے ان کے ہاتھوں میں گارے اور کوزا کرکٹ سے بھرے شاپنگ بیگ تھے یہ لوگ سماجی سببوں کے وزیر اور ریاض انگری کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچے اور انہوں نے یہ شاپنگ بیگ وزیر کے گیت کے سامنے الٹ دیے ایک گھنٹے میں وزیر کے گھر کے سامنے کوزے کرکٹ کا پہاڑ کھڑا ہو گیا پولیس نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن بعد ازاں وہ بھی اس اٹوٹھے احتجاج کو "انجوائے" کرنے لگی اور ریاض انگری نے میونسپل کارپوریشن کے محلے کو طلب کر لیا "کارپوریشن کا محلہ سارا دن کوزا کرکٹ صاف کرتا رہا" شام تک کوزا کرکٹ اور گارے صاف ہو گیا لیکن اس کی بدبو باقی رہی مظاہرین نے اس کے بعد میڈیا سے خطاب کیا "ان کا کہنا تھا جاوا کے پانچ سو ویسٹ کے ہزاروں شہری پچھلے دو ماہ سے اس صورتحال کا شکار ہیں اگر حکومت ایک وفاقی وزیر کے گھر سے کوزا کرکٹ اور گارے اٹھا سکتی ہے تو وہ سٹارٹین کے مکاناتوں سے گارے کیوں صاف نہیں کر سکتی" سٹارٹین کا کہنا تھا اگر حکومت نے پنڈ ویرنٹس پر پابندی نہ لگائی اور اگر حکومت نے سٹارٹین کو برجانہ اوان کیا تو وہ تمام ذریعوں کے گھروں کے سامنے کوزے کے ذخیرہ لگا دیں گے۔ لوگوں کا کہنا تھا وہ جاوا سے تپتے کرکٹ کرکٹ تک انسانی ذمہ داریاں گئے تمام لوگ شاپنگ بیگ میں گارے بھر رہے ہیں اور یہ شاپنگ بیگ ایک سے دوسرے سے دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے شخص سے ہوتے ہوئے جگرتے پھینچیں گے اور یوں ہم جاوا کا سارا گارے جگرتے منتقل کر دیں گے۔ حکومت کے لئے یہ دھمکی "اڈامنگ" تھی چنانچہ کابینہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا اور اگلے ہی روز مظاہرین کے تمام مطالبات مان لئے گئے انڈونیشیا میں فضائی آلودگی کا قانون پاس ہوا اور سٹارٹین کی بحالی تک پنڈ ویرنٹس کے تمام "آپریشن" روک دیے گئے پنڈ ویرنٹس نے مشینری منگوائی اور اس مشینری کے ذریعے جاوا کی فضا صاف کر دی۔

انڈونیشیا کے اس احتجاج کی دو بڑی خوبیاں تھیں ایک مظاہرین نے احتجاج کے دوران شہر کی کوئی حق توڑی کوئی نافرمانی کسی دکان مکان اور گاڑی پر حملہ کیا اور نہ ہی ٹریفک بلاک کی لوگ اپنی اپنی گاڑیوں اور سائیکلوں پر آئے اپنے شاپنگ بیگ وزیر کے گھر کے سامنے لائے اور پیچھے ہٹ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے یونین کے صدر نے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں کو اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتایا اور یہ لوگ پراسن طریقے سے منتشر ہو گئے اس احتجاج کی دوسری خوبی نفسیات تھی جاوا کے لوگ جانتے تھے حکومت اور حکومت کے کابینہ سے جگرتے میں بیٹھ کر گارے کوزے کرکٹ اور بدبو کی تنگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے لہذا

جب تک وہ حکومتی عہدہ داروں کو ان مسائل سے نہیں گزاریں گے حکومت متحرک نہیں ہوگی چنانچہ جہاد کے لوگوں نے سماجی وزیر کے گھر کے سامنے کوزا کرکٹ اور گارے کا پہاڑ کھڑا کر دیا اور حکومت کو مسئلے کی سنگین کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ اگر یہ لوگ اس کے برعکس پاکستانی طریقہ استعمال کرتے یہ ٹریک بلاک کرتے 'شیشے توڑتے' گاڑیاں جلا دیتے اور سڑکوں پر نکل کر گالیاں دیتے تو اس کا وہی نتیجہ نکلتا جو پاکستان میں لکھنا ہے پولیس آتی 'آنسو گیس چلتی' لاشیں چارج ہوتی سینکڑوں ہزاروں لوگ زخمی ہوتے اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

مجھے بچھلے دنوں برادر مہیمل صالح حیات کے شہر جھنگ جانے کا اتفاق ہوا مجھے وہاں چند ٹوٹے 'ٹے' ان لوگوں نے بتایا انگریز نے 1904ء میں جھنگ کو سرگودھا سے ملانے کے لئے دریائے ریل بنایا تھا 'یہ برج' 'چنڈیل' 'کھلاتا' ہے 'یہ ریل وادی سے نریک کے ذریعے جھنگ کو باقی ملک سے ملاتا ہے' یہ اس علاقے کا واحد ریل تھا لہذا جب موزگارڑیاں شروع ہوئیں تو یہ بھی اس ریل سے گزرنے لگیں 'ساتھ برسوں میں گاڑیوں کی تعداد میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا لیکن ریل نہیں بنائی

ہل ایٹی طبی عمر چوری کر چکا ہے۔ یہ کسی بھی وقت بڑے حادثے کا باعث بن سکتا ہے' جھنگ کے محکمہ سائنس برائے ریل کے سٹیشن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ صدر چوہدری شریک 'سابق وزیر و محکمہ ہندوستان'

ظفر اللہ جمالی گورنر پنجاب اور وزیر اعلیٰ پنجاب ریل کی تعمیر کا وعدہ بھی کر چکے ہیں لیکن یہ ریل نہ بن سکا' ان لوگوں کا کہنا تھا جو حکومت ایک ریل نہیں بنا سکی وہ کالا باغ ذیم کیا بنائے گی 'میں شس ہزار اور میں نے ان سے عرض کیا 'اسلام آباد اور جھنگ میں بڑا فاصلہ ہے ہماری آدمی حکومت جھنگ کے نام سے واقف نہیں ہوگی 'ہمارے صدر اور ہمارے وزیر اعظم آج تک جھنگ نہیں آئے لہذا ان لوگوں کو جھنگ کے مسائل کا کیسے علم ہو سکتا ہے؟ اگر اسلام آباد میں کوئی ریل ٹوٹتا ہوتا 'کوئی سڑک خراب ہوتی یا کسی تالے سے بدبو اٹھ رہی ہوتی تو شام سے پہلے اس کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے 'کیوں؟ کیونکہ اسلام آباد حکمرانوں کا شیرے اور خیر ان ان سڑکوں اور ان ریلوں سے روز گزارتے ہیں 'اگر آپ چنڈیل بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے اپنا مسئلہ حکمرانوں تک پہنچانا ہوگا اور اس کیلئے آپ کو انڈین شیا کے لوگوں کی تھلید کرنی چاہئے۔

اگر ہم غور کریں تو جھنگ کے لوگ ہیں 'شیخوپورہ' 'نکا' صاحب 'فیصل آباد' مظفر گڑھ' راجن پور' اوکاڑہ' رحیم یار خان' ذمیرہ 'غازی بنوں' 'الندی کوئل' 'حیدر آباد' 'دادو' 'تربت' یا پھر جن کے لوگ انہیں سب سے پہلے حکومت کی توجہ حاصل کرنی چاہئے 'انہیں اپنا مسئلہ مذہب اور شناخت

طریقے سے حکومت تک پہنچانا چاہیے، انہیں چاہئے یہ جاوا کے لوگوں کی طرح متعلقہ وزیر کے دروازے کے سامنے گارے کا پہاڑ کھڑا کریں اور جب وزیر صاحب گھر سے باہر آئیں تو بڑی عاجزی سے عرض کریں "سرسی ڈی انے کا ٹلا اگلی آئے گا اور یہ گند اٹھا کر لے جائے گا لیکن سرہارے شہر کا گند کون صاف کرے گا" ان لوگوں کو چاہیے یہ اسلام آباد لاہور کراچی پشاور اور کوئٹہ کی کسی اہم سڑک کے کنارے بیٹھ جائیں اور اس سڑک سے گزرنے والے ہر اہم شخص سے عرض کریں "جناب آپ کی سڑک اور پل تو بہن چکا ہے لیکن ہمارا چنڈ پل اور ہماری سڑک کون بنائے گا" اس سے بھی اچھا نسخہ پانڈرشپ ہے مثلاً جنگ کے تمام لوگ "پلہنڈ" قائم کریں، سارا شہر اس فنڈ میں پیسے ڈالے اور اس کے بعد حکومت سے درخواست کرنے، جناب ہم نے اتنے پیسے جمع کر لئے ہیں باقی پیسے آپ ڈالیں اور مہربانی فرما کر ہمارا پل بنا دیں، یہ مسائل حل کرنے کی "رائٹ اپروچ" ہے دنیا میں سب سے بڑا اور مستحیظ رشتہ بچے اور ماں کا تعلق ہوتا ہے لیکن ماں بھی اس وقت تک بچے کو دور نہ نہیں دیتی جب تک وہ روتا نہیں، ہمارے ملک کو بھی ایسے عوام مانگیں جو تہذیب اور شائستگی کے دائرے سے نکل کر روکنے والے بنتے ہیں، جانیں۔

Kashif Azad@OneUrdu.com



صرف چند نو جوان چاہئیں

یہ آئیڈیاس کا تھا اس آئیڈیے پر کام کس نے شروع کیا کسی کو معلوم نہیں! اگر کسی کو

معلوم بھی ہے تو بھی اتنی تفصیل اتنی گہرائی تک جاننے کی کیا ضرورت ہے! ہمیں تو صرف آئیڈیے تک محدود رہنا چاہیے، اس آئیڈیے تک جو واقعی لاجواب ہے جو حقیقتاً بے مثال ہے۔

امریکہ میں ایک این جی او ہے اس کا نام "فوڈ بینک" ہے۔ اس این جی او کے کارکنوں نے دیکھا امریکہ میں روزانہ ہزاروں نین خوراک ضائع ہوتی ہے لوگ ریسٹورانوں میں آتے ہیں کھانے کا آرڈر دیتے ہیں تو روزانہ کھاتے ہیں اور باقی "ڈسٹ بن" میں پھینک کر چلے جاتے ہیں، فائے شمار ہوٹلوں میں سو رہتا ہے اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک ہے وہاں کو انی اور سینڈ راک کے نام پر روزانہ لاکھوں نین خوراک ضائع ہوتی ہے۔ اس کی وجہ فائے شمار ہوٹلوں کا عالمی قانون ہے فائے شمار ہوٹلوں میں اگر گاہک کو کوئی ڈش سرد کر دی جائے اور گاہک اسے بخیر چھوڑے نہیں کرے تو بھی وہ ڈش ضائع کر دی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہوا فائے شمار ہوٹلوں خوراک کو ضائع کرنے کیلئے ہر ماہ لاکھوں ڈالر خرچ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسی امریکہ میں ہزاروں لاکھوں لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ ہر سال امریکہ میں سینکڑوں واقعات سنا سنے آتے ہیں جن میں لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں جب یہ دونوں حقیقتیں ان لوگوں کو معلوم ہوتیں تو ان لوگوں نے سوچا ہم کیوں نہ ایک ایسا ادارہ بنائیں جو خوراک کی زیادتی سے پریشان لوگوں

سے غذایہ کر کے ان لوگوں تک پہنچانے جو ذہل رونی کے سوسکے نکلروں کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں ان کی آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا ہے اور ان کی رگیں ان کی نہیں پت من کی رسیاں بن جاتی ہیں۔ خیال اچھا تھا یہ لوگ سیدان میں کود پڑے این جی اور حسرت کرائی انہوں نے اس کا نام فوڈ بینک رکھا تا نیا سار ہونٹوں میں گھسے اور انتظامیہ کو کھنایا، اگر آپ لوگ خوراک صنایع کرنے کی بجائے ہمیں دے دیا کریں تو لاکھوں لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے انتظامیہ کو کیا چاہیے تھا؟ انہیں ہر ماہ اس کام کیلئے ہزاروں لاکھوں ڈالر خرچ کرنا پڑتے تھے لہذا وہ فوراً مان گئے اب یہ ہوتا تھا "فوڈ بینک" کے کارکن مخصوص اوقات میں مختلف ہونٹوں میں جاتے تھے وہاں سے خوراک کے پیکٹ اٹھاتے تھے انہیں ہنتر لاتے تھے کھولتے تھے صاف کرتے تھے گرم کرتے تھے دوبارہ پیک کرتے تھے گاڑیوں میں رکھتے تھے اور ان بستیوں میں چلے جاتے تھے جہاں زندگی شرمندگی کا کبل اور حے کسی نہایت و بندہ کی خنجر ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا فوڈ بینک کا نینہ درک وسیع ہوتا گیا ہونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا خوراک وصول کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی این

جی او کے کارکنوں میں بھی اضافہ ہوا۔ محض حضرات بھی تو تھے اور یوں یہ ادارہ بڑھنے لگا۔ ہونٹوں اور لوگوں کو دیکھ کر ہنسا ہنسا کرے اور وہیں ہنسنے کا نالک بن گیا۔ ان کے اداروں میں کھانوں کو محفوظ رکھنے میں گرم کر کے اور انہیں پیک کرنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں کھانا آتا ہے نرالہ کے اندر ہی صاف ہوتا ہے گرم ہوتا ہے پیک ہوتا ہے اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کر تقسیم ہو جاتا ہے جو باقی بچ جاتا ہے وہ ان نرالوں کے فریجوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایک انداز سے کے مطابق یہ این جی او ہر سال تین لاکھ خوراک ضرورت مندوں تک پہنچاتی ہے۔

یہ ایک "کانز" ملک کی بات ہے ایک ایسے ملک کی بات جس سے 156 اسلامی ممالک کے عوام نفع سہ کرتے ہیں لیکن اس نفع کے باوجود اگر ہم یہ نیڈیا لیس اس پر عملدرآمد شروع کرویں تو میرا خیال ہے ہمارے ایمان پر لیکر نہیں آئے گی ہمارے ملک میں بھی روزانہ سینکڑوں ہزاروں ن خوراک صنایع ہوتی ہے۔ ہم صرف رمضان میں بحرین اور اظفاری کے وقت کتنی خوراک صنایع کرتے ہیں۔ اگر کوئی ادارہ ریسرچ کرے تو مجھے یقین ہے اعداد و شمار ہزاروں ن سے اوپر چلے جائیں گے۔ ہمارے ریسٹورانوں ہمارے فائینڈیشن ہونٹوں ہماری وجوہوں اور ہماری پارٹیوں میں کتنا رزق صنایع ہوتا ہے اگر کوئی شخص جائزہ لے آ کانون کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو جائے ہم لوگ رمضان میں جتنا عین لگی اور چینی استعمال کرتے ہیں اتنا ہم جمہوری طور پر سال بھر میں خرچ نہیں

کرتے اور ہم اس ایک مہینے میں جتنی بھجور کھاتے ہیں اتنی ہم پانچ سال میں استعمال نہیں کرتے ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف ہر شہر کے اندر اور ہر شہر کے باہر ایسی ہزاروں جگہ آبادیاں ہیں جن میں زندگی کا ایک ہی مقصد ہے مردی کی چاہ سنا اور خوراک کا راستہ دیکھنا۔ ہمارے ملک میں اس وقت ایسا کرنا کے قریب ایسے لوگ ہیں جو گرمی اور سردی میں کھلے آسمان تلے بھوکے پڑے رہتے ہیں ان لوگوں کو زندگی کی حرارت کے لئے کھانا چاہیے ان لوگوں سے ذرا بڑے پورا افغانستان بھوکا ہے اور کرنا لوگ درختوں کی چھال اور کچا پھرا کھانے پر مجبور ہیں ان لوگوں کو خوب کھانے کا سامان دینا چاہیے جیسا کہ 62 ہزار ٹن خوراک چاہیے جبکہ امریکی ہم افغانستان کی ستر فیصد زمین ختم بنا چکے ہیں اور پچھلے دو برس سے ان کی زمینوں پر کھوٹیں اگانا حالات میں یہ لوگ ہماری عمریوں اور ہماری نظاریوں کے صحیح صحیح دار ہیں۔

یہ درست ہے ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے ہم غریب ہے ویسا اور غیر منظم لوگ ہیں ہم "نوڈ پیک" جیسے ادارے نہیں بنا سکتے لیکن ہم نوڈ پیک جیسی چھوٹی چھوٹی "کمپنیاں" تو ڈال سکتے ہیں ہر شہر پر جسے اور جو چھلے کے چند نو جوانوں کو روکے ہوئے ہوں گے "نوڈ پیک" تو ڈال سکتے ہیں جو کھر کھر جا کر لوگوں کو بھانسیں کہ آپ اب انظار پر سو روپے خرچ کرتے ہیں اور آپ اس پر نو سو روپے خرچ کر لیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا ہر کھلے سے ایسے نو جوان باہر آئیں جو یہ سالن یہ دنیاں اور یہ دی دیں روپے ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو اپنی اپنی دہلیزوں پر بیٹھ کر سحری اور انظار کا لطف لینے والوں کے دل نرم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں جو اللہ کے دینے رزق سے تمہارا سا حصہ ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو زندگی کی سخت جگہ میں پس رہے ہیں اور اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں لیکن شاید ہمیں 16 کروڑ لوگوں سے چند ایسے نو جوان بھی نہ مل سکیں جو اللہ کیلئے باہر نکلیں ہم کتنے بد نصیب لوگ ہیں پہلے ہم میں مطالبہ کرنے اور نہ کرنے اور حق کو حق کہنے کی جرأت ختم ہوئی اور اب ہم میں نیکی کرنے اور نہ کرنے کا جذبہ بھی مفقود ہو جا رہا ہے۔



چنوں کا لفافہ

میں نے چنوں کے آخری دانے میں ڈالنے کاغذ کے لفافے کی گیندی
 بنانے کے لیے یہ لفافے ڈالنے کی بات میں نے کی ہے۔ اس کی طرف توجہ دینا چاہیے۔
 بچپن کا کچھ سوچا اور اب اس آگیا لفافے کی گیند اسی طرح میری سٹی میں رہی تھی۔

مجھ سے کالج اور یونیورسٹیوں کے اکثر نوجوان مطالعہ کرنے کا طریقہ پوچھتے ہیں وہ
 پوچھتے ہیں 'ہمیں کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں' ہمیں کون سا علم کہاں سے حاصل کرنا چاہیے
 اور ہم پڑھی ہوئی چیزوں کو کیسے یاد رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سوال ہمیشہ میری دلچسپی کا
 موضوع رہے ہیں 'میں ان سے کہتا ہوں بھائیو اور بہنو! مطالعہ ایک شوق نہیں ایک عادت ایک لذت
 ہوتی ہے جس شخص کو یہ لذت پڑ جائے اسے پھر اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی آپ
 مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہیں یہ لذت کیسے پڑتی ہے؟ ہم مطالعے کو اپنی عادت کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس کا
 صرف ایک طریقہ ہے آپ اپنی زندگی کا ہر اضافی لمبہ ہر اضافی لمحہ مطالعے کو دے دیں 'میں نے
 ایک لمبی عید و جمعہ کے بعد مطالعے کو عادت بنا لیا ہے میرے سامنے جو چیز پڑی ہوتی ہے میں اسے
 اٹھا تا ہوں اور پڑھنا شروع کر دیتا ہوں 'میں ڈائمنگ نیپل پر بیٹھا ہوں تو ٹیلیفون اٹنی کر کے کھینچی کا
 نام پڑھنے لگتا ہوں 'چنوں' چنوں اور کاتوں پر کھدے مار کے اور نشان دیکھنے لگتا ہوں 'اخبار کا
 کراہل جائے' نشوونما کا ڈبہ ہوا 'اکابر' ڈبہ ہوا 'گولڈن کی ڈبہ' ہوا کوئی بیگزین ہوا سامنے کوئی سانس

بورڈ ہونے کے سنے پرگی نیم پلیٹ ہو یا بینک کے فریم پر کندہ لفظ ہوں میں فوراً پڑھنا شروع کر دیتا ہوں میری یہ عادت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ میں غیر ممالک کے سفر کے دوران مقامی اخبارات اور میگزین تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں ان کی زبان میرے لئے انجینی ہوتی ہے لیکن میں تصویروں اور نقوشوں کی مدد سے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں ایک بار میں نے ہسپانوی زبان کا اخبار خریدا اور ایک دوست کی مدد سے اس کی ساری سرخیاں پڑھ گیا اس مشقت کے دوران میں خود کو ہسپانوی زبان کا ٹھیک ٹھاک "عالم" سمجھنے لگا میں جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی کاغذ دریافت کر لیتا ہوں اور گفتگو کے دوران آنے والے وقتوں میں وہ کاغذ پڑھ جاتا ہوں میری جیب اور میری ڈائری میں بھی اکثر کوئی نہ کوئی تراشا کوئی نہ کوئی مضمون پڑا ہوتا ہے میں اگر ٹریٹیک میں پھنس جاؤں یا مجھے کسی کا انتظار کرنا پڑے تو میں فوراً یہ تراشا نکالتا ہوں اور اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں رہی کتابیں اور اخبارات تو ان کے بارے میں میرا خیال ہے دنیا کی کوئی کتاب فضول اور کوئی اخبار بیکار نہیں ہوتا اور جو شخص روزانہ دو گھنٹے مطالعہ نہیں کرتا اسے خود کو پڑھا لکھا نہیں کہتا چاہے اس کی ساری سندس اور ساری ڈگریاں ضبط ہو جانی جائیں نہ تو صحیح مطالعے کی بات اب میں آپ کو ایک اور دلچسپ عادت بتاتا ہوں پچھلے تیس برس سے میں جب بھی بازار سے کوئی سودا خریدتا ہوں اور دوکاندار مجھے یہ سودا کسی اخباری کاغذ میں لپیٹ کر دیتا ہے یا یہ سودا مجھے کسی کتاب یا اخبار کے ورق سے بٹے لگانے میں ملتا ہے تو میں وہی پروہ لٹاؤ دو کاغذ سیدھا کر تا ہوں اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھ جاتا ہوں اس عجیب و غریب عادت کی وجہ میری عجیب و غریب سوچ ہے میں سمجھتا ہوں خوراک کی طرح فقرے اور لفظ بھی آپ کا رزق ہوتے ہیں اور قدرت مختلف حیلوں اور بہانوں کے ذریعے یہ رزق آپ تک پہنچاتی ہے چنانچہ یقین کیجئے آج تک وہ تمام لفظ اور تمام فقرے جنہوں نے میری زندگی میں بنیادی کردار ادا کیا جنہوں نے میری سوچ میرے عمل کے سارے دھارے بدل دیئے وہ فقرے وہ لفظ مجھے انہیں قانون اخبار کے انہیں کئے پڑے کاغذوں سے ملے چنانچہ میری زندگی میں یہ لگانے بڑے قیمتی ہیں۔

دیکھئے بات کہاں سے چلی اور کدھر لگی گئی میں آپ سے عرض کر رہا تھا میں چٹوں کا لٹاؤ ڈسٹ بین میں جھینکتے گا لیکن کچھ سے کی نوکری کے قریب پہنچ کر ایس آ گیا مجھے اچانک یاد آیا میں یہ لٹاؤ پڑھے بغیر پھینک رہا ہوں میں واپس گاڑی میں بیٹھا کاغذ کی گیند کھدنی لٹاؤ سیدھا کیا اس کے کنارے کھولے اور اسے چھوٹی میں پھیلا کر پڑھنے لگا یہ نفسیات کی کسی کتاب کا

ایک ورق تھا اس ورق پر ولیم جیمز کا ایک نہایت خوبصورت فلسفہ درج تھا میں ولیم جیمز کے بارے میں دیکھتا جانتا تھا یہ ایک معروف نفسیات دان تھا اور خود کو سنگنڈ فرائنڈ کا شاگرد کہتا تھا باقی اس نے زندگی میں کیا کیا کام کئے ہیں ان سے نا ابلد تھا لیکن اس کا جذبہ پرورج و فلسفہ کمال تھا اس نے کہا "انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے مثلاً اگر وہ دیکھی ہو تو وہ روتا ہے وہ خوش ہو تو وہ ہنستا ہے وہ غصے میں آئے تو وہ چیختا چلاتا ہے وہ محبت کرے تو وہ پکارتا ہے لہذا یہ سب ہے وہ خوش ہو تو وہ بھانگتا ہے وہ کامیاب ہو تو چھلکتا ہے لگتا ہے تانیاں دیتا ہے اور وہ بھوکا ہو تو نمدید چینی کا مظاہرہ کرتا ہے" ولیم جیمز کی یہ بات یہاں تک تو عام روزمرہ کا مشاہدہ تھا لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے "اگر انسان اس عمل کو اندر سے وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص بنڈا ریلیکس بیٹھا ہو وہ اٹھے اور اٹھ کر ناراضگی اور غصے کی ایک سنگ شروع کر دے وہ چیختے چلانے لگے تو تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حقیقتاً غصہ پیدا ہو جائے گا اسی طرح اگر کوئی شخص غصے سے بچتا رہتا ہو لیکن وہ اور بری دل سے خوش مزاجی اور وضع زاری کی ایک سنگ شروع کر دے وہ چہرے پر مسکائی مسکائی اور وہ گوارا سے ناگوارا ہوتے ہی اس کو برداشت کرنے کو زمانہ پر بعد خوش مزاجی اس کے غصے کی جگہ لے لے گی وہ حقیقتاً خوشگوار اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا" ولیم جیمز کے ان الفاظ نے میرے اوپر جاوڑی کام کیا ان دنوں میری شکر عروج پر تھی شکر کا ایک اثر انسانی مزاج پر بھی مرتب ہوتا ہے انسان پشمرہ اور آس اور تڑپار بنے لگتا ہے وہ مرکورس ہو جاتا ہے بلکہ جس قولہ میں ماخذ مذکورہ ایسی بات اسے بد مزاج اور لڑا کا بنا دیتی ہے ان دنوں میری شکر آؤٹ آف کنٹرول تھی لہذا میں ان دنوں خود کو تنہا اور اس محسوس کرتا تھا لوگوں کی ہنسی لوگوں کا مذاق گولی کی طرح میرے سینے پر لگتا تھا اس وقت ولیم جیمز کے یہ الفاظ الہام کی طرح میرے اوپر اترے لہذا اس لفظ نے میرا مقدمہ میری زندگی بدل دی اس کے بعد میں نے برے لمحات میں خوشی اور خوشی کے عمل کو اپنا معمول بنا لیا لہذا میں چند ہی دنوں میں نارمل اور خوش گو اور زندگی گزارنے لگا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے مجھے جب بھی غصہ آتا ہے میں جب بھی تڑپارے پین کا شکار ہوتا ہوں تو میں ہنستا شروع کر دیتا ہوں میں لوگوں کو لطفانا سننا شروع کر دیتا ہوں میں جب بے زار اور اداس ہوتا ہوں انتہائی اور اکلپے کا شکار ہونے لگتا ہوں تو میں دن میں دو بار شکر کرتا ہوں بہترین سوٹ پہنتا ہوں اعلیٰ خوشبو لگاتا ہوں گاڑی کی سروں کراتا

ہوں اسے پالش کرتا ہوں اور اپنے دوستوں سے ملاقات کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہوں لوگوں کو دعوت دیتا ہوں نوجوان بچے اور بچیوں سے کپ لگاتا ہوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر لکچر دیتا ہوں سزایہ لکچر چڑھتا اور کارٹون فلمیں دیکھتا ہوں شاپنگ کرتا ہوں ابھی فلمیں دیکھتا ہوں دوستوں کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرتا ہوں اور نیکی کے کام کرتا ہوں اور چند ہی گھنٹوں چند ہی دنوں میں میرا سوال کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے میں اپنے اندر نئی قوت انہی حرارت محسوس کرتا ہوں میرے برے موڈ کے دنوں میں اگر گاس ٹوٹ جاتا ہے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں "چلو اچھا ہوا اب پرانے گاس کی جگہ نیا آئے گا" اس سوچ کے باوجود اگر میرا انسوس ختم نہ ہو تو میں شام کو نئے گاس لے آتا ہوں یہ سننے لگاں پرانے گاس کا دکھ دور کر دیتے ہیں ان دنوں اگر بچے شور کرنے لگیں اور ان کا شور میرے مزاج پر تیزاب کی طرح گرنے لگے تو میں نہیں ڈانسنے کی بجائے ان کے ساتھ مل کر شور کرنے لگتا ہوں میں ان کے کھیل میں شامل ہو جاتا ہوں "یقین کیجئے ہوں کہ یہ کھیل میری جمیدگی میری اداسی کو ہالے جاتے ہیں میں نارمل

ہو جاتا ہوں" KashifAzad@OneUrdu.com

جنوں کا وہ لغافہ اور دلیم جیمز دونوں میرے محسن ہیں ان دونوں نے مجھے زندگی کا نیا رخ نیا پہلو دکھایا زندگی کے اس پہلو اس رخ نے مجھے زندگی گزارنے کا ذہنک سکھایا لہذا میں دن رات دلیم جیمز اور جنوں کے اس لٹانے کا شکر یہ ادا کرتا ہوں میں اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہوں۔



طاقت

نویارک میں مین مین تھا، مین مین کی 42 منزلہ عمارت تھی اور اس 42 منزلہ عمارت کے 40 ویں فلور پر اس کا دفتر تھا۔ مین مین اس کے دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا یہ پانچ ہزار سکوارفٹ کا دفتر تھا جس کا سارا عملہ امریکی تھا، سیکورٹی گارڈ سے نلے کر ریپبلیکن تک، ریپبلیکن سے نلے کر آفس سیکرٹری تک اور آفس سیکرٹری سے لے کر ٹیلی فون آپریٹر تک سب لوگ امریکی تھے اس سارے دفتر میں وہ واحد ایسی شخص تھا، اس نے تہمتی اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا، اس کے ہاتھ میں کیو باکس رکھا اور اس کے جسم سے فرانسسی خوشبو آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا ویسی پن المذاکرہ باہر آ رہا تھا اور اس کے لہجے اور اس کی چال ڈھال سے اس کے سیاہ لکڑی ہونے کا صاف پتہ چلتا تھا، سینڈی اس کی سیکرٹری نے میرے سامنے کافی کا گک رکھا اور چوہدری کو میرے حوالے کر کے چلی گئی، دفتر کے چاروں اطراف شیشے کی بڑی بڑی کڑکیاں تھیں اور ان کڑکیوں کے شیشے نو یارک شہر بکھرا ہوا تھا، شہر میں ابھی روشنیاں جاگنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔

وہ مسکرایا "تم پوچھ رہے تھے میں نے یہ ترقی کیسے کی" میں نے اثبات میں سر ہلادیا اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، اس کی مسکراہٹ میں بڑی جان تھی، وہ مخاطب کی طرف غور سے دیکھتا تھا، اس کے بعد آہستہ سے اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور اس کے بعد اس کے چہرے پر

انہائیت 'عہت اور بھروسہ کے سارے رنگ آجاتے تھے' میں نے پوری زندگی اتنی خوبصورت مکمل اور چوہلی مسکراہٹ نہیں دیکھی اس کی مسکراہٹ میں حقیقی کشش تھی وہ تھوڑی دیر تک کر بولا "مجھے اس مقام پر میری مسکراہٹ نے پہنچایا۔ میں پاکستان کا ایک "ان لچ اہل" شہری تھا میرے بزرگ کئی نسلوں سے سیالکوٹ کی نالیاں اور نوائٹ صاف کر رہے تھے میں جہاں ہوا تو میں نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا لوگ ایک "چوہڑے" کو دوسرا کام دینے کیلئے تیار نہیں تھے لہذا میں بے روزگار ہو گیا میں بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر لاہور چلا گیا میرے جیسے لوگ جب چھوٹے شہر سے بڑے شہر پہنچتے ہیں تو وہ ہر ماں ہو جاتے ہیں ان کا دل خوف اور کسرتی کے احساس سے بھر جاتا ہے لہذا وہ لوگ شہر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی مسکراہٹ سے محروم ہوتے ہیں میں بھی شہر پہنچ کر ہنسا اور مسکراتا بھول گیا میرے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی اور غصہ رہنے لگا پھر مجھے ایک شخص ملا یہ شخص ریگس چوک پر فالسوں کی ریڑھی لگاتا تھا اس نے مجھے دیکھ کر کہا "اؤ جب تک تم مسکراتا نہیں سیکھو گے تم کامیاب نہیں ہو گے" میرے لئے یہ عجیب بات تھی میں نے غصے سے

اس کی طرف دیکھا اس نے پوری کے نیچے سے شیشینا لیا اور شیشے سے ماسے لگا کر کہا "میں نے اپنی عمر بھر کی عمر بھر پر بے تحاشا غصہ نکرتا اور مجھ کی تھی اس نے میرے ماسے سے پینٹ

بنایا اور اس کے بعد بولا "اب تم میری فرمائش پر ذرا سا مسکراؤ" میں نے ہتھیار مسکراہٹ پر اس نے شیشہ دوبارہ میرے ماسے کر دیا میری شکل پر ٹھیک ٹھاک فرق پڑ گیا تھا اس کے بعد اس فالسے والے نے مجھے بتایا "جس شخص کے پاس کوئی ہنر نہ ہو وہ اگر صرف مسکراتا سیکھ لے تو اس کا مقدر بدل سکتا ہے" اس کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے مسکراہٹ کا فن سیکھنا شروع کر دیا میں نے مسکراہٹ کے بارے میں کتابیں خریدیں اور ان کتابوں کی روشنی میں مسکراتا سیکھنے لگا مجھے پتہ چلا انسان کے چہرے پر ایسے دوسرا دینے یا پوائنٹس ہوتے ہیں جو اس کے چہرے پر تاثرات پیدا کرتے ہیں ہمارے چہرے کا ہر تاثر ان چند پوائنٹس کا مرکب ہوتا ہے مسکراہٹ ہمارا واحد عمل ہے جس میں چہرے کے تمام پوائنٹس حرکت میں آتے ہیں جو شخص دن میں دس میں مرتبہ مسکراتا ہے اس کے چہرے کے تاثرات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں وہ چہرے کے ذریعے اپنے تمام جذبات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن جو لوگ کم مسکراتے ہیں ان کا چہرہ آہستہ آہستہ مرنے لگتا ہے۔ وہ لوگ "ایکسپریشن لیس" ہو جاتے ہیں مجھے پتہ چلا ہماری مسکراہٹ سے ہمارے جسم میں ایک کیمیکل پیدا ہوتا ہے یہ کیمیکل ہمارے تپے ہوئے اعصاب ہمارے سگتے ہوئے احساسات اور

ہمارے اچھے ہونے جذبات کو سکون پہنچاتا ہے یہ ہمیں سچی خوشی دیتا ہے اس کی وجہ سے ہم خود کو ہکا بھکا اور مطمئن محسوس کرتے ہیں اور یہ ہماری کام کرنے کی صلاحیت اور استعداد میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ میں ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر سکھانا دیکھنے لگا۔ میں شیشے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسکرانے کی پیکس کرتا رہتا۔

وہ اپنی مسکراہٹ کی پوری تاریخ دہرانے لگا۔ میں خاموشی سے منٹار ہا وہ بولا "مجھے پتہ چلا مسکراہٹ کی 21 قسمیں ہوتی ہیں" آپ مسکرا کر سلام کرتے ہیں" آپ مسکرا کر دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں" آپ مسکرا کر معذرت کرتے ہیں" آپ مسکرا کر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں" آپ مسکرا کر اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں اور آپ مسکراہٹ کے ذریعے اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ میں نے ایک سال میں مسکراہٹوں کی 21 اقسام پر عبور حاصل کر لیا، جس کے بعد مجھے محسوس ہوا میرے حالات احباب میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے ہر شخص مجھے پسند کرنے لگا ہے، میں موسم و منفی شخص ہو گیا لوگ میرا انتظار کرنے لگے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی "دو اپنی داستان کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا میں نے اسے ٹوکا "آج اپنی کامیابی کی

وجہ سے آپ نے آج مسکرایا، اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی میں اسی طرف آ رہا ہوں میں ان دنوں بے روزگار تھا، میں سارا دن نوکری تلاش کرتا تھا اور شام کو باغ جناح میں واک کرتا تھا وہاں ایک گورا بھی واک کرتا تھا، ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے لیکن جب ہم لوگ واک کرتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے تھے تو میں اسے "ہائل پاس" کرتا تھا، وہ میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا تھا، یہ میرا روزانہ کا معمول تھا، یہ سلسلہ ایک برس تک چلتا رہا، اس ایک برس میں مجھے کہیں نوکری نہ ملی، میں نے سینکڑوں درخواستیں دیں لیکن مجھے کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا، اس دوران مجھے کسی دوست نے مشورہ دیا "تم امریکہ چلے جاؤ وہاں بے تحاشا مواقع موجود ہیں، مجھے اس کا مشورہ اچھا لگا مگر میرے پاس وسائل نہیں تھے، میں اپنی جیب سے پاسپورٹ تک نہیں بٹوا سکتا تھا لیکن میں نے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا، میں نے دوستوں سے امداد لیا، پاسپورٹ بنوایا اور اگلے دن صرف پاسپورٹ لے کر امریکہ کی توفیق خانے کے سامنے کھڑا ہو گیا، وہاں لوگوں کی ایک طویل قطار لگی تھی، سب لوگوں نے ہاتھوں میں لمبی چوڑی بینک نیٹ منٹس اور کارڈ ہار کے کاغذات اٹھار کھے تھے جبکہ اس ساری قطار میں میں واحد شخص تھا جس کے پاس پاسپورٹ کے سوا کچھ نہیں تھا، میری کامیابی کا رتی برابر انسان نہیں تھا، میرے آگے کھڑے

تمام لوگ ناکام ہو کر کھڑی سے بیٹے جا رہے تھے لیکن جب میں کھڑی کے سامنے پہنچا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اٹھنے کی دوسری طرف وہی گورا بیٹھا تھا جو روزانہ ہارٹجناح میں واک کرتا تھا اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا میں نے بھی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا اس نے میرا پاسپورٹ پکڑا ایک منٹ انتظار کرنے کی ہدایت کی کھڑی سے اٹھا اتر گیا ایک منٹ بعد واپس آیا اور مجھے پاسپورٹ واپس کر دیا میں نے پاسپورٹ کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سال کاویزہ لگا تھا میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اس نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلا کر ہائی ہائی کر دیا

اس کی کہانی دلچسپ ہو گئی اس نے بتایا "میں جب نیویارک انٹیرپورٹ پر اترتا تو میری جیب میں صرف دس ڈالر تھے میں نے جو پہلا کام کیا وہ فرش کی صفائی تھی اس کے بعد میں ایک ٹیکسٹری میں لوڈ رہتی ہو گیا میں سوسائٹو کے کاربن اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کرتا تھا پھر میں سٹریٹ میں ہو گیا پھر میں نے کیسٹ کی دکان پر کام کیا پھر میں لوگوں کے گھروں میں اخبار بچھنے لگا اور میں آخر میں سول ایوی ایشن کی ایک کمپنی میں بھرتی ہو گیا۔ غرض کوئی ایسا کام نہیں تھا جو میں نے نہ کیا

ہو نہ ہو کام میں میری مسکراہٹ نے میرا ہاتھ دبا دیا مسکراہٹ مجھے ہر جگہ میں آگے سے آگے لے جاتی رہی میں کانسیاب ہونا چاہتا تھا پھر میں نے اپنا کچھ ہارٹجناح کر دیا میرا کارڈ باڈی اٹل لگا آج میں برس بعد میرا شمار نیویارک کے امیر ترین ایشیائی باشندوں میں ہوتا ہے میری کارڈ کمپنی ہے میرے پاس پاکستان کے کل ہوائی جہازوں سے زیادہ کارڈ جہاز ہیں لوگ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جبکہ میں اپنے ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ صرف مسکراہٹ کو اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں" اس نے اثبات میں سر ہلادیا اس نے کہا "تم یقین کرو میں جب فون اٹھاتا ہوں تو پہلو کہنے سے پہلے مسکراتا ہوں لوگ میری اس عادت پر میرا مذاق اڑاتے ہیں میں بھی جانتا ہوں دوسری طرف موجود شخص میری مسکراہٹ نہیں دیکھ رہا لیکن جب میں مسکراتا ہوں تو میری آواز میں ایک خوشگوار تاثر پیدا ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں یہ تاثر دوسری طرف موجود شخص تک ضرور پہنچتا ہے یقین کرو اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسکراہٹ کی شکل میں ایک ایسی صلاحیت دے رکھی ہے جس سے وہ پوری دنیا فتح کر سکتا ہے لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اس صلاحیت اور اس صلاحیت کی طاقت سے ناواقف ہیں وہ اس صلاحیت کے کمال سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر یہ لوگ اس طاقت سے آگاہ ہو جائیں تو یقین کرو یہ دنیا ان کے قدموں میں آگرے۔"

حافظ انوار

ماں کہنے کا ہنر

بچی کی آنکھ میں آنسو تھے اس نے پلہ سے آنکھیں پونچھیں اور روتی سسکتی آواز میں

بولتا ہوں میں، مجھ تو سبکی ہوں، میں سب کر رہی ہوں، اس کی پلہ سے کا تعان ہوں یا پھر میں باپ کی پلہ سے ہوں، میں کیا ہوں، میں نے شفقت سے جواب دیا، جیسا آپ ایک مکمل انسان ہو، اس کی عمر کیس

بائیس برس ہوگی، دو کالج میں پڑھتی تھی اور بے شمار دوسری ماڈرن کی طرح اس کی ماں بھی اس کی

شادی کرنا چاہتی تھی، پچھلے دنوں اس کیلئے ایک رشتہ آیا، لاکھوں روپے میں اچھی تر تھا، لاکھ کے

والدین دیہاتی ہیں، منظر سے تعلق رکھتے تھے، ہنڈا، وہ سب اور گائے میں خاص فرق نہیں سمجھتے تھے، بچی

جب ان لوگوں کے سامنے آئی تو لڑکے کی ماں نے اس کا اسی طرح جائزہ لیا، جس طرح عمو

دیہات میں جانوروں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، ماں نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے، اس کی فٹرنیس کی

اسے اپنے سامنے چلا، پھر اڑھٹھا کر دیکھا، اس کا قدم اس کا وزن معلوم کیا، منہ کھلوا کر اس کے

دانت گنے اور اسے سونگھ کر دیکھا، بچی حساس تھی، ان حرکتوں سے اس کا دل ٹوٹ گیا، وہ شاید یہ سب

کچھ برداشت بھی کر جاتی لیکن آخر میں لڑکے کی ماں نے ایک اور عجیب حرکت کی، وہ لڑکی کو باہر

لے کر گئی اور اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کا رنگ دیکھنا شروع کر دیا، یہ ایسا تھی، بچی روتی ہوئی

اندھ گئی، اس نے دروازے کو اندر سے جھنجھی لگائی اور پھر پورا دن اندر بند رہی، اس کے والدین

میرے جانتے نالے تھے، انہوں نے دوسرے دن بچی کو میرے پاس بھیج دیا، وہ اب میرے سامنے

پٹنٹی تھی میں نے کہا "بیٹا آپ ایک مکمل انسان ہو" اس نے سکتے ہوئے پوچھا "پھر انہوں نے میرے ساتھ ایسے کیوں کیا" میں ہنس پڑا "بیٹا اس لئے کہ وہ لوگ ادھر سے تھے ان لوگوں نے زندگی کو کبھی جانوروں سے اوپر اٹھ کر نہیں دیکھا ہم لوگ دوسرے لوگوں کو دوسری چیزوں کو اپنے معیار اور اپنے نقطہ نظر سے پرکتے ہیں ایک گائے دنیا کی ہر چیز کو گائے کی نظر سے دیکھے گی اور ایک چڑیا پوری کائنات کو چڑیا کی آنکھ سے پرکھے گی وہ لوگ کیونکہ انسانوں کے ہمیں میں جانور تھے لہذا انہوں نے جانوروں کی طرح تمہارا جائزہ لیا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تم خود سوچو اگر کوئی شخص گھاس کی پلیٹ میں ہیرا ڈال کر گدھے کے سامنے رکھ دے اور گدھا اس ہیرے کو زمین پر پھینک دے تو ہیرے کو تو اس سلوک پر ملال نہیں ہوتا چاہیے "پٹنٹی نے آنسو پونچھے اور تمہارا سا مسکرا کر بولی "سرا آپ اس موضوع پر ضرور لکھیں لڑکوں کے ماں باپ کو یہ ضرور بتائیں لڑکیاں بھی انسان ہوتی ہیں اور اللہ نے ان کو کبھی دل اور انا دے رکھی ہے "سرا نہیں سمجھا میں اللہ کی مخلوق کو بھڑکھڑایاں نہ بناؤں انسان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کریں "میں نے پٹنٹی کے ساتھ وعدہ کر لیا "پٹنٹی واہیں چلی گئی۔"

Kashif Azad@OneLink.com

شام کو پیرے ایک دوست آئے "میں اداں جیسا تھا انہوں نے وہ پوچھی "میں نے ان کو یہ سارا قصہ سنا دیا وہ بھی دنگی ہو گئے انہوں نے مجھے اپنے محلے کی ایک بچی کا واقعہ سنایا "پٹنٹی ذرا ادا جی شکل و صورت کی تھی اس کے گھر جو بھی لوگ آتے تھے پٹنٹی کو دیکھنے کے بعد واہیں چلے جاتے تھے یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ پٹنٹی نفسیاتی مریش بن گئی علاج شروع ہوا لیکن اتفاقاً نہ ہوا آج کل وہ پٹنٹی پاگل خانے میں ہے "ہم دونوں مزید دنگی ہو گئے اسی دوران ہمارا ایک تیسرا دوست بھی آ گیا "اس نے سارا قصہ سنا تو اس نے قہقہہ لگایا "ہم نے اس کی طرف غصے سے دیکھا مگر وہ ہنستا چلا گیا "وہ کئی منٹوں کی ہنسی کے بعد بولا "بے وقوف! صرف افسوس کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا "اس مسئلے کے حل کیلئے اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو آگے آتا چاہیے انہیں بولد شیب لینا ہوگا "ہم نے پوچھا "وہ کیسے" وہ مسکرا کر بولا "میں نے اپنے بیٹے کی شادی کرنی تھی "ہم نے اس سلسلے میں کم از کم بیس بیس رشتے دیکھے لیکن ہم نے کسی بچی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی "ہم نے پوچھا "وہ کیسے" وہ مسکرایا "ایک تو ہم براہ راست کسی کے گھر نہیں جاتے تھے کسی دوست نے اگر کوئی رشتہ بتایا تو ہم اس دوست کے گھر چلے جاتے اور وہ دوست بہانے سے بچی اور اس کے والدین کو وہاں بلا دیتا "ہم غیر محسوس طریقے سے پٹنٹی کو دیکھ لیتے اس

کے والدین کے ساتھ بھی گپ شپ لگاتے 'ہم نے کسی تقریب میں بچپن اور ان کے والدین کو بلا لیتے تھے اور غیر محسوس طریقے سے ان کا جائزہ لے لیتے تھے اس چالاکی کے دوران صرف ایک موقع ایسا آیا جب ہم کسی کے گھر گئے اور اس خاندان نے ہماری آمد کو "لاڑکے والے آئے ہیں" قسم کا تاثر دے دیا 'ہم وہاں جا کر پریشان ہو گئے 'بچی اور بچے کا میل مشکل تھا 'ہم لوگ بچی اور اس کے والدین کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتے تھے لہذا وہاں میں نے ایک عجیب تکنیک استعمال کی 'میں نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس سے کہا "بلی تم جس گھر بھی جاؤ گی وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوں گے 'مجھے تم بہت اچھی لگی ہو تم بالکل میری بیٹیوں کی طرح ہو لہذا میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا 'میرا بیٹا تمہارے قابل نہیں ہے اس کا آئی کیو لیول اس کی تعلیم اور اس کے رویے تم سے بہت مچھوٹے ہیں 'وہ خوبصورتی میں بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ میں تمہارے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا 'میرے ان الفاظ نے بچی اور اس کے خاندان کی ڈھارس بندھائی 'وہ آج تک ہمارا احترام کرتے ہیں 'ہمیں اپنے دوست کی یہ ادا بہت اچھی لگی 'وہ ذرا دیر کا اور پھر مسکرا کر بولا "ہم دوسروں کو پسند کرنے کیلئے شہ گلی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ہمیں لوگوں کو مسترد کرنے کیلئے اس سے چادر ہر گھنٹا چادر کی ضرورت ہوتی ہے ہاں تو دنیا میں سب ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ہاں کہا ایک آرٹ ایک ہنر ہے اور یہ آرٹ یہ ہنر ہمارے ملک کے ہر اس شخص کو اس وقت سیکھ لینا چاہیے جس وقت نرس اس کی گود میں اس کا بیٹا لا کر ڈالے ہے 'وہ ذرا سا رکھا اور پھر مسکرا کر بولا "ہمیں اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو یہ آرٹ یہ ہنر سکھانا ہوگا۔"



غربت انعام ہے

”میں تین نسلوں سے غریب ہوں، میرا اداہاری تھا، باپ منڈی میں مزدوری کرتا تھا

اور میں گریجویٹ بننے کے بعد چودہ سو لاکھوں کی دوکان بڑا کام کر رہا ہوں، غریب نہ رہی وہ نسلیں

کھا چکی ہے مجھے نصیب ہے، میں بھی اس گڑھے سے نہیں نکل سکوں گا،“ نوجوان کی آنکھوں سے

پانی کی دھار نکلی، دھار نے اس کے گل پر لکیری بنائی اور یہ لکیر ٹھوڑی پرت کر رک گئی وہاں ٹھوڑی

کے بالکل نیچے پانی کا ایک بلب چمک رہا تھا، وہ جب سانس لیتا تھا تو یہ بلب آہستہ سے لرزتا تھا

اور اس میں بے شمار رنگ سے گزر جاتے تھے، میں نے اس سے کہا، ”بیٹا غربت تو اللہ کا سب سے

بڑا عطیہ ہوتی ہے، تم ایک لاکھ 24 ہزار بیٹا کو دیکھو چند ایک کے سوا باقی سب نے غربت میں

آکھ کھولی تھی اور سب نے بھوک، غربت اور غریب الوطنی سے ابتدا کی تھی، تم تمام صوفیا، کرام کو

دیکھو، یہ سب لوگ غریب، نادار اور محروم طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، انہیں بھی کئی گلی دن ایک لقمہ

نصیب نہیں ہوتا تھا، انہوں نے پوری زندگی اچھے کپڑے نہیں پہنے، یہ اچھے گھروں میں نہیں رہے

تھے اور انہیں اچھی سواری نہیں ملی تھی، تم دنیا کے بڑے بڑے عالموں کو دیکھو ان میں کون امیر تھا،

کس نے بادشاہ کی گود میں آکھ کھولی تھی، کون منہ میں سونے کا بیج لے کر پیدا ہوا تھا، تم دنیا بھر کے

سائنس دانوں، شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، موسیقاروں اور اداکاروں کو دیکھو ان میں کون امیر تھا،

کون تھا جس کی پیدائش پر سارے شہر میں منگنی تقسیم ہوئی تھی، کون تھا جس کا بچپن نوکروں کی فوج

میں گزرتا تھا تم نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ دیکھو ایک یتیم بچہ جس کی زندگی کا آغاز ہی محرومی سے ہوا تھا آپؐ کے اصحابؓ کو دیکھو ان میں کون امیر تھا پورے مدینہ میں پانچ لوگ تھے جنہیں خوشحال کہا جاسکتا تھا تم اسلام کی پہلی جنگ دیکھو اللہ کے لشکر کے پاس کھواریں تک نہیں تھیں جس وقت اللہ کی مسلت کا پیغام سات براہظوں تک پہنچ رہا تھا اس وقت اللہ کے حبیبؐ کے دسترخوان پر کھجور تک نہیں ہوتی تھی آپؐ تک سے روزہ و انظار فرماتے تھے اور شکر کر کے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے اس وقت دنیا کے فاتحین بھوک سے اتنے مذہحال ہوتے تھے کہ چلتے چلتے گر پڑتے تھے نماز میں ان کے قیام لیے اور بھوے طویل ہو جاتے تھے میرے عزیز یہ بھوک یہ غربت تو اللہ اپنے مقرب بندوں کو دیتا ہے وہ جسے پسند کرتا ہے اسے غربت، علم اور عزت سے نوازتا ہے۔

نوجوان نے غصے سے آنسو پونچھے اور زہریلے لہجے میں بولا "آپ بھی مجھے مذہبانی ظور پر بلیک میل کر رہے ہیں آپ بھی مجھے مذہب دانش اور دلیل کی انہوں نے دے رہے ہیں میں اگر آپ کی بات مان لوں تو اس کا مطلب ہے مجھ سمیت دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے سمجھوتہ کر لینا جیسے انہوں نے مان لیا تھا تیرے دنیا میں دولت اس قدر آگئی اور تمہیں صرف ایک جینے لوگوں کیلئے کھانا دیا اور خروکی بے بسی اور غربت ہم جیسے لوگوں کا مقدر اور ہم اپنے مقدر کا شکر کر کے اللہ کی نعمتوں اللہ کے کرم سے انکار کر رہے ہیں" میں نے قہقہہ لگایا "میرے بچے تم دوسری غلطی کر رہے ہو تم چیزوں کو دوسری مرتبہ غلام زادے غلامانہ انداز سے دیکھ رہے ہو دنیا غربت اللہ کا کرم اللہ کا انعام ہوتی ہے لیکن صرف اور صرف اس شکل میں جب آپ اس سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں جب آپ اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو یہ کرم عذاب اور یہ نعمت زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے اب تم تمام انبیائے کرام کی حیات کا دہرا پہلو دیکھو انہوں نے غربت میں آکٹھ کھولی تھی لیکن انہوں نے ایک طویل جدوجہد اور کوشش کے بعد ان تمام لوگوں کے حالات بدل دیئے جنہوں نے اللہ کے پیغام پر بلیک کہا تھا تم مدینہ کی سلطنت دیکھو جس شہر میں کبھی کھجور تک نہیں ملتی تھی وہاں صرف 30 برس بعد زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں تھا حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے "خزانہ بہت بڑھ گیا ہے اب اس کے خرچ کی بھی کوئی راہ نہ نکالو" تم صوفیاء کرام کو بھی دیکھو ان کی حیات ہی میں دنیا جہان کی دولت ان کے دروازے پر اترتی ہی انہوں نے زندگی میں ایک چولہا چر حایا تو ہزار سال تک ان کا شکر چلا رہا دنیا کے سارے مصوروں، ناسارے موسیقاروں، اداکاروں، دانشوروں، شاعروں، مصنفوں اور ماہرین دانوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت، عزت اور بڑی حد تک دولت کا مزہ چکھ لیا تم آج

بھی دیکھو پکا سوکی تمسوریوں کی مالیت دنیا کے 30 لاکھ کے بجٹ کے برابر ہے الغریبوں کی آمدنی سے دنیا میں ہر سال بیس تیس لوگوں کو کئی ملین ڈالر ایسے جاتے ہیں مینٹھوں کی سمٹیوں کی رابٹنی، ایک وقت میں جرسی کے ٹول مالیتی ذخائر سے زیادہ بھی سوہرے بچے اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو غربت دیتا ہے یہ غربت اس کیلئے تحریک بھی ہوتی ہے جو صلہ بھی اور عزم بھی یہ اس کے ہاتھ بھی ہوتی ہے اور پاؤں بھی دنیا میں منتقل ہو یا بہت یہ وہ فصلیں ہیں جو صرف اور صرف غربت کی کھاد میں پیدا ہوتی ہیں اب یہ ہم پر ہے ہم اس غربت کو اپنے لئے تحریک بناتے ہیں اسے جو صلے اور عزم کی شکل دیتے ہیں یا پھر صبر اور سمجھوتے کی چادر تان کر چپ چاپ لیٹ جاتے ہیں یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کو دے رکھا ہے تم یقین کرو اللہ تعالیٰ جتنا فن اجتنی صلاحیت غریب کو دیتا ہے اتنی صلاحیت اتمکائنوں میں ہزار امیروں کو اجتنائی طور پر نصیب نہیں ہوتا لیکن اس صلاحیت اس فن سے نائدہ اٹھانا یہ تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کا کام ہوتا ہے"

میں راکارڈز مارا سوچ کر کہا "اچھا تم مجھے ایک سوال کا جواب دو تم نے بھی شہد کی کھٹی

کو شیر سے مٹھتے دیکھا ہے، نوجوان نے کہا کہ میں نے کہا کھٹی اور شیر سے نکلنے کی کوشش کر لی ہے یہ کوشش شہد بننے کے عمل کا حصہ ہے جب یہ بھی شیر سے آزاد ہوتی ہے تو اس کا شہد دوسری کھٹیوں سے سوگنا گاڑا حاشیریں اور صحت افزا ہوتا ہے یہ اس کھٹی کو قدرت کی طرف سے انعام ملتا ہے اگر یہ کھٹی جدوجہد کے دوران بہت پاروے تو یہ اس شیر سے مٹھن ہو جاتی ہے یہ مر جاتی ہے" میں نے نوجوان سے ہاتھ ملایا "نوجوان نے مٹھن کر آکھیں صاف کیس اور سلام کر کے چلا گیا ہر زندگی ایک نئے زاویے سے اس کا انتظار کرو ہی تھی۔"



دو گھنٹے اپنے لئے

حکومتی نظام میں سیکرٹری سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے اس عہدے پر متمکن شخص ایک بار
 اقتدار چھوڑنے کو مجبور ہونے چاہئے۔ حکومتی عہدے سے واپس آنا چاہئے اور عہدے سے ہٹا دیا جائے۔

وزیراعظم گورنر ہو یا وزیراعلیٰ وزیر ہو یا وزیر مملکت تمام احکامات سیکرٹری سے ہو کر ہی آتے
 ہیں یہ تمام لوگ سیکرٹری کو فون کرتے ہیں اور نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں 'شاہجی زیدی
 صاحب انور صاحب طارق صاحب یا جنرل صاحب میں یہ چاہتا ہوں' میری یہ خواہش ہے یا
 فلاں صاحب برائے ماہر اور ذہین ہیں آپ میرا فرما کر نہیں فلاں صاحب پوسٹ پر لگا دیں وغیرہ
 'سیکرٹری اسی وقت اپنے پی ایس کو بلاتے ہیں اور اسے صدر وزیراعظم یا وزیر کی خواہش سے مطلع
 کرتے ہیں اور پھر حکم جاری کرتے ہیں 'ابھی اسی وقت لیل تیار کر کے لائیں' یہ خط عموماً اس قسم کا
 ہوتا ہے 'میں وزیراعظم صدر یا وزیر کی ہدایت پر یہ حکم دیتا ہوں' فلاں صاحب کو فلاں عہدہ دے
 دیا جائے اور فلاں کو فلاں ٹھیکہ دے دیا جائے' وغیرہ وغیرہ حکومتی نظام سے واقف لوگ جانتے
 ہیں وزیراعلیٰ گورنر وزیراعظم اور صدر کی اصل طاقت سیکرٹری صاحبان ہوتے ہیں پورے ملک کی
 حدود و کرسی سارے سیاستدان، سفیر اور صنعت کار ان کے حجاج ہوتے ہیں ان کے ایک اشارے
 سے ادھر کی دنیا ادھر اور ادھر کی کائنات ادھر ہو جاتی ہے اگر دیکھا جائے تو یہ لوگ بہت مصروف
 ہوتے ہیں ان کا دن عموماً فجر سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور رات دو تین بجے تک جاری رہتا ہے یہ

روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں سینکڑوں فون کرتے اور سنتے ہیں سینکڑوں خط لکھتے ہیں اور سینکڑوں خط وصول کرتے ہیں ان لوگوں کی زندگی بہت خوفناک اور قابلِ رحم ہوتی ہے یہ عام طور پر مکی دن اپنے بچوں سے ملاقات نہیں کر پاتے اخبار نہیں پڑھ سکتے اور ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔

میں ایک میگزینی کو جانتا ہوں وہ جب ایڈیٹریل میگزینی تھے تو میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں بدل گئی اس دوستی کی بنیاد اظیفہ گوئی اور حیران کن قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں وہ مجھے اکثر بلایا کرتے تھے میں ان کے دفتر میں داخل ہوتا تھا تو وہ فروٹ سلاڈ منگواتے تھے اور پی اے کو حکم جاری کر دیتے تھے میں ایک گھنٹہ مصروف ہوں کوئی بندہ اندر آتا چاہے اور نہ ہی کسی کا فون اور اس کے بعد اظیفہ کا سیشن شروع ہو جاتا تھا ہم دنیا جہان کے اظیفہ سناتے تھے دنیا جہان کے چٹکے اور دلچسپ باتوں کا تبادلہ ہوتا تھا ٹھیک ایک گھنٹہ بعد وہ گھڑی کی طرف دیکھتے اور میں ہاتھ مار کر وہاں آ جاتا تھا ایک سال کی رفاقت کے بعد وہ میگزینی بن گئے میں نے ان سے رابطہ منقطع کر دیا ایک روز ان کا فون آیا "بھئی تم کہاں ہو؟" میں نے

عزیز کیا "میں ان شہر میں ہوں لیکن اب آپ کی سہولیات پر مبنی ہیں لہذا جیلر واپس نہیں

کرتا" انہوں نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر قہقہہ لگا کر بولے "تم آج دو بجے میرے پاس آ جاؤ" ان کا فون بند ہو گیا میں دو بجے ان کے دفتر پہنچ گیا فروٹ سلاڈ میز پر پڑا تھا انہوں نے پی اے کو حکم جاری کیا اور میرے ساتھ گپ شپ کا سلسلہ شروع کر دیا میں نے ان سے پوچھا "شاہ جی آپ جس پوسٹ پر ہیں اس پر تو اپنی کمر پر خارش کی باری تیسرے دن آتی ہے آپ مجھ پر اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں" وہ سنجیدہ ہو گئے اور ذرا سا آگے جھک کر بولے "میرے چودہ گھنٹوں میں میرا اپنا وقت صرف یہی ایک گھنٹہ ہے باقی سارے گھنٹے حکومت کے ہیں ایور رو کر سکی اور عوام کے ہیں یہ ایک گھنٹہ مجھے ری لیس کرتا ہے مجھے حقیقی خوشی اور مسرت دیتا ہے اگر میں ایک گھنٹہ قہقہہ نہ لگاؤں تمہارے سامنے ناٹکس پھیلا کر دل کھول کر بکواس نہ کروں تو شاید ایک ہفتے بعد میرا ہارت ٹیل ہو جائے" مجھے ان کی یہ بات عجیب لگی میں نے ان سے پوچھا "لیکن اس نیک کام کیلئے آپ نے صرف مجھے ہی کیوں منتخب کیا آپ جانتے ہیں میں جرنلسٹ ہوں اور کسی جرنلسٹ کا قرب بہت خطرناک ہوتا ہے آپ بخوبی جانتے ہیں انہوں نے قہقہہ لگایا اور سبب کی قاش الفا کر بولے "بے وقوف شخص آخر میرا بھی کوئی تجربہ ہے آخر میں بھی لوگوں کو بھینسا اور جانتا ہوں تمہارے ساتھ دوستی کی تمن و درجات ہیں شہر ایک تم ایک وسیع الطالعہ شخص ہو تم دنیا جہاں کی

چیزیں پڑھتے ہو، دو تم ایک اتنا پرست شخص ہو نہیں جانتا ہوں جس دن میں تمہیں ٹیکس بلاؤں گا تم اس دن ٹیکس آن کے اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہم حکومت میں رکھ کر ترس جاتے ہیں، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں ہمیں کوئی ایسا شخص ملے جس کے پیچھے ہم پھریں، وہ ہمارا عقاب نہ کرے اور تیسری بات! میں جانتا ہوں تمہیں میری پوزیشن میرے عہدے سے کوئی غرض نہیں، پچھلے ایک برس میں ہم کم از کم دو سو بار ملے ہوں گے لیکن تم نے آج تک مجھے کوئی کام نہیں کہا، تم نے کبھی کسی کی رفاہی نہیں کی، یہ بات بھی حیران کن ہے اور ہم ایسے لوگوں کو بھی ترس جاتے ہیں اور آخری بات میں نے محسوس کیا تم باری دوستی کے معاملے میں اپنی سھانیا نہ جس قربان کر دیتے ہو۔

میں نے ان کی باتوں سے کم و بیش اتفاق کیا اور ان سے پوچھا "لیکن آپ کو اس سارے کیل کی ضرورت کیا ہے!" "شاہجی! مجھے اور نشتر سے سو نہیں صاف کر کے بولے" دیکھو یاد زندہ رہنے کیلئے دینی لیکس ہونا، قہقہے لگانا اور بے لوث دوستوں کی کھینچی ضروری ہوتی ہے، میں جب زندہ رہ سکوں گا میں آتا ہوں، میں نے ایک توازن قائم کر لیا، میں جہاں بھی جاؤں، ایک آدھ ایسا شخص

ہوئی کتابوں پر بحث کروں، اس کے بعد میں اپنے آس کو وقت دیتا ہوں، اپنی ٹیلی کے ساتھ وقت گزارتا اور لمبی واک کرتا ہوں، یہ سلسلہ میں نے پورنی زندگی جاری رکھا، میں آج تک اس پکار بند ہوں، میرے لئے یہ بات بھی ایک دلچسپ انکشاف تھا، میں نے پوچھا "شاہجی آپ آج کل بھی واک کرتے ہیں" "شاہجی نے اثبات میں کہہ دیا، ہلائی "روز ایک گھنٹہ" میں نے پوچھا "اس کیلئے وقت کہاں سے نکالتے ہیں" انہوں نے پھر قہقہہ لگایا "ذرا سی شیطان سے کام لینا پڑتا ہے، یہاں دفتر میں لوگ بیٹھے ہوں تو میں پاؤں کے نیچے لگا ہن دہاتا ہوں، اچانک گرین ٹیلی فون بج اٹھتا ہے لوگ سم جاتے ہیں، میں ٹون اٹھا کر سو، بے انداز سے بات سننے کی اداکاری کرتا ہوں اور پھر میں سرکہہ کر فون رکھ دیتا ہوں، سہانوں کی طرف بے چارگی سے دیکھتا ہوں اور معذرت کر کے کہتا ہوں، مجھے بی ایم صاحب نے بلا لیا ہے، آپ لوگ کافی عیش میں ابھی آتا ہوں، سب لوگ بڑی ٹوش سے شہت اجازت دے دے، یہ سن لیا، ہوں ہاں میں دیکھا ہوں سوٹ اتار کر پاجامہ شرت پہنتا ہوں، چائے چاہات ہوں اور گراؤڈ میں جا کر جاگت شروع کر دیتا ہوں، گھنٹے بعد واپس جاتا ہوں تو وہ لوگ ناراض ہوئے، پھر میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں، میں ہنس پڑا اور اگر نیشنگ ہو رہی ہو تو؟" انہوں نے ایک اور قہقہہ لگایا "وہاں اچانک مجھے ایک چپٹا لاکر دی جاتی

ہے میں حاضرین سے کہتا ہوں بھائیو معاف کرنا مجھے پی ایم جلا رہے ہیں آپ سینک جاری رکھیں میں ان کی بات سن کر ابھی واپس آتا ہوں اور میں گراؤنڈ کی طرف بھاگ جاتا ہوں مجھے معلوم ہے اب تم پوچھو گے اگر میں پی ایم کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں تو میں کیا کرتا ہوں "میں نے ہاں میں گرون ہلا دی انہوں نے وائیں آنکھ وہائی اور منس کر بولے "میں پی ایم سے کہتا ہوں "سر آپ کے احکامات بہت ضروری ہیں مجھے آپ ایک گھنٹہ دے دیں میں ابھی احکامات ٹائپ کرا کے واپس آتا ہوں وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں میں واپس آتا ہوں اور وہ احکامات اپنے پی ایس کے حوالے کر کے گراؤنڈ بھاگ جاتا ہوں ہا ہا ہا۔"

شاہ جی کی باتیں بہت دلچسپ تھیں میری جرتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا میں جانے کیلئے کھڑا ہوا تو وہ اٹھو سے ہاتھ رگڑ کر بولے "یاد رکھو اگر تم صحت مند ہو چکے ہو چالاک ہو اگر تم زندہ ہو تو یہ ساری دنیا تمہاری ہے لیکن جس دن تم بیمار ہو گئے معذور ہو گئے یا کام کی ٹینشن سے فوت ہو گئے یہ دنیا اس دن تمہیں بھلا دے گی آج مجھے بلڈ پریشر ہولڈ ہے میری آنکھیں جھم جھم ہوتی ہیں اب مجھے فائنل نوٹیفکیشن دیا گیا ہے کرسی پر کوئی دوسرا صحت مند شخص بیٹھا ہوگا میں اس حقیقت سے واقف ہوں لہذا میں تم جیسے دوستوں اور ایک گھنٹے کی واک سے توانائی حاصل کرتا ہوں اور خود کو اگلے روز کیلئے کرسی کا اہل بنالیتا ہوں "انہوں نے ہاتھ ملایا اور میں باہر آ گیا لفٹ سے اترتے ہوئے میں نے سوچا "شاہ جی واقعی بہت چالاک ہیں وہ جانتے ہیں ذہنوں پر حکومت کرنے کیلئے حکمرانوں کے ذہن تازہ اور جسم طاقتور ہونے چاہئیں وہ جانتے ہیں زندہ لوگوں پر صرف زندہ لوگ ہی حکومت کر سکتے ہیں لہذا وہ اپنے لئے بھی روزانہ دو گھنٹے نکال لیتے ہیں اپنے آپ کو کبھی قرض دیتے رہتے ہیں"

ترقی کا سٹیڈیم

قلب امریکہ میں میرا گائیڈ تھا میں نے اس کے ساتھ امریکہ کی چھ ریاستوں میں سفر کیا وہ مجھے دیکھنے کے لیے کوئی ایسا دن نہیں دیکھا جس نے مجھے کھیلوں اور ورزشوں پر اتنا دلچسپ بنا دیا جتنے ابھی تک دیکھا ہے۔ 25 دن اگلے رہے میں نے جب واشنگٹن میں قلب کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی وہ ایک کمزور بوجھ تھا اور ذرا سا پیار بھی دکھائی دیتا تھا میرا خیال تھا وہ شاید ہی واشنگٹن سے باہر نکل سکے اور اس کے بعد مجھے ایک مردے کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا لیکن جب ہم نیویارک پہنچے تو میں قلب کی جتنی معاملہ فہمی وقت کی پابندی اور ان تھک شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا وہ پیدل چلتے ہوئے ہمیشہ مجھ سے آگے نکل جاتا تھا اور اس کی سانس تک نہیں بھولتی تھی میں اس پر پورے پورا سامان پونز کے حوالے کر دیتا تھا جبکہ وہ اپنے دونوں بیک خوراٹھا تھا مجھے آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ریسٹ کی ضرورت پڑتی تھی جبکہ قلب بغیر رے کے بغیر دم لئے چلتا رہتا تھا وہ صبح سو جاچے بے آنے کا وعدہ کرتا تھا تو ٹھیک چھ بج کر 14 منٹ پر وہ میرے دروازے پر ہوتا تھا اس نے 25 دنوں میں مجھے کسی فلاحیہ کسی ٹرین سے لیت نہیں ہونے دیا وہ صبح سے رات تک باہر تھکان میرے ساتھ گھومتا تھا میں اس کی اپنی شیشی پر حیران تھا میں نے ایک بار اس سے پوچھی وہ کراہا اور دیکھے بچے میں بولا "79 سال" میں نے اس کی تڑپی ہوئی زندگی کے بارے میں پوچھا شروع کر دیا اس کا بائیو ڈیٹا بہت دلچسپ تھا اس نے 18 سال کی عمر میں ایک ریستوران پر

کا شروع کیا تھا وہ شام کو کام کرتا تھا اور دن میں سکول جاتا تھا اس نے نوکری کے ساتھ ساتھ گریجویشن کی پورے نو سو فی صدی کیا وہاں سے بی اے کی ڈی کی اور پڑھانا شروع کر دیا پانچ سال پڑھا اور پھر ایک فرم میں ملازمت کر لی ملازمت چھوڑی اور اپنا کاروبار شروع کر دیا کاروبار سے وہ سیاست میں آیا اور ٹکوریڈا کی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا پارلیمنٹ کی مدت ختم ہوئی تو وہ فارن سروس میں چلا گیا اس نے اس سروس میں دو کر لبنان، سوڈان، ایران اور پاکستان میں کام کیا وہ 4 سال کراچی رہا فارن سروس چھوڑنے کے بعد اس نے این جی او بنالی اور جب این جی او چل نکلی تو اس نے دانشکدن میں آ کر پریٹنگ فرم بنالی مجھے اس وقت پتہ چلا میں جس فرم کے سربراہ ہوں کسی سرکرہ ہوں ملک اس فرم کا مالک ہے میرے لئے غیر انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی اس نے اس سے پوچھا "تم مالک ہو کر میرے ساتھ کیوں دھکے کھا رہے ہو؟" اس نے تہمت لگایا "تس سال میں ایک بار گائیڈ کا کام بھی کرتا ہوں اس سے میری استطاعت بھی بڑھتی ہے" میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور مجھے سیاحوں کی خواہشات اور ضروریات کا اندازہ بھی ہوتا ہے یوں میں اپنے تجربات کی روشنی میں اپنی کہنی کے کام میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہوں"

میں نے ایک دن وقت سے پوچھا "تم چار سال پاکستان میں کام کرنے کے لئے تم نے کس تجربے کی روشنی میں بناؤ کیا پاکستان بھی ترقی کر سکتا ہے" اس نے ذرا سا سوچا اور مسکرا کر بولا "ہاں لیکن ایک سرائے کے ساتھ اگر تم لوگ ورزش شروع کر دو تو تم کمال کر سکتے ہو" میرے لئے اس کا جواب ہم بلاست تھا وہ مسکرایا "تم میرے جواب کو غیر سنجیدہ سمجھ رہے ہو لیکن میں انتہائی سنجیدہ ہوں میں بچپن اور جوانی میں ایک سرائے نہیں کرتا تھا میں 6 گھنٹے ریستوران پر کام کرتا تھا اور وہ گھنٹے پڑھتا تھا لہذا میرے پاس ورزش کیلئے وقت نہیں پچتا تھا میں پڑھائی کے بعد جواب میں مصروف ہو گیا وہاں بھی مجھے وقت نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تو مجھے معلوم ہوا ہماری پارلیمنٹ کے تمام ارکان روزانہ ورزش کرتے ہیں ٹکوریڈا کی پارلیمنٹ میں 160 ارکان تھے ان میں سے 132 مختلف "ٹیمز" کے ممبر تھے جبکہ 28 رکن روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ کرتے تھے مجھے وہاں جا کر علم ہوا امریکہ کی تمام ریاستوں کے 98 فیصد ارکان پارلیمنٹ اور سو فیصد سیاستدان ورزش کرتے ہیں اور جو شخص سیاست میں آنے کے بعد ایک سرائے نہیں کرتا اسے سیاست میں سنجیدہ نہیں سمجھا جاتا میں نے ذرا سی تحقیق کی تو پتہ چلا امریکی عوام کا خیال ہے جو سیاستدان اپنے آپ کو اہمیت نہیں دیتا وہ ملک اور ملت کے لوگوں کو بھی اہمیت نہیں دے گا چنانچہ امریکہ میں سیاست کا آغاز انسان کے اپنے وجود سے ہوا ہے شاید یہی وجہ ہے امریکہ کا ہر

سیاستدان ورزش کا پابند ہے تم ہمارے صدر بل کلنٹن (اس وقت کلنٹن امریکہ کے صدر تھے) کو دیکھو کلنٹن روزانہ ڈیڑھ گھنٹے جاگنگ کرتے ہیں اس وقت صدارت کے تین بڑے امیدوار ہیں 'ہارج ہل' جان کیری اور انگلوزیہ تینوں ورزش کے عادی ہیں 'ہل' دن میں تین بار ایکسرس کرتے ہیں وہ صبح کے تین دن اپنے فارم ہاؤس پر گزارتے ہیں وہ اپنے ہاتھ سے گڑیاں کاٹتے ہیں زمینوں میں ٹریکس چلاتے ہیں 'جانڈروں کا دودھ دھرتے ہیں اور پودوں کو پانی دیتے ہیں، انگلوزیہ کوہ پیما ہیں وہ کوہ پیما کرتے ہیں اور جان کیری جاگنگ کرتے ہیں لہذا میں نے دوسرے سیاستدانوں کی پیروی میں ورزش شروع کر دی 'میں نے سیاست کے بعد کاروبار شروع کیا تو پتہ چلا امریکہ کے بزنس میں سیاستدانوں سے زیادہ ورزش کے پابند ہیں اس وقت امریکہ میں 1000 بڑے بزنس میں ہیں ان میں سے چار سو ارب پتی ہیں 'پوری دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی امریکہ میں پائے جاتے ہیں اور یہ تمام ارب پتی نو دلہے ہیں ان میں کوئی ایسا شخص نہیں جو تیسری نسل سے امیر ہو یہ سب پہلی اور دوسری نسل کے امراء ہیں لہذا ہم ان تمام ارب پتیوں کو سیلف میڈ کہہ

سکتے ہیں اس وقت دنیا کے 14 بڑے ادارے امریکہ کے ارب پتیوں پر مشتمل تھیں لیکن وہ ان کی کسی مشترک خاوتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں مجھے یقین ہے ایک ادارے کی تحقیق پڑھنے کا اعلان ہوا

اس نے امریکہ کے 1000 کامیاب بزنس میمنوں کی عادتوں کا چارٹ بنایا اس چارٹ کے مطابق ان لوگوں میں 23 عادتیں مشترک تھیں تم شاید یہ جان کر حیران ہو جاؤ ان 23 عادتوں میں پانچویں عادت ورزش تھی امریکہ کی ہزار بڑی کاروباری شخصیات ورزش کی عادی ہیں لہذا جب میں کاروبار کی دنیا میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا ورزش کے بغیر کوئی شخص اچھا بزنس میں نہیں بن سکتا چنانچہ میں نے روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ شروع کر دی اور آدھ گھنٹہ سٹریٹنگ اس کے بعد میں آج تک روزانہ ورزش کرتا ہوں اور صبح کے آخری دو دن کسی پہاڑ پر گزارتا ہوں میں وہاں کیسٹنگ کرتا ہوں پیڈل چلتا ہوں اور فطرت کے ساتھ 48 گھنٹے گزار کر واپس آ جاتا ہوں یہ اسی ورزش کا کمال ہے میں 79 برس کی عمر میں بھی فٹ ہوں مجھ میں تم سے زیادہ توانائی ہے 'وہ خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی کا وقفہ رہا وہ دوبارہ بولا 'قوموں کی ترقی سیاست اور صحیح پر استوار ہوتی ہے اور اس کیلئے سیاستدانوں اور بزنس میمنوں کا صحت مند مثبت اور فعال ہونا ضروری ہوتا ہے امریکہ کے تمام سیاستدان اور بزنس میں صحت مند بھی ہیں اور فعال بھی لہذا ہم دنیا کی سب سے بڑی سیاسی اور اقتصادی قوت ہیں 'تم اگر ہماری حالت کے پیچھے

جہاں تک کر دیکھو تمہیں اس میں ورزش نظر آئے گی اس وقت دنیا میں ورزش کی سب سے زیادہ مشینیں امریکہ میں خریدی جاتی ہیں دنیا میں سب سے زیادہ ٹریک سوٹ جاگرز اور لی ٹرٹس امریکہ میں کھتی ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ فوٹو سٹیٹسٹس امریکہ میں لئے جاتے ہیں امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ورزش انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے امریکہ میں سٹیکٹرزوں کمپنیاں ورزش کے نئے آلات اور نئی ورزشیں ایجاد کر رہی ہیں دنیا میں سب سے زیادہ جم امریکہ میں ہیں اور امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ورزش کیلئے باقاعدہ ٹیلی ویژن چینل ہیں جس میں ورزش کرانے کے ٹکڑے اور کمپنیاں ہیں لہذا یہی وجہ ہے ہم دنیا سے بہت آگے ہیں جبکہ میں نے پاکستان میں ایسا نہیں دیکھا میں کراچی کے ایک پارک میں جا ٹھک کرتا تھا مجھے اس پورے پارک میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا میں نے اپنے چار سالہ قیام میں پاکستان کے سیاستدانوں اور بزنس میوں کو جتنا سٹ اور بیمار دیکھا اتنا مجھے دنیا کا کوئی دوسرا بزنس مین اور کوئی دوسرا سیاستدان دکھائی نہیں دیا تم پاکستان جاؤ اور جا کر تحقیق کرو تمہارے ملک کے کتنے سیاستدان اور کتنے بزنس مین ورزش کرتے ہیں مجھے یقین ہے تمہیں ماہر کی ہوگی لہذا جس ملک کا سیاست دان اور بزنس مین ہے ساتھ ساتھ کاروبار دار نہ ہو سکے گا اور جو شخص ہو وہ ملک کیسے بڑی حرکتیں کرتا ہے اسے مثبت سوچ ہی ضرورت ہوتی ہے اور ورزش کے بغیر کسی شخص کی سوچ مثبت نہیں ہو سکتی اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا "تمہاری عمر کتنی ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "35 برس" اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے بازو پر ہاتھ پھیر کر بولا "جس ملک کا 35 برس کا نوجوان مجھ جیسے 79 سال کے بوڑھے کے ساتھ بیدل نہ چل سکتا ہو وہ ملک جدید دنیا کے چیلنجوں پر کیسے پورا ترے گا" دہرتی کے سٹیڈیم میں کیسے آگے بڑھے گا" میں نے مسلزا دیکھے اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

کرے گا کون

نوجوان بہت پریشان تھا وہ بار بار ہاتھ ملتا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر کہتا "اٹ از نو لیٹ سر وہاں تو لوگ سردی سے مر جائیں گے" وہ پریشان ہی گردن ہلاتا "ہاتھ ملتا اور گھر جئے گا" اس سے بڑا تھا جس کی یہاں سے اٹھیں گی اس دن بعد اسلام آباد، پشاور، کراچی اور وہاں سے بارش پہنچے میں دو دن لگ جائیں گے اٹ از نو لیٹ" ہم اس کی پریشانی کو دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

اس کا نام ہر درجہ زمین تھا وہ آئیر لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر بمشکل 28 برس تھی اس نے اپنے کیریئر کا آغاز بی بی سی سے کیا تھا کیریئر کے شروع میں اس کی ذہنی افریقہ لگ گئی وہاں اس نے انسانیت کا ایک انوکھا روپ دیکھا اس نے غربت، بیماری، جہالت، پریشانی، جنگ اور نقل مکانی کو ایک جگہ اکٹھے دیکھا وہ جوں جوں انسانی مسائل اور مصیبتوں کا مشاہدہ کرتا گیا تو اس سے اپنی معاشرت سے نفرت ہوتی گئی یہ نفرت آنے والے دنوں میں اتنی بڑھی کہ اس نے نوکری چھوڑ دی ان دنوں آئیر لینڈ کی ایک ایئر جی او "گولڈ" یونٹ میں کام کر رہی تھی روز زمین اس "ایئر جی او" میں شامل ہو گیا اور اس کے بعد وہ چھ سال تک گھر نہیں گیا وہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے ملک سے تیسرے ملک سفر کرتا رہا 8 اکتوبر کو پاکستان میں زلزلہ آیا تو وہ رضا کاروں کے ایک گروپ کے ساتھ پاکستان آ گیا ان لوگوں نے آزاد کشمیر میں کام شروع کر

و یا نوہر کے وسط میں سر دی شروع ہوئی تو "گول" نے بھارت سے چھتوں کی ہستی شہس در آمد کرنے کی درخواست دی یہ شہس کراچی آتا تھیں رو جڑوین ان کی ٹیسٹس کے لئے کراچی آیا تھا میں اس وقت کراچی کسٹم ہاؤس میں اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا تھا ہم دونوں کپ لگا رہے تھے کافی پیار ہے تھے اور عالمی سیاست پر گفتگو کرتے تھے لیکن رو جڑوین مسلسل ہاتھ مل رہا تھا اور ہانگ کے ان ساترین کے لئے پریشان ہو رہا تھا جو شدید سر دی میں ان شہس کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں نے توجہ ہانٹنے کیلئے اس سے پوچھا "تم کتنی تخواہ لیتے ہو" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تخواہ کیا مطلب؟" میں نے وضاحت کی "میرا مطلب ہے تمہارا بیج کتنا ہے" وہ مسکرایا "گول" میں آئیر لینڈ کے 1100 رضا کار کام کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی شخص تخواہ نہیں لیتا ہم سب لوگ ایک دو کروں میں فرش پر سوتے ہیں اون میں دو بار کھانا کھاتے ہیں اور سینے کے آخر میں ہمارا ادارہ ہمیں نوٹھ پینٹ اٹیوٹنگ کے سامان یا کپڑوں کے ایک آؤد جوڑے کے لئے تھوڑی سی پاکت سنی دے دیتا ہے" میں اور میرا دوست پریشان ہو گیا ڈین نے

www.KeenBook.com

سے وابستہ ہے اس این جی او کا مقصد آئرش حکومت کو تیسری دنیا کے مسائل سے آگاہ کرنا تھا اس ادارے نے سب سے پہلے افریقہ میں کام کیا یہ لوگ آفت زدہ علاقوں کے لئے خوراک پانی پتہ گا ہوں ادویات اور پرائمری انجیم کا بندوبست کرتے تھے یہ لوگ تیسری دنیا کے متاثرہ علاقوں میں جاتے تھے اور اپنی حکومت کو مقامی مسائل کے بارے میں مطلع کرتے تھے اور اسے فائل کرتے تھے دوسرے کاری سطح پر اس علاقے کی مدد کا اعلان کرے اس ادارے کا کہنا تھا "آئرش حکومت کو دنیا کے غریبوں کا پتہ چھین ہونا چاہیے" یہ لوگ اپنی حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے یہاں تک کہ 2003 میں آئر لینڈ کی حکومت نے پہلی بار جو گنڈا کے ساترین کے لئے بس ملین پاؤنڈ امداد کا اعلان کیا "گول" ایک چھوٹی سی تنظیم ہے لیکن یہ اس دولت دنیا کے 15 غریب ملکوں میں کام کر رہی ہے اس کے پاس ایک ہزار ایک سو رضا کار اور 2 ہزار مقامی لوگوں کا کھلا ہے یہ لوگ ہر سال 350 ملین پاؤنڈ خرچ کرتے ہیں اور ان کے ذاتی اخراجات محض پانچ فیصد ہیں "ادارے" لئے یہ ساری معلومات حیران کن تھیں۔ رو جڑو نے بتایا "گول" کے گیارہ سو رضا کاروں میں سے اپنے گھر نہیں گئے یہ لوگ ایک جگہ جاتے ہیں وہاں حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو انہیں کسی دوسرے ملک کسی دوسرے علاقے میں آفت کی اطلاع مل جاتی ہے اور یہ لوگ اپنا سامان باندھ کر اس علاقے میں

ملے جاتے ہیں۔ فوراً ج. کو گھر سے نکلے چھ سال ہو چکے ہیں " میں نے اس سے پوچھا " تم پاکستان کے بارے میں کیا جانتے تھے " اس نے فیس کر جواب دیا " میں نے آٹھ اکتوبر 2005ء سے پہلے پاکستان کا نام نہیں سنا تھا " یہاں زلزلہ آیا تو ہینڈ کو ارنر نے میں پاکستان جانے کا حکم دیا " ہم لوگ یہاں آ گئے " یہاں حالات بہت شراب تھے " ہم نے آئر لینڈ سے فنڈ منگوا یا " اس فنڈ سے بھارت سے شیش خریدیں اور اب ہماری کوشش ہے ہم برہنہاری سے پہلے بارغ کے لوگوں کو گھر بنا دیں " ابھی روجر کی گفتگو جاری تھی " میرے دوست کا اسٹنٹ اندر داخل ہوا اور روجر کو اس کا کھینٹل سر ہینٹیکٹ وے " با۔ روجر نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

روجر کے جانے کے بعد ہم بحث کے ایک نئے فیئر میں داخل ہو گئے " میرا دوست مجھ سے کہنے لگا " دنیا میں 156 اسلامی ممالک ہیں " تم ان اسلامی ممالک کا پروفائل نکال کر دیکھو تو تمہیں کسی اسلامی ملک میں کول جیسی کوئی تنظیم نہیں ملے گی " ہم پاکستانی ایک جذبائی اور ردول رکھنے والی قوم ہیں لیکن ہمارے ملک میں بھی کوئی ایسی تنظیم نہیں " میں نے اس کی تائید میں سر بلا ویلا

کی تائید میں کہا کہ پاکستان ہے " وہاں کا وہ تنظیم ہے جس کی بنیاد بھی میری تھی اس میں آج عالمی سطح پر ایک

ایک اسی تنظیم اور وہ نہیں " میرے دوست نے کہا " لیکن ہم اگر چاہیں تو کول جیسے تنظیموں اور سے بنا سکتے ہیں " تم ایسی فاؤنڈیشن کی مثال لے لو ایک ان پڑھ شخص نے کام شروع کیا اور آج ایسی دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایجوکیشن سروس ہے " یہ ادارہ پچھلے چار سال سے گنتی

بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہے " اس کا مطلب ہے ہم میں پوٹینشل موجود ہے " اس نیت اور ہمت کرنے کی ابر ہے " میں نے اس سے پوچھا " ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں " اس نے قہقہہ لگایا " جان اوشیا اور روجر ڈین کی طرح ہم لوگ بھی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنائیں " مختلف شعبوں کی تربیت حاصل کریں اور اس کے بعد نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر کام شروع کریں " مجھے یقین ہے چند برسوں میں ہماری تنظیمیں بھی عالمی سطح پر پہچانی جائیں گی " میں نے اس کی تائید کی " واقعی تم سب کچھ رہے ہو تم

حالیہ زلزلے میں ہماری تنظیموں کی کارکردگی دیکھ لو " ہماری مذہبی تنظیموں نے ہنگامی بنیادوں پر متاثرین کی مدد شروع کی اور کمال کر دیا " یورپ اور امریکہ تک کے ادارے اللہ مت زبست " جماعت الدعوة " الرحمت زبست اور الرشید زبست کی خدمات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے " عالمی ایجنسیوں کے تجزیے کے مطابق ان اداروں نے پانچ ادب روپے سے زیادہ فنڈ جمع کئے اور یہ فنڈ متاثرین تک پہنچائے چنانچہ اگر ہم صرف ان اداروں کو مضبوط بنادیں " ہم ان کی سرکاری

زیر پبلیکیشن 3.....0 - 163

سر پرستی شروع کر دیں اور ان کے کارکنوں کو نریٹنگ دست دیں تو یہ ادارے دنیا میں کمال کر سکتے ہیں یہ ہمارا بیج تبدیل کر سکتے ہیں 'میرے دوست نے سر ہایا اور قبیلہ لگا کر جواب دیا' لیکن کرے گا کون ہم لوگ نارورڈ باکوں سے باہر ظلم کے تو ان چیزوں پر توجہ دیں گے تاہم جو قوم آج تک کا اباغ ذمہ کا فیصلہ نہیں کر سکی تم اس سے توقع رکھتے ہو وہ گول جیسے ادارے بنائے گی تم بڑے بے وقوف ہو۔"



Kashif Azad@OneUrdu.com

مرہم کون لگائے گا

1992ء میں راولپنڈی میں پولیس کا جالی سلخ کا ایک سیمینار ہوا تھا، اس سیمینار میں
 جرنل صاحب نے یہ دن ملک سے بے جا پولیس دفاتر کیسٹان آئے۔ ان افسروں میں جاپان کا پولیس

چیف بھی شامل تھا۔ سیمینار کے بعد اُنز تھا، اُنز میں راولپنڈی کے ڈی آئی جی اور جاپان کے پولیس
 چیف ایک میز پر بیٹھ گئے اور دونوں نے گفتگو شروع کر دی، گفتگو کے دوران ڈی آئی جی نے
 جاپانی چیف سے پوچھا "آپ لوگوں پر کبھی سیاسی دباؤ نہیں آتا؟" جاپانی پولیس چیف نے تھوڑی
 دیر سوچا اور اس کے بعد جواب دیا "صرف 1963ء میں ایک بار آیا تھا" ڈی آئی جی صاحب ہم
 تن گوش ہو گئے چیف نے بتایا "1963ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جاپان کے دورے پر آئے
 تھے، وہ ایک دن کیلئے اداسا کا شہر چلے گئے، دوسرے دن ان کی جاپانی وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات
 تھی، انہوں نے اس کا سے سیدھا پرائیم منسٹر باؤس آتا تھا، راستے میں ٹریک جام ہو گئی، ان کے
 ساتھ موجود پروٹوکول افسروں نے ہمارے پولیس چیف سے رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی،
 پولیس کسی خصوصی بندوبست کے ذریعے انہیں نوکیو پہنچا دے، پروٹوکول افسروں کا کہنا تھا برطانوی
 وزیر خارجہ کی وزیر اعظم سے ملاقات انتہائی ضروری ہے اگر وہ انہیں وقت پر نہیں ملتے تو یہ ملاقات
 نہیں ہو جائے گی کیونکہ ایک گھنٹے بعد وزیر اعظم تین گھنٹے دورے پر روانہ ہو جائیں گے، پولیس
 چیف نے ان کی بات سن کر معذرت کر لی، اس کے بعد وزیر اعظم نے بذات خود پولیس چیف سے

درخواست کی لیکن پولیس چیف کا کہنا تھا 'ہمارے پاس وی آئی بیگز کو ٹریک سے نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں' یوں یہ ملاقات منسوخ ہوگئی اس ملاقات کی منسوخی کی وجہ سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات میں شدید کشیدگی پیدا ہوگئی "جاپان کے پولیس چیف خاموش ہو گئے ہمارے ڈی آئی جی نے شدت جذبات میں پہلو بدلا اور ان سے پوچھا "اس کے بعد کیا ہوا" پولیس چیف مسکرائے "اس کے بعد کیا ہوا تھا، یہ خبر اخبارات میں شائع ہوگئی، لوگوں نے وزیراعظم کے ریلے پر شدید احتجاج کیا اور وزیراعظم کو قوم اور پولیس دونوں سے معافی مانگنا پڑی "ہمارے ڈی آئی جی کیلئے یہ انوکھی بات تھی چنانچہ انہوں نے حیرت سے پوچھا "اگر پولیس چیف کے انکار سے وزیراعظم برامنا جاتے اور دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا " پولیس چیف نے تمہاری دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "پہلی بات تو یہ ہے ہمارا وزیراعظم بھی پولیس چیف کے ساتھ لڑائی نہ کرتا لیکن بالعرض بحال اگر دونوں میں جنگ چمک بھی جاتی تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا "پولیس چیف سانس لینے کیلئے رکا اور سنجیدگی سے بولا "وزیراعظم کو استعفیٰ دینا پڑتا" ہمارے ڈی آئی جی صاحب کا رنگ پیلا ہو گیا اور انہوں نے حیرت سے پوچھا "کیا جاپان میں پولیس چیف کا بیٹھو کیوں ہے؟" جاپانی پولیس چیف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں نے اسے ایک کا قانون، انصاف اور سلامتی کا نظام بہت مستحوط ہے۔ ہم نے عوام کی حفاظت کیلئے پولیس بنا رکھی ہے، وی آئی جی کو پروڈنکول دینے کیلئے نہیں بلکہ جاپان کا ہر شخص جانتا ہے اگر وزیراعظم اور پولیس چیف میں لڑائی ہوگی تو اس میں وزیراعظم ہی کا تصور ہوگا لہذا استعفیٰ بھی اسے ہی دینا پڑے گا۔"

مجھے یہ بات اس ڈی آئی جی نے سنائی تھی، یہ ڈی آئی جی بعد ازاں آئی جی بنے اور آج یہ پیش پولیس ہیرو کے ڈی جی ہیں اور ان کا نام ڈاکٹر شعیب مندل ہے۔

میں نے پچھلے دس برسوں میں بے شمار سیاستدانوں، وزرا، ماہور پولیس کے اعلیٰ افسروں کو یہ واقعہ سنایا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا جب تک آپ لوگ پاکستان میں جاپان جیسی پولیس نہیں بناتے اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے میاں نواز شریف سے لے کر شوکت عزیز تک سب حکمرانوں نے اس واقعہ پر سر دھنا تھا اور اس کے بعد پاکستان میں جاپانی پولیس سسٹم کے خاذا کا عزم کیا تھا لیکن عملی طور پر نواز شریف نے کوئی قدم اٹھایا اور مذہبی شوکت عزیز صاحب نے وہ مجھے پولیس کے اعلیٰ حکام تو میں نے جب بھی انہیں "سونی دینت" کرنے کی کوشش کی ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا جب تک ہمارے سیاستدان پولیس کا سیاسی

استعمال ترک نہیں کرتے یہ نظام ٹھیک نہیں ہو سکتا، جس جب ان کے ساتھ اصرار کرتا تو وہ بے شمار ایسی مثالیں دیتے جن میں کسی پولیس اہلکار یا افسر نے کسی سیاستدان یا کسی سیاسی خاندان کے کسی فرد پر قانون نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد کانسٹیبل سے لے کر زنی آئی جی تک سب لوگ معطل ہو گئے تھے یا انہیں بیک جنبشِ قلم بدل دیا گیا تھا، ان افسروں کا کہنا تھا جس ملک میں ایم پی اسٹ کے ملزم بھائی کے لئے چیف منسٹر تھانوں پر حملہ آور ہو جائے، جس میں اشتہاری ملزم کی دہائی کے لئے وزیر اعظم کا بھائی تھا، نہ پر حملہ کرے، ایک آپ کا تلو توڑ دے اور تمہارا کمر سے عام پینا شروع کر دے، جس ملک میں گاڑی کے شیشوں سے گالے کاغذ اتار دے، پر کانسٹیبل کو جھکڑی لگا کر جزیل صاحب کے سامنے پیش کر دیا جائے اور جس ملک میں وی وی آئی پی حدود منت کے دوران ایسی ٹینس کورٹ دینے پر پولیس اہلکار اس ملک کی پولیس میں جاپان جیسی سپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ میں جب پولیس افسروں کے یہ اوائل سنتا تھا تو میں انہیں "شیطان کی جواز" کہتا تھا، میرا خیال تھا، ان لوگوں نے کام نہ کرنے کے بہانے گھڑ رکھے ہیں اگر یہ لوگ اجتماعی طور پر فیصلہ کر لیں، ہم نے آج سے کسی سیاستدان کا ناخوشگوار حکم نہیں مانا تو یہ نظام دو دن میں ٹھیک ہو

www.paksociety.com

میں اپنے اس نظریے پر 28 جون 2006 تک قائم تھا لیکن 28 جون 2006 کو ہمارے ایک محترم ایم این اے سردار ظہیر نے مجھے اپنے نظریے کو "زی شیب" کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے پہلی بار سوچا جب تک ہمارے سیاستدانوں کا قبلہ درست نہیں ہوتا اور جب تک ان کی گردنوں کا سر یا نہیں سر تھا اس وقت تک اس ملک کا قانون اور پولیس ٹھیک نہیں ہو سکتی، سردار ظہیر کا واقعہ بہت دلچسپ ہے، سردار صاحب 28 جون کو مری تشریف لے گئے مری کی انتظامیہ مریوں کے سیزن میں شہر میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند کر دیتی ہے لیکن سردار ظہیر ایک بڑی کونسر اور دوسری گاڑیوں کے ساتھ مری میں داخل ہو گئے، ان کی کونسر نے نریٹک ہاؤس کو دی، پولیس کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس نے سردار ظہیر سے عرض کیا "جناب مری میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند ہے، سردار صاحب کو کانسٹیبل کی یہ جہارت پسند آئی، لہذا انہوں نے اسے ڈانٹ دیا، جس پر کانسٹیبل محمد یوسف نے اصرار شروع کر دیا، سردار صاحب کے بیٹوں اور سیکورٹی گارڈز کو یہ اصرار اچھا نہ لگا، دو لوگ نیچے اترے اور انہوں نے سیکڑوں لوگوں کے سامنے کانسٹیبل کو مارنا شروع کر دیا، ان لوگوں نے کانسٹیبل کو مار مار کر اس کے ڈانٹ، ٹاک کی بندی اور بازو توڑ دیا، لوگ یہ ظلم

برداشت نہ کر سکے اور آگے بڑھے اور انہوں نے بڑی مشکل سے کانٹھیل کی جان بچائی، کانٹھیل محمد یوسف اس وقت تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال مری میں زیر علاج ہے جبکہ سردار صاحب فتح یاب ہو کر واپس اسلام آباد پہنچ گئے ہیں، میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے محسوس ہوا سردار فضل کے گارڈز اور بیٹوں نے یہ کئے یہ تھنڈ اور یہ ٹھنڈے صرف کانٹھیل محمد یوسف کو نہیں مارے بلکہ انہوں نے یہ تھنڈ ملک کے آئین، قانون، روایات اور پورے پولیس ذیہارمنٹ کو مارنا ہے، یہ ٹھنڈ بنیادی طور پر ہمارے کلچر، ہماری پارلیمنٹ اور ہماری سیاسی الٹ کے منہ پر آیا ہے، یہ ٹھنڈے ثابت کرتے ہیں ہمارے سیاستدان کس قدر منہبوا اور احمق سے ہیں اور ان کی نظروں میں ہمارے قانون، ہمارے نظام اور ہماری پولیس کی کیا اہمیت ہے، یہ ثابت کرتے ہیں ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں ہرزور اور شخص قانون سے جوتے صاف کرتا ہے اور اسے کوئی شخص نہیں پوچھتا، ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں کوئی بڑا شخص قانون اور قانون نافذ کرنے والوں کو تسلیم نہیں کرتا، جس میں قانون صرف غریبوں کیلئے ہوتا ہے اور جس میں منہبوا لوگ ہر ضابطے پر ہاتھ دے کر بندھتے ہیں، میں نے جب سے واقعہ پڑھا ہے میرا دل کرتا ہے جس اس واقعے کے واہوں کو اٹھا کر لوں اور ان لوگوں کو پھانسی لٹکا دوں، میری اس بات کو سننے والے سب سے بڑا گروہ ان لوگوں سے تھنڈ کرنا، جس میں ملک میں ان کو پھانسی لٹکانا ہے، میں نے ان کو کوئی ادارہ یا کوئی پولیس ایجنسی ایم این اے کے سامنے چھینک بھی مارا ہے، یہ تو پورے ایم این کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے لیکن جب اس ایم این کے کارندے پورے ملک کا استحقاق پورے ملک کی عزت اور تہذیب و تمدن اٹھاتے ہیں تو کسی ایم این، کسی پارلیمنٹ اور قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے کان پر جوں تک نہیں رہتی، میں ان سے عرض کروں "حضور اس ملک کے عوام کے کئے چھٹے اور اڑانے استحقاق پر ہم کون لگائے گا، حضور سردار فضل صاحب جیسے لوگوں کا ہاتھ کون روکے گا۔"



ترقی کی شاہراہ

امیر تیمور اسلامی تاریخ کا ایک عجیب کردار تھا، وہ سر قند کے ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک معمولی زمیندار تھے۔ قدرت نے تیمور کو بلاؤں کے طوفان اور سختیوں سے گونڈا کر دیا۔ وہ نہ صرف خانہ فرغانہ کا حکمراں تھا بلکہ وہ مغربی آفت سے پہلے ہی آیت کی طرف اسی ترتیب سے قرآن مجید پڑھ سکتا تھا۔ وہ لفظ اور تاریخ کا بھی ماہر تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت سے کام کر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا سکتا تھا۔ گرز کھما سکتا تھا۔ تیر پھینک سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا اور وہ شریعت کا اس قدر پابند تھا کہ اس نے پوری زندگی نماز قضا نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا وحشی اور ظالم بھی تھا۔ وہ پچاس برس تک جنگیں لڑتا رہا، اس نے سارا سنٹرل ایشیا، ایک تہائی ہندوستان، افغانستان، ایران اور عراق فتح کیا، اس نے ترکی اور یورپ کے کئی ملک بھی روند ڈالے، وہ اپنی فتوحات کے باعث "تیمورزی گریت" کہلایا، وہ قتل کر کے خوش ہوتا تھا، اس کا کینا تھا، وہ اپنی کئی بوٹی گردن سے اپنے خون جیسا تھمتی نکال دے کوئی نہیں۔ وہ جو شہر فتح کرتا تھا اس کی ساری آبادی کو قتل کر دیتا تھا، عمارتیں ڈھا دیتا تھا اور تسلیں گرا دیتا تھا، اس نے ذرا بڑا بڑا لاکھ لوگوں کے سر توڑ کر کھوپڑیوں کے مینار بنائے لیکن اس تمام تر ظلم اور وحشت کے باوجود اس میں ایک عجیب عادت تھی وہ جو شہر جو ملک فتح کرتا تھا وہاں کے ملاء و دانشوروں، شاعروں اور صنعت کاروں کو امان دے دیتا تھا اس نے اپنی فوج کو حکم دے رکھا تھا "تم مشرک شہر کی آبادی

سے جو چاہو سلوک کر دو لیکن خبر در تہبہاری آواز اور تہبہاری گوار کسی صنعت کار، کسی شاعر، دانشور اور عالم پر نہیں اٹھنی چاہیے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے، مذہب اور طبقے سے کیوں نہ ہو، وہ جنگ کے بعد متوحہ علاقوں کے علماء سے گفتگو بھی کرتا تھا ان سے علم اور معلومات حاصل کرتا تھا انہیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا اور پھر انہیں عزت کے ساتھ سرفرد میں آباد فرماتا تھا اس کی اس عادت کا یہ نتیجہ نکالنا چودھویں اور پندرہویں صدی کے وسط میں دنیا میں سب سے زیادہ شاعر، دانشور، عالم اور صنعت کار تیمور کی سلطنت میں تھے دنیا میں سب سے زیادہ درس گاہیں، مسجدیں، بازار اور کارخانے بھی سرفرد اور بخارا میں تھے اور دنیا میں سب سے خوشحال لوگ بھی سنٹرل ایشیا میں آباد تھے اس دانت عالم یہ تھا، دنیا جہان کے ماہرین تیمور کے پاس آتے تھے اسے اپنائیں، اپنی مہارت دکھاتے تھے اور وہ انہیں جو مہارت سے لاوا دیتا تھا، وہ انہیں اپنے ملک کے بہترین علاقوں میں آباد کرتا تھا کوئی آکر دس سے کہتا تھا "میں دنیا میں سب سے اچھا چاول اگا سکتا ہوں" تو وہ اس سے بحث پوچھتا تھا، اس کے مطالبے کے مطابق اسے رقم دے دیتا تھا اور اسے پورے اختیارات کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا تھا، شاید یہی وجہ تھی تیمور کا دور سنٹرل ایشیا کا سنہری ترین عہد

Kasni Azad@OneUrdu.com

تیمور کا یہ اصول آج تک دنیا میں کارفرما ہے دنیا کا ہر وہ معاشرہ جس میں صنعت کاروں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کی تعداد زیادہ ہے اس کا شمار ترقی یافتہ دور خوشحال معاشرہ میں ہوتا ہے اور ہر وہ حکومت کا ماب اور کامران ہے جس کی کابینہ میں دانشور اور ماہرین ہیں، آپ امریکہ کی مثال لیجئے، جہاں کی کابینہ کے میں ارکان ہیں، ان ارکان میں سے صرف پانچ رکن سیاستدان ہیں جبکہ باقی تمام ارکان عالم اور فاضل ہیں ان میں وزیر داخلہ، نیشنل ڈزیرمنٹ، ایٹن ایل چارڈ، چیف آف شاف اینڈ ریو ایج کارڈ، نائب صدر ڈک چیٹی اور ہوم لینڈ سکیورٹی کے وزیر نام راج جیسے لوگ شامل ہیں، جہاں کی کابینہ کے تمام رکن جان پی والٹرز، توانائی کے وزیر، سوسٹیل ڈیولپمنٹ اور وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس تو ہاٹا کا عہدہ ہونے والے ہیں، پروفیسر سے۔ مس رائس 1981ء سے 1989ء تک اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں پالیٹیکل سائنس کی پروفیسر رہی تھیں انہوں نے تدریس کے قومی سطح کے دو بڑے ایوارڈ بھی حاصل کیے تھے، وہ اس وقت بھی یونیورسٹیوں میں لیکچرر رہتی ہیں، یونیورسٹی آف ٹینیسی کے پالیٹیکل سائنس میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے انہوں نے وہاں چھ سال پڑھایا تھا اور نیشنل ڈرگ کنٹرول پالیسی کے ڈائریکٹر

جان لی والٹر زمشلی گن سلیٹ یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر تھے، ان کے علاوہ کابینہ کے باقی ارکان صنعت کار، ۱۹۷۰ء کی بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو اور زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین ہیں مثلاً آپ امریکہ کے وزیر زراعت مائیک جو ہاز کو بیچتے وہ ایک زمیندار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ہاتھوں سے فارمنگ کی تھی بلکہ انہوں نے زرعی کمپنیاں بھی چلائیں۔ وزیر تجارت کارلوں گینرز امریکہ کی ایک مشہور تجارتی کمپنی میں ملازم رہے ہیں انارنی جنرل الیگزینڈر ایلس مختلف کمپنیوں کے مشیر تھے۔ وزیر دفاع ڈونلڈ رامز فیلڈ نیوی میں پاکستان رہے، انار کے مشیر رہے اور دنیا کی تین بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو رہے، جنجنت اور بجٹ کے ڈائریکٹر ہاشوا اور تجارت کے نمائندہ رابرٹ بی زسٹ لیک Zoellick سرکاری ملازم تھے۔ خصوصی امور کے وزیر جم ٹیکسن ایک عام سپاہی تھے، ہاؤسنگ کے وزیر اٹنلسو، جیکسن امریکن الیکٹریک پاور کے عام ملازم تھے، وزیر خزانہ جان ڈبلیو سنو امریکہ کے نامور برنس مین ہیں، سماجی بہبود اور صحت کے وزیر مائیک لیوٹ طویل عرصے تک سماجی بہبود اور عوامی صحت کے غیر سرکاری اداروں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے عوامی صحت کے لیے شہرینہ بون مرکام کیا، انہوں نے صحت کے وزیر مارک والی ہالڈ لیک کا کاروباری شخصیت ہیں، دو گراں چھوڑتے کے کاروبار سے منسلک رہے اور امریکہ کی وزیر تعلیم مارگریٹ سٹیٹنگنر طویل عرصے تک نیگاس کی سکول بورڈ ایسیوشن کی ڈائریکٹر رہی ہیں۔

آپ دیکھ لیجئے یہ تمام لوگ اپنے اپنے شعبے کے ماہر ہیں۔ ان کی زندگیوں میں ان شعبوں میں گہری جن جن کے وہ آج وزیر ہیں، ہذا یہ لوگ حلقہ اٹھانے سے پہلے اپنے شعبوں کے مسائل اور مشکلات سے واقف تھے انہیں معلوم تھا ان کے نیچے کتنے دفتر کام کر رہے ہیں اور ان میں کس افسر کے پاس کیا اختیارات ہیں اور کس شعبے میں کیا تبدیلی کی جائے تو سسٹم زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہے، یہ حقیقت ہے زراعت کی وزارت کو ایک زمیندار زیادہ بہتر طریقے سے چلا سکتا ہے اور ایک ڈاکٹر وزارت صحت اور ایک صنعتکار ایڈمنسٹری کی وزارت کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے، وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی یونیورسٹی کا ایسا وائس چانسلر جس نے عملی زندگی کا آغاز سکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا ہو وہ تعلیم کی وزارت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لاسکتا ہے چنانچہ کہنے کا مطلب ہے اگر ہم ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں، اگر ہم ملک کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں امیر تیمور کی طرح باپچر امر کی نظام کی طرح سیاست اور حکومت میں پروفیسروں اور ماہرین کی تعداد بڑھانی چاہیے۔ ہمیں تمام شعبوں

کی قیادت ماہرین کے حوالے کر دینی چاہیے۔ اگر ایک شرکت عزیز کے آنے سے خزانے کی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے، ملک ذی فائد سے نکل سکتا ہے اور ہمارے قرضوں میں کمی آ سکتی ہے تو کیا ہم اپنی انڈسٹری، تعلیم، صحت اور تجارت کے شعبے جناب شرکت عزیز جیسے ماہرین کے حوالے نہیں کر سکتے، ایسا ہم ان شعبوں میں یہ تجربہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ایک پروفیسر صاحب بتا رہے تھے وہ جب امریکہ میں تھے تو انہیں مشاورت کیلئے بیٹا گان تک میں بلایا جاتا تھا لیکن جب وہ پاکستان آئے تو وہ اپنی تنخواہ کیلئے چھ مہینے تک دفتروں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ انہیں کلرک تک اپنے دفتر میں گھسنے نہیں دینا تھا۔ ذرا سوچنے کیا بلندی ہے امریکہ میں پروفیسر وزیر ہیں اور کیا پستی ہے پاکستان میں پروفیسر تنخواہوں اور پینشنوں کیلئے، نکلے کھارے ہیں، امیر تھور نے کہا تھا وہ ملک بھی قائم نہیں رو سکتا جو اپنے عالموں و دانشوروں اور صنعتکاروں کی عزت نہیں کرتا۔ امیر تھور کے چھ سو سال بعد سنہری کسنجر نے امریکہ میں اعلان کیا تھا "امریکہ اس وقت تک پر پاد رہے گا جب تک یونیورسٹی کے پروفیسر، دانشور اور بزنس میں اس کی پالیسیاں بناتے رہیں گے"

www.KitaboSunnat.com

نہیں کر سکتے؟ پاکستان کی تمام جماعتیں 2007ء کو الیکشن کا سال قرار دے رہی ہیں۔ صدر پرویز مشرف بھی "الیکشن مہم" کے سلسلے میں پورے ملک کے دورے کر رہے ہیں، پنجاب حکومت بھی صدر صاحب کو اگلے دس سال تک دروی میں رکھنے کی خواہش مند ہے، یہ سارے کام ہونے چاہئیں کیونکہ یہ پاکستان کے بے شمار لوگوں کی بچا کیلئے ضروری ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ ملک کی حقیقی ترقی پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اگر صدر صاحب دروی کے ساتھ ساتھ یہ قانون بھی بنوا دیں کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنی مرکزی قیادت میں ماہرین کو پچاس فیصد کوڑے لگیں، اگر صدر آج اعلان فرمائیں ملک کی اگلی کابینہ کے پچاس فیصد وزراء، ماہرین اور پروفیسروں کے تو ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہم اس شاہراہ پر آ سکتے ہیں جو ملک کو ترقی کی انتہا تک لے جاتی ہے، جو قوموں کو خوشحال قوم بناتی ہے۔



ہم بھکاری ہیں

تاگنگ شان (TANG SHAN) چین کا ایک تاریخی شہر ہے، یہ شہر بیجنگ سے 95 میل دور شمال چین میں واقع ہے، 1976ء تک اس کا شمار چین کے پندرہویں نمبر سب سے بڑے شہروں میں ہوتا تھا، اس وقت اس کی آبادی دس سے چندرو لاکھ تھی یہ ایک ہشتا کھینٹا شہر تھا لیکن 28 جولائی 1976ء کو رات تین بج کر 42 منٹ پر اس شہر پر قیامت نوبت پڑی، صوبہ میں زلزلہ آیا، زلزلے کی مختلف لہریں "تاگنگ شان" میں تھیں اور پورا شہر زمین بوس ہو گیا، ریکٹر سکیل پر اس زلزلے کی شدت 17 اعشاریہ 8 تھی، اس زلزلے میں تاگنگ شان کے 16 لاکھ 55 ہزار لوگ مارے گئے جبکہ 7 لاکھ 80 ہزار شدید زخمی ہوئے، اس شہر میں سات ہزار 2 سو 18 خاندان ایسے تھے جن کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا، یہ چین کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا دوسرا جبکہ 20 ویں صدی کا سب سے بڑا زلزلہ تھا، اس وقت ماؤ زے تنگ زندہ تھے، ان کی عمر 83 سال تھی اور وہ علیحدگی تھے لیکن دو فوراً تاگنگ شان پہنچ گئے، اس وقت پوری دنیا نے چین کو امداد کی پیشکش کی لیکن ماؤ زے تنگ نے امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا، ان کا کہنا تھا "قدرت نے یہ آفت صرف چین پر اتاری ہے لہذا اسے برداشت بھی صرف چین کرے گا" اس دور میں کسی نے ماؤ زے تنگ کو مشورہ دیا "زلزلے کے باعث تاگنگ شان کی زمین کمزور ہو چکی ہے لہذا ہمیں اب اس جگہ شہر آباد نہیں کرنا چاہیے، ماؤ نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا، انہوں نے فرمایا "ہم تمہیک اسی جگہ ایک ایسا تاگنگ شان آباد

کریں گے جو پچھلے شہر سے خوبصورت اور منہبوطا ہوگا" اس اعلان کے چند دن بعد 9 ستمبر 1976ء کو اڈے سنگ انتقال کر گئے اور ان کی جگہ کوئٹہ کو چین کی کیونست پارٹی کا جیڑ میں بنا دیا گیا کوئٹہ سیدھے تا سنگ شان گئے اور انہوں نے بلے پر کھڑے ہو کر اعلان کیا "اڈے کے بیٹے اپنے باپ کے قول کا پاس کریں گے" اڈے کے بیٹوں نے واقعی اپنے باپ کے قول کا پاس کیا آج تا سنگ شان کا شمار چین کے چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے اس میں بے شمار فلک بوس عمارتیں، ٹیکنیریاں، فارم ہاؤسز اور فلیٹس ہیں دنیا آج اس شہر کو چین کا بھاد شہر (بروشی آف چائنا) کہتی ہے۔

تا سنگ شان کی تعمیر نو بیسویں صدی کا معجزہ ہے چینی قوم نے یہ معجزہ کیسے دکھایا یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کہانی ریلیف کے کاموں سے شروع ہوتی ہے زلزلے کے بعد شہر میں تین قسم کے لوگ تھے ایک وہ لوگ جو زلزلے میں انتقال کر گئے دوسرے وہ جو زخمی ہو گئے اور تیسرے وہ لوگ جو اس سانحے میں پوری طرح بچ گئے چینی حکومت نے فوری طور پر نیشنل گورنمنٹ اور ریڈ کراس کو

www.Paksociety.com

مرحلہ بحالی کا تھا اس زلزلے میں تا سنگ شان کے چار لاکھ خاندان متاثر ہوئے تھے ان متاثرین کے پاس رہنے کے لئے جگہ نہیں تھی چینی حکومت نے متاثرہ خاندانوں کی خواتین 'بچوں' بوزھوں اور زخموں کو پورے ملک میں پھیلا دیا حکومت ایک خاندان کے لوگوں کو جمع کرتی ان کے ہاتھ میں ریل کا ٹکٹ پکڑاتی اور انہیں حکم دیتی کہ لوگ فلاں شہر کے فلاں محلے میں چلے جاؤ وہاں فلاں شخص تمہارا انتظار کر رہا ہے وہ خاندان وہاں پہنچ جاتا جس کے بعد میزبان اس خاندان کے نان نلھے کا ذمہ دار ہو جاتا یہ میزبان رضا کا تھے حکومت نے زلزلے کے دوسرے دن ملک بھر میں اعلان کر دیا تھا ہمارے پاس چار لاکھ متاثرہ خاندان ہیں جو لوگ متاثرین کو اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں دو اپنا اپنا نام لکھوا دیں۔ لوگوں نے نام لکھوا دیئے۔ اس کے بعد انتظامیہ متاثرہ خاندان کے افراد کو دیکھ کر رضا کار کا تعین کرتی اور اس خاندان کو رضا کار گھرانے کے پاس بھجوا دیتی اس سکیم کے نتیجے میں 8 ہفتوں میں تمام متاثرہ خاندان سہل ہو گئے دوسری طرف حکومت نے پورے ملک سے رضا کار جمع کئے اور ان رضا کاروں کو تا سنگ شان سے ملے افغانی کی (مدداری سونپ دی رضا کاروں نے چار ماہ میں پورا شہر صاف کر دیا۔ تیسرا مرحلہ شہر کی تعمیر نو تھی تعمیر نو میں تا سنگ شان کے زخمہ جج جانے والے شہریوں نے دل و جان سے حصہ لیا۔ یوں ٹھیک ایک سال بعد تا سنگ شان اپنے پورے قہ کے ساتھ

زمین پر کھڑا تھا' آج جو بھی شخص ٹانگ شان جاتا ہے وہ شہر کی خوبصورتی اور پائیداری دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور وہ یہ یقین کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتا یہ شہر کبھی موت اور نعشوں کا قبرستان تھا۔

میں نے ٹانگ شان کی یہ کہانی چین کی ایک کتاب میں پڑھی تھی اور جب 8 اکتوبر 2005ء کو پاکستان میں زلزلہ آیا اور بالا کوٹ سے مظفر آباد تک 25 لاکھ گھرانے اس زلزلے کا شکار ہو گئے تو مجھے فوراً ٹانگ شان یاد آیا اور میں نے سوچا ہمیں بھی ٹانگ شان سے سبق سیکھنا چاہیے ہمیں چاہیے ہم پورے ملک سے ایسے خاندانوں کے نام جمع کریں جو چند ماہ کے لئے زلزلے سے متاثرہ خاندانوں کی کفالت کر سکتے ہیں ہمارے ملک میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کے پاس ایک سے لاکھ مکان ہیں یہ لوگ زلزلہ زدگان کی مدد بھی کرنا چاہتے ہیں اگر حکومت متاثرہ خاندانوں کو ان کے حوالے کر دے تو یہ لوگ بڑی آسانی سے سال چھ مہینے ان لوگوں کی کفالت کر سکتے ہیں اس ضمن میں پنجاب گورنمنٹ کی مثال دی جا سکتی ہے جناب پرویز الہی پنجاب میں

"ایک خاندان اپنا بیٹے سیم" کا اعلان کر چکے ہیں مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے چھ مہری صاحب

آباد کریں گے یہ ایک قابل تقلید روایت ہے دوسرے صوبوں میں بھی ایسی سیکسیس شروع کی جا سکتی ہیں اسی طرح میں نے کل اخبار میں پڑھا ہانسکوہاؤس اور داؤلا کوٹ میں پرائمری سکولوں کی تعمیر اور بحالی کا کام ایم کیو ایم نے اپنے ذمے لے لیا ہے یہ بھی ایک اچھی روایت ہے۔ اس وقت پاکستان میں چھوٹی بڑی 127 سیاسی جماعتیں ہیں اگر یہ تمام سیاسی جماعتیں ایم کیو ایم کی طرح متاثرہ علاقوں کے مختلف منصوبے اپنے ذمے لے لیں کوئی ہل بنانا شروع کر دے کوئی صاف پانی کے پلانٹ لگا دے کوئی کالج اور ہسپتالوں کی تعمیر شروع کر دے کوئی دس کلو میٹر سڑک اپنے ذمے لے لے کوئی بجری لاوے کوئی سینٹ لے آئے اور کوئی کھڑکیاں دروازے فراہم کر دے تو زلزلے سے متاثرہ لوگ ایک آدھ سال میں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو سکتے ہیں۔ مظفر آباد ہانسکوہاؤس اور داؤلا کوٹ اور ہانسکوہ کے تمام شہر قصبہ اور دیہات تعمیر ہو جائیں گے ہم متاثرین کے سلسلے میں ایک اور غلطی کر رہے ہیں ہم اس آفت میں زندہ بچ جانے والوں کو بھی امداد سے رہے ہیں میں نے امدادی کمیٹیوں میں ایسے بے شمار لوگ دیکھے ہیں جنہیں زلزلے کے دوران خراش تک نہیں آئی لیکن یہ لوگ اب کیمپوں میں روٹیاں توڑ رہے ہیں حکومت کو چاہیے وہ ان صحت مند لوگوں کو بحالی کے کاموں پر لگا دے ان کے بچوں خواتین اور بزرگوں کو رضا کار خاندانوں کے حوالے

کرے اور ان لوگوں کو متاثرہ دیہات میں لے جا کر امدادی سرگرمیوں پر لگا دے انہیں اپنے اپنے گھر تعمیر کرنے کی ذمہ داری سونپ دے، مجھے خطرہ ہے اگر یہ لوگ اسی طرح کیپوں میں پڑے رہے تو یہ لوگ آہستہ آہستہ بے کار ہو جائیں گے اور یہ لوگ واپس جانے سے انکار کریں گے۔

میں ایک بار پھر واپس تاگ ٹانگ کی طرف آتا ہوں۔ چین کی حکومت نے جب تاگ ٹانگ کی تعمیر نو کا اعلان کیا تھا تو لوگوں نے اس کا بڑا خوبصورت ریسپانس دیا، انہوں نے 'ایک چینی ایک اینٹ' کا ناکارمووا اپنالیا، چین کے تمام شہریوں نے ایک ایک اینٹ خریدی اور یہ اینٹ اپنے خڑے پر تاگ ٹانگ شان پہنچا دی، صرف ایک ہفتے میں تاگ ٹانگ شان میں 50 کروڑ اینٹیں جمع ہو گئیں، یہی عالم سینٹ 'بجری اور سرینے کا تھا' لوگوں نے ایک ایک پاؤ سینٹ، ایک ایک بانٹی، بجری اور ایک ایک سریا اکٹھا کیا اور تاگ ٹانگ شان بھجوا دیا، ہم بھی یہ کر سکتے ہیں، پچھلے ماہ تک جو لوگ کپڑے، جوتے، خیمے اور خوراک جمع کر رہے تھے وہ لوگ اب تعمیراتی سامان جمع کر سکتے ہیں، وہ لوگ سریا، بجری، سینٹ، اینٹیں، کھڑکیاں اور واڑے اور فرنیچر جمع کر س، لوگوں میں ڈانٹیں

اور یہ ایک گاؤں تعمیر کرانے کے لئے ملے گا۔ یہ سب کچھ سزا کی ایک جہاں میں

آزاد کشمیر اور بزارہ کے تمام متاثرہ علاقے آباد ہو جائیں گے، ہر گھر سے قبیلوں کی آوازیں آ رہی ہوں گی اور ہر گھر میں زندگی اور ہر مکان میں خوشیاں ہوں گی، ذرا سوچئے اگر چین یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے، دوسری بات پاکستان کے اس ڈنڈے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا، ہم میں اور چین میں بڑا فرق ہے، چین نے 1976ء میں امداد لینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ ہماری فوجی قیادت 2005ء میں کنگول لے کر پوری دنیا میں نکل پڑی تھی، ہم نے جموں واپس پھیلنا کر لوگوں سے امداد طلب کی تھی، ہم نے ثابت کر دیا تھا، ہم اخلاقی لحاظ سے بھکاری ہیں۔

کوئے کے انڈول سے ہنس نکلنے کا انتظار

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس دور میں برطانیہ اور امریکہ نے مل کر اتحادی فوجیں بھیجیں۔ آخر اتحادی فوجوں نے نازیوں کو ہار دیا۔

دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیڈل برگ اور گونن جن پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی۔ پھر چلنے والے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیر اعظم کے ایک ساتھی نے ان سے یہ آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تھی تو وہ نے مسکرا کر جواب دیا تھا "اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئی تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا" اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت کہہ راضی ہو کوئی محفوظ ترین جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی ہائیڈل برگ اور گونن جن نکلا گیا۔

تاریخوں اور اہتماموں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی افادیت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی

نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں کالج اور سکول آباد رہتے ہیں ان کے ٹیچر بالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس تو اپہ زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو سو برس بعد کا زمانہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 بلین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدقماش جاگیر داروں کی جاگیریں بیچ کر سکول بنانے شروع کر دیے۔ اس دور میں مصر میں دو دو دنوں میں تین تین سکول کھولے گئے تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے پچھلے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج چوٹی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا 70 فیصد حصہ ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد

پرائمری سکولوں میں آج بھی تو اسی کیفیت ہے۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں

طالب علم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو استاد ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے اساتذہ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں اساتذہ کی تنخواہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آگئی اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈیکلین کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہزار اکال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود نتائج کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں اہم لال قلعے پر چھنڈے لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جس کے صرف ایک شہر توکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

اہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا ٹوکس بنائے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلانے نیکینالوجی کی

پچاس ساٹھ نئی یونیورسٹیاں بنائے، شہروں، قصبوں اور دیہات سے جن جن کریڈنٹس جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے، بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے، انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پاد پیداکرے جو علم، ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو، حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے، احتساب بیرونی ڈیپانٹوں اور لیروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے جتنے یہ وہ رقم ہے جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا، حکومت یہ کہے یہ رقم لیروں سے واپس نہیں ملی، وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے، جن میں صرف سائنس کی تعلیم ہی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آجائے گا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پیکش کی تھی، اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سود صحاف کر دیں گے۔ حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود دنیاوی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟

ادارے، عسکرانوں کی ترہجیات میں صرف دو چیزیں اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فواید نظر آتے ہیں، ہذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے، کسی ایسی پالیسی کو نکلنے دیتے ہیں جس سے ملک، قوم کو فائدہ پہنچے سکے، جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر نواب اکبر خان کیٹی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو یا تحفظ حقوق نسواں کا مل پیش کرنا ہو تو وہ دو دن لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم، روزگار، صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو دو دو سال تک فائل ہی جمن نہیں لیتی لہذا جس ملک، جس معاشرے میں حکومت کی ترہجیات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے چمکے گی، اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ ہم بڑے دلچسپ لوگ ہیں گو سے کے انڈوں سے نہیں نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔



دو نعشیں

زندگی میں بعض اوقات یوں ہی جلتے پھرتے کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو آپ کے دہن میں گھسٹا ہو کر رہتا ہے اور پوری زندگی آپ کو پیچھا نہیں چھوڑتا میری زندگی میں بھی دو ایسے واقعات پیش آئے تھے جو ہر گد کی جڑوں کی طرح میرے شعور میں جڑت ہو کر رہ گئے تھے اور میں پوری کوشش کے باوجود انہیں اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا۔

پہلا واقعہ 2001ء میں پیش آیا ان دنوں حکومت اخبارات میں انتہائی مطلوب مجرموں کے بارے میں ایک اشتہار شائع کرایا کرتی تھی اس اشتہار میں سب سے اوپر ایک نوجوان کی تصویر ہوتی تھی یہ نوجوان حکومت کو دہشت گردی کی بے شمار وارداتوں میں مطلوب تھا حکومت نے اس کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر رکھی تھی یہ نوجوان اس وقت افغانستان میں روپوش تھا اور اس کی وجہ سے پاکستان میں شدید قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگی پائی جاتی تھی یہ نوجوان بعد ازاں گرفتار ہوا اور ایک پولیس مقابلے میں جاں بحق ہو گیا اس نوجوان نے ایک رات مجھے فون کیا اور مجھ سے درخواست کی آپ حکومت تک میری ایک اینٹلی پہنچائیں میں نے پوچھا کیا؟ اس نے کہا "الرحمۃ علیہ وعدہ کرے وہ" میں پوسٹل معافیے میں تیس ماہ سے نا وہ میں عدالت میں پیش ہونے اور اپنے اوپر لگائے گئے تمام الزامات کی صفائی کا موقع دے گی تو ہم لوگ

گرفتاری دینے کیلئے تیار ہیں" میں نے اس سے وعدہ کیا میں ان کی یہ پیشکش حکومت کے کسی اعلیٰ عہدیدار تک پہنچا دوں گا اس کے بعد میں نے اس سے وہ سوال پوچھا جو عموماً ایسی صورت حال میں میرے جیسے لوگ پوچھا کرتے ہیں میں نے اس سے پوچھا "وہ کیا وجہ تھی جس نے ایک عام سے نوجوان کو اتنا بڑا دہشت گرد بنا دیا" اس نے قبضہ لگا کر جواب دیا "نواز شریف کے پہلے دور میں حکومت نے ہیرود گاؤں جو انوں کو چھوٹے قرضے دینے شروع کئے تھے اس میں ان دنوں غربت اور بے روزگاری کے انتہائی دور سے گزر رہا تھا" میں نے پچاس ہزار روپے کے قرضے کیلئے اپلائی کیا "میرا خیال تھا میں اس رقم سے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لوں گا میں پورا سال اس قرضے کے پیچھے خواہ ہوتا رہا لیکن مجھے قرضہ نہ ملا آنے والے دنوں میں غربت بے روزگاری مذہبی شدت پسندی اور حکومتی رویے مجھے اس طرف لے آئے" میں دہشت گرد مشہور ہو گیا" میں نے اس کی بات پر افسوس کیا "اس نے ایک اور قبضہ لگایا اور ہتھے ہتھے ہوا" افسوس کی بات تو آگے آئے گی "جس حکومت نے مجھے 50 ہزار روپے قرضہ نہیں دیا تھا آج اسی حکومت نے میرے سر کی قیمت

انکے گرد روپے تھڑو کھرنی تھے اس نے ان الفاظ کے ساتھ ہی فون بند کر دیا لیکن وہ الفاظ اس کا لہجہ اور اس کے لہجے کی سنگینی آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے مجھے ہر روز کسی نہ کسی وقت اس کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں ہم دو لوگ ہیں جو کسی بے روزگار کو 50 ہزار روپے قرض نہیں دیتے لیکن بعد ازاں اسی کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر دیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے میں ایک دوست کے دفتر میں بیٹھا تھا ایک اور سیانی عمر کا بیمار شخص وہاں آیا "کرسی پر بیٹھا پانی کا گلاس مانگا پانی پیا اور اس کے بعد درخواست کی میں بے روزگار ہوں "میرے پانچ چھ بچے ہیں گھر میں دو تین دن سے قاتے ہیں مجھے کوئی ایسی نوکری چاہیے جس سے میں بال بچوں کا پینٹ پال سکوں "میرے دوست نے اس سے فوراً معذرت کر لی "میرے دوست کا کہنا تھا اس کا چھوٹا سا کاروبار ہے جس میں کسی نئے ملازم کی تنخواہ نہیں اجنبی نے سنت کرنے کے انداز میں چند فقرے بولے لیکن میرے دوست نے اس سے سخت لہجے میں معذرت کر لی "وہ شخص اٹھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا چند لمحے بعد میرے دوست کا نوکر بھاگتا ہوا اندر آیا اور ہانپتے ہوئے بولا "ابھی ابھی جو شخص باہر نکلا تھا وہ دفتر کی دہلیز پر بے ہوش پڑا ہے" ہم لوگ گھبرا کر باہر نکلے وہ شخص حقیقتاً دہلیز پر گر پڑا تھا ہم نے اسے اٹھایا لیکن وہ اس وقت تک مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا وہ فوت ہو چکا تھا دفتر کے سامنے مجمع لگ گیا ہم نے پولیس کو بلایا "انٹرنل کو ہسپتال

لے کر گئے ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد سوت کی وچہل کا دور و قرار دیا ہم نے اس کی جیسوں کی
 تلاش لی اندر سے تمہیں چار روپے کی ریزکاری اور ایک چھوٹی سی ڈائری لگی ہم نے اس ڈائری کی
 مدد سے اس کا پتہ تلاش کیا وہ راولپنڈی کے نالہنی کے کنارے ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا
 ہم جب اس کی تلاش لے کر اس کے گھر پہنچے تو پتہ چلا واقعی اس گھر کا چولہا بجھے ایک ہفتہ ہو چکا
 تھا میرے دوست نے اسی وقت دفتر سے پچاس ہزار روپے منگوئے اور بیوہ کی ہتھیلی پر رکھ دینے
 وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میرا دوست اس گھر آنے کو پانچ ہزار روپے ماہانہ دے رہا ہے میں
 جب بھی اس سے ملتا ہوں میں اس سے کہتا ہوں ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں ہم نے اس شخص کو
 دو تین ہزار روپے کی نوکری نہیں دی لیکن ہم اس کے خیم بچوں کو ہر مہینے پانچ ہزار روپے دے رہے
 ہیں اگر ہم اس وقت اس کی حالت پر غور کر لیتے تو شاید اس کی جان بچ جاتی شاید اس کے بچے خیم
 نہ ہوتے میرا دوست اس وقت اپنے آفس پونجھتا ہے اور ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا ہے "میں پانچ
 ہزار میں ایک زندگی خرید سکتا تھا لیکن میں نے پچاس ہزار روپے دے کر ایک نفس خرید لی۔"

ایک کروڑ روپے کی گردن کا مالک وہ نوجوان اور 50 ہزار کی یہ نفس آج تک میرے
 سامنے ہر پڑتی ہے میں روڈ پر اس کا اٹھا کر اس کی شہرتے میں پھرتا ہوں میں روز بھی ایسے جہڑستان
 کی تلاش میں نکلتا ہوں جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں جہاں میں یہ جو ہر اتار سکوں لیکن مجھے
 اس ملک میں کوئی ایسا جگہ نہیں ملتی مجھے زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں ملتا جہاں میں یہ دونوں نفسیں
 پھینک کر آؤں جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں۔



لوگ بھی ضروری ہیں

مریم کا سر پکرایا اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں نہیں کھرنے کو جھکے ویسے لیکن

بھی مہنگا تھا اور اس سکول میں پڑھنے والے بچے بھی امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہذا ایسے سکول میں کسی بچی کا بے ہوش ہو جانا خطرے سے خالی نہیں تھا انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے پرنسپل سے نے کرچیز اسی تک سب مریم کی کلاس میں جمع ہو گئے کہ سہولتیں منگوائی گئی بچی کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا بچی کے والدین بھی ہسپتال پہنچ گئے مریم تھوڑی دیر بعد ہوش میں آگئی لیکن ڈاکٹروں نے اس کا اعلائے جاری رکھا شام کو خون کی رپورٹس آئیں تو پتہ چلا ساڑھے چار سال کی مریم ہلڈ کینسر کی مریض ہے مریم کی والدہ غش کھا کے گر گئی اور والد ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ مریم کے والد محمود صاحب کالیئوں کے بہت بڑے تاجر ہیں مریم محمود صاحب کی واحد اولاد تھی محمود صاحب نے مریم کا علاج شروع کرا دیا وہ اسے امریکہ تک لے کر گئے لیکن مریم کی سائیس مختصر تھیں مریم پچھلی جنوری میں انتقال کر گئی ایک کہانی یہاں ختم ہو گئی دوسری کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے محمود صاحب کو جنوں میں امریکہ سے ایک خط موصول ہوا یہ خط اس ہسپتال کی انتظامیہ نے لکھا تھا اس خط میں مریم زیر علاج رہنے کی خط میں سود صاحب اور تیم صاحب لے خون کی رپورٹس تھیں اور ان رپورٹس کی روشنی میں ہسپتال انتظامیہ نے ان کو مشورہ دیا تھا آپ دونوں کے

خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جن کے ملاپ سے بلڈ کیسر پیدا ہوتا ہے ہمیں خدشہ ہے آپ کے ہاں جو بھی بچ پیدا ہوگا اسے بلڈ کیسر ہوگا چنانچہ آپ اس ضمن میں احتیاط کریں "عمود صاحب کیلئے یہ ایک "شاکنگ" خبر تھی انہوں نے پاکستان کی تین چار بڑی لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کرائے سب لیبارٹریوں نے امریکی رپورٹ کی تصدیق کر دی عمود صاحب آج کل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ دینے دیے ہوتے تو آج تک ان کا سینہ بچوں کا قبرستان بن چکا ہوتا وہ بچوں کی اسوات کا دکھ سہتے سہتے فوت ہو چکے ہوتے ۔

پاکستان میں اس وقت عمود صاحب جیسے لاکھوں والدین ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اپنے بچوں کو موت کا تحفہ دے دیتے ہیں اور ان کے بچے آنکھ کھولتے ہی موت کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں میڈیکل سائنس کے مطابق دنیا کا ہر مرد ہر عورت اور ہر عورت ہر مرد کیلئے "سوت اپیل" نہیں ہوتی بعض مردوں کے خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جو مخصوص کیمیکل کی حامل خواتین کے جسم میں پہنچ کر خون ناک بیماری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں یہ امراض بعد ازاں بچوں میں منتقل ہوتے ہیں شادی کے بعد باپ کے بچے پیدا ہوتے ہیں یا پھر ان میں شکار ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں جسکیلئے سیما کی وجوہات خالصتاً موردی ہوتی ہیں کیسر کی وجہ بھی والدین کے جینز ہوتے ہیں اگر ماں اور باپ دونوں میں کیسر کے جینز موجود ہیں تو بچے میں کیسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اسی طرح اس وقت دنیا میں ایڈز چھاپا ٹائٹس ٹی بی اور سٹفلس سمیت بے شمار ایسے امراض ہیں جو عورت سے مرد اور مرد سے عورت کو لگ جاتے ہیں اوساں کے بعد دونوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں یہ بیماریاں آگے چل کر دوسری اور تیسری نسل کو منتقل ہو جاتی ہیں اسی طرح جسمانی معذوری یا گل پینا نفسیاتی بیماریوں اور سختی سماجی رویوں کا تعلق بھی عورت اور مرد کی "فارمیشن" سے ہوتا ہے اگر میاں بیوی میں کوئی جسمانی 'نفسیاتی یا ذہنی عیب موجود ہو تو وہ عیب کسی نہ کسی شکل میں اگلی نسل میں منتقل ہو جائے گا اسی لئے میڈیکل سائنس "کزن میرج" کے خلاف ہے امریکہ نے آج سے 70 برس پہلے قانون بنایا تھا امریکہ میں جرم بھی شخص شادی کرے گا وہ پہلے اپنا میڈیکل ٹیسٹ کرائے گا یہ قانون اس وقت امریکہ کی 49 ریاستوں میں ۶۰ یو ایس اور اسے Premarital Certificate کہا جاتا ہے اس قانون کے تحت امریکہ میں شادی کا خواہش مند ہر جوڑا اپنا خون ٹیسٹ کراتا ہے یہ ٹیسٹ بعد ازاں ناؤن کیٹی میں جمع کرا دیا جاتا ہے یہ سرٹیفکیٹ صرف 65 دنوں تک کارآمد رہتا ہے اگر

اس دوران شادی نہ ہوتی جوڑے کو دوبارہ نمیسٹ کرنا پڑتا ہے اس نمیسٹ کی وجہ سے نہ صرف امریکہ کا ہیلتھ بجٹ کم ہو گیا بلکہ وہاں بے شمار سو روٹی اور متعدد امراض بھی ختم ہو گئے امریکہ کے بعد اب یورپ مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں بھی شادی سے پہلے میڈیکل نمیسٹ کا قانون لاگو ہو چکا ہے۔

پاکستان کا شمار اس وقت دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں ایڈز پھیلنا جس کی اور سی ٹی بی اور خلیجی سیما تیزی سے پھیل رہے ہیں ان امراض کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ شادی ہے اگر شادی سے پہلے نوجوانوں کا میڈیکل نمیسٹ ہو جائے تو بے شمار لوگ ان امراض سے بچ سکتے ہیں اور یوں ہماری اگلی نسل زیادہ صحت مند اور شاندار ہو سکتی ہے مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے پچھلے دنوں پاکستان کی ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی کے ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ کے طالب علموں کا طبی معائنہ ہوا مکلاس میں 70 طالب علم تھے ان 70 طالب علموں میں سے 7 طالب علم چھانناٹس کے مریض نکلے ان طالب علموں کو اپنی بیماری کا علم تک نہیں تھا یہ ایک اعلیٰ تعلیمی

ادارے کی صرف ایک کلاس کی صورت حال تھی تو یہ باقی معاشرے کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں میری حکومت سے درخواست ہے کہ پاکستان میں ایسا قانون بن جائے جو محبوب صاحب جیسے لاکھوں

لوگ تباہ ہونے سے بچ سکتے ہیں پاکستان میں شادی بیاہ کی رسموں پر ہر سال اربوں روپے ضائع ہوتے ہیں ہم لوگ ماہوں مہندی پھانساں اور آتش بازی پر بھی کروڑوں روپے لگا دیتے ہیں اگر ہم ان اخراجات میں میڈیکل نمیسٹ کو بھی شامل کر لیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن اس کا ہماری قومی اور سماجی زندگی پر بڑا اچھا اثر پڑے گا آج کل اچھی لیبارٹریوں میں خون کی سکریننگ کیلئے تین سو روپے لگتی ہیں اور یہ ہو گھوہن کے نمیسٹ (اسے میڈیکل زبان میں ELECTRO PHRESIS کہتے ہیں) چار سو روپے میں ہو جاتے ہیں لہذا صرف 700 روپے میں ہماری اگلی نسل کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے میری حکومت سے درخواست ہے وہ کالاباغ جیسے بڑے بڑے ایٹوز کے ساتھ ساتھ ایسے چھوٹے چھوٹے ایٹوز پر بھی توجہ دے ان ایٹوز سے کروڑوں لوگوں کو فائدہ ہو سکتا ہے ڈیم بہت ضروری ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ لوگ بھی ضروری ہوتے ہیں کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو ملک میں ڈیم تو بن جائیں لیکن ان ڈیموں سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہ بنیں۔



بیڈ کوالٹی پرائس

پروفیسر صاحب بہت دیکھی تھے انہیں دیکھی ہونا بھی چاہیے تھا آپ خود سوچنے آپ
 اپنی بڑی ہونے لگی تھی بڑھتی ہوئی علم آپ کا اور بڑھتا بچھوٹا لوگوں آپ کے آگے آتے ہیں
 تھے آپ سے علم حاصل کرنے آتے ہوں لیکن ایک شام دو پوائس کانسٹیبل آپ کو سڑک کے
 کنارے کھڑا کریں اور آپ کی عزت نفس کو بونوں سے روند ڈالیں آپ احتجاج کریں تو وہ
 سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں آپ کو گالیاں دیں آپ کے کپڑے پھاڑ دیں اور آپ کے بازو
 مروڑیں تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا آپ خود کو بے بس اور لاچار محسوس نہیں کریں گے؟ یقیناً آپ کے
 جذبات بھی وہی ہوں گے جو اس وقت پروفیسر صاحب کے تھے۔

میں نے ان سے عرض کیا "میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن میرا خیال
 ہے آپ اس سلوک کے سختی تھے آپ کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا" انہوں نے حیرت
 سے میری طرف دیکھا میں نے ان سے پوچھا "پروفیسر صاحب آپ سے گھر کیلئے کچھ خریدنا
 ہیو تو آپ کس کنبھی کو نوٹیت دیں گے" پروفیسر صاحب نے کسمسا کر جواب دیا "ظاہر ہے میں اچھی
 کنبھی کو نوٹیت دوں گا" میں ایسا پتھا خریدوں گا جو کارکردگی میں اچھا اور دیر پا ہوگا" میں نے ہاں
 میںی گردن ہلائی "اگر آپ اس کی جگہ ایک سب شینڈرڈ کچھ خریدتے ہیں تو اس کا کیا نقصان
 ہوگا" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرے پورے گھر کی دائرہ تک چل جائے گی" میرا فریج میز

ٹی۔ وی اور میری دوسری اشیاء برباد ہو جائیں گی یا پھر میں اس بچھے کو اٹھا کر الیکٹریٹنوں کی دکانوں کے چٹا لگا تار ہوں گا" میں بھی مسکرایا اور میں نے ان سے پوچھا "اگناکس کی زبان میں اس نقصان کو کیا کہتے ہیں انہوں نے فوراً جواب دیا "بیڈ کوائٹی پرائس" میں نے تہقہہ لگایا "پروفیسر صاحب ہماری پولیس بیڈ کوائٹی پرائس ہے جس کی پرائس پورے معاشرے کو کسی نہ کسی شکل میں ادا کرنا پڑتی ہے" پروفیسر صاحب نے اڑا سا سچا اور پھر غیر یقینی لہجے میں بولے "کیا تم اس کی مزید وضاحت کرو گے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں نہیں! عرض کریں آپ کے گھر میں بچاس لاکھ روپے نقد ہیں اور میں چالیس لاکھ روپے کے زیورات پڑے ہیں اس گھر میں آپ اور آپ کے بچے بھی رہتے ہیں لیکن آپ ان سب کی حفاظت کیلئے ایک کمرہ روئے وقوف اور ست چوکیدار رکھ لیتے ہیں آپ اس چوکیدار کو صرف 2 ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں اس شخص کو اس دو ہزار روپے میں اپنی رہائش کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے اپنے کھانے پینے اور آنے جانے کا بندوبست بھی کرنا پڑتا ہے اور اپنے لئے اردی اور جوتے بھی لینا پڑتے ہیں آپ بتائیے وہ شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ شخص پورے غلطیوں سے آپ کے مال اور جان کی حفاظت کرنے کا؟ پروفیسر صاحب نے انکار میں سر ہلادیا میں نے عرض کیا "آپ کی حفاظت تو رسمی دور ہو سکتا ہے وہ شخص ایک روز آپ ہی کو لوٹ لے اس کے برعکس اگر آپ ایک ماہر جہان اور پڑھا لکھا گارڈ رکھتے ہیں اسے اس کی ضرورت کے مطابق محوہ دیتے ہیں اسے کھانا اردی اور تھیاری دیتے ہیں اور اسے رہائش کیلئے مناسب جگہ دیتے ہیں تو وہ بڑے غلطیوں کے ساتھ آپ اور آپ کے مال کی حفاظت کرے گا اور آپ زیادہ سکون اور آرام سے سو سکیں گے"

پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر دھیمے لہجے میں بولے "لیکن اس سارے فلسفے کا سیرے مسئلے کے ساتھ کیا تعلق" میں نے عرض کیا "پروفیسر صاحب اس کا بڑا گہرا تعلق ہے پولیس حکومتی اداروں میں سب سے اہم اور بااثر محکمہ ہوتا ہے یہ وہ واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کا پندرہ کروڑ لوگوں اور پندرہ بلین ڈالرز مالیت کی حکومت کے ساتھ روزانہ رابطہ رہتا ہے پولیس کسی بھی ملک کی مالیاتی، قانونی، سیاسی، ثقافتی، سیاسی اور اخلاقی دولت کی محافظ ہوتی ہے لہذا اس کا کام ہے اس کی طرف سے اس کی ساری ضروریات کی فراہمی کرنا اور اس کی سلامتی پر ہونا چاہیے پولیس کی تنخواہیں ملک کے تمام دوسرے اداروں سے زیادہ ہونی چاہئیں ان کے پاس وزیراعظم اور صدر سے زیادہ جدید گاڑیاں اور انتہائی شاندار رہائش گاہیں ہونی چاہئیں ان کی تعلیم

اور تربیت تمام دوسرے اداروں سے بہتر اور معیاری ہوئی چاہیے لیکن بد قسمتی سے ہم پاکستان میں تین بلین ڈالر سے گوارا پورٹ تو بنا دیتے ہیں لیکن اس کی حفاظت کی ذمہ داری سارا حصے چھ ہزار روپے ماہانہ کے ایس ایچ او کو سونپ دیتے ہیں ہم اس ملک میں تعلیم بھی عام کر رہے ہیں ہم اس ملک میں 50 ہزار بی ایچ ڈی بھی پیدا کر رہے ہیں ہم دنیا جہاں کے سرمایہ کاروں کو اس ملک میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دے رہے ہیں لیکن ہم ان سرمایہ کاروں ان بی ایچ ڈی ڈاکٹروں اور ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی حفاظت کا بندوبست نہیں کر رہے ہم ان لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت کی پابندی نہیں کر رہے ہم اس ملک کو انڈسٹریل سٹیٹ بھی بنانا چاہتے ہیں ہم اس ملک کو بدست گردی سے بھی پاک کرنا چاہتے ہیں ہم اسے امدتال پسند اور روشن خیال بھی بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا اس ساری روشن خیالی اس ساری آزادی اور اس ساری انڈسٹری کی حفاظت کون کرے گا؟ کیا سارا حصے تین ہزار روپے لینے والے اسے ایس آئی یا جوبن جولائی کی گرمی میں جلنے والے پولیس کانسٹیبل میں اتنی اہلیت ہے؟ ہم نے کبھی یہ سوچا؟

یوٹیلٹی سٹریٹ کے اتفاق کے اندر رہو جہاں کچھ اس کا نام کیا ہے اسے اس کے

نے قبضہ کر لیا آپ نے پاکستان میں پھر کا ایک ایسا تجربہ کیا جس میں کوئی روشن دان کوئی کھڑکی نہ ہو لیکن ساتھ ہی آپ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ خواہش کریں اس کا ماحول سونڈر لینڈ جیسا ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس وقت آپ کے پاس دو آپشن ہوں گے آپ چاہستان سے نکل کر سونڈر لینڈ چلے جائیں یا پھر پٹر کے اس مکان کے اندر ان سارے آلات ان ساری سہولتوں کا بندوبست کریں جو آپ کو سونڈر لینڈ کا ماحول فراہم کریں اگر آپ اس ملک میں عزت نفس وقار اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو پولیس کو وہ ساری سہولتیں دینا پڑیں گی جو امریکا، یورپ اور مشرق بعید میں حاصل ہیں اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو پھر آپ اسی طرح بید کو اٹلی پر اُس پے کرتے رہیں گے "یوٹیلٹی سٹریٹ" کے سکرا کر میری اس بات سے بھی اتفاق کیا لیکن پھر پوچھا "اس کیلئے رقم کہاں سے آئے گی حکومت کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں" میں نے قبضہ لگایا "اگر حکومت گوارا پورٹ بنا سکتی ہے اس کے پاس انٹرنیشنل سطح کے انٹرنیشنل بنانے کیلئے رقم ہے اگر وہ 80 ارب روپے کا سونڈر ہے بنا سکتی ہے تو وہ پولیس پر بھی پانچ ارب روپے روپے لگا سکتی ہے اگر آپ چار پانچ کھرب سے کلاباؤں ذمہ بنا سکتے ہیں تو آپ اس مشینری پر دو چار ارب روپے کیوں نہیں لگاتے جس نے آنے والے دنوں میں اس ذمہ کی حفاظت کرنی ہے اگر آپ اس

معاشرے کو روشن خیال اور اعتدال پسند بنانے کیلئے دس بیس ارب روپے خرچ کر سکتے ہیں تو آپ اس ادارے پر چار پانچ ارب روپے کیوں نہیں لگا سکتے جس نے کل کو اس روشن خیالی اور اس اعتدال پسندی کی حفاظت کرنی ہے پروفیسر صاحب ہم عجیب لوگ ہیں ہم پانچ کروڑ روپے کا گھر تو بنا لیتے ہیں لیکن ہم چوکیدار کو صرف اڑھائی ہزار روپے دیتے ہیں "میں رکا اور پھر آہستہ آواز میں کہا "جب تک ہم گھر کی مالیت اور چوکیدار کی تنخواہ میں توازن قائم نہیں کرتے ہم لوگ اس وقت تک اسی طرح بینڈ کوٹنی پر افس پے کرتے رہیں گے ہم اسی طرح سڑکوں پر پولیس کے ہاتھوں مار کھاتے رہیں گے ہم اسی طرح کانسٹیبلوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہیں گے"



Kashif Azad@OneUrdu.com

ماہ نور بنام مملکت خداداد

یہ 18 فروری کی شام تھی لیاقت علی قریشی! چہرہ سے اپنی ساس کے گھر سے نکلا اس کو
 جلد سائیکل پر چار دو گھنٹے سوار تھے اس کے پیچھے اس کی بیگم لاری لٹھی تھی اس کے آگے اس کی بچی

بنی تھی اور سب سے آگے تین سال کی ماہ نور بیٹھی تھی یہ لوگ فیروز پور روڈ پر پہنچے تو اچانک ماہ نور
 نے چیخ ماری لیاقت علی قریشی گھبرا گیا اس نے آگے جھک کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے
 اندھیر چھا گیا ماہ نور کی گردن کے ساتھ ڈور لپٹی تھی اور اس کی شرک سے خون کے فوارے پھوٹ
 رہے تھے لیاقت علی قریشی نے ڈور ہٹانے کی کوشش کی 'سوز سائیکل غیر متوازن ہوئی اور دو
 چاروں سڑک پر گر گئے لیاقت علی قریشی اس کی بیگم فوزیہ بڑی بیٹی اور ماہ نور کو شدید چوٹیں آئیں
 لیاقت قریشی نے فوراً ماہ نور کو جھولی میں اٹھایا سڑک کے کنارے جینا اور روٹا شروع کر دیا بچی کا
 نصف گھٹ چکا تھا 'مطلق سے خون کی آبداریں بہ رہی تھیں لیاقت علی قریشی کے گریبان سے
 لے کر وہ اس تک خون ہی خون تھا بچی کو سرد سہ ہسپتال لے جایا گیا ڈاکٹروں نے ماہ نور کی جان
 بچانے کی کوشش کی لیکن بچی کا کٹا ہوا گلا سیاہ جاسکا ماہ نور نے ہسپتال کے بیڈ پر جان دے دی۔

یہ بچی ہنسنت کا آغاز تھی میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا 'بھارت میں ایک ایسا فرقہ
 موجود ہے جو اپنے تہواروں کا آغاز معصوم بچوں کے خون سے کرتا تھا اس عمل کو وہ ملی جڑھانا کہتے
 تھے ماہ نور کا خون ہمارے ملک کے سب سے شاندار اور خوبصورت ترین تہوار کا آغاز ہے ہم

لوگ ہر سال اس تہوار کا آغاز بچوں کے خون سے کرتے ہیں اور مختلف مروجوں کے وہ سپندرہ لوگوں کی قربانی دے کر اس تہوار کو نفاذ انجام تک پہنچاتے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے ہم نے اس سال بھی نہ صرف یہ روایت نبھائی بلکہ اس روایت کی جڑوں کو ماہ نور کا خون دے کر اسے اپنے لئے نیک شگون بنا لیا میری حکومت سے درخواست ہے وہ ماہ نور کی اس قربانی کو "آئین" کا حصہ بنا لے وہ اس ملک میں قانون پاس کر دے ہم ہر سال فروری میں ماہ نور جیسی ایک بچی کی قربانی دیا کریں گے اور اس کے بعد جب تک جشن بہار کا تہوار جاری رہے گا ہم روزِ مہج شام اس تہوار کو بچوں کا لہو پلاتے رہیں گے۔ ہم اسے روزِ دس بیس بچوں کی قربانی پیش کریں گے لیکن ذرا رکے ماہ نور ہم سے اپنا جرم چھری ہے وہ ہمارا ہاتھ تمام کر ہم سے پوچھ رہی ہے اس کا تصور کیا تھا!

ماہ نور کے چار جرائم تھے ایک وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئی تھی جس میں تفریح انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے جس میں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ وہ لیاقت علی قریشی کے گھر پیدا ہوئی تھی اس موز سائیکل سوار لیاقت علی قریشی کے گھر جو اسے بچپاس ساتھ لاکھ کی گاڑی میں

بٹھا کر اس کی جان کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے گلہ نشہ رک اور شہرگ میں خون کی نالی دے دی تھی اور چار روزہ پاکستان کے کسی فیملہ ساز شخص کی بچی نہیں تھی وہ ایک عام بے بس اور بے کس انسان کی بچی تھی اور یہ حقیقت ہے اس ملک کے عام بے کس اور بے بس لوگوں کے بچے قربانی کے جانور ہوتے ہیں اور یہ نظام یہ سسٹم اور یہ معاشرہ ان کی قربانی بچپن میں قبول کر لے یا پھر بالغ ہونے کے بعد انہیں بے روزگاری، لاقانونیت، دہشت گردی اور مہیاشات کے چھانسی گھاٹ پر لٹکا دے ماہ نور بھی ان بچوں میں سے ایک بچی اور یہ اس معاشرے کا اس بچی پر خصوصی کرم تھا اس نے صرف تین سال کی عمر میں اس کی قربانی قبول کر لی۔ اسے دنیا کے دکھوں سے آزاد کر دیا۔

دنیا کی ہر روڑ کے پیچھے ایک ہاتھ ہوتا ہے یہ حقیقت ہے جب پتنگ ہوا میں لہرائی ہے تو ڈورہ الے ہاتھ اس کی منزل کا قین نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے جب پتنگ کشتی ہے تو ہاتھوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا ان کی ہے مہار ڈور اب کس کس کا گھاگالے گی اس ڈور کی دھار پر کون کون سی ماہ نور سے اس دھار سے پھسا ہوا کس کس لیاقت علی قریشی اور ان کے بچے سے اسے نوبت کس کس کے ارمان اور کس کس کی خواہشوں کی شہرگ کانے گی یہ کتنے لوگوں کو زندگی کے دکھوں سے آزاد کر کے واپس لوٹنے کی اور یہ دوبارہ اڑنے کے بعد کس کس کی مانگ کس کس کی گود

اجازت دے کی دینا ہو سکتا ہے ان ہاتھوں کو مورد الزام ٹھہرائے، وہ ان نوجوانوں کو الزام دے جو چھتوں، مسلموں اور دیواروں پر چڑھ کر چنگیس اڑاتے ہیں لیکن میں ان نوجوانوں کو بے گناہ سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے، دار کے سرے ہمارے نظام، ہمارے قانون اور ہماری حکومتوں کے ہاتھوں تک جاتے ہیں، ان کے ایک سر سے پر ماہ فور جیسی پچیاں ہوتی ہیں اور دوسرے سر سے پر ہماری حکومتیں، ہماری عدالتیں، ہمارا قانون اور ہمارا نظام ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے ہماری حکومتوں، ہمارے نظام کے ہاتھوں پر رستے چڑھے ہیں، یہ بیانی سے محروم ہے، اس کے کانوں تک آواز نہیں پہنچتی، اور اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نصب ہے۔ میں نے بڑے عرصے پہلے اپنے ایک بزرگ سے پوچھا تھا قدرت، دو دو تین تین سال کے بچوں کو کڑوں میں گرا دیتی ہے اور انہیں سڑکوں اور ریلوے سڑکیں پر مروا دیتی ہے، قدرت کو اتنے چھوٹے بچوں سے کیا دشمنی ہوتی ہے، وہ ان پر اتنا ظلم کیوں کرتی ہے، میرے بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا تھا، انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کے بچے ہوتے ہیں، قدرت یہ ۱۲ سالہ بچوں کو انسان کو یہ سبق دیتی ہے تمہارے من ہول کے ڈھکن غائب ہیں، تمہاری ہر کیس اور تمہاری ریل گاڑیاں غیر محفوظ ہیں، تمہارا قانون نامکمل ہے، تمہارے الصحاف کا نظام، پوری طرح کام میں کرنا یا اور تمہاری حکومتیں نظام میں اور اگر تم نے اور تمہاری نسلوں نے اس ملک، اس معاشرے میں رہنا ہے تو تمہیں اپنی حکومتوں، اپنی عدالتوں، اپنے قانون، اپنی سڑکوں اور اپنے من ہول کو ٹھیک کرنا ہوگا، قدرت اس کو بتاتی ہے، اگر تم نے ان چیزوں پر توجہ نہ دی تو تم اپنی مسلمیں مکھو دو گے، تم بے اولاد مر جاؤ گے۔

ماہ فور کی تصویر میرے سامنے پڑی ہے، اس کا گلہ روئی میں لپٹا ہوا ہے، اس کی آنکھیں بند ہیں، اس کے سر پر گھن کا کوئی لپٹا ہے اور اس کے چہرے پر بے شمار سوال ہیں، یہ سوال اس مملکت خداوار کے نام ایک عرضی، ایک درخواست، ایک استغاثہ، ایک اپیل اور ایک رست ہیں، ہم سب لوگ، اس ملک میں رہنے والے ہم 16 کروڑ لوگ، ماہ فور کے مجرم ہیں۔ صدر پرویز مشرف سے لے کر پانچ سو روپے روزانہ کے مزدور، عبدالکریم تک سب اس بچی کے مجرم ہیں، یہ بچی اپنا استغاثہ گھن پر لکھ کر اس منصف کی عدالت میں حاضر ہو گئی ہے، جو اس کا کائنات کا سب سے بڑا جج ہے، جو اس کائنات کی ساری شد گوں کا خدا ہے اور جس نے انسان کے ہاتھ میں قلم اور کتاب بکھرانے سے پہلے اس کتاب، اس قلم کی قسم کھائی تھی، جو عادل ہونے پر فخر کرتا ہے اور جس کا کہنا ہے میں تمہاری شد رگ سے بھی زیادہ تریب ہوں اور یہ وہ شد رگ ہے جو 18 فروری کو فیروز پور روڈ پر کٹ گئی

تھی۔

ماہ نور کا مقدس اللہ کی عدالت میں دائر ہو چکا ہے مجھے یقین ہے اگر اس بچی کا کفن میلا ہوئے سے پہلے انسانوں کی عدالت نے اس استغاثہ کا فیصلہ نہ کیا تو اللہ اس رٹ کا فیصلہ دے دے گا اللہ اس بچی کے مجرموں کو کیفر کر دار تک پہنچا دے گا۔ حضرت عمر نے فرمایا تھا میں وہ جہل کے کنارے بڑے کتوں کی پیاس ٹنک کا ذمہ دار ہوں میرے اس ملک کے حکمران بتائیں یہ تین سال کی ماہ نور کس کی ذمہ داری تھی اس کا خون کس کی گردن پر تحریر ہوتا ہے؟ خدا کیلئے خدا کے عذاب سے ڈر! خدا کیلئے انسانوں کے خون سے نہ کھیلو، انسانوں کے رب سے نہ کھیلو۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

پروین بنام ابرار الحق

مجھے پروین نے چند روز پہلے 11 نومبر سے پچاس روپے کا نوٹ بھجوایا میں نے یہ نوٹ
 اپنی بیوی کو دکھایا اور میں اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ اس کے ساتھ بیچنے والا پرچہ ہے اور
 اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں اس بچی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمہ دار
 کون ہے اور وہ کون سا شخص کون سا ادارہ ہے جو اس بچی کے دل پر مہم رکھے گا جو اس کے ساتھ
 انصاف کرے گا جو اس کی عزت بحال کرے گا مجھے کچھ نہیں آتی اس بچی کے ساتھ ہونے والے
 ظلم کا ذمہ دار ابرار الحق ہے ہماری حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی ہے یا پھر بے حسی کی
 گہری نیند میں سو یا ہوا یہ پورا معاشرہ اور میں یہ بھی یقین نہیں کر پاتا اس بچی کے آنسو ابرار الحق
 پونچھے گا صدر معظم اس کیلئے وقت نکالیں گے اس کی فریاد وزیراعظم سنیں گے قائم مقام چیف
 جسٹس جناب رانا بھگوان داس سومونڈا کمیشن لیس گے یا پھر پورا معاشرہ مل کر کوئی ایسا ضابطہ اخلاق
 بنائے گا جس کے بعد پروین جیسی بچیاں اس ملک میں عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی گزار سکیں گی
 میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے کوئی جواب نہیں ملتا میں سوچتا ہوں ابرار الحق ایک بین الاقوامی
 ستار ہیں چنانچہ ان کے پاس تھرڈ اسٹیئر کی اس بچی کے لئے کوئی وقت نہیں صدر معظم دہشت گردی
 کے خلاف امریکی جنگ میں بری طرح معروف ہیں انہوں نے ابھی چیف جسٹس اور یو نیٹام
 جیسے اہم مسائل بھی حل کرنے ہیں چنانچہ ان کے پاس بھی ایسے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کیلئے وقت

نہیں اوزیر اعظم اور ان کی حکومت ملک کو معاشی آزادی کا تھوڑا سا چھوٹا چاہتی ہے چنانچہ ان کے پاس بھی پروین کیلئے وقت نہیں قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس عدلیہ کے بحران میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایسے چھوٹے مسائل کیلئے وقت نہیں اور ان کے پاس وقت ہو بھی تو عدل کا نظام اس وقت تک خاموش رہتا ہے جب تک کوئی ساکن اپنا سارا اثاثہ بیچ کر زخمیر عدل نہیں بلاتا اور پیچھے رو جاتا ہے معاشرہ تو جس معاشرے نے قرآن مجید کا اثر نہیں لیا جس نے اللہ اور اللہ کے رسول کے احکامات سے آنکھ اور کان بند کر لئے وہ پروین جیسی بچیوں کی آواز کیسے سنے گا لیکن اس کے باوجود میں پروین کے خط اور اس کے بھجوائے پچاس روپے کے نوٹ کو اپنے اوپر قرض سمجھتا ہوں اور میں یہ قرض اس مملکت خدا داد کے کندھوں پر ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں میں پروین کا مقصد اس پورے معاشرے کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور اس معاشرے سے درخواست کرنا چاہتا ہوں اگر تم لوگوں نے پروین جیسی بچیوں کی آواز نہ سنی تو تم لوگ کوئی آواز سننے کے قابل نہیں رہو گے۔

پروین کے پچاس روپے کے نوٹ کے ساتھ خط تھا اور اس خط میں لکھا تھا "سربراہم پروین ہے اور سن 4 جون پہلے تک اس کے ایک کانس کاغذ میں محمد امجد علی صاحب نے لکھا لیکن ابراہیم الحق کے ایک گانے کی وجہ سے نہ صرف مجھے اپنی تعلیم اور جوری چھوڑنی پڑی بلکہ اس گانے نے میری زندگی مشکل بنا دی میں اس خط کے ساتھ آپ کو 50 روپے بھیج رہی ہوں تاکہ جب بھی آپ میرے 50 روپے کا نوٹ دیکھیں تو آپ کو میرا خط یاد آجائے اور آپ بازار سے ابراہیم الحق کی کیسٹ "نعرہ سازا عشق ہے" خریدیں اور اس کی اسے سائیز کا دوسرا گانا سنیں جس میں ابراہیم الحق نے پروین کا نام لے کر نہیں ہے ہورد باتیں کی ہیں کہ اگر آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پروین ہوتا تو آج میری طرح آپ کی بیٹی یا بہن بھی آپ سے آنکھیں چر رہی ہوتی ابراہیم الحق نے اس گانے میں پاکستان کی تمام پروینوں کے بارے میں جو الفاظ کہے ہیں مجھے وہ لکھتے ہوئے شرم آ رہی ہے ابراہیم الحق نے اس گانے میں کہا ہے "نی پروین تو بڑی ٹھیکیں اوپر سے تو مسکین اندر سے تو بڑی شو تھیں" میرے کان میں گونج رہی تھی میں نے کہا جب کانج کی کنکٹیں کے قریب سے گزرتی تھی تو لڑکے کو کرسی کی شکل میں یہ گانا گانے لگتے تھے اور اس کے بعد قہقہے لگتے تھے ایک دن میں نے ہمت کی اور ان لڑکوں سے اس شرارت کے بارے میں پوچھ لیا تو ان کا کہنا تھا ہم ابراہیم الحق کا گانا گارہے ہیں میں نے اس وقت تک یہ گانا نہیں سنا تھا اس شام جب میں نے یہ گانا اپنے کانوں سے سنا تو

میرے دل نے چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس کے اندر چلی جاؤں لیکن تڑپن پہنی اور نہ میں اس کے اندر جا سکی مگر میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی 'جاوید صاحب کاش آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پردین ہوتا ہے آپ سے پوچھتی ابرار الحق کا یہ گمان ہے کہ آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے آپ یہ گمان کر کس طرح اپنی بیٹی یا بہن سے آنکھ چراتے ہیں 'جاوید صاحب میں پوچھتی ہوں اگر ابرار الحق کی بہن کا نام پردین ہوتا تو کیا وہ اپنی بہن کے متعلق بھی گامگاہ کر دینا کو یہ بتاتا "پردین تو بڑی ٹیکسین 'تو بڑی شوٹسین" میری دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ ابرار الحق کو ایک بیٹی دے اور اس کا نام پردین ہو پھر میں اس سے پوچھوں اب تو یہ گانا سنا اور اس کے بعد اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے جاوید صاحب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اس ملک کے کسی یا اختیار شخص کی بیٹی یا بہن کا نام پردین نہیں ورنہ یہ گندی کیسٹ کب کی بہن ہو سکتی ہوتی 'جاوید صاحب خدا کیلئے یہ کیسٹ یا میری یہ فریاد ایوان صدر پہنچا دیں تاکہ اس ملک کی تمام پردینوں کو گھر سے باہر نکلنے ہونے شرم نہ آئے۔ دوسرا مجھے بتائیں میں اپنے والد اور بھائیوں کو کیا بتاؤں میں نے کالج کیوں چھوڑ دیا تھا؟ کیا میں یہ بتاؤں لڑکے ان کی بیٹی یا بہن کو ٹیکسین اور شوٹسین کہتے تھے اور ان میں یہ الفاظ سننے کا حوصلہ نہیں تھا 'جاوید صاحب میری یہ فریاد اور درخواست لکھ کر آپ پر فرس ہے میں آپ کو یہ خط لکھ کر اپنے دل کے

بوجھ کو ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔ کاش میرے والدین نے میرا نام پردین نہ رکھا ہوتا" میں جانتا ہوں ابرار الحق اس معاملے میں تصور دار نہیں ہیں اور انہوں نے کسی پردین کو ذہن میں رکھ کر یہ گانا لکھا ہوگا اور نہ ہی گایا ہوگا لیکن بعض اوقات ہماری ذرا سی لاپرواہی بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں کئی گھول دیتی ہے ہماری ذرا سی بے احتیاطی پردین جیسی لڑکیوں کیلئے زندگی مشکل کر دیتی ہے ابرار الحق ایک اچھے انسان ہیں انہوں نے نارو وال جیسے دورانہ شہر میں جدید ہسپتال بنا کر کمال کر دیا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے وہ گلوکاری میں احتیاط نہیں کرتے ان کے گانے اکثر اوقات اطلاق کی ساری حدیں عبور کر جاتے ہیں وہ بھی بلو کے نام سے ایسی بے ہودہ باتیں منسوب کر دیتے ہیں کہ سن کر شرم آتی ہے 'بھئی پورے پنجاب کی خواتین کو ناخننے کی دعوت دے دیتے ہیں اور بھئی پردین جیسی بچیوں کیلئے عزت اور آبرو کے ساتھ جینے کے راستے بند کر دیتے ہیں اگر ابرار الحق گانا بناتے وقت لفظوں کا ذرا سا خیال رکھ لیں وہ ناموں سے پرہیز کریں تو میرا خیال ہے ان کی نیک نامی میں بھی اتنا فرق ہوگا اور ان کے ضمیر پر بھی بوجھ نہیں پڑے گا مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے "مچ پنجابن مچ" پر رومل کے بعد پنجاب کو بھانجنا بنا دیا تھا

اس تبدیلی سے ان کے گانے پر بھی کوئی اثر نہ پڑا اور چٹاپوں کی دل آزاری کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا اسی طرح اگر وہ پردین کی جگہ پری کر دیں شہزادی یا ملکہ لکھ دیں اور ناموں کے وزن کو سامنے رکھ کر کمپوزیشن میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دیں تو اس سے بھی پردین جیسی بے شمار بچیاں شرمندگی سے بچ جائیں گی اس میں کوئی شک نہیں فن عظیم ہوتا ہے لیکن انسانی جذبات اس سے بھی عظیم تر ہوتے ہیں چنانچہ فنکار کو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی جذبات کی عظمت کو ضرور مد نظر رکھنا چاہیے انہیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہیں ان کے فن سے کسی کی دل آزاری تو نہیں ہو رہی ان کے لفظ کسی کے دل پر بلینڈ کی طرح تو نہیں گر رہے یہ سوال تخلیقی عمل کے دوران دنیا کے ہر فنکار کے مد نظر ہونا چاہیے مجھے ایک بار نبی اکرم کی حیات پر بننے والی فلم "دی مسیج" کے پردیوسر کا انٹرویو دیکھنے کا موقع ملا تھا انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا تھا "آپ نے فلم میں کسی جگہ نبی اکرم کا سایہ نہیں دکھایا کیوں؟" انہوں نے جواب دیا "میں یہ جسارت کر سکتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا میری اس حرکت سے عالم اسلام کی دل نشینی ہوگی لوگ میری جسارت کو

قبول نہ کریں گے" اگر ہم فن کے مغربی نقطہ نظر سے یہ دیکھیں تو جو ڈیوسر کی بات تھوڑی سی ہو گی لیکن اگر ہم انسانی جذبات احساسات اور عقیدت کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو پردیوسر سچا دکھائی دے گا اخلاق تہذیب اور شانگی ہر دور میں فن سے عظیم رہی ہے اور ہے گی یہ حقیقت ہے دنیا کا کوئی گانا کوئی نظم کوئی غزل کوئی افسانہ کوئی ناول کوئی قلم اور کوئی تصویر کبھی انسانی جذبات کی جگہ نہیں لے سکے گی کیونکہ دنیا کا ہر گانا اور ہر گلوکار دقیق ہوتا ہے جبکہ انسانی جذبات اور انسانی اطلاعات اب تک قائم رہنے والی بچائیاں ہیں لہذا دنیا کا کوئی گانا اور کوئی گلوکار خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو جائے معاشرہ اسے ماں بہن اور بچی کے رشتے یا مال کرنے کی اجازت نہیں دے گا 'میرا دل چاہتا ہے میں ابرار الحق سے پوچھوں یہ کیسی گلوکاری ہے جسے سننے کے بعد بچوں کو اپنے نام اور اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے' بھائی اپنی بہن سے نظر میں جراتا ہے اور بیٹیاں اپنے باپ سے شرمندہ ہو جاتی ہیں 'میرا دل چاہتا ہے میں بھی ابرار الحق سے پوچھوں کیا واقعی ان کی بہن یا بیٹی کا نام پردین ہوتا تو بھی وہ یہ گانا گاتے؟ اس وقت ان کا کیا رویہ ہوتا!

یہ پردین کا مقدمہ ہے اور اس مقدمے میں ملک کے مشہور گلوکار ابرار الحق مجرم ہیں کیا یہ معاشرہ اس معاشرے کے سولہ کروڑ لوگ اس معاشرے کی دو ہزار عداوتیں تین ہزار جج اور ڈیڑھ لاکھ وکیل یہ مقدمہ لڑیں گے کیا ہم شاعروں اور بیوں موسیقاروں اور گلوکاروں کیلئے بھی کوئی

زیر دہانت 3.....0.....197

ضابطہ اخلاق طے کریں گے اور کیا ہم پروین مجیدی بچیوں کو تحفظ دیں گے اس سے ساری سوال آج کے دن پر چھوڑتا ہوں میں یہ سوال اس ملک کے لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔

نوٹ: (اس کالم کی اشاعت کے فوراً بعد قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے سومنوار ایکشن لے لیا تھا عدالت نے امیر الحق کو طلب کیا اور ان کے اس گانے پر پابندی لگا دی بعد ازاں عدالت نے گانے میں موجود الفاظ ایٹ کرنے کا حکم دے دیا)



Kashif Azad@OneUrdu.com

رباب بنام پاکستان

رباب احمد کراچی کی ایک صحافی ہیں ان سے میری ملاقات پانچ برس پہلے ہوئی تھی وہ ان دنوں کسی عجیب سے کام پر مشغول ہیں ان کے لہجے سے راباب پہنچتا ہوں اور شہر دور سے ان کا ایک خط موصول ہوا اس خط نے مجھے بلا کر رکھ دیا یہ خط ایک عام شہری کا پاکستانی معاشرے اور حکومت پر سچا اور سچ تبصرہ ہے۔ اس خط میں وہ سارے احساسات پائے جاتے ہیں جو اس ملک کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرنے والے کروڑوں لوگوں کے دل سے گزرتے ہیں۔ اس خط میں وہ سارے دُخم اور وہ سارے گلے بھی موجود ہیں جو اس ملک کے عوام کی زبان پر ہیں، میں آپ کو رباب کے دکھ میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

رباب احمد اس ملک کے لوگوں کو ایک نئی کہانی سنانا چاہتی ہیں ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا عامر عامر بے انتہا شہر آتی اور ذہین تھا اچھا لباس اور اچھی خوراک اس کی خاص کمزوری تھی بہن میں اسے کوئی لڑکی اچھی لگتی تھی تو وہ کہتا تھا میں اسی سے شادی کرونگا 29 مئی 2006 کو اس کی شادی ہو گئی اس وقت عامر کی عمر 32 سال تھی عامر شادی کے بعد خود کو مکمل قصور کرنے لگا تھا۔ اسے اپنی کی شدید خواہش تھی وہ کہتا تھا اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی عنایت کی تو وہ اس کا یہ نام رکھے گا۔ اسے سکول میں داخل کرائے گا اور اس کے ساتھ اس طرح کھیلے گا وغیرہ۔ رباب اور ان کا خاندان عامر کی ان باتوں پر ہنستا رہتا تھا ابھی عامر کی شادی کو فقط دو ماہ گزرے تھے کہ اس کے

خاندان میں ایک شادی آگئی۔ رباب عامر کی بیوی اور عامر گاڑی میں بیٹھ کر شادی گھر پہنچ گئے۔ عامر تھوڑی دیر ہال میں بیٹھا رہا اور اس کے بعد زور ہو کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ 18 اگست 2006 کی رات تھی عامر کو ابھی گاڑی میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہاں ایک نو عمر لڑکا آ گیا لڑکے نے عامر کی گاڑی کا شیشہ بھجایا عامر نے شیشہ پیچھے کیا تو لڑکے نے عامر کی کینٹی پر پستول رکھ دیا۔ لڑکے نے عامر سے اس کا سواہل مانگنا شروع کر دیا عامر نے حیل و حجت سے کام لیا تو لڑکے نے گولی چلا دی۔ گولی عامر کی چھاتی سے ہوتی ہوئی ریزہ کی ریزہ کی ہڈی تک پہنچی اور ہڈی کو چھلکتی ہوئی نکل گئی۔ رباب اور اس کا خاندان شادی کے ہنگامے میں گم تھا اتنے میں باہر شور ہوا اور چند لوگ بھاگتے ہوئے رباب کے پاس پہنچے اور اسے حادثے کی اطلاع دی۔ یہ لوگ باہر کی طرف بھاگے گاڑی میں عامر خون میں لست پت پڑا تھا ان لوگوں نے عامر کو اٹھایا اور فوراً ہسپتال پہنچے گئے ہسپتال پہنچنے کے بعد ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں جا کر ان لوگوں کو پتہ چلا جب تک پولیس نہیں پہنچتی اس وقت تک مریض کا علاج ممکن نہیں۔ رباب کا بھائی خون میں لست پتہ تھا۔

ہسپتال میں پولیس کا دور دورہ دیکھ کر ان کی کھان ٹھیک تھا وہ عامر کو بھی آنکھیں کھولنے کا کسی بھی علاج تھا اور کسی خاموش ہو جاتا تھا وہ بار بار رباب کا ہاتھ پکڑ کر کہتا تھا "آپا میں مر جاؤں گا" رباب اس کی بات سن کر پاگلوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی۔ کسی نے اس مظلوم خاندان کو مشورہ دیا تم لوگ فوری طور پر کسی سفارش کا بندوبست کرو کیونکہ پولیس کے آنے کے بعد بھی عامر کا علاج نہیں ہو سکتا گا۔ رباب نے جیسے تیسے ایک سفارش کا بندوبست کیا سفارشی ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد ڈاکٹروں نے عامر کا علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا سب سے پہلے مریض کا سنی سکین ہو گا۔ جب تک سنی سکین کی رپورٹ نہیں آتی وہ مریض کے ہارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ عامر اس رات اپنے درد کے ساتھ دست و گریبان رہا۔ صبح عامر کی سنی سکین کی رپورٹ آئی تو پتہ چلا عامر نہ صرف دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکا ہے بلکہ اس کا ایک پیچھرا بھی رنجی ہے گولی ٹکرنے کی وجہ سے اس کی ایک پبلی بھی رنجی ہے اس کی ریزہ کی ہڈی بھی متاثر ہے اور اس کے ایک بازو میں بھی زخم موجود ہے۔ رباب اور اس کا خاندان ہسپتال میں پاگلوں کی طرح گردش کرتا رہا انہیں یوں سوس ہوا اس ہسپتال کی انتظامیہ نے پاس وقت ہے نہ عی و دامر اور نہ ہی دوا۔ ان لوگوں نے فوراً عامر کو اس ہسپتال سے نکالا اور اسے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ہسپتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد

چوتھا ہسپتال آیا یہاں تک کہ چار ماہ میں بارہ ہسپتال تبدیل ہوئے لیکن عامر کی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ ناٹنگوں سے مکمل طور پر محذور ہو گیا۔ رباب کا کہنا تھا عامر کو جب بھی ہوش آتی تھی تو وہ اپنی ناٹنگوں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ رباب عامر کی بیوی اور دوسرے رشتہ دار اسے کھوکھلی تسلی دے دیتے تھے۔ رباب کا کہنا تھا ہم لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے عامر کو کم از کم زندگی تو دے دی۔ ہمارے لئے اتنی ہی کافی تھا ہمارا بھائی آنکھیں کھولتا ہے چند لفظ بولتا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہاتھ ملا لیتا ہے۔ عامر کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی عامر کا خاندان ہسپتال تبدیل کرتا رہا لیکن اس خاندان کو اکثر دنوں کے بھیس میں پیشہ درجہ تک تو ملے لیکن پورے شہر میں انہیں کوئی مسیحا نہ ملا کسی نے اس خاندان کا ہاتھ نہ تھاما کسی نے اس نوجوان کی زندگی کیلئے کوشش نہیں کی۔ پورا خاندان چھ ماہ تک امید اور ناامیدی کی صلیب پر لٹکا رہا ان چھ ماہ میں وہ روز اپنی ناٹنگوں پر کھڑا ہونے کے خواب دیکھتا تھا وہ ایک خوبصورت اور مستند زندگی کی دعائیں کرتا تھا لیکن 31 دسمبر 2006 کو عامر اور اس کی دعائیں و دُؤں انتقال کر گئیں عامر مر گیا اور جاتے جاتے پورے خاندان کو زندہ درگور کر گیا۔

Kashif Azaad@Oneltdu.com

جناب کا کہنا تھا کہ وہ مسلمان بننے کے لئے یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عامر کو صرف 32 سال کی عمر دی تھی لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اس ملک، اس ملک کے قانون اور موہاں پھیننے والوں کے بارے میں سوچا شروع کر دیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کیا صرف چند ہزار روپے کے موہاں کے لئے عامر جیسے نوجوان کا قتل انصاف ہے؟ وہ سوچتی ہے اس کا مجرم کون ہے اور وہ عامر کے خون کا پرچہ کس کے خلاف کٹوائے وہ ناظم شہر کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے یا وہ کراچی کے گورنر اور وزیر اعلیٰ کا گریبان پکڑے وہ وزیر اعظم اور صدر کے سامنے کھڑی ہو جائے یا وہ پورے شہر کو اپنا مجرم سمجھے۔ رباب کا کہنا ہے ہماری حکومت کو اس ملک میں القاعدہ کی چیونٹی تک نظر آجاتی ہے لیکن اسے شہر میں مرنے والے ہزاروں عامر دکھائی نہیں دیتے۔ اس کا کہنا تھا پاکستان کے کسی شہر میں جب بھی عامر جیسے دس بیس لوگ مر جاتے ہیں تو حکومت "مجرموں کو فرادہ اتنی سزا دی جائے گی" کا اعلان کر کے مظلوموں کی قبر پر پتھر اور لواختین کے سینے پر مہر کی سل رکھ دیتی ہے۔ رباب کا کہنا تھا اگر عامر کسی دی آئی پی کا بیٹا ہوتا تو کیا وہ اسی طرح سڑک پر مارا جاتا اور اگر وہ مارا جاتا تو کیا حکومت اس کے مجرموں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیتی؟ کیا اس ملک کے کسی دی آئی پی کا عامر بھی اسی طرح چھ ماہ تک خواہشوں اور دعائیں کی صلیب پر لٹکے لٹکے ختم ہو جاتا اور کیا اس

کے خاتمے کے بعد حکومت اسی طرح خاصش رہتی: رباب کا کہنا تھا اس ملک میں جب کسی وزیر کا کوئی جتنا جرم کرتا ہے تو پوری حکومت اس کے سیاہ کپڑے پر سفید چادر ڈال دیتی ہے۔ وزیروں کے جیلوں کے جرم میں بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور ان بے گناہوں کو بے گناہی کی پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے اس ملک میں امریکہ کسی کا ہم دے دے تو حکومت اس نام کے تمام لوگوں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیتی ہے۔ ہمارے سیاستدان ہمارے حکمران امریکہ کے اشارے پر زمین تک کھود ڈالتے ہیں ہمارے پولیس ہماری ایجنسیوں کی تمام تر مہارتیں اس ملک کے حکمران خاندانوں کی حفاظت میں صرف ہوتی ہیں اگر امریکہ دسل کالسی کی تصویر ہماری ایجنسیوں کے حوالے کر دیتا ہے تو ہماری ایجنسیاں ماچس کی ایک ڈبلی کے ذریعے اصل کالسی تک پہنچ جاتی ہیں لیکن بد قسمتی سے ان کے پاس عام جیسے شہریوں کے لئے کوئی دقت نہیں۔ رباب پوچھتی ہے یہ کون لوگ ہیں جو روز پستول لے کر گھر سے نکلے ہیں اور راستے میں آنے والے عام جیسے ہر نو جوان کے دل میں سوراخ کر جاتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں، وہ کہتی ہے یہ کون لوگ ہیں جن کی نظر میں ایک موبائل فون انسان جان سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے عام جیسے لوگوں کی حفاظت کا صحت اٹھایا تھا، جنہیں ہم اس لئے اپنا پیسہ کاٹ کاٹ کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ کڑے دقت میں ہماری مدد کریں گے ہماری حفاظت کریں گے۔ رباب کا کہنا تھا وہ کون لوگ ہیں جو پاکستان میں اسلحہ لارہے ہیں اور یہ اسلحہ کئی کئی تقسیم ہو رہے ہونے لگے ہیں جو اس اسلحہ کو عوام پر استعمال کر رہے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا اسے پورا پاکستان جرم کی آماجگاہ محسوس اور ہائے وہ جب بھی اخبار میں کسی واردات کی خبر پڑتی ہے یا اسے کس فنش کی تصویر نظر آتی ہے تو اس کے سینے میں عام زندہ ہو جاتا ہے۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے محسوس کرتی ہے اب اس ملک کے لوگوں کو پانی بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بلوں کے ساتھ ساتھ اپنی جانوں کا خراج بھی دینا پڑے گا اب اس ملک کے لوگوں کو پراپرٹی ٹیکس کی طرح حکومت کو چاہئیں بھی دینا پڑیں گی۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس نے عام گورنر کے دیکھے ہیں وہ اپنے بڑے بھائی کو پاکستان واپس نہ آنے کی درخواستیں کر رہی ہے کیونکہ اس کے اندر یہ خوف بیٹھ گیا ہے اگر اس کا دوسرا بھائی بھی پاکستان آ گیا تو وہ بھی کسی دن اسی طرح دہشت گردی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کیا اقتدار اعلیٰ کو کراچی کے یہ مسائل نظر نہیں آ رہے کیا حکومت کو کراچی میں عام جیسے لوگوں کی فنشیں نظر نہیں آ رہیں کیا حکومت کی نظر میں عام انسان اور عام انسان کی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ رباب کا کہنا تھا عام کے بعد

بھی انہوں نے ہزاروں لوگوں کو چھینے چاٹنے میں برابر ہوتی ہی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں ہر روز کراچی میں بے شمار دارا تیں ہوتی ہیں لیکن حکومت کی طرف سے قرار داتی سزا کی ایک دھمکی کے سوا کچھ سامنے نہیں آتا۔ رباب کا کہنا تھا ہم کب تک اسی طرح قربانیاں دیتے رہیں گے ہم کب تک اس ملک میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہیں گے۔ رباب کا کہنا تھا اس ملک میں ایک زندگی عام بیسے لاکھ ڈالر سے جینا اور دوسری طرف بڑی بڑی گاڑیوں شرابوں کی محفلوں غیر ملکی دوروں سے بڑے پائرن اور مرگے اونچی غار شوں والی زندگی ہے۔ اس کا سوال تھا عام بیسے لوگوں اور بڑے لوگوں کے درمیان یہ فرق کب تک قائم رہے گا۔ ہم لوگ عوام کا خون ٹچ کر کب تک اکانوینت کا بازار ہم کرتے رہیں گے اور ہم یہ کہیں نہیں مان لیتے ہم ایک تباہ شدہ آدم ہیں ہم یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے ہم دنیا میں امریکہ جیسے بڑے ممالک کے مفادات کی حفاظت کرنے کیلئے اترے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا وہ ہر روز رباب عامر کی پوچھیں سالہ بیوہ کو کہہتی ہے اپنے والد کے افسردہ چہرے اور اپنے خاندان کی زندگی ہوئی آواز سنتی ہے اور وہ اپنے گھر کے خالی پن اور

کھینچنے اور دھنسنے جانتے لوگوں کی سزا سے تو اس ملک والوں کو بڑے دل سے ہاتھ دھو کر اپنے خونیں آواز سے دو

کئی شہر میں ہیں بلکہ کئی لاکھوں میں زندہ ہے۔ اس وقت اس کا دل چاہتا ہے کاش پاکستان کے حکمرانوں کی ادا د کے ساتھ بھی ایسا ہو کاش کبھی یہ لوگ بھی ہسپتالوں کے دھکے کھائیں کاش یہ لوگ بھی کبھی اپنے بہادری کی اٹھیں اٹھا کر ایک ٹھیک سے دوسرے ٹھیک جائیں۔ کاش ان لوگوں کی اولاد بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خواہش کرتے کرتے فوت ہو جائے اور کاش کبھی اس ملک کے قہرانوں کو بھی عام انسانوں جیسی زندگی گزارنا پڑے۔ رباب کا کہنا ہے اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ کسی طرح حکمران طبقے کو ان حالات کا شکار ہوتے دیکھے جن کا دوا دار اس کا خاندان شکار ہے۔ اس کا کہنا تھا وہ اس ملک کے تمام حکمرانوں کو اپنا جرم سمجھتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے اس کے بھائی کی جان اس ملک کی حکومت نے لی۔ اس کا کہنا ہے یہ معاشرہ فرعونیت کا شکار ہو چکا ہے لہذا اسے سانس لینے کیلئے اب کسی موبی کی ضرورت ہے۔ اس نے خط میں لکھا، مجھے کوئی ایسی عدالت بتائی جائے جس میں وہ اس معاشرے کے عام انسانوں کا مقدمہ دائر کرے اسے وہی ایسا سزا بتایا جائے جس کا وہ کریاں پڑھ لے۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس کا بھائی آئل ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دن رات قیامت کی دعائیں مانگ رہی ہے وہ اس دن سے روز محشر کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو سکے اور وہ اس ملک کے حکمرانوں کا

گریبان پکڑ سکے۔

یہ رباب کا مقدمہ تھا رباب نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی میں اس کا مقدمہ کسی اعلیٰ عدالت میں پیش کر دوں۔ میں نے یہ خط پڑھنے کے بعد آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے اس ملک میں دور دور تک کوئی ایسا ایوان کوئی ایسی عدالت نظر نہیں آئی جس میں رباب کا مقدمہ دائر ہو سکے لہذا میں نے بے بس ہو کر رباب کا یہ مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے یقین ہے عوام کی عدالت بھی یہ مقدمہ دوسرے کان سے خارج کر دے گی کیونکہ مقدمے اور زمین انسان سنا کرتے ہیں اور بد قسمتی سے یہ ملک بے حس کا قبرستان بنا چکا ہے اور بے حس کے قبرستانوں میں انسان نہیں بیٹھے صرف اور صرف قبریں ہستی ہیں، ہم سب 16 کروڑ قبروں میں آباد ہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

رٹ آف دی گورنمنٹ

سارہ میڈیکل سنور اسلام آباد کے جی اینٹ مرکز میں دواؤں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ 4 دسمبر 2006 کو تین نوجوان سنور میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مختلف چیزوں کی قیمت پوچھی۔ چند کاغذیں لکھیں گاؤں کی طرف آئے اور جیب سے پیس کی بجائے پستول نکال لیا۔ سنور کے مالک احتشام الحق کا بائزر پر پٹھے تھے نوجوانوں نے انہیں ساری نقدی حوالے کرنے کا حکم دیا۔ احتشام الحق صاحب جرأت مند قسم کے انسان تھے وہ ااکوڑوں کے ساتھ الجھ پڑے ایک نوجوان نے ان کی طرف پستول کیا اور گولی چلا دی۔ احتشام الحق صاحب فریش پر گرے اور تر پنے لگے۔ نوجوانوں نے دراز کھولی اس میں موجود رقم نکالی اور اطمینان سے چلے ہوئے سنور سے باہر نکل گئے جبکہ احتشام الحق صاحب موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ میں نے یہ واقعہ پانچ دسمبر 2006ء کے اخبارات میں پڑھا تھا اور اس کے بعد اپنے ایک ساتھی سے پوچھا تھا "ڈاکوؤں کو اس جھبہ لے سے سنور سے کتنی رقم مل گئی ہوگی" میرے ساتھی نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا "ایک یا دو ہزار روپے" میں نے اس سے پوچھا "تین نوجوان ایک دو ہزار روپے لوانے کیلئے آئے اور دو ایک شخص کو قتل بھی کر گئے یہ انتہائی خوفناک صورت حال نہیں؟" میرے ساتھی نے افسوس سے سر ہلا دیا اور کہا "آج کل لوگ ایک کلومیٹی کیلئے دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں"

میرے ساتھی کا کہنا تھا آج سے دس برس پہلے تک ڈاکے صرف ٹیکسوں، سینکوں اور

بڑی بڑی کمپنیوں تک محدود تھے ڈاکو بڑے منظم انداز سے آتے تھے اور کم از کم پچاس ساٹھ اداکے دوپے لوٹ کر لے جاتے تھے لیکن اب ہمارے معاشرے میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی گھنیا کلاس پیدا ہو چکی ہے جو ضروریات زندگی کیلئے ڈاکے ڈالتی ہے یہ لوگ روز ایک ریکٹ بناتے ہیں اور راستے میں آئے وانے ہر شخص کو لوٹ لیتے ہیں سائیکل سوار سے لے کر کرپا یا مرچنٹ تک سب لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں یہ لوگ راہ چلنے لوگوں کو روک کر ان کی جیب سے موہاٹل نوٹ تک نکال لیتے ہیں ان کی گھڑی ٹینک اور پرس چھین لیتے ہیں اور سلام کر کے چلے جاتے ہیں مجھے اپنے ساتھی کی بات سن کر ایبٹ آباد کے ایک دوست کا واقعہ یاد آ گیا میرے دوست نے بتایا۔ ایک دن تین ڈاکو اس کے گھر گھس آئے گھر میں صرف ان کی والدہ تھی ڈاکوؤں نے اماں جی کے پاؤں چھوئے اور بڑے احترام سے بولے "اماں جی ہمیں صرف سات ہزار روپے چاہئیں مہربانی کر کے دے دیں" اماں جی نے سات ہزار روپے نکال کر دے دیئے ڈاکوؤں نے رقم لی اماں جی کے دو بارہ پاؤں چھوئے اور ہنس کر بولے ہم نے دراصل بجلی کا بل جمع کرنا تھا ہمارے پاس پیسے نہیں تھے لہذا ہم نے سوچا ڈاکے مار لیتے ہیں پھر سے دوست نے بتایا ڈاکو صاحب کو اپنا نام لے کر اس نے اپنی والدہ کو رقم کی بجائے ڈاکوؤں کیلئے منگھر پایا میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب ضرورت کی وجہ سے بھی ڈاکے ماتے ہیں شاید میرے دوست کی بات درست ہو۔ آپ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو اس میں ڈاکے اور ایکسپرنٹ کی خبر ضرور ملے گی ایک اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان میں روزانہ بیس سے پچاس ہزار وارداتیں ہوتی ہیں جن میں آدمی سے زیادہ وارداتیں ڈاکے ہوتے ہیں میری پچھلے دنوں ایک سابق ڈاکو سے ان وارداتوں کے بارے میں سمجھ لو ہوئی تھی یہ شخص دس برس پہلے تک ایک نامور ڈاکو تھا لیکن بھروسہ ایک بیہ صاحب کی مہربانی سے توجہ تائب ہو گیا میں نے اس سے ان وارداتوں کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا "پاکستان میں اب پارٹ نام ڈاکو آچکے ہیں" میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا "پیشہ ور ڈاکو کبھی قتل نہیں کرتا وہ کبھی کسی شخص کے سینے یا سر میں گولی نہیں مارتا وہ زیادہ سے زیادہ کسی شخص کے سر میں ہسٹول کا بت مارے گا اسے بے ہوش کرے گا اور دوسرے لوگوں کو اس کی بے ہوشی سے ڈرا کر رقم نکلاوے گا ڈاکے کے دور ان قتل ہمیشہ پارسہ نام اور واقعاتی ڈاکو کرتے ہیں" میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا "پارٹ نام ڈاکوؤں کو ہسٹول پکڑنے اور ہسٹول چلانے کی تکنیک نہیں آتی دوسرا یہ بگ واردات کے دوران اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتے لہذا یہ لوگ سیدھی گولی

چلا، بچے ہیں" اس نے بتایا "ماہرین صرف رقم کی مقدار اور واردات کے دوران رقمی ہونے والوں کی تعداد دیکھ کر ڈاکوؤں کے "کیلے" کا اندازہ لگالیتے تھے کوئی بھی پروفیشنل ڈاکو لاکھوں سے کم کا ڈاکہ نہیں ڈالتا وہ ہدف پر باقاعدہ تحقیق کرتا ہے اور ہمیشہ اس دن واردات کرتا ہے جس دن ہدف کے پاس ٹینک ٹھاک رقم جمع ہو وہ واردات کے دوران سیدھی گولی بھی نہیں چلاتا اور وہ کبھی پکڑا نہیں جاتا یہ گھٹیا قسم کے پارٹ ٹائم ڈاکو ہوتے ہیں جو وہیں بیس ہزار روپے کیلئے واردات کرتے ہیں اور بندے بھی مار دیتے ہیں"

مجھے نہیں معلوم اس سابق ڈاکو کی بات کہاں تک درست تھی لیکن یہ بات حقیقت ہے پاکستان میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی کلاس پیدا ہو چکی ہے جو وہیں بیس ہزار روپے کیلئے کسی بھی وقت اور کہیں بھی ڈاکہ اٹال سکتی ہے اور اس واردات کے دوران اگر اسے ایک آدھ بندہ بھی مارتا پڑے تو وہ دروغ نہیں کرتی سوال یہ ہے یہ ڈاکو کون ہیں میرا خیال ہے یہ ڈاکو اس ملک کے بے روزگار نوجوان بھی ہیں اور ضروریات زندگی اور مہنگائی کے ڈسے ہوئے شریف شہری بھی یہ ڈاکو گنلوں اور

ٹیلی ویژن چینلوں کے نرینڈے بھی ہیں اور ساتھ ہی یہ بچھلے دنوں ایک مغلّی اور پوٹ برائی بھی ہیں اس سلسلے میں انکشاف ہوا تھا شہری زندگی کا ایک بچہ بالغ ہونے تک نیلا دیرین اور گھڑوں

کے ذریعے اور سلا 26 ہزار قتل دیکھ چکا ہوتا ہے یہ قتل یقیناً اس کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں شاید یہی وجہ ہے آپ کسی گھر کسی دکان پر جا کر دیکھ لیں آپ کو اس کے گیت پر ایک دو مسلح گارڈز ضرور ملیں گے یہ گارڈز کون ہیں اور یہ کیوں ہیں؟ یہ گارڈز اس معاشرے میں پرہان چہننے والا خوف ہیں یہ گارڈز ثابت کرتے ہیں ہمارا معاشرہ واردات کے خوف میں جھکا ہو چکا ہے ہذا اب ہمارے ملک میں صرف وہ شخص اطمینان سے سو سکتا ہے جس کے گیت پر دو گارڈز جاگ رہے ہیں میرا خیال ہے ہمارے معاشرے کو بے روزگاری، مہنگائی، میڈیا اور لاکٹائزیشن تیزی سے اس موڑ کی طرف لے جا رہی ہے جس پر پہنچ کر انسان اپنے سامنے سے بھی ڈرنے لگتا ہے جس میں ہر دوسرا شخص قاتل اور ہر پہلا شخص ڈاکو بن جاتا ہے۔

یہ حالات کس نے ٹھیک کرنے ہیں؟ سیدھی سی بات ہے اس صورتحال کو صرف حکومت سنبھال سکتی ہے لیکن آپ وپسپ امر ملاحظہ کیجئے ہماری حکومت دانا اور بلوچستان میں تو اپنی "رٹ" قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے اسے دزیرستان اور کوکلو میں تو اپنی رٹ چیلنج ہوتی نظر آتی ہے لیکن ہمارے ڈاکوؤں کی وہ فوج دکھائی نہیں دیتی جو روز ملک کی ہر گلی ہر محلے ہر مکان اور ہر دکان

میں حکومت کی رست کو چیلنج کرتے ہیں، حکومت کے پاس اپنی ٹیمیں میں رست قائم کرنے کے لیے رست ہے اور نہ ہی حکومت کا کوئی اہلکار ان ڈاکوؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے لہذا حکومت کی رست کا یہ عالم ہے آج ایس ایچ او تک سیکورٹی کی گاڑیوں اور مسلح سپاہیوں کے بغیر تھانے سے نکلنے اٹھنے ہمارے آئی جی صاحبان کو بھی اپنی حفاظت کیلئے سو پچاس گاڑیوں کی ضرورت رہتی ہے اور حکومت کا کوئی وزیر سیکورٹی کور کے بغیر آفس نہیں جاتا، حالت یہ ہے لوگ روز بٹھتے ہیں لیکن کوئی شخص تھانے میں پرچہ درجن نہیں کراتا کیونکہ لوگ انصاف اور قانون سے مایوس ہو چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ رہت کھولنے کے بعد مزید خوار ہو جائیں گے، یہ ہے ہماری ساری رست اور یہ ہے حکومت، ہم لوگ بھی مجیب ہیں، ہم امریکہ کو افغانستان اور عراق میں امن قائم کرنے کے مشورے تو دیتے ہیں لیکن ہمارا اپنا یہ عالم ہے ہمارا وزیر مہتمم ایک عام شہرٹی کی حیثیت سے شادی کی کسی تقریب میں نہیں جا سکتا، ہمارے ایس ایچ او صاحبان تک کی جیب کٹ جاتی ہے اور ہمارے تجوں تک کی گاڑیاں چوری ہو جاتی ہیں۔ ہم دنیا کے انجائی دلچسپ لوگ ہیں، ہمیں وزیرستان اور کوہلو کے باغی تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اسلام آباد اور گرامی میں انجمن قائم نہیں کر سکتے، انہیں ہے قریب اور جلال کے غلوں کو کوئی اور پوروں سے نہیں پہچانتے، یہ ہے ہماری رست اور یہ ہے ہماری حکومت۔



افسوس ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا

مرزا طاہر حسین کی داستان میں بے شمار کہی اور ان کہی کہانیاں چھپی ہیں، طاہر حسین

ہر ایک سماجی اور سیاسی مسئلہ پر اپنے جادو اور لہجے کے ساتھ بڑے بڑے شہرہ آفاق اور جتنا تھا وہ 77 اور 78

1988ء کو ناول پلینڈی آیا، وہ چنگوال میں اپنے رشتے داروں سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں اس کی

ٹیکسی ڈرائیور سے لڑائی ہو گئی، اس لڑائی میں ڈرائیور جمشید خان ہلاک ہو گیا۔ طاہر حسین کا کہنا تھا

جمشید خان اور اس کے ساتھی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی، اس نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں

جمشید خان اپنے ساتھی کے ہسپتال سے مارا گیا، طاہر حسین نے ثبوت میں یہ جواز پیش کیا "میں نے

جمشید کی نقش انصافی، ٹیکسی میں رکھی اور نقش لے کر خود تھانے میں پیش ہو گیا، اگر میں گناہگار ہوتا تو

میں جمشید کی نقش جنگل میں پھینکتا اور وہاں سے فرار ہو جاتا" قصہ مختصر پولیس نے طاہر حسین کو گرفتار

کر لیا، طاہر حسین کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور 1989ء میں سیشن کورٹ اسلام آباد نے اسے

سزائے موت دے دی۔ طاہر حسین کے لواحقین نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی لیکن ملزم اپنی بے

گناہی ثابت نہ کر سکا، مقدمہ شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ چلا گیا، دونوں عدالتوں نے اس کی

سزا بحال رکھی، لواحقین نے 2005ء میں صدر سے رحم کی اپیل کی لیکن صدر نے بھی یہ درخواست

مسترد کر دی، جس کے بعد طاہر حسین کو مئی 2006ء کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہو گیا، اس فیصلے تک

چینچے چینچے طاہر حسین 18 برس قید کاٹ چکا تھا، طاہر حسین کے لواحقین نے صدر پر دیر شرف کو

مجرم کی سزا مرتقید میں بدلنے کی اپیل کی، طاہر حسین کے لواحقین نے برطانوی حکومت سے سفارش کی درخواست بھی کی، برطانوی حکومت نے یہ درخواست پاکستان میں اپنے ہائی کمیشن کو بھجوا دی، برطانیہ کے ہائی کمیشنر یہ درخواست لے کر صدر جنرل پرویز مشرف سے ملے، صدر نے طاہر حسین کی سزا پر عملدرآمد ایک ماہ کے لیے معطل کروایا، اس دوران طاہر حسین کی داستان اخبارات تک پہنچی اور اخبارات نے طاہر حسین کے حق میں لکھنا شروع کر دیا، سزا کی معطلی کا اور انہی ختم ہوا تو صدر نے اس میں ایک ماہ کی توسیع کر دی، اس دوران طاہر حسین کے بھائی معقول جمشید کے لواحقین سے بھگوتے کی کوشش کرتے رہے، انہوں نے دو کروڑ روپے تک خون بہا دینے کی پیشکش کی لیکن معقول کے لواحقین نے صاف کرنے سے انکار کر دیا۔ صدر نے تیسری بار سزا معطل کر دی، طاہر حسین کے بعض چائے والے معقول کے گاؤں گئے اور خاندان کو مختلف ترغیبات دینے لگے لیکن وہ لوگ نہ مانے، صدر نے چوتھی بار پھانسی رکوا دی، اس دوران 29 اکتوبر 2006ء کو برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس اپنی اہلیہ کیلا پارک کے ساتھ پاکستان آئے اور انہوں نے صدر پرویز مشرف سے مرزا طاہر حسین کی رہائی کی سفارش کی۔ اکتوبر 2006ء کے آخر میں

برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے مرزا طاہر حسین کے صدر پرویز مشرف کو نئی نئی کیا۔

وزیر اعظم نے 18 نومبر 2006ء کو تین روزہ دورے پر پاکستان آتا تھا اس دوران برطانوی میڈیا اور این جی اوز نے بھی پاکستان پر ہاؤڈاٹا شروع کر دیا۔ اب طاہر حسین کی پھانسی کے لیے نومبر کا مہینہ طے ہوا تھا، اکتوبر میں برطانوی وزیر اعظم کے دورے کے سلسلے میں ہائی کمیشن کے محلے اور پاکستانی دفتر خارجہ میں ملاقاتیں شروع ہوئیں، ان ملاقاتوں کے دوران پاکستانی اہلکاروں کو محسوس ہوا توئی بلیر، اپنے دورے میں وزیر اعظم شوکت عزیز اور صدر پرویز مشرف کے سامنے طاہر حسین کا مسئلہ اٹھائیں گے اور برطانوی وزیر اعظم کی طرف سے دوسری بار سفارش سفارتی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہوگی، صدر نے بھی صورت حال کی نزاکت کو محسوس کیا لہذا انہوں نے 15 نومبر 2006ء کو مرزا طاہر حسین کی پھانسی کو مرتقید میں بدل دیا۔ وزارت دفاع نے قید کے دنوں کا تخمینہ لگایا تو پتہ چلا طاہر حسین سزا کے دن پورے کر چکے ہیں چنانچہ 16 اور 17 نومبر کی درمیانی شب طاہر حسین کو برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ برٹش ہائی کمیشن کا ایک اہلکار 17 نومبر کی صبح طاہر حسین کو لے کر برٹش ایئر لائن میں سوار ہو گیا یوں مرزا طاہر حسین 18 نومبر دوپہر ایک بج کر 15 منٹ پر ڈیہمرو ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ڈیہمرو ایئر پورٹ پر ان کی تصویریں بنیں اور یہ تصویریں

دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئیں، یہ تصویریں پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپیں۔

مرزا طاہر حسین نہ صرف لیڈر میں اپنے خاندان کے پاس پہنچ چکے ہیں بلکہ وہ نئے سرے سے ایک خوبصورت اور محفوظ زندگی بھی شروع کر چکے ہیں۔ ان کی زندگی بچ گئی یہ فیصلہ اس لحاظ سے خوش آئند ہے لیکن جہاں تک طاہر حسین کے کیس کا معاملہ ہے تو یہ مقدمہ پاکستان کی دستوری، قانونی اور سفارتی زندگی پر بے شمار ایسے وجوہات چھوڑ گیا ہے جن کو دھونے میں ہمیں مدد میں لگ جائیں گی اس کیس کا پہلا پہلو برطانوی حکومت کا رویہ تھا، برطانیہ نے ایک بار پھر دنیا پر اپنی اخلاقی برتری ثابت کر دی، برطانیہ نے ثابت کر دیا وہ اپنے شہریوں کے مسائل کو انتہائی سنجیدگی سے لیتے ہیں، وہ اپنے ایک مسلمان شہری کے لیے پرنس چارلس تک کو پاکستان بھجوا سکتے ہیں۔ دوسرا پہلو ہم نے دنیا پر ایک بار پھر اپنی قانونی، آئینی اور سفارتی کمزوری ثابت کر دی۔ ہم نے ثابت کر دیا ہم بیرونی دباؤ میں آخری حد تک جا سکتے ہیں، یقیناً ہماری حکومت کے پاس دوسرے اقدامات کی طرح اس فیصلے کے حق میں بھی بے شمار محسوس و لاکل موجود ہوں گے لیکن سوال یہ ہے

اگر مرزا طاہر حسین پاکستان کے شہری ہوتے ان سے یہ جرم برطانیہ میں سرزد ہوتا اور وہ برطانوی عدالتوں میں لڑتے ہوتے چھائی تک پہنچ جاتے تو کیا جہاں حکومت ان کے لیے بھی پرنس

چارلس اور ٹونی بلینئر جتنی کوشش کرتی اور کیا ہماری ان کوششوں کے نتیجے میں برطانیہ نہیں رہا کر دیتا؟ سوال یہ ہے اگر صدر پرویز مشرف یا وزیراعظم شوکت عزیز برطانیہ کے دورے پر جاسے تو کیا لندن میں ان کی لینڈنگ سے پہلے برطانوی حکومت مرزا طاہر حسین کو پاکستان بھجوا دیتی؟ مجھے یقین ہے ان تمام سوالوں کا جواب انکار ہے، ہم جانتے ہیں برطانیہ کبھی پاکستان کے لیے اپنا قانون یا منابطہ تبدیل نہ کرتا ہم یہ بھی جانتے ہیں ہمارے اس مطالبے پر ٹونی بلینئر بڑے آرام سے کندھے اچکاتے اور سواری کہہ کر دوسری طرف منڈ موز لینے، اس وقت بھی برطانوی جیلوں میں سوا دو سو اور امریکی جیلوں میں 190 پاکستانی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہماری حکومت نے کبھی ان قیدیوں کے لئے برطانوی حکومت سے بات کی؟ گوانتانامو بے میں اس وقت 29 پاکستانی محبوس ہیں سوال یہ ہے کیا پاکستان نے کبھی ان پاکستانیوں کا مقدمہ لڑا؟ کیا پاکستان نے صدر بلینئر کے دورے سے پہلے امریکہ سے یہ مطالبہ کیا تھا "جب تک آپ ہمارے ان قیدیوں کو رہا نہیں کرتے اس وقت تک آپ پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکتے" مجھے معلوم ہے ہم نے آج تک ایسا کیا اور نہ ہم کبھی کریں گے کیونکہ ہم نے خود کو ایک غلام ریاست تسلیم کر لیا ہے لہذا ہم کبھی امریکہ کے احکامات

کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، کبھی سعودی عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنی پالیسیاں تبدیل کرتے ہیں، کبھی برطانوی وزیر اعظم کو اپنے فالوون اور ضابطوں کا تھ پیش کرتے ہیں اور کبھی چین کی خوشنودی کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم کبھی شرق کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی مغرب کو لپائی نظروں سے نکلنے لگتے ہیں، ہم روز اپنے لیے نیا قبلہ تراشتے ہیں، ہم روز اپنے خدا بدلتے ہیں اور اس کے بعد شکوہ کرتے ہیں دنیا ہماری عزت نہیں کرتی، ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں دنیا کبھی خادموں اور ملازموں کی عزت نہیں کیا کرتی، عزت کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے، جو لوگ خود اپنی عزت نہیں کرتے دنیا کبھی ان کی عزت نہیں کیا کرتی، افسوس قدرت نے ہمیں خود کو بادشاہ اور عزت دار ثابت کرنے کا ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن ہم نے یہ موقع بھی کھو دیا، ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا، لالچ اور خوف ہماری قومی پالیسی ہے اور دنیا کا ہر دوسرا ملک ہماری اس پالیسی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

اندھی آنکھوں کے خواب

یہ پانچ برس پہلے کا واقعہ ہے، اٹلی کے شہر میلان میں ایک ہسپتال کی عمارت گر گئی تھی۔ یہ عمارت ہوئی ہے، عمارت کی تعمیر میں انیس سو تیس میں استعمال ہوا تھا، طریقہ تحقیق انہی تو معلوم ہوا تھا۔ تعمیراتی کمپنی کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی، اس نے ماسی میں جتنی عمارتیں بنائی تھیں ان میں بھی تعمیراتی ٹائٹس پائے گئے تھے، سوال پیدا ہوا پھر اس بدنام فرم کو ٹھیکہ کس نے دیا۔ انکشاف ہوا تاؤن میئر ٹھیکے میں ملوث تھا۔ کیس کارپوریشن مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ مجسٹریٹ نے میئر کو طلب کر لیا۔ سماعت ہوئی، جرم ثابت ہو گیا، مجسٹریٹ نے فیصلے کی تاریخ دے دی اس دوران میئر نے اپنا اثر دوسرے استعمال کیا اور فیصلے کے دن سے پہلے مجسٹریٹ کے چاؤلے کے ادکات آگئے۔ مجسٹریٹ نے چارج چھوڑ دیا۔ عوام کو خبر ہوئی تو عوام سراکوں پر آگے نرا سپورٹ بند ہو گیا، شہر ڈاؤن ہو گئے، تعلیمی اداروں میں پھنسی ہو گئی اور پورا میلان شہر جام ہو گیا، عوام کا ایک ہی مطالبہ تھا، "ہمیں ہمارا مجسٹریٹ واپس چاہیے" میلان کے عوام کا خیال تھا جو مجسٹریٹ میئر کو عدالت میں بلا سکتا ہے وہ یقیناً ایک ٹڈنڈے باک ایماندار اور شفاف چیف ہے اور میلان شہر کو ایسا ایفر نہیں کھونا چاہیے، آنے والوں دنوں میں احتجاج اس قدر زور پکڑ گیا کہ حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا، اس مجسٹریٹ نے دوبارہ اسی عدالت کا چارج سنبھالا، میئر کا کیس سنا اور عدالتی کارروائی کے بعد میئر کو باقاعدہ سزا سنائی۔

آپ یہ دانتھن کر ہرگز یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ اٹلی کوئی آئیڈیل ملک ہے وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور اس ملک میں تمام بکریاں اور شیر ایک ہی گھاٹ پر پیتے پلاتے ہیں اٹلی دراصل یورپ کا جنوبی ایشیا اور وسطی افریقہ ہے وہاں سیاسی کرپشن مردوج پر ہے اور وہ جرائم میں تیسری دنیا کے جاہل ممالک کا مقابلہ کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاسی جماعتیں اٹلی میں ہیں اور وہاں تیزی سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اٹلی میں سیاسی رشوت ہاؤس ٹریڈنگ، انتخابات کا ناجائز استعمال، اقربا پروری، ووٹ کھسوٹ اور کرپشن انتہا پر ہے پورا ملک مافیا کے کنٹرول میں ہے اور سرکاری ادارے اور حکومتیں پریشگر وپوں کے زیر اثر رہتی ہیں لیکن ان تمام قباحتوں کے باوجود اٹلی کے عوام بیدار مغز اور روشن ضمیر ہیں وہ اچھے اور برے کی تیز رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں اگر شہری اپنی 'ایمانداریت' کی حفاظت کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مستقبل نہیں لوٹ سکتی لہذا اٹلی کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جن میں ہر ایمانداری اور عزت دونوں محفوظ ہیں اور اگر کوئی اتھارٹی کوئی حکومت ان ایمانداریوں پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرے تو شہری فوراً

مڑکوں پر آجاتے ہیں لہذا شاید یہی وجہ ہے جس کے باعث اٹلی تمام کرپشن اور مافیا کے بلوچوں کا دشمن اور سماجی سچ پر مبنی کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے سچی یا فوڈ ممالک میں ہوتا ہے۔ ہات

صرف اٹلی کی نہیں یہ ایک ناقابل تردید سچ ہے دنیا کے ہر ملک میں ایسے چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی ان ٹیکرینی جن کا ایمان جن کی مہارت اور جن کی ایمانداری شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ جنہیں دنیا کے سارے یکساں مل کر نہیں خرید سکتے اور جنہیں دنیا داری کا سارا بوجھ نہیں جھکا سکتا۔ اگر معاشرے اگر ملک ان لوگوں کی حفاظت کر لیں اگر ان کی عزت ان کی حرمت بچالیں تو وہ ملک وہ معاشرے تیار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس وقت میرے دوست اور میرے عزیز تحریک عدم اعتماد کی ناکامی کا ماتم کر رہے ہیں اس ان کے اس دکھ اس افسوس میں ان کے ساتھ ہوں لیکن میرا خیال ہے اس ملک اس معاشرے میں تحریک عدم اعتماد کی ناکامی سے بڑے حادثے بھی ٹھہر پڑے ہوں ہیں یہاں بڑے بڑے سائیکے ہو رہے ہیں اور ہونے کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے ضمیر پر جوں تک نہیں رہتی مثلاً آپ جنس طارق محمود کا کیس دیکھیں طارق محمود بلوچستان ہائی کورٹ کے جج تھے انہوں نے صدر پرویز مشرف کے ریفرنڈم سے اختلاف کیا ایکشن کمیشن کی سیٹ چھوڑی دیا ویرا حوا تو انہوں نے بلوچستان ہائی کورٹ سے بھی استعفیٰ دے دیا اس ملک اس معاشرے میں جنس طارق محمود جیسے کتنے لوگ ہیں؟ کون ہے اس ملک میں

جس میں حکومت وقت سے اختلاف کی جرأت ہے؟ کون لوگ ہیں جو حکومتی اقدامات کی یوں مخالفت کی جرأت کرتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے موقف کی سچائی پر اپنی نوکری قربان کر دیتے ہیں جنس طارق محمود کا اختلاف صحیح تھا یا غلط؟ آئیے دیکھیں اس سے کیا نظر انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا ایک سرکاری ملازم بھی حکومت سے اختلاف کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور اسے بھی اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ اب ہوتا تو یہ چاہیے تھا حکومت ایسے فحشی شخص کی قدر کرتی۔ ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کرتی لیکن حکومت نے ان کا استعفیٰ فوراً منظور کر لیا اس سے بھی کہیں انسوس ناک بات عوامی رویہ تھا۔ عوام کی طرف سے جنس طارق محمود کے حق میں کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ عوام جو ابرار الحق اور نصیبو مال کا گانا سننے کیلئے توج ہو جاتے ہیں انہوں نے جنس طارق محمود پر استعفیٰ واپس لینے کیلئے دباؤ ڈالا اور نہ ہی حکومت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور ملک میں کوئی تحریک چلی تھی اور نہ ہی احتجاج کا کوئی سلسلہ اُگرا اس وقت عوام جنس طارق محمود کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو سوچنے ہمارے نظام میں موجود ان جیسے

ہو جاتے لوگوں کی کتنی حوصلہ افزائی ہوتی (دو لوگ جو اپنے ایمان کے چراغ بن گئے۔ انہوں کی

دیوار بنائے بیٹھے ہیں اور سوچتے ہیں ان کے احساس تہائی میں کئی کی آئی؟ کیا ان کے دلوں سے سزا دیکھیں کا احساس ختم نہ ہو جاتا؟ ہماری تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں ہمارے سامنے کئی لوگوں نے اپنے ضمیر کے خلاف انتظامیہ کا ساتھ دینے سے انکار کیا لیکن لوگ کھڑے ہو کر ان کا تشاد دیکھتے رہے اور کسی شخص نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کا ساتھ نہ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اپریل 1999ء میں سرگودھا کی سول جج روبینہ سعید ججی اور لاہور کے سول جج طاہر نعیم نے استعفیٰ دیئے تھے ان ججوں کا کہنا تھا ججوں کی تنخواہیں کم ہیں کرپشن بہت زیادہ ہے اور ہمارے رشتے دار بھی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں لہذا ہمارے لئے انصاف کرنا ممکن نہیں اس دور میں ایسے لوگ تلاش کرتا رہا جو آگے بڑھ کر ان روشن ضمیر ججوں کا ساتھ دیتے۔ جان کا حوصلہ بڑھاتے لیکن عوام کی طرف سے خاموشی رہی۔ اب یہ لوگ بھی کہیں برتن مانجھ رہے ہوں گے یا نیوٹن پڑھا رہے ہوں گے۔

محاضرے کریں اور ججوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں اگر ان میں زندگی وجود ہوتی دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست نہیں دے سکتی مگر انسوس کا مقام ہے ہمارے معاشرے کی دلوں سے زندگی ہی خارج ہوتی جا رہی ہے لوگوں میں اچھائی کا ساتھ دینے کی جرأت ہی مرنی جا رہی

زیر پبلیکیشن 3.....0.....215

ہے اور یہ سچ ہے اگر معاشرے سر جائیں اگر ان لوگوں کی رگوں سے جرأت ختم ہو جائے تو آپ تحفظ حقوق نسواں مل لے آئیں یا ایش علی لوگ، ایک ہی جواب دیں گے قبول ہے قبول ہے عوام سنی کی طرح ہوتے ہیں سنی اچھی اور صحت مند ہوتے ہیں اور پودے بھی اچھے ہوتے ہیں لیکن ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں ہم عوام پر توجہ دینے کی بجائے اچھی اور مضبوط جمہوریت کے خواب بننے ہیں ہم اندھی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

بنیادی اصول

آرنلڈ شیواز گر 30 جولائی 1947ء کو آسٹریا کے قصبے تھال میں پیدا ہوا۔ وہ ایک پھرل پہلوان تھا اس کے باؤی ہلڈنگ سٹریچ کی لمبائی 20 سال کی عمر میں سنسز یونیورسٹی میں کیا۔ وہ آسٹریا کی فوج میں بھرتی ہوا۔ آسٹریا میں اس کا مستقبل بہت روشن تھا لیکن ایک دن اس نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے دوستوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا کہنا تھا "سنسز یونیورسٹی کو ہاں جانا چاہیے جہاں سے یونیورسٹی شروع ہوتی ہے" وہ امریکہ چلا گیا۔ آرنلڈ شیواز گر امریکہ پہنچا اور اس نے وہاں معمولی کاموں سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ ان کاموں سے ہوتا ہوا ہالی ووڈ پہنچ گیا۔ ہالی ووڈ میں اسے "ٹرمینلز" جیسی شہرہ آفاق فلم مل گئی۔ ٹرمینلز اپنے دور کی بین الاقوامی فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم سے آرنلڈ نے کروڑوں ڈالر کمائے۔ اس فلم کے بعد اس کا شمار ہالی ووڈ کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے اداکاروں میں ہونے لگا۔ اس کے گھر کے سامنے فلم سازوں کی ٹائٹس لگ گئیں۔ 1986ء میں اس نے اریزا کے ساتھ شاہی کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا۔ 2001ء تک وہ جنس ایک اداکار اور سپر ستار تھا لیکن اپریل 2001ء میں اس کی ملاقات کارل روڈ سے ہوئی۔ کارل صدر بئش کا سیاسی مشیر تھا۔ کارل نے آرنلڈ کو "ٹرمینلز" میں کام کیا۔ یہاں کے سے چار برس تک رہا۔ اسے یہاں ہی تمہا سٹیم میں گیس نہیں آجاتے۔ آرنلڈ کیلئے یہ ایک تیراں کن پیشکش تھی اس نے گھبرا کر جواب دیا "میں ایک ہڈی بندر

اور ادا کار ہوں' کیا تم یہ سمجھتے ہو میں کیلیفورنیا جیسی بڑی ریاست چلا سکتا ہوں' کارل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ پر ہاتھ کر کے بولا 'تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے' کارل نے تجربہ کیا' آرٹلز کوریج بلکن پارٹی کے ٹکٹ پر کیلیفورنیا میں الیکشن لڑایا اور وہ حیرت انگیز طریقے سے جیت گیا جس کے بعد 17 نومبر 2003ء کو اس کی زندگی نے ایک اور کروت لی' اس نے کیلیفورنیا کے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور وہ اس ریاست کا 'بادشاہ' بن گیا۔ جس میں اس نے مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔

کیلیفورنیا نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کی امیر ترین ریاست ہے' کیلیفورنیا دنیا میں دولت کے لحاظ سے 5ویں نمبر پر آتی ہے' پہلے نمبر پر امریکہ ہے' دوسرے نمبر پر جاپان' تیسرے نمبر پر جرمنی' چوتھے پر برطانیہ اور پانچویں نمبر پر کیلیفورنیا ہے' کیلیفورنیا کے بعد فرانس کا نمبر آتا ہے اور فرانس کے بعد باقی پوری دنیا' آپ نے اکثر ریاست کے اندر ریاست کا محاورہ سنا ہوگا' یہ محاورہ

کیلیفورنیا سے شروع ہوا تھا' کیلیفورنیا جیسا کہ ریاست کے اندر ایک مضبوط ترین ریاست ہے' دنیا کی تین بڑی اقتصادیاں' نظم و ضبط اور جوائنٹ سے کیلیفورنیا میں ہیں اور آرٹلز جیسا کہ آخر اس کیلیفورنیا

کا گورنر ہے' آرٹلز کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دنیا کا واحد شخص ہے جو کانڈ کے ایک ٹکڑے پر دستخط کر کے ایک منٹ میں کسی بھی شخص کو ایک منٹ میں ارب پی بنا سکتا ہے' یہ پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کر کے سینکڑوں ارب پیسوں کو فنڈ ہاتھ پر بھی لا سکتا ہے۔ آرٹلز 21 ویں صدی کا قانون بھی کہلاتا ہے' اسے دنیا کے طاقتور ترین انسان کا خطاب بھی مل چکا ہے' مگر دنیا کے اس طاقتور ترین انسان کے ساتھ جنوری 2006ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا' جنوری کے آخر میں اس نے اپنی 'ہارلے ڈیوڈسن' موٹر سائیکل نکالی' موٹر سائیکل کے ساتھ چھوٹی لڑائی نکالی' اس لڑائی میں اپنے 13 سالہ بیٹے پیٹرک کو بٹھایا اور سیر پر نکل گیا' سیر کے دوران اس کی موٹر سائیکل دیوار سے ٹکرائی' آرٹلز اور اس کا بیٹا شدید زخمی ہو گئے' پولیس فوراً موقع پر پہنچی' کیلیفورنیا کے قانون کے مطابق آرٹلز سے ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا گیا' گورنر نے پولیس کو لائسنس پیش کر دیا۔ لائسنس دیکھنے کے بعد سار جٹ نے گورنر کو سیٹ کیا اور اس سے عرض کیا 'سریہ گاڑی کا لائسنس ہے آپ اس لائسنس پر مہربان نہیں چلا سکتے' آرٹلز گھبرا گیا اور اس نے گھبرا کر پوچھا 'اب کیا ہوگا' سار جٹ نے جواب دیا 'میں آپ کو گرفتار کروں گا' کورٹ میں پیشی کروں گا اور کورٹ آپ کے بارے میں فیصلہ کرے گی' آرٹلز نے فوراً سڑک کیل طلب کرنا کہا۔ ذرا

زیر پبلاکٹ 3.....0.....219

وہ کنار اور زمین کا وہ کوہ ہوتا ہے جہاں سے آنے والے نکل کے سورج طلوع ہوتے ہیں، جہاں سے تو میں اور ان کے آنے والے دن جنم لیتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسا کوئی کوہ ایسا کوئی کنار اور ایسی کوئی چوٹی نہیں جہاں سے ہمارا نکل طلوع ہو سکے ہماری بنیادوں میں اصول اور قانون کا کوئی ایسا پتھر، کوئی ایسی اینٹ بھی نہیں جس پر ہم ترقی اور خوشحالی کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ میرا دوست خاموشی سے سنتا رہا میں نے عرض کیا "کاش میں آرمیڈڈ کیا یہ تصویر پاکستان کے ہر با اختیار شخص کی میز پر رکھ سکوں اور اس کے بعد اس سے عرض کر سکوں" حضور جس طرح اہستہ پر گنا نہیں اگایا جاسکتا بلکہ اسی طرح قانون کے بغیر زمین کے کسی ٹکڑے کو ملک میں نہیں کروڑوں لوگوں کے ہجوم کو توہم اور 200 توہمیں کو ابھی توہم نہیں بنایا جاسکتا" میں نے عرض کیا "کاش میں نہیں بتا سکوں ہم کچھوں کی کوکھ سے ہاتھی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

قانون

ایوب خان کے دور میں چند چینی ماہرین کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر آیا۔ اسے لوگ داکٹر کے ڈاکٹرنس کیلئے سٹیٹ میڈیکل کالج میں لے گئے اور اس وقت سے وہاں ایوب خان نے ایک چھت چنگی پائی وفد کا ایک رکن یہ دیکھ کر جس پر 'امیر بان معاملہ' بھانپ گیا لہذا اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "چھت نئی نئی ہے ہم قائل ۱۲ ماٹ کر رہے ہیں" مہمان نے قبضہ لگایا اور پورے احماد سے بولا "شروع شروع میں ہماری چھتیں بھی چنگی تھیں پھر ہم نے ایک ٹھیکیدار کو گولی مار دی اس کے بعد چھت نئی ہو یا پرانی کبھی نہیں چنگی" یہ چینی مثال ہے۔ آپ سعودی عرب کو لیجئے پورے ملک میں جب اذان ہوتی ہے تو تمام دکاندار اپنی دکانیں اپنی درکشٹیں اور اپنے دفتر کھلے پھوڑ کر سبید چلے جاتے ہیں مسرانوں کی دکانیں سونے اور جوہریوں کے شیکس جو اہرات سے بھرے ہوتے ہیں لیکن مجال ہے کوئی ان کی طرف نظر بھی آکھ سے بھی دیکھ لے کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں اگر اس ملک میں کوئی شخص چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اگلے جمعہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ چوری کے معاملے میں جمن کے قوانین زیادہ سخت ہیں وہاں چور کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور موت بھی بڑی میاں تک۔ چور کے سر میں گولی ماری جاتی ہے اور جب لوہا چھین لیں آتے ہیں تو انہیں پہلے اس گولی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

پوری دنیا جرم و سزا کے معاملے میں اس بات پر متفق ہے سزا کا طویل یا خوفناک ہو جاتا

ضروری نہیں ہوتا جتنا ضروری اس کا تعلق ہوتا ہے مثلاً آپ کسی معاشرے میں سرعام کھانسنے کی سزا موت رکھ دیں لیکن اس سزا پر عملدرآمد نہ ہو تو آپ اس کا نتیجہ خود ملاحظہ کر لیں گے سارا شہر کھانسا دے گا جبکہ اس کے برعکس آپ اس 'جرم' کی سزا سچے ماہ طے کر دیں لیکن مجرم کو معلوم ہو جس دن اس سے یہ جرم سرزد ہوگا دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکے گی آپ دیکھ لیجئے گا سچے ماہ کی یہ سزا پھانسی سے زیادہ پر اثر ثابت ہوگی۔ یہ بھی حقیقت ہے جن معاشرہ میں سزاؤں پر عملدرآمد کمزور ہوتا ہے جن میں انصاف میں تاخیر اور تفتیشی نظام کربن ہوتا ہے ان معاشرہ میں آپ سزائیں جتنی چاہیں طویل اور قانون جتنا چاہیں مضبوط بناویں وہاں جرم نہیں رک سکتے کیونکہ ان معاشرہ کا مجرم یہ جانتا ہے وہ رشوت اور سفارش کے ذریعے سزا سے بچ جائے گا وہ جانتا ہے اگر اسے سفارش نہ مل سکے تو بھی وہ عدالتی نظام کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے لگا اسے دیکھ لیجئے گا چنانچہ پاکستان جیسے تمام معاشرہ تمام ممالک میں ہر سال نئی نئی جیلوں نئی عدالتوں اور نئے نئے جرموں کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ معاشرے میں انصاف کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن انصاف نہیں ہوتا آپ اس معاشرے میں جہاں تک کر دیکھیں اس کا حقیقی سزاؤں میں سزاؤں کی سزاؤں میں اضافہ ہوا آ رہا ہے اور دیکھ کر وہی کیلئے نئی سزائیں اور نئی عدالتیں بنیں لیکن ہر آنے والا دن ان جرائم میں اضافے کی خبر لے کر طلوع ہوا۔ کیوں؟ کبھی کسی نے سوچا بات بہت سادہ اور عام فہم ہے ہم سزاؤں میں تو اضافہ کر دیتے ہیں نئی عدالتیں اور نئے قانون بھی بنا دیتے ہیں لیکن ہم سزاؤں پر عملدرآمد کا نظام نہیں بناتے قانون کو اٹل، قطعی اور سب کیلئے یکساں بنانے کی کوشش نہیں کرتے لہذا ہمارا ہر جرم یہ بھتا ہے قانون کوئی بھی ہو سزا خواہ کتنی بھی سخت ہو اس نے بلاخر چھوٹ جاتا ہے چنانچہ وہ جرم پر جرم کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ ملاوٹ کو لہجے میر ظفر اللہ برانی صاحب کی حکومت نے ادویات اور کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے والوں کیلئے 25 سال قید جائیداد کی قرئی اور لائسنس ضبط کرنے کی منظوری دی تھی اس معاشرے کیلئے یہ قانون اور یہ سزا بہت ضروری تھی کیونکہ جتنی ملاوٹ اس ملک میں ہوتی ہے شاید ہی دنیا کے کسی ملک کسی معاشرے میں ہوتی ہو۔ اس ملک میں اسپرین تک خالص نہیں ملتی۔ میں شوگر کامریض ہوں میں ہر مہینے امریکہ سے دو آمیں منگوا کر پاتا تھا کیونکہ میں

جب بھی پاکستانی برانڈ استعمال کرتا تھا تو میری شوگر آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی تھی میں سوچتا تھا کیا یہ ظلم نہیں ایک ہی برانڈ ایک ہی کمپنی کی وردا امریکہ میں کچھ ہے اور پاکستان میں کچھ ہمارے ملک میں چائے کی پتی سے لیکر کاربڈہ 'سرج' کے پاؤڈر سے رنگا ہوا برانڈ وال سے پلاسٹک کے باریک دانے اور ہلکی سے پیلا رنگ برآمد ہوتا ہے ہمارے ملک میں گوشت ناخالص ہوتا ہے آنے اور بھی میں ملاوٹ ہوتی ہے ہمارے ملک کے ٹیکسٹائل گولیاں اور کپڑوں خالی ہوتے ہیں ہمارے ملک میں وووہ کا ایک گھاس تک صاف سٹراٹس ملتا پاکستان میں آپ کسی پوتانی ووا خانے کی کوئی مشہور دو اینسٹ کراہیجے۔ آپ کو اس میں 'سٹیرائزڈ' ملیں گے۔ اس ملک میں ہزاروں لاکھوں ایسے ووا خانے ہیں جو رجسٹر ہیں اور نہ ہی ان کی ادویات لیکن ان کے کارخانے بھی موجود ہیں 'سٹور' بھی ہیں اور 'ریٹیل' کا نظام بھی ہے۔ آپ پورے ملک کا دورہ کریں آپ کو ہر وہ فٹ بعد کسی نہ کسی ووا یا کسی نہ کسی حاذق طبیب کا بورڈ ملے گا۔ یہ کون لوگ ہیں اور انہیں کس نے یہ وحندہ کرنے کی اجازت دی ہے اور ان کی ادویات میں کون کون سے اجزاء ہیں۔ آج تک کسی نے یہ دیکھا اور بڑی بڑی کمپنی نے ہو چکا پاکستان کے ہوا چائے میں کون سا ملک ہے جس میں اس کا ہوا ہوا گنجائش موجود ہے۔ یہ اعزاز صرف ہمارے ملک کو حاصل ہے ہمارے ملک میں گوالوں کے برتنوں سے مینڈک برآمد ہوتے ہیں اور اس میں خراب بدبودار اور مسحت گندم ہیں کر لوگوں کو کھلاوی جاتی ہے لہذا اس ملک کو ملاوٹ ایکٹ کی بڑی ضرورت تھی جہاں صاحب نے جب اس ایکٹ کا اعلان کیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس قانون کو خوش آمدید کہا تھا میں یہ سمجھتا تھا ملاوٹ کے مجرموں کے لئے 25 سال کی سزا بھی کم ہے لیکن بات پھر وہی نکلی اس قانون پر بھی عملدرآمد نہ ہوا لہذا آج اس قانون کو پاس ہوئے تین برس گزر چکے ہیں لیکن حال 15 کروڑ لوگوں کے اس ملک میں ایک بھی 'ملاوٹ' مگر فائر نہیں ہوا۔ قانون بن چکا ہے اعلان بھی ہو چکا ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے مجھے یقین ہے اس ملک میں ملاوٹ کا کاروبار آئندہ بھی جاری رہے گا کیونکہ اس ملک کے ملاوٹچے جانتے ہیں سزا 25 سال ہو یا 225 سال اس ملک میں کوئی شخص ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا اور اگر کسی غلطی سے ان پر کوئی ہاتھ اٹھ بھی گیا تو وہ دس تیس پچاس ہزار روپے خرچ کریں گے اور اگلے ہی روز اپنے گھرنے اپنے چہرے پر بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہے قانون اور اس کی اصل پوزیشن میں نے چند روز پہلے اخبارات میں چیف

Kashmiri.com

www.paksociety.com

جلس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری کا ایک بیان پڑھا تھا انہوں نے ذمہ تربیت
ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن ججوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا 'انصاف کے معاملے میں کسی قسم کا
کھمبہ نہ کیا جائے' میں نے بے اختیار سوچا اس ملک میں عدالتیں اور جج ہیں لیکن انصاف نہیں
تانون ہے لیکن قانون کا خوف نہیں! میں نے سوچا 'تانون اور سزاؤں کا خوف وہاں ہوتا ہے جہاں
سزائیں دی جاتی ہیں جس ملک میں قانون بھولنے کیلئے بنائے جاتے ہوں اور سزائیں کتابوں میں
رکھے کیلئے وہاں سزائیں اور قانون کیا حیثیت رکھتے ہیں! وہاں انصاف کون کرے گا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

کاش ملک کی ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں

دنیا میں کیسپس کا تصور انگریزوں نے دیا تھا وہ جب تعلیمی ادارے بناتے تھے تو ان میں دو باتوں کا خاص خیال رکھتے تھے وہ ایک ان کے تعلیمی ادارے شہر سے باہر ہوتے تھے انگریزوں کا خیال تھا شہر میں سکول ازم ہونا ہے شہر میں ہنگامہ درش اور ہائوسنگی ہونا ہے اور یہ تمام چیزیں طالب علموں کی کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں اور وہ تعلیمی اداروں کو سب سے زیادہ رقبہ دیتے تھے وہ سکول اور کالج میں بے شمار لان، گارڈن اور کھیل کے میدان بناتے تھے انگریزوں کے تعلیمی ادارے مختلف بلاکوں میں منقسم ہوتے تھے اور ان بلاکوں کے درمیان لان، گارڈن اور فوارے ہوتے تھے انگریزوں کا کہنا تھا کیسپس کی وسعت طالب علموں کا وقتی اخق وسیع کرتی ہے اور یہ ان کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ کرتی ہے اور ان کا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ تعلیمی اداروں کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ان میں طالب علموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے یہ "اپ گریڈ" ہوتے رہتے ہیں سکول ہائیر سیکنڈری سکول اور کالج 'یونیورسٹیاں بن جاتے ہیں لہذا جب یہ اپ گریڈ ہوتے ہیں تو انہیں زیادہ زمین اور زیادہ رقبے کی ضرورت پڑتی ہے ان کا خیال تھا جب ان کے تعلیمی ادارے "اپ گریڈیشن" کے مرحلے پر پہنچیں تو ان کے پاس زمین کی کمی نہ ہو انہیں نئی جگہ میں بنانے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے چنانچہ آج آپ پاکستان میں انگریزوں کے بنائے سکول کالج اور یونیورسٹیاں دیکھ لیں آپ کو ان میں یہ دونوں خوبیاں ملیں گی۔

انگریزوں نے اس خطے کے ہر قبیلے پر شہزادہ ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں کوئی مذکورہ تعلیمی ادارہ بنایا تھا۔ یہ تمام تعلیمی ادارے شہروں سے باہر بنائے گئے تھے لیکن آبادی میں اضافے کے باعث شہر چلتے گئے یہاں تک کہ ان 60 برسوں میں زیادہ تر تعلیمی ادارے شہروں کے درمیان آ گئے ان تعلیمی اداروں کے ارد گرد کمرشل ازم کاروبار یا باہر ان تعلیمی اداروں کی زمینیں "پرائم لینڈ" کا درجہ اختیار کر گئیں پاکستان میں جب پلاٹ کا مرض ابھرا اور قبرستان تک پلاٹ بین کر پک گئے تو اس سوچ نے پاکستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کیا اس طبقے کا نام لینڈ مافیا تھا اس مافیا نے سرکاری زمینوں پر قبضہ شروع کر دیا تعلیمی ادارے ان لوگوں کا سب سے بڑا ہدف تھے اس کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی "تیسویں" تھی، پاکستان میں تعلیم اور تعلیمی اداروں کو کوئی والی وارث نہیں چنانچہ پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی اداروں کی زمینوں پر لینڈ مافیا قابض ہو چکا ہے، ان اداروں میں چکوال کا کالج بھی شامل ہے۔ چکوال کے پوسٹ گریجویٹ کالج کی "فرنٹ سائیز" چکوال کی مین سڑک پر آتی تھی یہ سائیز کروڑوں روپے مالیت کی تھی چکوال کی سیاسی انتظامیہ اس زمین کی قدر و قیمت سے واقف تھی لہذا ان نے کالج کی 300 کنال ٹکڑے پر قبضہ کر لیا یہ لوگ اس مافیا کے 180 وگا میں اور ان وگاؤں پر پبلکس بنا کر چاہتے تھے سیاسی انتظامیہ نے اس منصوبے کی اجازت کیلئے پنجاب گورنمنٹ کو لکھا پنجاب گورنمنٹ نے جنوری 2006ء کو انہیں اجازت دے دی حکومت نے ٹکڑے تعلیم کو بھی اس فیصلے سے مطلع کر دیا اس تحریری اجازت کے بعد چکوال کے تحصیل ناظم نے کالج کی "ہائڈری وال" اور وی کالج کے ٹیکسٹ بکوں اور پروفیسروں نے اس واقعہ پر احتجاج شروع کر دیا انہوں نے ضلعی انتظامیہ کے خلاف ایک قرارداد دست پاس کی یہ قرارداد اور پروفیسروں کا احتجاج اخبارات میں شائع ہونے لگا انہما دونوں انگریزی کے ایک معاصر اخبار "ڈان" میں اس واقعے کے بارے میں ممتاز کالم نگار ایاز امیر نے کالم بھی لکھا، یہ کالم چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری کی نظروں سے گزرنا انہوں نے اسی وقت "سومونو ایکشن" لے لیا سپریم کورٹ نے چکوال کے ناظم غلام عباس تحصیل ناظم اور ڈی سی اوسیت تمام محتلفہ حکام کو عدالت میں طلب کر لیا یہ حضرات 5 مئی کو سپریم کورٹ میں حاضر ہوئے چیف جسٹس نے انہیں 300 کنال جگہ کالج کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا ضلعی ناظم نے اسی وقت عدالت سے معذرت کی اور وہ وگاؤں اور پبلکس کے منصوبے سے دستبردار ہو گئے اس کے بعد چیف جسٹس نے بڑے جارحی ریمارکس دیتے چیف جسٹس نے فرمایا "تعلیمی ادارے کمرشل

مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیے جا سکتے، تعلیم کی فراہمی اور تعلیمی ادارے کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے، آپ اپنی آنے والی نسلوں کو کیا دینا چاہتے ہیں، اگر آپ تعلیمی اداروں کی جگہ کاروبار کیلئے استعمال کریں گے تو وہاں کاروبار ہوگا وہاں ہوٹل نہیں گے وہاں منشیات بھی فروخت ہوں گی جس کے بعد وہاں تعلیمی ماحول برقرار نہیں رہ سکے گا" یہ رپورٹ 6 مئی 2006ء کو روزنامہ جنگ سمیت تمام اخبارات میں شائع ہوئے۔

پیریم کورٹ کے اس حکم کے بعد شاید پاکستان کے وہ تمام تعلیمی ادارے بچ جائیں جن کی زمینیں بدقسمتی سے شہر میں آگئی تھیں اور ان پر شہروں کے ناظم اور ان کے پروردہ مانیا نظریں جمائے بیٹھے تھے، یہ لوگ کس قدر مستکمل اور خوفناک ہیں اس کا اندازہ آپ کو چھوٹے اضلاع اور چھوٹے شہروں میں جا کر ہوتا ہے، یہ لوگ مسجد میں اور گاہیں اور قبرستان تک بچے ہیں، ہر سال یہ لوگ قبروں پر ٹریکٹر چلاتے ہیں اور اس کے بعد ان پر دکانیں بنا کر کروڑوں روپے سمیت لیتے ہیں ان لوگوں کی دہشت برود سے سرکاری زمینیں تک محفوظ نہیں ہیں انہوں نے کوئی سکول چھوڑا، نہ ہسپتال اور نہ ہی کوئی کھیل کا میدان، سکول اور کالج ان لوگوں کا خصوصی ہدف ہوتے ہیں، مجھے کوئی صاحب قرار ہے جسے منکر اور وہاں شہر میں بھی کالجوں کی زمینوں کے ساتھ یہ سٹاک ہو چکا ہے، چکوال کی سیاسی انتظامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے ساتھ کرنا چاہتی تھی، میں اس ایکشن پر پیریم کورٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، جب سے جسٹس افتخار محمد چودھری پیریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے ہیں اور انہوں نے عام اور غریب لوگوں کے مسائل پر سوشل ایکشن لینے شروع کیے ہیں یقین کیجئے لوگوں کے دل میں عدالتوں کا احترام پھر اٹھائی لینے لگا ہے، لوگوں کی عدالتوں کے ساتھ ایک بار پھر تو قعات وابستہ ہونے لگی ہیں، نور محمد تاجک کا کیس بڑا شادی بیاہ کے کھانوں کا مسئلہ، ہونڈی اور سوارہ کی رسم، ویڈیو پیریم جوڈیشل کونسل کا معاملہ، چیف جسٹس کے سوشل ایکشنز نے عام کے دل میں عدالت کی محبت اور احترام میں اضافہ کیا، چیف جسٹس صاحب نیلی وچرن اخبارات اور عوام کی عام درخواستوں تک پر سوشل ایکشن لیتے ہیں، وہ اسی وقت علاقے کی ساری سرکاری مشینری کو عدالت میں طلب کر لیتے ہیں، ان کے یہ اقدامات ہیرو کرکسی کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی لارہے ہیں، مجھے ایک ڈی آئی جی بتا رہے تھے آج جب اخبار میں کسی جرم یا زیادتی کے بارے میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو ہم لوگ فوراً خوفزدہ ہو جاتے ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے ابھی ہمیں پیریم کورٹ سے نیلی فون آجائے گا جس کے بعد ہمارے لئے نوکر ہی بچانا مشکل ہو جائے گا، ڈی

آئی جی کا یہ اعتراف میرے لیے ایک کھلمکھٹ تھا اس وقت میں نے دل سے دعا کی اللہ کرے ہماری عدلیہ کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے سو سو نو ایکشن کی یہ روایت اعلیٰ عدالت سے لوہڑ کو رٹس تک جائے اور اس ملک کے تمام بیج اسی سپرٹ اور اسی جذبے کے تحت کام کریں تاکہ پاکستان میں وہ وقت آجائے جب کوئی مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار یہ سوچے اس ملک کے بیج اور اس ملک کی عدالتیں جاگ رہی ہیں اور اگر میں نے یہ جرم کیا تو میں ان جاگتی عدالتوں اور ان بیدار ججوں سے بیخ نہیں پاؤں گا؟ مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے اگر میں نے جرم کیا تو اسے پورے ملک میں کوئی ایسی جگہ کوئی ایسا مقام نہیں ملے گا جہاں چھپ کر وہ عدالتوں اور ججوں سے اوجھل ہو سکے گا۔ میرے دل سے دعا تھی کاش ہمارے ملک میں ایسا وقت آجائے جب اس ملک کے تمام مجرم یہ یقین کر لیں وہ جرم کے بعد قانون اور انصاف سے نہیں بچ سکیں گے وہ حساب دے لیں بغیر اس زمین پر نہیں رہ سکیں گے کاش اس ملک میں ایسا وقت آجائے کاش ہماری ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

بُرا قانون

میں نے کارڈ نکول کر دیکھا 'کارڈ پر جلی حروف میں "حقیقہ" لکھا تھا 'میں نے حیرت

سے قریشی صاحبہ کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی اور کہا "اے کون دیکھو اس میں دیکھو، یہ کون سا ہے؟"

پولیس چھاپے باری رہتی ہے چنانچہ میں نے بیٹے کی دعوت دلیرا اور نواسے کا حقیقہ لکھا کر دیا 'ہم

لوگ کارڈ حقیقہ کے تقسیم کر رہے ہیں لیکن دعوت ویسے کی دے رہے ہیں "میں نے عرض کیا "

جناب آپ کو اس لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت تھی آپ چپ چاپ قانون پر عملدرآمد

کریں لوگوں کو ایک کولڈ ڈرنک چائے یا سوپ بلائیں خود بھی پریشانی سے بچیں اور دوسروں کو بھی

کوفت سے بچائیں "قریشی صاحبہ مسکرائے "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں ذات برادری والا

آدی ہوں مجھے قانون کے ساتھ ساتھ دس دوسری چیزوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے 'جنید میرا اکلوتا

بیٹا ہے 'میرے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا بہت کچھ ہے لہذا میں ایک بھر پور دیلا اور ڈاکر سکتا ہوں "میں

نے ان سے عرض کیا "آپ ویسے کی رقم کسی ضرورت مند کو دے دیں آپ کو ثواب بھی ہوگا اور آپ

قانون توڑنے کی محنت سے بھی بچ جائیں گے" قریشی صاحبہ نے فوراً فرمایا "میں ہر سال

کر دس روپے کی چیرٹی کرتا ہوں 'میں نے تین فرسٹ بنا رکھے ہیں 'بیٹے کی شادی سے پہلے میں

نے جس غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائی تھیں 'میں اس چیرٹی کے باوجود بیٹے کا دلیرا اور ڈاکر

سکتا ہوں لہذا تم خود بتاؤ 'اب میں کیا کروں 'میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اگر ہم شادی کی تعریبات کے بارے میں تحقیق کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ تعریبات ہماری ثقافت ہماری روایات کا حصہ ہیں یہ روایات اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے چلی آ رہی ہیں آپ برصغیر پاک و ہند کے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی شادیوں کا جائزہ لیں آپ کو ان تمام مذاہب کی شادیوں میں بے شمار یکساں "کامن" باتیں ملیں گی یہ پھر اور روایات کی یکسانیت ہے اس خطے میں جب بھی کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کا جیز بنانا شروع کر دیتی ہے اسی طرح جب بھی لڑکے کے ماں باپ بہو کی تلاش میں نکلتے ہیں تو وہ لڑکی والے کی حیثیت ضرور دیکھتے ہیں اور عموماً جیز کی توقع بھی رکھتے ہیں یہ عادت والدہ سے لے کر جلال آباد تک لوگوں میں "کامن" ہے اور اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے لوگ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے اور لڑکیوں کے جنم پر سنجیدہ ہوتے آ رہے ہیں یہ روایات اس خطے کی جڑوں میں اس خطے کی بنیادوں میں موجود ہیں اور پچھلے پانچ چھ ہزار سال میں دنیا کی کوئی طاقت انہیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکی ہاں البتہ پاکستان میں چند ایسی برادریاں ضرور موجود ہیں جنہوں نے اتفاق رائے سے ان روایات کو کسی حد تک مکمل برداشت بنالیا یہ وہ برادریاں ہیں جو اپنے بچوں کی شادیاں مولانا خاندان میں کرتی ہیں اور جنہیں ان لوگوں کو مستحق ہونا ان کے بعض بھائی بھائی شادی بیاہ کی رسمیں انور نہیں کر سکتے تو انہوں نے سب کی سہولت کیلئے ان روایات میں بعض چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر دیں مثلاً بعض برادریوں میں سارے رشتے داروں کی لڑکی کا جیز بناتے ہیں پورا خاندان کنٹری پیش کر کے بارات کی خورد و نوش کا بندوبست کرتا ہے بعض خاندان مساجد میں نکاح کرتے ہیں اور ان خاندانوں میں بارات اور ویسے کی رسمیں ختم ہو چکی ہیں بعض خاندانوں میں لڑکی والوں کے اخراجات بھی لڑکے والے برداشت کرتے ہیں اور بعض خاندانوں میں شادی انتہائی سادگی سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد نیا جوا باری باری اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر جاتا ہے اور دو رشتے دار انہیں چھتی تھکتے تھکتے دے کر واپس بھجواتے ہیں لیکن رسومات میں یہ تبدیلیاں صرف چند خاندانوں تک محدود ہیں یہ معاشرتی شکل اختیار نہیں کر سکیں ان کے اثرات پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے۔ ہماری شادی بیاہ کی رسمیں مذہبی نہیں سماجی اور ثقافتی ہیں آپ ہار یا مال کو لیجئے عرب دو بے کے گلے میں ہار نہیں ڈالتے عرب دو بے کو سلامی بھی نہیں دیتے لیکن برصغیر کے تمام مسلمان دو بے کے گلے میں ہار بھی ڈالتے ہیں اور اسے سلامی بھی دیتے ہیں مال ڈالنے اور سلامی دینے کی رسم چھ ہزار سال پہلے ہندوستان میں رائج ہوئی

تھی اور یہ آج تک ہندوستان کے تمام مذاہب 'فرتوں اور نسلوں کے لوگوں میں موجود ہے' بھی صورتحال ہندی کی ہے 'برصغیر کے تمام مذاہب کے لوگ 'ہین کو ہندی لگاتے ہیں اسی طرح چرائیاں 'ہین کا شادی کا جواز' اور 'ہنگوئی' 'منجائی' 'ناج گانا' و 'دھ پرائی' 'شہ' 'لا اور سہار کھادیں' بھی اس خطے کی روایات ہیں اور یہ روایات خطے کے تمام مذاہب 'توسوں اور نسلوں میں یکساں موجود ہیں' ان روایات کو آج تک کوئی مذہب اور کوئی نظریہ تبدیل نہیں کر سکا 'یہ بھی ان روایات میں سے ایک روایت ہے اور یہ بھی ہزاروں سال سے اس خطے میں چلی آ رہی ہے۔

آزادی سے پہلے انگریز مقامی روایات اور رسموں کے خلاف کوئی قانون نہیں بناتے تھے 'وہ رسموں اور عقیدے کے خلاف قانون کو برا قانون (BAD LAW) کہتے تھے' ان کا خیال تھا قانون بنانا کمال نہیں جوتا اصل کمال اس قانون پر عملدرآمد کرانا ہوتا ہے لہذا جس قانون پر عملدرآمد ممکن نہ ہو حکومت کو وہ قانون نہیں بنانا چاہیے 'شاید یہی وجہ تھی انگریز نے کبھی کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس پر وہ عملدرآمد نہیں کر سکتا تھا مثلاً انگریز چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھا لیکن

اس نے 1947 تک اس کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا کیونکہ وہ جانتا تھا ہندوستان کے تمام مذاہب اور تمام علاقوں میں یہ روایت موجود ہے اور لوگ اس قانون کو تسلیم نہیں کریں گے 'انگریز ذات برادری اور طبقائی تفریق کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن اس نے کبھی برہمن کو شہر کے ساتھ بھانے کی کوشش نہیں کی 'اس نے تمام ریلوے سٹیشنوں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے پانی کے الگ الگ کمرنگوا دیئے 'اس نے فوج تک میں ہندو اور مسلمانوں کے باہرچی خانے علیحدہ علیحدہ رکھے 'انگریز نے ڈیڑھ سو سال میں کبھی اندرون شہر کرفیو لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا پرانے شہروں کی گلیاں تنگ ہوتی ہیں اور ان میں پولیس کے گھوڑے نہ سکتے 'موزمائیگی اور جیپیں نہیں جا سکتیں لہذا حکومت وہاں کرفیو پر عملدرآمد نہیں کر سکتی کی اور گائے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف کا باعث بنتی تھی چنانچہ انگریز نے ڈیڑھ سو سال میں گائے کے بارے میں کوئی قانون نہیں بنایا 'انگریز کہتا تھا حکومت کو قانون بنانے سے پہلے معاشرے میں 'سوشل میٹجنگ' لانی چاہیے 'اسے مقامی لینڈروں اور زمین جی اوز کی مدد سے پہلے معاشرے کا حراج بدلنا چاہیے 'جب معاشرے کا حراج بدل جائے تو اس کے بعد قانون کی باری آتی ہے 'اس سٹیٹس ام' 'سی' کی مثال بھی دے سکتے ہیں 'انگریز نے سٹی کی رسم کے خلاف قانون بنانے سے پہلے راجہ رام موہن کے ذریعے ہندو معاشرے میں ایک سوشل میٹجنگ کی بنیاد رکھی 'جب راجہ رام موہن کی تعلیمات ایک

تحریک کی شکل اختیار کر گئیں تو اس کے بعد انگریزوں نے سنی کے خلاف قانون پاس کیا اور اس قانون پر پوری طرح عملدرآمد کر لیا۔

میں دل سے شادی بیاہ پر اصرار کے خلاف ہوں، میں ویسے اور ہارات کے اخراجات کو بھی پسند نہیں کرتا لیکن جہاں تک اس قانون کی بات ہے تو میرا خیال ہے یہ ایک "بیلے" ہے اور اس قانون نے معاشرے کی انجمنوں میں اضافہ کر دیا ہے اس نے ہماری معاشرتی منافقت بڑھا دی ہے۔ اس نے رشوت لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری کے نئے دروازے بھی کھول دیئے ہیں اس نے لوگوں کو ویسے کو حقیقے کا نام دینے پر مجبور کر دیا ہے اور اس قانون نے با اختیار اور بے اختیار کی تلخ میں بھی اضافہ کر دیا ہے آج حالت یہ ہے با اختیار لوگ دھڑلے سے ویسے کرتے ہیں ان کی دھرت میں قانون بنانے اور نافذ کرنے والے دونوں شریک ہوتے ہیں اور پولیس باہر کھڑی ہو کر ان وی آئی پی کی حفاظت کرتی ہے لیکن جب کسی بے اختیار شخص سے ویسے کا جرم سرزد ہو جاتا ہے تو پولیس اس کی دیکھیں تک اٹھا کر لے جاتی ہے یہ تفریق عوام کے دلوں میں نفرت کے

سبب بنتی ہے۔ ہر اخبار کے لیے حکومت کو ان ملک کے مسائل پر توجہ دینی چاہیے حکومت کو

چاہیے اس ملک کی نصف سے زائد وادائیں جعلی ہیں ان جعلی وادوں سے ہزاروں لوگ ہلاک ہو چکے ہیں لیکن آج تک پولیس نے کسی ڈرگ سنور پر چھاپہ نہیں مارا پاکستان کا شمار دنیا کے ان دس ملکوں میں ہوتا ہے جن میں خالص خوراک نہیں ملتی اور جس میں دودھ سے لے کر آٹے تک میں ملاوٹ ہوتی ہے لیکن آج تک کسی عدالت نے ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا پاکستان میں آج تک کسی ملاوٹ بازار کسی جعل ساز کو پھانسی نہیں ہوئی ہمارے ملک میں دنیا میں سب سے زیادہ وٹریک ہارٹے ہوتے ہیں لیکن آج تک ان حادثوں کی روک تھام کیلئے کوئی قانون نہیں بنا اور تعلیم اور صحت ہر شعبہ کی گنجائش حق ہے لیکن آج تک پاکستان میں اس گنجائش حق کیلئے کوئی قانون نہیں بن سکا ہم پاکستانی جب ان معاملات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے ہماری حکومت کو جب بھی پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ وائٹنٹ اور رینٹ کے نیچے یا جلا کر بیٹھ جاتی ہے اور ہماری حکومت فوجی کی سرہم پٹی کے بجائے اسے ہائری سٹانا شروع کر دیتی۔ ہم عجیب لوگ ہیں جس رسم کو چھ ہزار سال کی تاریخ نہیں بدل سکی ہم اس کے سامنے ڈنڈے لے کر کھڑے ہیں لیکن جو مسائل ہماری معمولی سی توجہ سے حل ہو سکتے ہیں ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ہم واقعی بہت دلچسپ لوگ ہیں ہر قانون بنانے میں پوری دنیا میں کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

چیف جسٹس صاحب کے حضور

میں 2004ء میں آسٹریا گیا، فاروق چودھری دیا تا میں میرے میزبان تھے چودھری صاحب انعام صاحبی میں ملازمت کرتے ہیں اور پچھلے میں کچھ دنوں میں ہے آسٹریا میں مقیم ہیں۔ مجھے آسٹریا یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا، پرسکون اور خوبصورت ملک لگا۔ دیا نا شہر کے مین درمیان سے اریائے ڈینیوب گزرتا ہے یہ دریا آگے چل کر آسٹریا کو سمندر سے ملاتا ہے میں فاروق صاحب کے ساتھ دیا نا شہر میں محوم رہا تھا تو مجھے شہر کے درمیان منبری رنگ کی ایک خوبصورت عمارت دکھائی دی یہ شہر کی ویدہ زیب اور مصورانہ قسم کی عمارت تھی مجھے چودھری صاحب نے بتایا یہ دیا نا کارٹریڈنٹ پلانٹ ہے پورے دیا نا شہر کا سیوریج یہاں آتا ہے یہ پلانٹ سیوریج کے پانی کو صاف کرتا ہے اسے گندگی ہو، جراثیم اور کیمیائی عناصر سے پاک کرتا ہے اور پھر یہ پانی دریا ئے ڈینیوب میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس پلانٹ کی وجہ سے ڈینیوب یورپ کا صاف ترین دریا ہے مجھے یہ بات عجیب لگی لہذا میں نے چودھری صاحب سے پوچھا "اس سارے ترو کی کیا ضرورت تھی یہ لوگ سیوریج کا پانی براہ راست دریا میں پھینک دیتے" چودھری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "آسٹریا کے لوگ اسے ظلم سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے پچھلے برسوں نے اس ایک صاف ستھرا دریا دیا تا لہذا میں نے اسے وہاں سولہ گواہت تھانہ رواں اور سبے پور دیا تا پانا ہے یہ لوگ دریا کی جنگلی پہاڑوں، پھیلوں اور پارکوں کو امانت سمجھتے ہیں

چنانچہ امانت کی طرح ان کی حفاظت کرتے ہیں "میں نے کہا" یہ ایک عجیب منطلق ہے "چودھری صاحب نے فرمایا" یہ عجیب منطلق نہیں، یہ عقل مندی ہے "آسٹریا کی حکومت نے بچاس برس پہلے تحقیق کرائی تو پتہ چلا کہ دریا آلود ہو گا تو آنے والے دنوں میں ویانا کا صحت کا بجٹ آٹھ گنا بڑھ جائے گا چنانچہ ان لوگوں نے ٹریسٹ پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا "آج ویانا کا صحت کا بجٹ یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں سے کہیں کم ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "ٹریسٹ پلانٹ کا صحت کے بجٹ سے کیا تعلق؟" چودھری صاحب مسکرائے "یہ دریا آسٹریا کی ہزاروں ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے اس کا پانی جنگلوں پارکوں اور جھیلوں تک پہنچتا ہے یہ بارش کا باعث بھی بنتا ہے اور یہ مضافات کی آبی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اگر یہ پانی آلود ہو گا تو اس سے پیدا ہونے والی مچھلیاں، سبزیاں، پھل، بارش اور ہوا بھی زہریلی ہوگی ماحول کا یہ زہر شہریوں کو تیار کرے گا اور اس بیماری سے صحت کے بجٹ میں اضافہ ہو جائے گا چنانچہ آسٹریا کی حکومت نے ماحول اور شہریوں کو صحت مند رکھنے کے لئے دریا کی صفائی کا فیصلہ کیا لہذا آج ویانا کے لوگ صحت مند بھی ہیں اور

ان کی عمریں بھی لمبی ہیں آپ کا ان اس دریا کی فکر کیسے ہو گا میں نے ان کی فیکٹریوں کی طرف اشارہ کیا

میں نے کہا "اور یہ سارے بوزھے ٹیک ٹھاک صحت مند ہوں گے"۔ میں ویانا کے اس ٹریسٹ پلانٹ اور دریائے ڈینیوب کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے میری نظروں سے چیف جسٹس آف پاکستان مسز جسٹس افتخار محمد چودھری کے چند ریہارڈس گزرے اور مجھے ویانا کی دو تمام خوبصورت دو پہریں اور شاہی یاد آگئیں جو میں نے دریائے ڈینیوب کے صاف سترے پانیوں کے قریب بیٹھ کر گزاریں تھیں "چیف جسٹس نے ایک مقدمے کے دوران ریہارڈس دیکھے" "فیکٹریوں کے فضلات پانی میں بھینکنے سے چھپائش کا مرض پھیل رہا ہے لہذا فیکٹریوں کی گندگی دریاؤں اور نہروں میں نہ پھینکی جائے" سی ڈی اے ٹالہ ٹی میں گندگی بھینکنے کا نوٹس لے "چیف جسٹس نے یہ ریہارڈس سپریم کورٹ کے چانچرنگی لارجرنگی کی ایک سماعت کے دوران دیکھے تھے یہ بیچ ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں دائر ایک پیشین کیلئے تشکیل دیا گیا تھا۔ بیچ نے سماعت کے آخر میں ماحولیات کے ڈائریکٹر جنرل اصحف بھاسا کو اسلام آباد کے سیکرٹری امیر ای ائی ٹانن کا دو اسموں میں سروے کرنے اور چاروں صوبوں میں ماحولیاتی ٹریبونل بنانے کا حکم دیا۔

مجھے یہ احکامات اور چیف جسٹس کے ریہارڈس پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی، چیف جسٹس کو

اللہ تعالیٰ ایسے مزید احکامات جاری کرنے کی استطاعت عطا فرمائے، چودھری صاحب مدلیہ کی

سارخ کے مقبول ترین چیف جسٹس ہیں۔ چیف جسٹس صاحب اخبارات میں چھپنے والی جھوٹی چھوٹی خبروں پر سوسائٹیز ایکشن لے لیتے ہیں اور اس ایکشن کے نتیجے میں ان سینکڑوں ہزاروں منظرہوں کو انصاف اور ریلیف ملتا ہے جو شاید برسوں عدالت کے دروازے تک نہ پہنچ پائیں۔ میں واپس موضوع کی طرف آتا ہوں، ہماری بزرگ نسل بتاتی ہے ان کی جوانی میں پاکستان کے تمام ندی، تالے، اچھلیں اور دریا صاف ستھرے تھے۔ 1970ء تک راولپنڈی اور اسلام آباد کے شہری تالائی کا پانی پیتے تھے۔ اس نالے کا پانی "منرل واٹر" ہوتا تھا کیونکہ مارگلہ کی وادی کے بے شمار چشمے اور جھرنے تالائی میں شامل ہوتے تھے اور یہ آگے چل کر ہزاروں لوگوں کی ضرورت پوری کرتے تھے لیکن پھر، کچھتے ہی دیکھتے لہنی ایک گندے اور بدبودار نالے کی شکل اختیار کر گیا۔ دریا سے سوال بھی کسی وقت اس علاقے کا انتہائی صاف ستھرا اور شفاف دریا تھا لیکن آج یہ دریا بے اور نہ ہی اس کا صاف شفاف پانی۔ یہی صورتحال دریا کے جہلم، چناب، ستلج اور راوی کی ہے۔ راوی بھی ملکہ نور جہاں اور جیا گیکر کا دریا ہوتا تھا لیکن آج کو بے تک اس کا پانی نہیں پیتے، کیوں؟

www.ksars.org

تدیوں اور تالوں میں پھینک دیتے ہیں۔ ہماری آبادی میں جوں جوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہماری ندیوں، تالوں اور جھیلوں میں آلودگی بڑھ رہی ہے اور ہمیں اس آلودگی کا تالان بیماری اور موت کی شکل میں ادا کرنا پڑ رہا ہے یہ آلودگی آگے چل کر ہمارے کھیتوں اور باغوں تک پہنچتی ہے اور ہم لوگ اس آلودگی میں پروان چڑھنے والی سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں۔ ہمارے وہ یہاں کے لوگ ان دریائوں، نہروں اور ندی تالوں کا پانی پیتے ہیں۔ یہ ندی نالے زمین میں رس کر ہمارے آبی وسائل کو بھی آلودہ کر رہے ہیں اور یہ آلودگی ننگوں اور نونٹیوں سے ہو کر ہمارے معدوں تک پہنچ رہی ہے چنانچہ آج ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی طبی مسئلے کا شکار ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بیمار ہے، چھانٹش اور کینسر دینا کے مہلک ترین امراض ہیں اور اس آبی آلودگی کے باعث یہ دونوں امراض پاکستان میں بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں لہذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ پاکستان کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری ہاؤسنگ سکیموں کو قانونی طور پر پابند کر دیں وہ اپنی سیدرتاج لائن کے آخر میں ویانا جیسے نرینٹ پلانٹ لگائیں، عدالت تمام مومن کیشیوں، سوشل کارپوریشنوں اور میٹرو پولیٹن انتظامیہ کو بھی پابند کر دے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں سیدرتاج کے ساتھ نرینٹ پلانٹ لگائیں اور پاکستان میں اس وقت تک کسی ہاؤسنگ سکیم کو اجازت نہ دی

زیر پلانٹ 3.....0.....235

جائے جب تک وہ یکم سیرج کا ٹریڈنٹ پلانٹ نہ خرید لے اور یہ پلانٹ سیرج لائن کے ساتھ لگانے کا تحریری معاہدہ نہ کر لے۔ میں ہاؤسنگ کے وفاقی وزیر سے بھی درخواست کر چکا ہوں انہوں نے بھی اس پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا تھا لیکن میرا خیال ہے اس کے لیے بڑی سطح پر قانون سازی اور غور و فکر کی ضرورت ہے لہذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ ٹریڈنٹ پلانٹس کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنائیں وہ اس ملک کی اگلی نسل پر احسان کر جائیں ہم آج کیا کھا رہے ہیں کیا پلار رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر سوچنے ہماری آنے والی نسل کل کیا کھائے گی اور کیا پیئے گی میری چیف جسٹس کے حضور درخواست ہے وہ کل عدالت میں بیٹھتے ہوئے 2010ء کا کیٹنڈرو کیجے لیں اور اس کے بعد اپنے دریاؤں اور ندی نالوں پر نظر ڈالیں اور سوچیں ہمارے بزرگوں نے ہمیں کتنا صاف ماحول دیا تھا لیکن ہم اپنے بچوں کیلئے کیا ماحول چھوڑ کر جا رہے ہیں ہم انہیں کیا دے کر جا رہے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

انصاف

لندن میں دن کے گیارہ بجے تھے اور یہ 9 مارچ کا دن تھا، میں چودھری نصر محمد کا

انتظار کر رہا تھا، نصر مٹھے کے لانا سے دیکھ لیں اور وہ لندن میں ایئر کونشن کا کام کر کے ہیں، نصر نے مجھے واٹر لوکیشن پر چھوڑنا تھا، میں اس شام لندن سے بیرس جا رہا تھا، دن گیارہ بجے مجھے اچانک یہ منگھم سے فون آیا اور کسی صاحب نے باپتے ہوئے بتایا، "صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو معطل کر دیا ہے" اس خبر نے لندن کی تنگی کو تپش میں تبدیل کر دیا، میں نے بارہویں منزل کے اس فلیٹ کی کھڑکی کھولی اور ایک لمبا سانس لیا، مجھے دو دن پہلے میاں شہباز شریف کا ڈیرا یاد آ گیا، میاں صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی تھی، ہم دونوں ایجویریوڈ کے ایک لہنائی ریستوران میں بیٹھ گئے اور تین گھنٹے تک پاکستان کے حالات پر گفتگو کرتے رہے تھے، میاں شہباز شریف کا کہنا تھا "میں دیکھ رہا ہوں پاکستان کے عوام مزموں پر کھڑے ہیں اور حکمران جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں" میں نے سوچا کیا اس شروعات کی شروع ہو سکتی ہے، مجھے میاں نواز شریف سے اپنی ملاقات بھی یاد آئی، میاں صاحب کا کہنا تھا "فوجی حکمران ایک غلطی کے فاسلے پر کھڑے ہیں" میں نے سوچا "کیا یہ وہی غلطی ہے جو سب کو حکمرانوں کی ٹانگیں جلا دے گی" مجھے اظاف حسین سے ملاقات بھی یاد آئی، 8 مارچ کو ایم کیو ایم کے انٹرنیشنل ہیڈ کوارٹر میں اظاف حسین سے میری گفتگو ہوئی تھی، اس گفتگو میں اظاف حسین نے دعویٰ کیا تھا "وہ دن دور

نہیں جب عوام کو اختیار ملے گا" میں نے سوچا "کیا عوام کو اختیار ملنے کا دن آچکا ہے" گیمبرج سکوائر کے اس فلیٹ کے نیچے زندگی رواں دواں تھی پورے لندن پر سورج چمک رہا تھا اور میں کھڑکی کھول کر اپنے ملک کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میرے ہاتھ کوئی سرانہیں آ رہا تھا۔

میرا سفر دوبارچ کو شروع ہوا میں نے سات دن لندن رک کر پیرس جانا تھا میں نے خود کو چند دن چھٹی دے دی تھی پورے ملک میں ہم دھماکے ہو رہے تھے پورے تیس دن تک روز کوئی نہ کوئی بری خبر ملتی تھی اور یہ خبر کالوں سے لے کر درج تک ہر چیز کو پھیل اڑاتی تھی لہذا میں نے حالات سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا لیکن برادرم عابد عبداللہ کا خیال تھا "خبر نویسوں کو چھٹی نہیں ملا کرتی لوگ کالوں کا انتظار کرتے ہیں" میں نے درمیان کاراستہ نکالا میں نے ایڈوائس کالم لکھ دیے یہ سدا بہار قسم کے کالم تھے میرا خیال تھا لوگوں کو میری غیر موجودگی کا اندازہ نہیں ہوگا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا نورج آ یا اور پاکستان میں ہر چیز تبدیل ہو گئی لندن میں میرے پانچ ہدف تھے میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف، میرے دوست پرویز رشید، بے نظیر بھٹو اور ایم کیو

ایم کے سربراہو العارف حسن میں نے سوچا میں ان کو گلے سے ملنا چاہتا ہوں زیادہ وقت گزار کر

پاکستان کے آنے والے سیاسی دنوں کا اندازہ لگاؤں گا لیکن بے نظیر بھٹو میرے لندن پہنچنے سے پہلے یعنی چلی گئیں لہذا میرے پاس صرف چار ہدف رہ گئے۔ میں میاں شہباز شریف کا "نہن" ہوں میں نے سوچا میں ان سے ان دنوں کی ناگفتہ تعلیمات سنوں گا جب انہوں نے پنجاب میں سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی میاں شہباز شریف کو اقتدار سے فارغ ہونے ساڑھے سات سال گزار چکے تھے لیکن مجھے ان ساڑھے سات برسوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے شہباز شریف کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف نہ کی ہو شہباز شریف نے حقیقتاً پنجاب میں حکمرانی کا ایک نیا معیار طے کر دیا تھا لہذا ان کے بعد پنجاب کا تاج جس شخص کے سر پر بھی رکھا گیا وہ دانشگاہی یا غیر دانشگاہی میں شہباز شریف کا مقابلہ کرنا دکھائی دیا "آپ گورنر خالد مقبول کو دیکھ لیجئے یا وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الہی کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو پنجاب کے یہ دونوں حکمران میاں شہباز شریف کے چیلنج کا مقابلہ کرتے دکھائی دیں گے لندن کے بعد میں نے پیرس اور سویٹن جانا تھا ان دنوں سطوں میں میرے دوست جبرئیل شیخ اور محمد دم عباس رہتے ہیں یہ دونوں غیر سیاسی اور غیر صفائی قسم کے دوست ہیں لہذا میں ہمیشہ ان کی کہنی کو انجوائے کرتا ہوں لیکن درمیان میں نورج آ گیا چیف جسٹس آف پاکستان معطل ہوئے اور میری چھٹی کیمنسل ہو گئی اور میں چند روز نورج آ کو امیں آ گیا۔

چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ اس سلوک کے مستحق تھے اور کیا صدر جنرل پرویز مشرف کو ایسا قدم اٹھانا چاہئے تھا؟ ان سوالوں کا جواب دقت دے گا اور یہ دقت زیادہ دور نہیں لیکن جہاں تک چیف جسٹس آف پاکستان کی ذات کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں 'سیری چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ چند ملاقاتیں رہی ہیں 'سپریم کورٹ کے دوسرے سینئر ترین جج جسٹس رانا بھگوان داس میرے مہربان اور دوست ہیں رانا صاحب کے ساتھ میری اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں رانا صاحب کی محفل میں بعض اوقات دوسرے جج حضرات بھی موجود ہوتے ہیں لہذا مجھے رانا صاحب کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس کی شخصیت کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا کسی صاحب اختیار کے کوئیگ اور عام لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہوتا ہے 'وینا کا ہر شخص اپنے سینئر افسروں کو دعو کر دے سکتا ہے لیکن دنیا کا کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے جونیئر افسروں سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی دعو کر دے سکتا ہے 'لوگ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ ہمارے بارے میں کیا بولتے ہیں یہ بات تھارڈ پارٹی ہوتی ہے 'عوامی ذہنیاتی چیلنج ایج و عزت اور وہ ذلت ہوتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ دعویٰ فرماتے ہیں لہذا ہم لوگ کسی بھی شخص کا چیلنج دیکھ کر اس کے مستقبل کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں 'چیف جسٹس آف پاکستان ان دونوں معاملات میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں، میں نے ان کے کولیس کے سند سے ہمیشہ ان کی تعریف سنی، ان کے ساتھی بچوں کا کہنا تھا وہ انتہائی ان تھک شخص ہیں، وہ رات گئے تک دفتر میں کام کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی ذریعہ التوا مقدمے ٹھنکانا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے کیس ملتوی کرنے پر پابندی لگا دی تھی دو دو کیوں کو کیس لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ عدلیہ کے ایج کے بارے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وغیرہ۔

چیف جسٹس کا چیلنج ایج اس سے بھی کہیں آگے تھا۔ چودھری صاحب نے اپنے سومونو اختیار کو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا انہوں نے سپریم کورٹ میں انسانی حقوق تیل قائم کیا۔ یہ تیل عام شہریوں کی سادہ کاغذ پر تحریر درخواستوں پر متحرک ہو جاتا تھا چنانچہ منوبھین کا کیس ہو یا رسول بخش کی پولیس قبضے میں ہلاکت، ٹھیل کی پانچ بچیوں کی زبردستی شادی کا مسئلہ ہو یا حیدرآباد میں تین نابالغ بچوں کی گرفتاری اور نثار آدم خان میں پانچ سالہ بچی کا رشتہ کرنے کا معاملہ ہو یا کوٹ غلام محمد میں بجلی کے کرنٹ سے تین بچوں کی ہلاکت چیف جسٹس نے ان تمام معاملات پر سومونو ایکشن لیا

اور خود کو عام شہری کا چیف جسٹس ثابت کیا۔ وہ روز اخبارات پر مذکورہ سوشل میڈیا کیس لیتے تھے اور آبی جی سے لے کر وزرا اور جاگیرداروں تک کو کورٹ میں طلب کر لیتے تھے لہذا ان کے دور میں عام شہریوں کو انصاف بھی ملا اور ریٹیف بھی ہو چھلے دواڑ حائے برسوں میں چیف جسٹس اور ان کا سوشل میڈیا کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا اگر ان کا مسئلہ چیف جسٹس تک پہنچ گیا تو انہیں ضرور ریٹیف ملے گا، چودھری صاحب کے سوشل میڈیا کیسوں نے انہیں ریکارڈ مقبولیت عنایت کی یہاں تک کہ وہ عام لوگوں کی آخری امید بن گئے۔ چودھری صاحب نے عدلیہ کے وقار میں بھی اضافہ کیا، انہوں نے مہم میں انصاف کے خراب ہوتے ہی کبھی سہارا دیا لہذا آج یہ ان کی مقبولیت کا نتیجہ ہے پاکستان کے مہم ان کے لیے سڑکوں پر کھڑے ہیں اور پاکستان کا بچہ بچہ حکومتی اقدامات کی مذمت کر رہا ہے۔

میں نے کل اپنے ایک دوست سے پوچھا "اب کیا ہوگا" اس نے ہنس کر جواب دیا "نولے کے منہ میں ساپ آ گیا ہے، اگر نولے نے ساپ نگل لیا تو وہ مارا جائے گا اور اگر اس نے ساپ نگل دیا تو ساپ کو اڑھانے میں نہیں ملے گی" میرے دوست کا کہنا تھا۔ یہ وہی صورتحال ہے جو خیر علی شہزاد اور علی بیٹو کے مسئلے میں درپیش تھی اس دوران کے تجربے کا نتیجہ تھے "قبریں دو ہیں اور مرد ایک" میرے دوست کا کہنا تھا سپریم کورٹ کے ایجنٹوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا حکمرانوں کو وسیع القلب اور تحمل حراج ہونا چاہیے، اگر صدر محترم 9 مارچ کو ذرا سا تحمل کا مظاہرہ کرتے، اگر دوست قلبی سے کام لیتے تو آج پاکستان کے کونے کونے میں آگ نہ لگتی اور آج حکومت کو مہم کی توجہ ہٹانے کیلئے ٹیلی ویژن چینلوں پر حملے نہ کرانا پڑتے، میرے دوست کا کہنا تھا "حکومت کے بعض اہل خواہ صدر اور چیف جسٹس کی صلح کی کوشش کر رہے ہیں، یہ بھی خواہ چیف جسٹس سے جان کی امان طلب کر رہے ہیں، اگر چیف نے حکومت کو جان کی امان دے دی تو حکومت کیس واپس لے لے گی بصورت دیگر چیف جسٹس کا کیس عدالت سے گلیوں میں چلا جائے گا اور اس کا فیصلہ لوگ کریں گے" میں نے اپنے دوست سے اتفاق کیا کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں جب عدالتوں اور حکومتی ایوانوں میں انصاف نہیں ہوتا تو پھر لوگ گلیوں اور سڑکوں پر انصاف کرتے ہیں اور اہم لوگ بد قسمتی سے بلائی تیزی سے ایوانوں سے سڑکوں کی طرف آ رہے ہیں، ہم اپنا انصاف لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔



کاشف آزاد

358 برس بعد

دو تار نوک کے علاقے مائل ہام میں پیدا ہوا اس کے والد نے اس کا نام کوک رکھا
لیکن وہ سر ایڈورڈ کوک کے نام سے مشہور ہوا۔
Kashif Azad@OneClick.com

ایڈورڈ کوک 1556ء میں تاجنگٹن اسکول میں داخل ہوا اور وہاں سے پڑھا جو
ترینی کاغذ کیمبرج تک پہنچ گیا۔ ترینی کاغذ کا شمار دنیا کے نامور کالجوں میں ہوتا ہے اس کالج نے
دنیا کو سیکنگٹون ہزاروں معروف لوگ دیئے دنیا ترینی کاغذ پر تاز کرتی ہے۔ لیکن ترینی کاغذ سر ایڈورڈ
کوک پر فخر کرتا ہے۔ آج سر ایڈورڈ کوک کو ترینی کاغذ سے فارغ ہونے 4 سو 32 برس ہو چکے ہیں
لیکن کالج کی دیواروں 'کالج کی لائبریری' کالج کے کینے نیریا اور کالج کے لانوں میں آج بھی
ایڈورڈ کوک کے نقش باقی ہیں آپ آج بھی ترینی کاغذ میں داخل ہوں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے
آپ ایڈورڈ کوک کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ دنیا جی جی کر کہہ رہی ہے قانون بنانے اور
قانون کی حرمت بچانے والے کبھی فوت نہیں ہوتے 'دنیا کا کوئی بادشاہ کوئی حکمران اور کوئی آمر
قانون سازوں کو نہیں مٹا سکتا' سر ایڈورڈ کوک 1578ء میں لندن بار کا ممبر بنا اور 1589ء میں
برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا '1592ء میں ورسوئٹرز جنرل اور ریکارڈر آف لندن بنا'
1593ء میں اسے دارالعوام کا جج بنا دیا گیا اور وہ 1594ء میں وہ سر فرانسس بیکن کو شکست
دے کر انارڈنی جنرل بن گیا 'برطانیہ میں 1603ء بہت اہمیت کا حامل ہے اس سال سنوارٹ

خاندان کا ایک شہزادہ جیمز اول آگے بڑھا اور اس نے ٹیوڈر خاندان سے برطانیہ کا تخت چھین لیا۔ جیمز اول ایک طالع آزماء اور آمرانہ فطرت کا بادشاہ تھا۔ وہ ملک کے تمام اختیارات اور اقتدار اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو حکم مانا جھانچا جائے لیکن اس وقت تک برطانیہ کے عام شہری بیدار ہو چکے تھے لہذا ان پر عسکرانی جتان آسان نہیں رہا تھا۔ جیمز اول ایک حکمراں نہیں تھا اس نے حالات کو بھانپ لیا چنانچہ اس نے عدالت کو ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا اس دور میں سرائے ورڈ کوک کا طوطی بولتا تھا۔ جیمز اول نے 1606ء میں ایڈورڈ کوک کو چیف جسٹس بنا دیا۔ جیمز اول کا خیال تھا ایڈورڈ کوک چیف جسٹس بننے کے بعد اس کے غیر قانونی احکامات کی حمایت کرے گا اور یوں بادشاہ قانون کے لبادے میں رو کر اپنے آمرانہ اختیارات سے لطف اندوز ہوتا رہے گا لیکن بادشاہ کے ارادوں پر بہت جلد اس پر زنگی کیونکہ ایڈورڈ کوک نے چیف جسٹس کا حلف اٹھایا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے سر پر سفید بالوں کی دگ اور جسم پر چیف جسٹس کا گاؤن دیکھا اور اپنے آپ سے پوچھا "کیا تاریخ مجھے بادشاہ کا نظام

کھینکے گا؟" اس کے پاس ایک سی ماہر کی اور اس کی کا پابلیکٹی

سرایے ورڈ کوک نے بادشاہ کی بجائے عام شہری کا بیج بننے کا فیصلہ کیا اس نے برطانیہ کے مظلوم شہریوں کا ہاتھ پکڑ لیا اس کا کہنا تھا "جب تک قانون بادشاہ سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتا اس وقت تک ہم برطانوی معاشرے کو مہذب قرار نہیں دے سکتے" اس کا کہنا تھا "معاشرہ کو قانون عزت دیتا ہے بادشاہ نہیں اور بد قسمتی سے برطانیہ قانون کی بجائے بادشاہوں کا ملک بنے آنے والے دنوں میں سرائے ورڈ کوک کے خیالات نے شاہی خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔ بادشاہ پریشان ہو گیا لیکن اس کے پاس اس پریشانی کا کوئی حاد نہیں تھا۔ سرائے ورڈ کوک اس وقت تک اپنے فیصلوں کے ذریعے عام شہریوں کے دل میں گھر کر چکا تھا اور لوگ اس کی کارکردگی اور ایمانداری سے مطمئن تھے۔ 1610ء میں ایڈورڈ کوک نے برطانیہ کے شاہی خاندان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اس نے فیصلہ دیا "بادشاہ قانون میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کر سکتا جس سے عام شہریوں سے حقوق سارے ہو سکیں۔ یہ فیصلہ بادشاہی اقتدار کو بردوراست بنا تھا اس وقت تک بادشاہ کا غر پر دو سطریں لکھ کر نہ صرف قانون کی کسی بھی شق کو معطل کر سکتا تھا بلکہ وہ کسی بھی وقت تمام شہری حقوق بھی ساقط کر سکتا تھا لیکن ایڈورڈ کوک کے اس فیصلے نے بادشاہ کے اختیارات کے سامنے قانون کی دیوار کھڑی کر دی۔ بادشاہ نے ایڈورڈ کوک کو دبانے کیلئے اسے

شاہی بیچ کا اضافی چارج دے دیا اس دور میں سپریم کورٹ کے دو بیچ ہوتے تھے ایک بیچ کا سن لاء کہلاتا تھا جبکہ دوسرا کنٹری بیچ تھا' کا سن لاء کا چیف جسٹس عام شہریوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کرتا تھا جبکہ کنٹری بیچ کا چیف جسٹس شاہی خاندان کے اختیارات اور حقوق کا محافظ ہوتا تھا' کنٹری بیچ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کا چیف جسٹس تخت کے سامنے جوابدہ تھا' بادشاہ کا خیال تھا ایڈورڈ کوک کنٹری بیچ کا چارج لینے کے بعد قانونی لحاظ سے بے بس ہو جائے گا لیکن ایڈورڈ کوک کنٹری بیچ کا چارج لینے کے باوجود خاموش نہ ہوا وہ نہ صرف عام شہریوں کے حقوق کے لئے لڑتا رہا بلکہ وہ بادشاہ کے بے لگام اختیارات کو بھی چیلنج کرتا وہ نومبر 1616ء کو اس وقت کے "وہی ٹلفر" فرانسس بیکن نے بادشاہ کی مشہور ایڈورڈ کوک کے خلاف ریفرنس دائر کر دیا اور بادشاہ نے اس ریفرنس کی بنیاد پر 14 نومبر 1616ء کو ایڈورڈ کوک کو معطل کر دیا۔ سرائیڈورڈ کوک کی معطلی کی خبر جوں ہی عام ہوئی برطانیہ کے شہریوں نے ہنگامہ کر دیا لوگ سڑکوں پر آئے اور انہوں نے برطانیہ کا نظام وریم بریم کر دیا یہ احتجاج ایک سال تک جاویں وہاں یہاں تک کہ حکومت نے 1617ء میں اسے دہرا کر کے پڑھ کر ہٹا دیا۔ 1620ء میں برطانیہ میں الیکشن ہونے لگے تو لوگوں نے سرائیڈورڈ کوک کو بادشاہ کے حلقے سے الیکشن لڑایا، اسے الیکشن میں بھاری ووٹوں سے کامیاب کر لیا اور اسے کنڈمپٹ پر اغوا کر دیا اور انعام پہنچا دیا۔ پاولیٹائی سرائیڈورڈ کوک آنے والے دنوں میں چیف جسٹس ایڈورڈ کوک سے زیادہ خطرناک نکلا۔ اس نے دارالعوام میں بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کر دیا۔ وہ جس دن دارالعوام میں تقریر کرتا تھا اس دن لندن کی گلیاں لوگوں سے بھر جاتی تھیں۔ لوگ پارلیمنٹ ہاؤس کی گیلری سے تقریر سنتے تھے اور باہر آ کر لوگوں کے سامنے یہ تقریر پڑھ دیتے تھے۔ یہ تقریر منہ سے منہ اور شخص سے شخص تک ہوتی ہوئی پورے برطانیہ میں پھیل جاتی تھی، ایڈورڈ کوک نے اپنی تقریروں سے شاہی خاندان کو نفرت کا استعارہ بنا دیا اس نے پارلیمنٹ میں فرانسس بیکن کو رشوت خوردگی ثابت کر دیا۔ 1621ء میں حکومت نے اسے جیل میں پھینک دیا لیکن حکومت نوامہ کی کوشش کے باوجود اس پر الزام ثابت نہ کر سکی۔ 1625ء میں جیمز اول کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ چارلس اول بادشاہ بن گیا۔ چارلس اول پرانے بادشاہ کے مقابلے میں کئی گنا آسرا و ظالم تھا۔ اس نے ایڈورڈ کوک پر حملے شروع کر دیے۔ ایڈورڈ کوک 1628ء کو پارلیمنٹ سے ویتاخر ہوا اور 1634ء کو انتقال کر گیا لیکن اس وقت تک وہ بادشاہ کے اختیارات میں وراثت ڈال چکا تھا چنانچہ ایڈورڈ کوک کے انتقال کے بعد پارلیمنٹ اور تخت کے درمیان لڑائی

شروع ہوگئی یہ جنگ پارلیمنٹ ہاؤس سے گلیوں میں پہنچی اور برطانیہ میں سول وار شروع ہوگئی، لوگوں نے بادشاہ چارلس اول کو بچا اور اسے 1649ء میں پھانسی دے دی، چارلس کی پھانسی کے بعد برطانیہ میں شاہی خاندان ختم ہو گیا اور اقتدار "کونسل آف سٹیٹ" کو منتقل ہو گیا۔ سرائیو ورڈ کوک کا مشن مکمل ہو گیا۔ 1660ء میں برطانیہ میں بادشاہت بحال ہوئی لیکن اس بادشاہت کے منہ میں آمریت کے دانت نہیں تھے۔

آج اس واقعے کو 358 برس گزر چکے ہیں لیکن لوگ آج بھی سرائیو ورڈ کوک کو یاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کا یہ قول دہراتے ہیں "معاشرے اس وقت تک مہذب نہیں ہو سکتے جب تک ان میں قانون کی بجائے بادشاہ حکمران رہتے ہیں" میں نے 16 مارچ 2007ء کو سرائیو ورڈ کوک کا یہ قول پڑھا اور سوچا برطانوی بادشاہ نینر اول چارلس اول اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف میں کتنا فکری اشتراک پایا جاتا ہے برطانوی بادشاہوں نے 351 برس پہلے سرائیو ورڈ کوک کو منتقل کر دیا تھا اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف نے 9 مارچ 2007ء کو ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو سب کچھ میں بلا کر "غیر فعال" کر دیا، میں نے سوچا کیا ہم مہذب معاشرے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں؟ کیا ہم 358 برس بعد بھی ضمیر اور ایمان کے اس دورے پر پہنچ پائے ہیں جس پر 1649ء میں برطانیہ کے عوام تھے، میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا ہم میں 358 برس بعد بھی اتنی جرأت نہیں کہ ہم اس ملک میں قانون، قانون کی حکمرانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کیلئے لڑ سکیں؟ کیا ہم آج بھی برطانیہ کے 358 برس پرانے معاشرے سے ہزاروں قدم پیچھے نہیں ہیں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال پوچھے اور ایسی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔



بڑی عدالت

یہ ایرلن کی گیارہ تاریخ 2007ء کا سن تھا، صبح کے پونے دس بجے تھے اور کراچی ہائیکورٹ کا باروم تھا، سینیٹر وسیم سجاد پی ایس او کی فوج کاری کے کیس کی ضروری شکایے کراچی آگے تھے وسیم سجاد سماعت کے بعد کورٹ روم سے نکلے اور ٹہلے ٹہلے باروم میں چلے گئے، باروم میں اس وقت زیادہ دکھا نہیں تھے وسیم سجاد ایک میز پر بیٹھ گئے انہوں نے چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لیتے لگے، دس بجے کے قریب دکھا دکھا ایک دستہ باروم میں داخل ہوا انہوں نے وسیم سجاد کو دیکھا تو وہ ٹھٹک گئے اور انہوں نے وسیم سجاد کے خلاف چارجیٹیاں شروع کر دیں، ان دکلاء میں صلاح الدین گنڈاپور بھی شامل تھے، وہ آگے بڑھے، وسیم سجاد کے پاس پینچے اور ذرا سے تیز لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے، "وسیم صاحب آپ باروم سے باہر چلے جائیں، وسیم سجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں پوچھا، "کیوں؟" گنڈاپور نے اسی لہجے میں جواب دیا، "آپ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس میں شکوتی وکیل ہیں، آپ قانون کے پیشے کی توہین کر رہے ہیں، ہم لوگ آپ کو پینڈ نہیں کرتے چنانچہ آپ فوراً باروم سے چلے جائیں، وسیم سجاد نے چائے نوش کرنے کی مہلت مانگی لیکن گنڈاپور نے سادھی بو دکلاء کی طرف اشارہ کیا اور وسیم سجاد کو بتایا، "یہ لوگ مشتعل کوزے ہیں، یہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیں، وسیم سجاد نے جوئیر دکلاء کی طرف دیکھا، وہ انہیں شعلہ بار نظروں سے گھور رہے تھے، وسیم سجاد معاملے کی سنگینی بھانپ گئے، لہذا انہوں نے چائے چھوڑی اور باروم سے نکل گئے، یعنی

شاہدین کا کہنا ہے دو ہندوازاں ہائی کورٹ کے کیٹے ٹیرانس مگے اور انہوں نے وہاں سے چائے پی۔

چیف جسٹس آف پاکستان کے معاملے میں اب تک تین قسم کی صورت حال سامنے آئی۔ پہلی صورت حال دکنہ کا اتھارڈ ان کارڈرٹل اور عدلیہ کے ساتھ ان کا اخصا ہے دکنہ نے چیف جسٹس کے حق میں سڑکوں پر نکل کر پوری دنیا کو حیران کر دیا یہ وہ کام تھا جو پاکستان کی تاریخ میں بڑی سے بڑی سیاسی جماعت نہیں کر سکی، اگر دیکھا جائے تو صدر پرویز مشرف کو پچھلے ساڑھے سات برسوں میں پہلی بار کسی منظم روٹل کا سامنا کرنا پڑا، اس معاملے میں کراچی سے طورخم اور سکرو سے چین تک سارے دکنہ وہم خیال ہیں اور حکومت پوری کوشش کے باوجود ان میں ”ڈنٹ“ نہیں ڈال سکی، حکومت پوری کوشش کے باوجود دکنہ اور بار کونسلوں کو تقسیم بھی نہیں کر سکی، حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دکنہ کی تحریک منبھوت اور تیز ہوتی جا رہی ہے اور معاشرے کے دوسرے طبقے بھی اس میں شامل ہو رہے ہیں، دوسری صورت حال غیر فعال چیف جسٹس کی مقبولیت میں اضافہ ہے، حکومت کا خیال تھا چیف جسٹس دکنہ برادری، بیورو کریٹس، سیاستدانوں اور بزنس مینوں میں غیر مقبول ہیں اور یہ سارے طبقے ریٹرنس کے بعد حکومت کا ساتھ دینے کے لیے دکنہ لیا شدہ ان کو تیز اور بنام شہر لوٹنے کے لیے غیر فعال کے بعد چیف جسٹس کو تاریخی اہمیت دی اور چودھری صاحب دیکھتے ہی دیکھتے میرا بننے چلے گئے، یہاں تک کہ لوگ ان کے قلم ان کے جٹھے اور ان کے پھنے ہوئے کوٹ کی لاکھوں روپے بولی لگانے لگے، لوگ آج ان کے ہاتھ چومتے ہیں اور ان کے حق میں وہ سارے نعرے لگاتے ہیں جن کیلئے پاکستان کے بڑے بڑے سیاستدان ترس رہے ہیں، 14 اپریل کو چیف جسٹس بار کونسل سے خطاب کے لئے سکرم گئے تھے، وہ جب سکمر انٹر پورٹ پر اترے تو آدھا شہر وہاں جمع تھا، چیف جسٹس کو جلوس کی شکل میں بار کونسل ہال تک لایا گیا، چیف جسٹس کا یہ استقبال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا اگر چیف جسٹس پاکستان کی دس بڑی بار کونسلوں میں خطاب کر لیں تو حکومت کے خلاف وہ تحریک شروع ہو جائے گی جو پچھلے سات برسوں میں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور ایم ایم اے شروع نہیں کر سکی اور تیسری دہم جہاد جیسی صورت حال ہے، حکومت کو سپریم جوڈیشل کونسل میں اپنا وقف ثابت کرنے کے لئے دیکھ لیں، مل رہے، چیف جسٹس کے خلاف ریٹرنس کی شروعات نسیم بخاری نے کی تھی، نسیم بخاری نے فروری میں چیف جسٹس کے خلاف ایک خط لکھا تھا، اس میں انہوں نے اخبار ٹھہر پڑ سرنی کی بات کو ہدف تنقید بنایا تھا، یہ خط پاکستان اور بیرون پاکستان بڑی سطح پر پڑھا گیا تھا لیکن حکومت نے

جوں ہی چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا نسیم بخاری کیلئے عدالتوں میں جانا مشکل ہو گیا وہ پچھلے دنوں سندھ کی ایک عدالت میں پیش ہوئے تو دکھانے لے ان پر حملہ کر دیا پنجاب کی ایک تحصیل میں ان کا ایک ہم شکل ہت گیا اور ایک ریستوران میں ویڈیوں نے انہیں کھانا دینے سے انکار کر دیا حکومت نے ریفرنس کیلئے جناب شریف الدین پیرزادہ سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا یہ شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے کسی حکومت کو پہلا انکار تھا حکومت نے بڑی مشکل سے انہیں منایا اور وہ مئی کے مہینے میں عدالت میں پیش ہونے لگے حکومت نے فخر الدین جی ابراہیم ایس ایم ظفر اور حفیظ پیرزادہ سے بھی رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" جیسا جواب دے دیا حکومت نے سرکاری دیکھوں اور ایڈووکیٹ جنرلوں کو حکم دیا لیکن انہوں نے بھی استغفوں کی دھمکیاں دے دیں اس بنا کہ دقت میں صرف خالد راٹھا اور وسیم جادو سے تہمت منسوخ کیوں نہ سرحد کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا لیکن وہ بھی اس دقت شدید و باؤ کا شکار ہیں خالد راٹھا کورٹس میں داخل نہیں ہو پاس ہے وہ اب سڑک پر بھی نہیں نکل پاتے مختلف بار کونسلیں ان کی رکنیت منسوخ کر رہی ہیں جبکہ وسیم جادو کے ساتھ ہونے والا سلوک آپ ملاحظہ فرمائیے جس سے یوں محسوس ہوتا ہے اگر یہ مقدمہ سبلا جلا تو حکومت

KashmiriAcademy.com

مجھے اس سارے منظر میں وسیم جادو کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز محسوس ہوتا ہے یہ بنیادی طور پر معاشرے کا احتساب تھا یہ واقعہ ثابت کرتا ہے جب معاشرہ کسی شخص کا احتساب کرتا ہے یا جب عام شخص کی عدالت کسی کے خلاف فیصلہ دیتی ہے تو "مظلوم" کے پاس اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا بالغ معاشرے عدالتوں سے باہر بھی فیصلے کیا کرتے ہیں اور یہ فیصلے معاشروں کا اصل حسن ہوتے ہیں ذرا تصور کیجئے وسیم جادو کے ساتھ جو کچھ کراچی ہائیکورٹ کے باروم میں ہوا یا ان کے ساتھ جس لہجے میں صلاح الدین کٹھاپور نے گفتگو کی اگر یہ لہجہ اور یہ صورت حال وسیم جادو اور خالد راٹھا کے ساتھ پورے ملک میں پیش آنے لگے اور لوگ جہاز میں ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیں انہیں ریستورانوں میں کھانا سرو نہ کیا جائے یہ لوگ سنوروں سے سودا سلف نہ خرید سکیں سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء ان کے بچوں کو روک کر سوال پوچھنا شروع کر دیں لوگ ان کی تقریبات کا باجکات کر دیں منیڈا انہیں باتا چھوڑ دے اور لوگ ان کے ساتھ کھڑا ہونے سے پرہیز کرنے لگیں تو ان کا کیا بنے گا؟ میرا خیال ہے یہ لوگ بھی جلد دوسرے دکھانے کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی

حکومت کا ساتھ دینے سے پہلے ویس ویس مرتبہ سوچیں گے ہم اگر اس صورتحال کو زار سا پھیلنا کر دیکھیں، اگر ہم اس میں مارشل لا لگانے والوں کو بھی شامل کر لیں، اگر ہم حکومتی پارٹیوں میں شامل ہونے والے سیاستدانوں اور وزراء کو بھی اس کنگری میں ڈال دیں اور اگر لوگ ویم جہاد کی طرح ان کا احتساب بھی شروع کر دیں تو شاید پورے ملک کا قبلہ درست ہو جائے اور کوئی طالب آزما اس کے بعد ملک کے مقدر سے کھیلنے کی جرأت نہ کرے تمام شخص کی نظر اور عوام کی نفرت دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک معاشرے اس عدالتی نظام میں داخل نہیں ہوتے اس وقت تک ان میں قی اور ہیبریاٹ قسم کی سوچ جنم لیتی رہتی ہے اس وقت تک وہ ترقی نہیں کرتے چنانچہ میرا خیال ہے جناب ویم جہاد کے ساتھ ہونے والے سلوک کا کیوں ذرا سا وسیع ہونا چاہیے یہ فارمولہ دوسرے سیاستدانوں اور فوجی حکمرانوں پر بھی آزمایا جانا چاہیے جس نے ایک بار برطانیہ کے ایک ریٹائرڈ جنرل سے پوچھا تھا 'کیا فوج برطانیہ میں مارشل لا نہیں لگا سکتی' اس نے فوراً جواب دیا تھا 'ہاں لگا سکتی ہے دنیا کی ہر فوج اپنے ملک میں مارشل لا لگا سکتی ہے' اس نے اس کے بعد پوچھا 'پھر تم لوگ کیوں نہیں لگاتے' اس نے براخوب صورت جواب دیا تھا 'اس کا کہنا تھا' ہم مارشل لا لگا تو لیں گے لیکن ہمارے عوام اسے تسلیم نہیں کریں گے' اس کو انے جرنیل سے مجھے معلوم ہوا تو ہماری رائے دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک یہ رائے نہیں جاگتی اس وقت تک قوموں کا مقدر سویا رہتا ہے' آج پانچ دہائیوں کی رائے نے حکومتی دیکل کو جانے کی بیالی قسم نہیں کرنے دی زار سوچنے جب سولہ کروڑ لوگوں کی رائے جاگ اٹھے گی تو اس وقت ہمارے ان حکمرانوں کا کیا بنے گا جو آئین، قانون دستور اور اخلاقیات پر دستِ فحش پھرا کر کاکٹیل پارٹیاں کر رہے ہیں، جس ملک کو 'سافٹ ٹارگٹ' سمجھ رہے ہیں، میرا خیال ہے ہم بڑی تیزی سے اس بڑی عدالت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔



لیگل پروفیشنلز

دسم جہاد صاحب ملک کے نامور سیاستدان اور قانون دان ہیں وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ڈائریکٹرز جنرلس میں حکومت کے وکیل بھی ہیں۔ میں نے چند دن قبل ایک کالم میں دسم جہاد کا ذکر کیا تھا یہ کالم کراچی بار روم میں دسم جہاد کے ساتھ پیش والے ایک واقعے کے بارے میں تھا دسم جہاد کراچی بار میں چائے پینے گئے تھے لیکن وہاں موجود ایک وکیل گنڈاپور نے انہیں بار روم سے چلے جانے کا "مشورہ" دیا اور دسم جہاد اس مشورے کے احرام میں بار روم سے باہر چلے گئے اس کالم کے رد عمل میں دسم جہاد نے گزشتہ روز مجھے خط لکھا جس میں انہوں نے فرمایا "مجھے چائے پر کراچی بار کے چند دکلاء نے مدعو کیا تھا چائے بھی وہاں پیسنے وکیل ساتھیوں نے منگوائی تھی آپ نے درست لکھا بار روم میں اس وقت دکلاء کی تعداد کم تھی یہ بھی درست ہے ایک وکیل جن کا نام بعد میں گنڈاپور صاحب معلوم ہوا وہ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے کہا تھا آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ آپ وفاقی حکومت کے ریفرنس میں وکیل ہیں یہ درست ہے میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے فوراً چلا گیا تھا لیکن میں نے ان سے کوئی بحث کی تھی اور نہ ہی مجھے وہاں کسی نے گھورا تھا میں نے وہاں ناراض لہجہ بھی اختیار نہیں کیا تھا مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں پروفیشنل سے اس رضا ہوں اور ایک وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں میں یہ کام صرف عدالت میں کروں گا یہ ایک وکیل کا حق ہے لوگ عدلیہ کی

آزادی کو بجا طور پر اہمیت دیتے ہیں لیکن اتنا ہی اہم تصور وکالت کی آزادی بھی ہے یہ جمہوری روایات کا حصہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وکیل جس جانب سے چاہے پیش ہو اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے نوکل کا دفاع کرے اگر دفاع Case کی Popularity کی بنا پر کیا جائے تو پھر وکلاء اپنا فرض ادا نہیں کر سکیں گے۔ وکلاء نے ہمیشہ Rule of Law کیلئے جدوجہد کی ہے لیکن وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر ملک میں Rule of Law کا نفاذ محصور ہوگا۔

میں نے وہیم سجاد کے قانونی اور "وکیلانہ" حق کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا رد عمل آپ کے سامنے پیش کر دیا لیکن جہاں تک ان کے موقف کا تعلق ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں اپنے اعتراضات کی وضاحت آگے چل کر کروں گا۔ ہم سرے دست وہیم سجاد کے خط کی ابتدائی سطروں کی طرف آتے ہیں وہیم صاحب نے تسلیم کیا کہ سجاد صاحب نے ان سے کراچی بار روم سے جانے کا "کہا" تھا اور وہ اس "کہا" کے "احرام" میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے چلے گئے تھے وہیم سجاد نے یہ بھی تسلیم کیا کہ سجاد صاحب نے انہیں چیف جسٹس کیس میں حکومت کی

وکالت پر بار روم سے نکل جانے کی درخواست کی تھی جتنا پھر وہیم سجاد کے ان دعووں

اعتراضات کے بعد صرف "بے عزتی" کے ساتھ اور وزن کا تخمینہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ کراچی بار روم میں وہیم سجاد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بے عزتی تھی لیکن وہیم سجاد سے بے عزتی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کسی بار روم میں کوئی جو نیئر وکیل کسی سینئر وکیل کسی سابق چیئر مین جیٹ اور کسی سابق صدر کو چائے پینے سے روک دے یا حکومت کی وکالت کے جرم میں اسے بار روم سے چلے جانے کا حکم دے دے اور بار روم میں موجود وکلاء اس جو نیئر وکیل کی "بد تمیزی" پر خاموش رہیں اور سینئر وکیل بار روم سے چپ چاپ نکل جائے اور اس بد تمیزی پر بار روم کی انتظامیہ جو نیئر وکیل کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی نہ کرے اور پاکستان بھر کے وکلاء اس جو نیئر وکیل کو اس "بد تمیزی" پر سہارا دینا شروع کریں تو یہ بے عزتی نہیں ہوتی۔ میں نے جب سے وہیم سجاد کا یہ جواز پڑھا ہے مجھے انشورنس ایجنٹوں کا ایک لطیفہ یاد آرہا ہے آج انشورنس ایک باعزت اور قابل تعظیم پیشہ ہے لیکن لوگ ابتدائی دنوں میں انشورنس کے تصور "انشورنس کمپنی اور انشورنس ایجنٹوں کو پسند نہیں کرتے تھے یہ لطیفہ اس دور سے متعلق ہے انشورنس کے ابتدائی دنوں میں کسی جو نیئر انشورنس ایجنٹ نے اپنے سینئر سے شکایت کی "سر ہمارا پیشہ بہت اچھا ہے ہمیں اس پیشے میں ایمارڈ اور پوارا بھی ملتا ہے اور ہم لوگوں کو حاشیہ شانیت بھی فراہم کرتے ہیں لیکن سر اس کے

ہاں جو ہمارے ساتھ لوگوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا لوگ ہماری بے عزتی کرتے رہتے ہیں " سینئر نے جو نیر ایجنٹ کی شکایت سن کر تہہ لبہ لگا دیا اور جو نیر کی طرف دیکھ کر بولا "تو جوان تم لوگوں نے ایک آئینڈ بی اور میں پرو فیشن جوائن کیا جب ہم لوگ اس پٹے میں داخل ہوئے تھے تو لوگ ہم پر کچھ نہ کی تو کرایاں الٹ دیتے تھے وہ ہم نہ کہتے چھوڑ دیتے تھے اور پورا عملہ مل کر انہیں گالیاں دیتا تھا لیکن ہماری بے عزتی کبھی نہیں ہوئی " سینئر کا اور دوبارہ گویا ہوا "تو جوان بے عزتی صرف محسوس کرنے والی چیز ہوتی ہے مگر تم محسوس نہ کرو تو دنیا کا کوئی شخص تمہاری بے عزتی نہیں کر سکتا لہذا جب بھی کوئی شخص تمہاری بے عزتی کرنے لگے تو تم فوراً ہمارے بارے میں سوچو اور محسوس کرنا بند کرو تمہاری بے عزتی نہیں ہوگی " اگر اس سینئر اشور ٹس ایجنٹ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو واقعی اس سارے کھیل میں وہیم جہاں کی بے عزتی نہیں ہوتی تھی وہ چاہئے پینے کیلئے بارہم گئے تھے "مگنڈ اپور صاحب نے انہیں اٹھا دیا وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلے گئے اور دوسری جگہ بیٹھ کر چائے پی لی لہذا اس میں بے عزتی والی کیا بات تھی!۔

وہیم جہاں سے نکلے تھے وہیں اپنے لیگل پرو فیشن پر بھی فخر کا اظہار کیا "میں ان کے اس اعزاز کا مستحق نہیں کرتا، ان کی حیثیت ہے گاؤں دنیا کا باعزت ترین پرو فیشن اور وہ گاؤں محاشروں کے معزز ترین

لوگ ہوتے ہیں یہ لوگ محظوموں کو انصاف لے کر دیتے ہیں اور انہما اور محاشروں کی نظر میں انصاف دینے اور انصاف میں مدد دینے والے لوگ دونوں انتہائی معزز سمجھے جاتے ہیں "میں یہاں تک وہیم جہاں کے اعزاز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن جوں ہی وہ فرماتے ہیں "میں وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں "تو ان سے میرے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں لیگل پرو فیشن ایک نوبل پرو فیشن ہوتا ہے لیکن اس پرو فیشن کو نوبل رکھنا وکیل کی ذمہ داری ہوتی ہے دنیا کا بہترین وکیل جب عدالت میں کھڑا ہو کر شیطان کی وکالت کرے گا یا وہ وقت کے فرعون نمرود یا یزید کا وکالت ناسرے کرے عدالت میں چلا جائے گا تو اس کا پرو فیشن صرف پرو فیشن بن کر رہ جائے گا اس سے "لو بیٹھی" ختم ہو جائے گی لوگ اس وکیل پر تپ کر رہیں گے اس میں کوئی شک نہیں وہیم جہاں تک ایک "نوبل لیگل پرو فیشنل" تھے لیکن آج انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے گا وہ صرف "پروفیشنل" بن چکے ہیں اور ان کے ایک وکالت تھے کی وجہ سے ان کے ساتھی ان سے نفرت کر رہے ہیں ایمان اور ایمان داری کے بغیر پرو فیشن پرو فیشن نہیں رہتے وہ رضائی کا کوٹھا بن جاتے ہیں اور میرے محترم وہیم جہاں کوٹھوں کے دور میں داخل ہو گئے ہیں لیکن ان کا اصرار ہے

ان کی اس ایمان فرہشی کے باوجود ان کی عزت کی جائے انہیں نکریم دی جائے انہیں یہ عزت اب صرف بازار سے مل سکتی ہے معاشرے سے نہیں دسیم جاد نے اپنے رول میں 'وکالت کی آزادی' کا ذکر بھی کیا میں ان کی اس آزادی کا احترام بھی کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں 'کیا معاشروں کیلئے وکالت کی آزادی ضروری ہوتی ہے یا انصاف کی دسیم جاد نے وکالت کی آزادی کو جمہوری روایات کا حصہ بھی قرار دیا میں ان کی یہ بات بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں 'وہ کس جمہوریت اور کون سی روایات کی بات کر رہے ہیں جس ملک میں دسیم جاد جیسے قانون دان یونیفارم کے ساتھ میں پناہ لے لیں اور جس میں دسیم جاد جیسے 'ریگل پروفیشنل' سینٹ کے نکت کیلئے اپنی وفاداریاں اور اپنی سیاسی وابستگیاں بدلی لیں اس ملک میں روایت اور جمہوریت کہاں باقی رہتی ہے۔

دسیم جاد نے فرمایا 'دکاءہ نے ہمیشہ رول آف لاء کیلئے جدوجہد کی اور وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر رول آف لاء کا نفاذ ناممکن ہوگا' میں ان کے اس نکتے سے بھی اتفاق کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ان سے یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں 'اگر دسیم جاد اور خالد راہخاہ رول آف لاء کے لئے ضرور ہے ہیں تو ملک کے باقی ذریعہ ہلاکہ دلیل کس کیلئے ضرور ہے ہیں یہ لوگ کالے کوٹ سین کر ہیر سے دن سڑک پر کیوں آ جاتے ہیں اور یہ لوگ سپریم کورٹ کے سامنے احتجاج کیوں کر رہے ہیں دسیم جاد نے اپنے خط میں جمہوری روایات کا حوالہ دیا تھا میں ان سے عرض کرتا چاہتا ہوں جمہوریت کا پہلا اصول اکثریت ہوتی ہے جمہوریت میں اکثریت ہمیشہ سچی اور اقلیت جھوٹی ہوتی ہے لیکن چیف جسٹس کے معاملے میں حکومت اور دسیم جاد دونوں یہ اصول ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں اس معاملے میں دسیم جاد اور خالد راہخاہ جیسے دو 'ریگل پروفیشنل' خود کو سچا کہتے ہیں جبکہ فخر الدین میاں جی ابراہیم سے ایس ایم ظفر تک باقی ذریعہ ہلاکہ وکیلوں کو غلط اور غیر جمہوری سمجھتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ میں آخر میں مزید دسیم جاد سے پوچھنا چاہتا ہوں معاشروں کو رول آف لاء چاہیے یا رول آف جسٹس اگر معاشروں کو رول آف جسٹس چاہیے تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا اس نکتہ کو آف جسٹس کا چیف اس وقت خود انصاف مانگ رہا ہے اور دسیم جاد اور خالد راہخاہ جیسے 'ریگل پروفیشنل' اس انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔

(نوٹ: اگر جناب دسیم جاد اور خالد راہخاہ چیف جسٹس آف پاکستان کا کیس سپریم

کورٹ کے بجائے اخباری صفحات اور کالموں میں لڑنا چاہیں تو میں حاضر ہوں)

وہ کون ہے؟

کراچی کی ایک شاہراہ پر تین نعشیں بڑی حد تک نعشوں کے قریب ایک گاڑی جل رہی تھی اور ایک شہر کے حلالیوں نے اسے اجاگر کر کے تلاش کیا اور ان نعشوں پر لگی ایک کراچی اور چھاپا "یہ کون لوگ ہیں" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس نے ذرا دیر بعد دوسرا سوال کیا "انہیں کس نے مارا" میں اس سوال پر بھی خاموش رہا اس نے ذرا توقف کے بعد تیسرا سوال کیا "یہ سب کون کر رہا ہے" لیکن میرے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا میں نے فوراً جواب دیا "خوف" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے اس سے عرض کیا "بزرگ کہتے ہیں ہاتھی جب خوفزدہ ہوتا ہے تو وہ جنگل میں اندھا دھند بھاگتا ہے اور وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو کچلتا چلا جاتا ہے" طاقتور لوگ بھی ہاتھی کی طرح ہوتے ہیں یہ لوگ جب خوفزدہ ہوتے ہیں تو یہ بھی راستے کی ہر رکاوٹ گراتے چلے جاتے ہیں" میں نے اس کا اور دوبارہ عرض کیا "یہ طاقتور لوگ خوف کے عالم میں ہمیشہ نعشوں کے پیچھے پناہ لیتے ہیں" وہ بڑی دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا اس نے آخر میں ایک لمبی آہ بھری اخبار اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

یہ بارہ سنی کی آہ تھی 9 مارچ اور 12 سنی کے درمیان واقعات کا ایک سمندر خاکی ہے نہ کھینے والے واقعات کی رفتار اور ترتیب پر جبران ہیں 9 مارچ 2007ء سے پہلے صدر پرویز مشرف حکومت کے پاس بے شمار راستے تھے، حکومت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور سپریم

کورٹ آف پاکستان کے اختیارات کو تسلیم کر لیتی، عدالت کے تمام احکامات پر چپ چاپ عملدرآمد کرتی اور اپنی ٹیک نامی میں اضافہ کرتی رہتی، صدر صاحب دہرے کے مطابق جو بیٹھنا اور اتارنے اور مقبول ترین سولیشن لینڈر کی حیثیت سے دوبارہ منہ صدارت پر فائز ہو جاتے اور حکومت بے نظیر بھٹو کے ساتھ ڈیل کر لیتی، اکتوبر میں الیکشن کرائی اور اگلے پانچ برس کیلئے اقتدار میں آ جاتی لیکن پھر اچانک نو مارچ آیا اور حکومت کیلئے "آپشن" محدود ہوتے چلے گئے، میں نے چند دن پہلے ایک سابق سیکرٹری سے پوچھا تھا صدر صاحب بڑے سکون سے حکومت کر رہے تھے، ایس 9 مارچ کا "کٹا" کھولنے کی کیا ضرورت تھی، سیکرٹری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "یہ عمران صدر صاحب نے پیدا نہیں کیا تھا، یہ آمریت اور اقتدار کی کا پیرا کروہ کر آس تھا" آمریت کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتی وہ ہمیشہ عمران پیدا کرتی ہے، میں نے ان کی بات سنی اور خاموش ہو گیا، نو مارچ کے بعد بھی حکومت کے پاس تین آپشن تھے، حکومت چیف جسٹس کے خلاف دائر ریفرنس واپس لے لیتی جس کے نتیجے میں سارا ایٹو "لیوز" ہو جاتا، حکومت سپریم جوڈیشل کونسل پر نو مارچ کرتی اور اپنی مرضی کے مطابق ججوں کو لے کر لیتی اور تین حکومتیں پڑھنے کا ہتھیار کرتی، اگر سپریم کورٹ چیف جسٹس کو بحال کر دیتی تو حکومت یہ فیصلہ چپ چاپ قبول کر لیتی لیکن ان تینوں آپشنز سے پہلے ایک نئی صورت حال نے جنم لے لیا، چیف جسٹس نے ملک بحر کے دور سے شروع کر دیے اور ان کے اعزاز میں تاریخی جلوس نکھنے گئے، لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر آ گئے، اس صورت حال کے بعد بھی حکومت کے پاس ایک راستہ موجود تھا، حکومت چیف جسٹس کو جلنے، جلوس اور ٹیلیوں کی مکمل اجازت دے دیتی، ملک میں گرمی کی شدید لہر آ چکی تھی، لوگوں کیلئے دو بیٹھے بعد باہر نکلنا مشکل ہو جانا تھا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے جو دھری شجاعت حسین نے حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا، صدر صاحب اس پر رضامند بھی تھے لیکن اس میں ایک خطرہ تھا، اپوزیشن پارٹیاں تجزی سے چیف جسٹس کے سامنے میں پناہ لے رہی تھیں اور حکومت کے بعض اہم ججوں کا خیال تھا، یہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے لال کر سیلاب کی شکل اختیار کر لیں گے اور یہ سیلاب آنے والے دنوں میں ساری حکومت کو بہا لے جائے گا، چنانچہ حکومت نے سیلاب لے سامنے بند بانہ مٹنے کا فیصلہ کر لیا، ایک طرف یہ سارے آپشن چل رہے تھے اور دوسری طرف حکومت، ججوں پر بھی "ورک" کر رہی تھی، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی نے دو بیٹھے قبل سپریم کورٹ کے سیکرٹری جج اور قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس سے ملاقات کی، کوشش کی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا، حکومت

نے نواب سرفراز نام کے ایک شخص کے ذریعے بھی تجوں سے رابطوں کی کوشش کی رانا صاحب کے ایک استاد انڈیکانٹ سے اسلام آباد شریف لائے اور انہوں نے بھی وہ بے ربطے لفظوں میں "ملاقات" کی سفارش کی لیکن رانا صاحب نے ملاقات گفتگو اور رابطے سے صاف انکار کر دیا جو زمین جیٹ محمد میاں سومرو نے بھی کراچی میں قائم مقام چیف جسٹس سے ملاقات کی کوشش کی لیکن انہیں بھی شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا سومرو صاحب بعد ازاں پیریم کورٹ کے ایک سینئر جج سے ملنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جج صاحب نے انہیں مشورہ دیا حکومت کیلئے ایک ہی آبدوندا ندرات بچا ہے وہ ریفرنس واپس لے لئے سومرو صاحب نے اوپر رابطے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گئے لیکن تاحال ان کا اوپر رابطہ نہ ہو سکا سومرو صاحب نے چند روز پہلے لاہور ایئر پورٹ پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے بھی ملاقات کی تھی یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی اور اس ملاقات میں بھی انہوں نے چیف جسٹس کو سمجھانے بھانے کی کوشش کی تھی لیکن چیف جسٹس نے "مجھے سمجھنے سے انکار کر دیا تھا مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کو اس بحران سے نکالنے کیلئے تین شخصیات کام کر رہی ہیں ان میں محمد میاں سومرو شریف الدین پیر زکوٰۃ اعلیٰ جی آئی ایس آئی شامل ہیں۔"

اب آتے ہیں 12 مئی کے بحران کی طرف یہ بحران حکومت کے ایک "جاوڈر" نے پیدا کیا تھا اس جاوڈر کا کہنا تھا پاکستان کی عدالتیں سڑکوں کی صورت حال کو سامنے رکھ کر فیصلے دیتی ہیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی زندگی کے تیس برس عدالتوں میں گزرے ہیں وہ عدالتوں کی اس نفسیات سے واقف ہیں چنانچہ وہ جان بوجھ کر دور سے کہہ رہے ہیں ڈھسڑوں پر لوگوں کو انکار رہے ہیں اور ان کی اس حکمت عملی کا اثر عدالتوں پر ظاہر ہو رہا ہے اس جاوڈر کا کہنا تھا عدالت نے چیف جسٹس کی مقبولیت دیکھ لی ہے لہذا وہ اب کوئی ایسا فیصلہ نہیں دے گی جس سے عوام میں ہلکا کا ایچ خراب ہو اور اگر فرض کریں عدالت چیف جسٹس کے خلاف فیصلہ دے بھی دے تو بھی لوگ اسے قبول نہیں کریں گے چنانچہ اب حکومت کو بھی اپنا مقدمہ سڑکوں پر لڑنا چاہیے اسے بھی چیف جسٹس اور اپوزیشن کی طرح اپنی سڑھٹ پاور کا مظاہرہ کرنا چاہیے اسے بھی ریلیاں نکالنی چاہئیں حکومت نے جاوڈر کا مشورہ مان لیا چنانچہ پہلے مئی کے شروع میں اسلام آباد میں حکمران پارٹی نے ریلی نکالی اور اس کے بعد 12 مئی کو کراچی کی حکمران جماعت ایم کیو ایم کو وہیں عوامی طاقت کے مہر پور "مظاہرے" کا موقع دے دیا گیا حکومت کی اس مکمل جھوٹی کے بعد جو جی جی چیف جسٹس نے کراچی ایئر پورٹ پر قدم رکھا کہ وہ 12 مئی 2010 کو گئے اور 13 مئی 2010 کو واپس آئے۔

نے اسلام آباد میں عوام کے خاصٹیس مارنے سمندر سے خطاب کیا اور کراچی کے واقعات کو "عوامی طاقت" قرار دیا، ابھی کراچی کے قتل عام کے وجہ نہیں دھلے تھے کہ 14 مئی کو سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کو قتل کر دیا گیا، سید حماد رضا ڈی ایم جی افسر تھے اور انہیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ذچونیشن پر سپریم کورٹ لائے تھے، ڈو چیف جسٹس کے سٹاف افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے اور ان کے بہت قریب کھجے جاتے تھے، سید حماد رضا کے قتل نے ایک بار پھر سارے نظام کو ہلا کر رکھ دیا، 14 مئی کی سہ پہر جب سپریم کورٹ کے سینئر جج تعزیت کیلئے حماد رضا کے گھر پہنچے تو مرحوم کی بیوہ شہانہ حاد نے اسے "نارنگ کنگ" قرار دیا، ان کا کہنا تھا خفیہ اداروں کے اہلکار ان کے خاندان کو پھیلے کئی دنوں سے "ڈی بریننگ" کیلئے بلارہے تھے، ڈی بریننگ کے ان سیشن کے دوران حماد رضا سے چیف جسٹس اور ان کی فیملی کے بارے میں پوچھا جاتا تھا، حماد رضا کو وعدہ معاف گواہ بننے کی پیش کش بھی کی گئی تھی لیکن حماد رضا نے انکار کر دیا، جس پر اسے قتل کر دیا گیا، حماد رضا کی بیوہ کا کہنا تھا یہ قتل بنیادی طور پر بچوں کیلئے وارننگ ہے، اگر ہم 9 مارچ کے

بعد سیدیا کی صورت حال دیکھیں تو یہ بھی سید حماد رضا سے ملتی جلتی ہے، اناروہ اور مین اور مقبول ہو گئی

ویرن چینلو پر حملے ہو چکے ہیں، 12 مئی کو "آج" کیلئے ویرن پر ہونے والا حملہ انتہائی مسوناک تھا، اس حملے کے دوران "آج" کے کارکن جس کرب سے گزرے اور انہوں نے جس صورت حال میں اپنی پروٹیشنل ذمہ داریاں پوری کیں اس نے بھی عالمی سطح پر حکومت کا سچا ٹھیک خاک خراب کیا۔

ہم اگر موجودہ صورت حال کا تجزیہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کوئی طاقت میڈیا، بچوں اور عوام خبیون کو ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے، کوئی ہے جو خوف کے عالم میں پورے معاشرے کو خوفزدہ کر رہا ہے، وہ کون ہے، امیر اخیال ہے، اس کا نام صدر پرویز مشرف ہے!



ہم لوگوں نے تو

وہ شخص تھی: وہ پھر میں سزا کے پر پوانہ دار بنا چکا تھا۔ کسرو کی اس کے چہرے پر آنکھ لگا رہی تھی اس کے حرکت کرنے ہاتھوں کو سسروا مہرنگ تھا اور کبھی اس کے گلے پاؤں کو تو نہیں کر لیتا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور سزا کے دوزخ کی طرح تپ رہی تھی لیکن وہ شخص سرستی کے عالم میں ناچتا چلا جا رہا تھا، غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا قافلہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اصول والے ذمہ دار ہیں رہے تھے اور اڈا ڈبیکر سے نسرے بلند ہو رہے تھے کسرو میں ایک لمبے کیلئے جھوم کی طرف گھومنا تو سادہ نظر کا زیاں ہی کا زیاں اور لوگ ہی لوگ تھے افتخار محمد چوہدری کبھی کبھی ہاتھ گاڑی سے باہر نکال کر لہراتے تھے اور لوگ ان کا ہاتھ دیکھ کر دیوانہ وار نعرے لگاتے تھے۔

میرے دوست نے ٹیلی ویژن کی آواز بند کی اور میری طرف مڑ کر بولا "کیا واقعی چیف جسٹس اتنے پاپولر ہیں" میں نے فوراً ٹی میں سر جلا دیا اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ٹیلی ویژن مکرین پر نظر ڈال کر بولا "پھر یہ کیا ہے!" میں نے جواب دیا "یہ حکومت کی غیر مقبولیت ہے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھا رہا میں نے عرض کیا "9 مارچ تک افتخار محمد چوہدری ایک غیر متبادل چیف جسٹس تھے وہ دکھانے اور سزا دیکھنے اور سزا دیکھنے میں زیادہ پسند نہیں کئے جاتے تھے وہ بھری عدالت میں سینئر وکلاء کو ڈانٹ دیتے تھے وہ وکلاء کی درخواست پر کیس بھی

ملتی نہیں کرتے تھے وہ بیوروکریسی کے ساتھ بھی بہت سخت تھے وہ ایس ایچ اے سے آئی جی اور ڈی سی اے سے چیف سیکرٹری تک سب کو "ٹھف ٹائم" دیتے تھے وہ ساتھی جنوں میں پاپولر نہیں تھے انہوں نے چیف جسٹس بننے کے بعد برسوں سے زیر التوا مقدمے ختم کر دیئے تھے وہ خود بھی راست گئے تک دفتر بیٹھے تھے اور ساتھی جنوں کو بھی بھٹائے رکھتے تھے ان کے ساتھیوں کو پانچ پانچ بجے تک چائے نہ پھینکے جیسی ہوتی تھی کام کی کثرت کے باعث چارج دل کے مریض بن گئے جبکہ زیادہ تر ہائی بلڈ پریشر اور سینشن کا شکار ہو گئے چودھری صاحب کی ذات سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا تو وہ صرف عام لوگ تھے چیف جسٹس اخبار پڑھ کر سو نو ایکشن لے لیتے تھے جس کے نتیجے میں ان مظلوموں کو ریلیف مل جاتا تھا جن کی دیکل اور عدالت تک رسائی نہیں ہوتی تھی لہذا اگر جج بولا جائے تو وہ دکھلا، بیوروکریسی اور ساتھی جنوں میں غیر مقبول اور چند ہزار عام شہریوں میں مقبول تھے "میرے دست نے بے چینی سے پہلو ہلا اور ٹیلی ویژن سکرین کی طرف دیکھ کر بولا" لیکن پھر یہ جہوم "میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا" یہ جہوم حکومت کے خلاف ریفرغزم ہے عوام

کیاری طرز پر حکومت سے ٹک تھے؟ میر نے کہا کہ وہ جہوموں کو چاہیے کہ وہ اپنے جی بھلا کر تو

بھی عوام اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کرتے "میرے دست نے بڑی بے مبری سے پوچھا"

لیکن کیوں "میں نے عرض کیا" اس کی دو بڑی وجوہات ہوتی ہیں اول آمر کو اقتدار میں رہنے کیلئے

بے شمار سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر سمجھوتہ عوام کی رگوں سے نکلتا ہے اور دوم آمر

ہمیشہ طاقت کا بیجانہ استعمال کرتا ہے اور عوام یہ دونوں چیزیں برداشت نہیں کرتے چنانچہ ان کے

دلوں میں آمر کے خلاف نفرت جنم لینے لگتی ہے ہماری حکومت اور ہمارے جنرل صاحب کے ساتھ

بھی یہی ہو رہا تھا جنرل پرویز مشرف کو اقتدار میں رہنے کیلئے دہر کی ایجنڈے سے سمجھوتہ کرنا پڑا

تھا انہیں افغانستان میں امریکی آپریشن کی حمایت کرنا پڑی وہ طالبان اور مجاہدین کی گرفتاریوں پر

بھی مجبور ہوئے انہوں نے جنوبی وزیرستان اور قبائلی علاقوں میں بھی فوجی آپریشن کئے انہیں

بلوچستان میں فوج کشی بھی کرنا پڑی اور دو مشرقی روایات میں گندھے معاشرے کو روشن اور

اعتدال پسند بنانے پر بھی مجبور ہو گئے یہ سارے سمجھوتے عوام کو پسند نہ آئے ہمارے صدر سات

برسوں میں عوام کیلئے بھی کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے تھے ان سات برسوں میں

پٹرول کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا آنا والیں تھی چینی اور چاولوں کے نرخ دو گنا ہو گئے

ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں ستر گنا اضافہ ہوا بجلی، گیس اور پانی کے بل گھیس سے گھیس پہنچ گئے تعلیم

صحت اور روزگار عام شہری کی زندگی سے دور ہو گیا اور بے روزگاری اپنی انتہائی سطح کو چھونے لگی۔ اس کے علاوہ ملک میں امن و امان اور سیکورٹی کے مسائل بھی پیدا ہو گئے لوگ دن و رات سے تنے گئے پولیس چوروں اور ڈاکوؤں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گئی ڈاکوؤں اور چوروں کی وجہ سے ہر دوکاندار اور ہر صاحب حیثیت شخص گھر پر سیکورٹی گارڈ رکھنے پر مجبور ہو گیا مولر دے تک پر گزریاں لئے تھیں اور سوبائٹ چھیننے کی وارداتیں معمول بن گئیں عام شہری اس سے بھی بری طرح متاثر ہوا۔ جنرل صاحب احتساب کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئے تھے نیپ نے شروع میں غیر جانبداری دکھانی ماضی کے تمام کرپٹ سیاستدان گرفتار کر لئے گئے لیکن پھر ان تمام کرپٹ سیاستدانوں کو جمع کر کے حکومتی پارٹی بنائی گئی اور اس پارٹی نے بعد ازاں جنرل صاحب کو نیا نظام اور صدارت کا تختہ دیا اس سارے کھیل کے دوران احتساب کا عمل غیر جانبداری کھو بیٹھا اور لوگ قومی احتساب بیورو کو سرعام ایکشن کمیشن کہنے لگے اس کے بعد ہی سکی کسر گھروں سے غائب ہونے والے لوگوں نے پوری کر دی یہ لوگ اپنے خاندانوں عزیزوں رشتے داروں غلوں اور شہروں میں

www.PAKSOCIETY.COM

حکومت پر لوگوں کا خون کھول اٹھا ان حالات میں لوگوں کو حکومت کے خلاف کھڑا ہونے کیلئے کوئی بہانہ چاہیے تھا یہ لوگ کسی بڑے واقعے کے منتظر تھے اور 9 مارچ 2007ء کو انہیں وہ بہانہ بھی مل گیا اور افتخار محمد چوہدری کی قتل میں لیڈر بھی مہذب آج لوگ 50 سینٹی گریڈ کی گرمی میں سڑکوں پر کھڑے ہیں "میں خاموش ہو گیا۔"

میر سے دوست نے پوچھا "کیا تم افتخار محمد چوہدری کو لیڈر سمجھتے ہو" میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا میرا دوست غور سے میری طرف دیکھنے لگا "میں نے عرض کیا " پاکستان میں اس وقت تین بڑے لیڈر ہیں "مختار مدظلہ نظر بھٹو نواز شریف اور الطاف حسین لیکن بدقسمتی سے یہ تینوں لیڈر ملک سے باہر ہیں ان میں سے الطاف حسین حکومت کے اتحادی ہیں "بے نظیر بھٹو ایک مکی پکی ڈیل میں بندھی ہوئی ہیں جبکہ میاں نواز شریف کسی اچھے وقت کے انتظار میں لندن میں بیٹھے ہیں میرا دعویٰ ہے اگر یہ لوگ 2005ء کے بعد ملک میں ہوتے تو اس وقت حالات ان کے ہاتھ میں ہوتے لیکن یہ لوگ ملک میں آنے کی جرأت نہ کر سکے اور جرأت لیڈروں کا پہلا نصف ہوتی ہے "عوام بھاگنے پاپشت دکھانے والے لوگوں کو پسند نہیں کیا کرتے ان حالات میں افتخار محمد چوہدری سامنے آئے اور لوگ ان کے گرد جمع ہوتے چلے گئے تم بتاؤ لوگوں کو چوہدری صاحب کی

کس خوبی نے متاثر کیا" وہ خاموش رہا میں نے عرض کیا "وہ مارچ کو حکومت کے سامنے ہسپا نہیں ہوئے تھے وہ حکومت کے سامنے اٹ گئے تھے چنانچہ لوگوں نے انہیں کندھے پر اٹھایا میں اس فقید المثال استقبال کے باوجود یہ سمجھتا ہوں وہ لیڈر ہیں اور مذہبی وہ زیادہ دیر تک اس صورتحال کو سنبھال سکیں گے یہ صورتحال اپنے نئے گارڈ ٹاور پیدا کرے گی اور یہ گارڈ ٹاور آگے چل کر فائدے اٹھائیں گے" میں خاموش ہو گیا میرے دوست نے آخری سوال پوچھا "کیا حکومت سمجھوتے پر مجبور ہو جائے گی" میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا میں نے عرض کیا "چیف جسٹس سپریم کورٹ سے مجال ہو جائیں گے لیکن حکومت اس فیصلے کو قبول نہیں کرے گی حکومت کے ماہرین دن رات آئین سے ایسی دفعات تلاش کر رہے ہیں جن کے ذریعے سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد چیف جسٹس کو دوبارہ غیر فعال کیا جاسکے" حکومت صدر صاحب کو پارلیمنٹ سے بھی نئے اختیارات لے کر دینے کی پلاننگ کر رہی ہے چنانچہ جب تک حکومت قائم ہے چیف جسٹس واپس سپریم کورٹ نہیں جاسکیں گے" میں خاموش ہو گیا میرا دوست اٹھا اور زاماد پر سوچ کر بولا "

اگر حکومت ریفرنس واپس لے لے تو یہ بنا راجن پندرہ سو تین ختم ہو سکتا ہے" میں نے دشاتے میں سر ہلایا اور مسکرا کر جواب دیا "ہاں لیکن حکومت ریفرنس واپس نہیں لے گی" میرے دوست نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "آمریت پوری دنیا کے سامنے جھک سکتی ہے لیکن وہ اپنے لوگوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی تم پولینوٹا پارٹ سے سیسولٹی تک دنیا کے تمام آدمیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو یہ لوگ دشمنوں کے قدموں میں جھک گئے تھے لیکن انہوں نے اپنے لوگوں کے خلاف دائر ریفرنس واپس نہیں لئے" صدر پر دیر شرف بھی اس صورتحال سے نکلنے کیلئے امریکہ سے سمجھوتہ کر لیں گے لیکن وہ انتہا رحمہ چودھری کے ساتھ ہاتھ نہیں ملائیں گے ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے تو آدھا ملک بھارت کو دے دیا تھا لیکن بنگالیوں کو اقتدار نہیں دیا تھا ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے B کروڑ بنگالیوں کی بات نہیں مانی تھی ہم ایک چیف جسٹس کی بات کیسے مانیں گے"



ججوں کی ذمہ داری باقی ہے

مجھے ایک بار میری کورٹ کے موجودہ جسٹس ظلیل الرحمن مدد سے کے ساتھ سز کرنے کا مقالہ لکھا تھا یہ 1999ء کا سال تھا عطا، اسی کا کسی صاحب اس وقت تاروے میں پاکستان کے سفیر تھے اور جسٹس ظلیل الرحمن مدد سے اور میں ان کے مہمان تھے 'بزرگ کہتے ہیں اگر کسی شخص کو سمجھنا ہو تو اس کے ساتھ سز کریں' اس کے ساتھ کہا: کھائیں اور اس کے ساتھ معاملہ کریں' میں نے اس سال مدد سے صاحب کے ساتھ سز بھی کیا قیام بھی کیا اور کھانا بھی کھایا اس میں معاملہ نہیں کر سکا جس کا مجھے ابھی تک افسوس ہے جسٹس صاحب اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے اور میری ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی اس ملاقات میں جسٹس صاحب کی شخصیت کے بے شمار رنگ میرے سامنے آئے ان رنگوں میں ان کی کیونکہ میں باور میں مزاج اور دانشوری بھی شامل تھی میں نے ان ملاقاتوں میں جج کے پردے میں ایک شاندار شخص دریافت کیا اس ملاقات کی بے شمار یادیں آج تک میرے ذہن میں تازہ ہیں مجھے آج بھی یاد ہے جسٹس مدد سے نے اسٹو میں عطا، یعنی قاسمی کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھ کر فرمایا تھا "انصاف صرف ججوں کی ذمہ داری نہیں معاشرے کا ہر شخص جج یا منصف ہوتا ہے اس پر بھی انصاف کی اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے جتنی ججوں پر اللہ تعالیٰ نے لہاں جمید میں داس الفاظ میں تحریر کیا "تم لوگ انصاف قائم کرو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا صرف جج انصاف قائم کریں چنانچہ انصاف ہر سے معاشرے کی ذمہ داری ہوتا

ہے

جلس مد سے نے احساس ذمہ داری پر بھی بڑی خوبصورت مثال دی تھی انہوں نے فرمایا تھا "اگر انسان کے پاس سائیکل ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کی ہوا چیک کرتا ہے اگر اس کے پاس موٹر سائیکل ہو تو وہ اس کا پٹرول انجن آئل اور بیڑی کا پانی چیک کرے گا اگر وہ گاڑی کا مالک ہے تو وہ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ریڈی ایٹر کا پانی اور چاروں پہیوں کی ہوا دیکھ لے گا وہ سینے میں ایک بار گاڑی کا چیک اپ بھی کر لے گا لیکن جب ہوائی جہاز کسی ایئر پورٹ پر اترتا ہے تو اس کا ایک ایک قبضہ ایک ایک نٹ ایک ایک بولٹ اور ایک ایک پرزہ چیک کیا جاتا ہے اور جب تک ایئر پورٹ کا انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ مطمئن نہیں ہو جاتا اس وقت تک جہاز کو اڑنے کی اجازت نہیں دی جاتی" جلس ظلیل مد سے کا فرمایا تھا "سائیکل اور جہاز کے بارے میں روینے کا یہ فرق ذمہ داری کی وجہ سے ہے ہم جانتے ہیں اگر سائیکل یا موٹر سائیکل خراب ہو گا تو اس سے صرف ایک شخص کو کوئی ہوگی اسی طرح اگر گاڑی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جائے تو اس سے چند لوگوں کی جان جائے گی لیکن جہاز میں سینکڑوں لوگ سوار ہوتے ہیں چنانچہ جب جہاز حادثے کا شکار ہوتا ہے تو نہ صرف اس میں سوار لوگ جان سے جاتے ہیں بلکہ زمین پر موجود لوگوں اور جانوروں کیلئے بھی خطرہ بن جاتا ہے لہذا جہاز کی سائیکل، موٹر سائیکل، گاڑی اور بس سے زیادہ پڑتال کی جاتی ہے" جلس صاحب کا فرمایا تھا "انسان سامی لحاظ سے جوں جوں ترقی کرتا ہے اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ بلند مرتبہ لوگوں کو جہاز کی طرح اپنے کل قبضوں اور نٹ اینڈ بولٹس کا خیال رکھنا چاہیے" اس دور میں مل کنٹین امریکہ کے صدر تھے جلس مد سے نے مل کنٹین کی مثال دیتے ہوئے فرمایا تھا "فرض کریں اگر آپ اور میں پاگل ہو جائیں تو ہمارے پاگل پن کا نقصان صرف چند لوگوں کو پہنچے گا لیکن اگر مل کنٹین پاگل ہو جائے تو وہ آدمی دنیا کو تباہ کر دے گا چنانچہ مل کنٹین کو ہر فیصلے سے پہلے چچا اس مرتبہ سوچنا چاہیے اسے اپنی محبت یا نفرت کے اظہار سے پہلے ہاتھ اٹھانے، ہلانے اور گرانے سے پہلے دس دس مرتبہ سوچنا چاہیے کیونکہ اس کی ایک جنبش ایک حرکت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں لوگوں کی زندگیاں وابستہ ہیں" جلس صاحب نے امریکہ کے صدر روز ویلٹ کی مثال بھی دی تھی ان کا فرمایا تھا "روز ویلٹ نے 1945ء میں جاپان پر ایٹم بم ترانے کا حکم دے دیا تھا، ذرا سوچئے ان کے ایک حکم سے تیس لاکھوں لوگوں کی زندگیاں چلی گئیں آپ تصور کیجئے اس شخص کے پاس اتنا خونخوار اختیار تھا، ان کے اس اختیار

کے ایک غلط استعمال کا کیا نتیجہ نکلا؟

جنس خلیل الرحمن رمدے کے ساتھ وہ سفر وہ ملاقاتیں اور یہ ساری باتیں ماضی کا قصہ بن گئیں لیکن آج 24 مئی 2007ء کو جب میں نے اخبارات اٹھائے اور اخبارات میں جنس خلیل الرحمن رمدے کے بیانات پڑھے تو مجھے 1999ء کی وہ گرمیاں، اوسلو کی وہ شامیں اور جنس صاحب کے ساتھ ہونے والی وہ ساری گفتگو یاد آگئی، جنس خلیل الرحمن رمدے اس وقت چیف جنس افتخار محمد چودری کے خلاف صدر پرویز مشرف کے دائرہ کردہ ریفرنس کی سماعت فرما رہے ہیں اس سماعت کیلئے قائم مقام چیف جنس رانا بھنگوان واس نے 13 ججوں کا بیٹھایا تھا اور جنس خلیل الرحمن رمدے اس بیٹھ کے سربراہ ہیں، 23 مئی کو بیٹھ کے سامنے ریفرنس کی سماعت تھی اس سماعت کے دوران جنس خلیل الرحمن رمدے نے بڑے دلچسپ ریماڈرکس دیئے تھے انہوں نے فرمایا تھا "اگر ججوں کو اس طریقے سے نکالا جاتا رہا اور اس کا کوئی مداوانہ ہوتا تو پھر والدین اپنے بچوں کو بیٹھ بننے کی نصیحت کریں گے" جنس صاحب کے ریماڈرکس 24 مئی کے اخبارات میں

شہر شیوں کے ساتھ شائع ہوئے اور مجھے اوسلو کی وہ ساری شامیں یاد آ کر اگلے اور میں نے فوری طور پر اپنے دلچسپ سے جواب کیا، اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ ڈسٹار مجید بھٹو کوں ہے اور میرٹ ڈاکٹن میں بے شمار لوگ آئے لیکن پھر بری نظر 13 ججوں کے اس بیٹھ پر آ کر رک گئی اور مجھے محسوس ہوا اس وقت پاکستان پاکستان کی عدلیہ اور پاکستان کے مستقبل کی ذمہ داری ان 13 ججوں پر استوار ہوتی ہے، آنے والے کل میں لوگ اپنے بچوں کو بیٹھ بنانا چاہیں گے یا نہیں اس کا فیصلہ بھی اس وقت ان 13 ججوں کے ہاتھ میں ہے، کل پاکستان کے لوگ عدلیہ کے بارے میں کیا سوچیں گے، پاکستان میں جمہوریت کی کیا حالت ہوگی، پاکستان کے عوام کے پاس کیا حقوق ہوں گے اور دنیا آنے والے دنوں میں پاکستان کے بارے میں کیا سوچے گی اس کا فیصلہ بھی اب 13 ججوں نے کرنا ہے، مجھے محسوس ہوتا ہے جنس خلیل الرحمن رمدے اور ان کی ٹیم اس وقت ذمہ داری کی ہار ایک بار پر چل رہی ہے، ان لوگوں کی ذرا سی بے احتیاطی اس ملک کی رہی تھی ساکھ بھی ٹیم کر دے گی اور ان لوگوں کا ایک فیصلہ اس ملک کے ان تمام لوگوں کو زبان و دے گا جن کے منہ پر 60 برس سے خوف کے تالے لگے ہیں۔

مجھے یقین ہے 13 ججوں کا یہ پینل درست فیصلہ کرے گا لیکن اس کے باوجود میں جنس رمدے کو اوسلو کی وہ شامیں یاد کرنا چاہتا ہوں اور ان سے تقاضا کرتا چاہتا ہوں 21 مئی

کو چھپو ملنی کے دو دیکھوں نے اپنے نام سے پرویز ہنا کر انٹارنگا دیا تھا آپ کے فیصلے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو یہ لوگ ایک بار پھر اپنا نام تبدیل کر دیں کہیں ایسا نہ ہو لوگ سپریم کورٹ کی طرف ہنگامی اٹھا کر کہیں یہ وہ کورٹ ہے جو اپنے چیف کو انصاف نہ دے سکی کہیں ایسا نہ ہو لوگوں کا انصاف سے اعتماد اٹھ جائے اور وہ عدالت کی بجائے گلیوں، ظلوں اور بازاروں میں اپنا فیصلہ کرنے لگیں میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں آج سے تیس برس پہلے کولمبیا میں باغیوں نے سپریم کورٹ پر قبضہ کر لیا تھا ان لوگوں نے جج اور 100 وکیل قتل کر دیئے تھے لیکن ججوں نے ہمت نہ ہاری 1990ء میں کولمبیا کی سپریم کورٹ نے مانیا کے خلاف مقدمہ منشا شروع کیا تھا تو مانیا نے جوشی پر عدالت میں بم دھماکہ کرتا تھا اور اس دھماکہ میں جج مارا جاتا تھا اس کیس کی سماعت کے دوران 99 جج مارے گئے لیکن اس کے باوجود سماعت جاری رہی اور عدالت نے مانیا اور ڈی پبلو اسکو ہار کو مجرم قرار دیا یہ فیصلہ عدل کی تاریخ میں کولمبیا کو ہمیشہ کیلئے سرخرو کر گیا پاکستان کولمبیا نہیں اور نہ ہی پاکستان میں کولمبیا جیسے حالات ہیں لیکن اس کے باوجود عوام عدالت اور ججوں سے اسی استقامت کی توقع رکھتے ہیں تو سب وکیل اور صحابہ شہداء شہداء محمد پر ہدائی کیلئے اپہ آ کر اسی ذمہ داری پوری کر چکا ہے اب ججوں کی ذمہ داری باقی ہے بلکہ ان لوگوں کو استقامت اور انصاف کا مظاہرہ کرنا چاہیے خواہ ہماری عدالت کولمبیا کی عدالت ہی کیوں نہ بن جائے۔



جس طرح

میں دہائی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا تو مجھے محسوس ہوا میں جدید دنیا میں آ گیا ہوں اور ہر وقت سے گزریے حیات میں ایک نئی روشنی اور نئی امیدیں اور نئی آہیں اور نئی آوازیں ہیں۔ اس تھا گاڑیوں کی طویل قطاریں اور عمارتوں پر چلتی بجھتی روشنیاں خوشحالی اور ترقی کی نوید سناری تھیں ہماری گاڑی دہائی کی مرکزی شاہراہ اجمل علی سے گزر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کیا آج اس شاہراہ پر کفر سے ہو کر کوئی سوچ سکتا ہے 1980ء تک اس جگہ ریت کے نیلے اونٹوں کے ریوز اور خشک جھانڑیاں ہوتی تھیں یہاں خاک اڑتی تھی اور غربت اور بے بسی کا شت ہوتی تھی لیکن پھر اس ملک اس شہر کو ایک ڈڈنری شخص ملا اور اس ڈڈنری شخص نے ریت کے ان ٹیلوں کا مقدر بدل دیا اس نے دیرانے کو دنیا کے جدید ترین شہر میں تبدیل کر دیا اس ڈڈنری شخص کا نام شیخ محمد ابن راشد الختوم تھا۔

شیخ محمد 1949ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ دہائی کے سلطان شیخ راشد الختوم کے تیسرے صاحبزادے تھے ان کی ابتدائی زندگی عربی ٹینوں کی روایتی ثقافت کے مطابق گزری وہ بچپن میں اپنے بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ کھیلنے کودتے رہے تھے اونٹوں پر چینے کر رہیں لگاتے تھے یا پھر صحرا میں برن کے پیچھے بھاجتے تھے 4 سال کی عمر میں انہوں نے گھر پر عربی اور اسلام کی تعلیم شروع کی 1955ء میں ان کی باپانہ تعلیم شروع ہوئی انہیں دہائی کے احمدیہ سکول میں

داخل کروا دیا گیا، انہوں نے اس سکول میں عربی، انگریزی، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، اسی سال کی عمر میں وہ ایشیاء سکول میں داخل ہو گئے، وہ دو سال تک اس سکول میں پڑھتے رہے، اس کے بعد انہیں دودھی کے سیکنڈری سکول میں داخل کروا دیا گیا، شیخ محمد کے والد شیخ راشد انھیں نوٹس دیا، انہیں بتانا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی شیخ محمد عسکری تعلیم حاصل کریں، جس کے بعد انہیں لندن یا امریکہ کی کسی ملٹری اکیڈمی میں داخل کروا دیا جائے اور وہاں سے واپس آ کر وہ دودھی کی فوج کی کمان سنبھال لیں، شیخ کی اس خواہش کا پس منظر بہت دلچسپ تھا، شیخ کا خاندان کئی نسلوں سے تجارت سے وابستہ تھا، تجارت وراثت کی شکل میں ان کے خاندان میں منتقل ہوتی جا رہی تھی، ان کے تین بیٹے تجارت سے منسلک تھے، تہذیب ان کی خواہش تھی ان کا ایک بیٹا سپہ سالار بنے، لیکن شیخ محمد کا رجحان ذرا مختلف تھا، او آرتس، زبان اور فنون لطیفہ میں دلچسپی لیتے تھے، جب شیخ نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو شیخ محمد نے انگریزی زبان میں داخلہ لینے کا اعلان کر دیا، شیخ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ ہٹ کے کہے تھے لہذا مجبوراً شیخ راشد کو ان

کی بات ماننا پڑی، انہوں نے شیخ محمد اپنے کزن شیخ محمد بن جلیفہ انھیں کے ساتھ برطانیہ بھیجے، وہاں

انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے مل کاؤنسل انگریزی زبان میں داخلہ لے لیا، جس دن انہوں نے کیمبرج میں قدم رکھا تھا اس دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا، یہ واقعہ اس کے چل کر دودھی جیسے جدید اور خوبصورت شہر کی بنیاد بنا۔ یہ شیخ محمد کا کلاس میں پہلا دن تھا، سب طالب علم ایک دوسرے کو اپنا تعارف کر رہے تھے، جب شیخ محمد نے اپنا تعارف کرایا تو جنوبی امریکہ کے کسی طالب علم نے ان سے پوچھا، "آپ انگریزی سیکھ کر کیا کریں گے؟" وہاں کلاس میں چین کا ایک طالب علم بھی تھا، اس نے شیخ پر چمکتی کسی "یادداشتوں کو انگریزی سکھائیں گے" کلاس روم میں ایک تہ قہہ گونجا، اس تہ قہہ اور چینی طالب علم کی چمکتی نے شیخ کو سوچنے پر مجبور کر دیا، شیخ نے سوچا دنیا عربوں کو بدو سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی، اس وقت اس کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کیا، دودھی کو ایک ایسی ریاست بنائیں گے، جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ہوگی، لوگ اس کا حوالہ دیا کریں گے، شیخ محمد کا یہ عزم آگے چل کر آج کے دودھی کی بنیاد بنا۔

شاہ محمد رضا عرصہ یورپ رہے، وہ وہاں لے نظام کا معائنہ کرنے رہے، وہ دودھی کے دن یورپ کے دوسرے ممالک اور شہروں میں نکل جاتے اور وہاں جا کر ان کے طرز تعمیر ان کے حکومتی اور سرکاری نظام ان کی تجارت، ان کے ٹیکوں ان کے ویٹیز، سسٹم اور ان کی طرز گفتگو کا مطالعہ

کرتے اور یورپ کی جیسوسیوں ہوں اور یوں میں بیٹھ کر ان کا نظام دیکھتے وہ ان کے اسٹریٹجس اور گورنوں کا سسٹم دیکھتے وہ ان کے سیکورج، بجلی اور پانی کے نظام کا مطالعہ کرتے اور وہ ان کے سکولوں، اسپتالوں اور ڈاک خانوں کا جائزہ لیتے جب اور یورپ کا سارا نظام سمجھ گئے تو انہوں نے نتیجہ نکالا جب تک کسی ملک کا سسٹم بہتر نہیں ہوتا وہ ملک ترقی نہیں کرتا جب تک اس ملک میں سرمایہ کاری نہیں ہوتی وہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس ملک میں اہتمام پسندی اور روشن خیالی نہیں آتی جب تک اس ملک میں مسجد اور تفریح گاہیں دونوں نہیں ہوتیں اور جب تک لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق رقم اور بنیادی سہولتیں نہیں ہوتیں اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا وہ اپنی دینی آئے اور انہوں نے نئے دینی کی بنیاد رکھنا شروع کر دی۔ اس وقت تک صحرا عرب امارات میں جمل لگا چکا تھا اور شیخ زاہد بن سلطان النویان ایک انقلابی جذبے کے ساتھ امارات کی ترقی اور استحکام کا کام شروع کر چکے تھے شیخ محمد نے آگے بڑھ کر زیادہ تر کام اپنے ہاتھ میں لے لیا انہوں نے اسلامی معاشرے کو اہتمام کی راہ پر لایا انہوں نے شراہوں کے لئے

بہترین شہر بنانے، جواز یون کے لئے اجنبی خدہ سر جواہ خانے اور غازیوں کے لئے دنیا کی بہترین مسجدیں بنانے انہوں نے دنیا جہاں کے سرمایہ کاروں کو دعوت دی اور ان کیلئے روٹی کی

سرزمین کھول دی انہوں نے دیکھا مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی جدید شہر موجود نہیں چنانچہ مشرقی ممالک کے امراء کو علاج، تعلیم، تفریح، شاپنگ، کاروبار اور عیاشی کے لئے لندن، پیرس اور نیویارک جانا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہر سال مشرق سے اربوں ڈالر مغرب چلے جاتے ہیں انہوں نے سوچا اگر مشرقی ممالک کے امراء کے لئے چند گھنٹوں کی ڈرائیو اور مختصر سی ملاقات پر ایک ایسا شہر موجود ہو جو کسی بھی طرح یورپ اور امریکہ سے کم نہ ہو تو ان اربوں ڈالر کا رخ مشرق کی طرف پھیرا جاسکتا ہے لہذا آج حالت یہ ہے دنیا میں سب سے اچھی اور سستی تعلیم روٹی میں ملتی ہے دنیا میں سب سے زیادہ شاپنگ سب سے زیادہ علاج اور سب سے زیادہ تفریح روٹی میں ملتی ہے روٹی دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے روٹی میں دنیا کا سب سے مہنگا ہوٹل موجود ہے روٹی میں سب سے زیادہ مساجد پارلر چہاں روٹی دنیا کا سب سے بڑا اسٹریٹ اور دنیا کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے یہ سب ایک شخص کے ورثان اور محنت کا نتیجہ ہے اور اس شخص کا نام شیخ محمد بن راشد المنتموم ہے۔

میں شیخ محمد بن راشد المنتموم کے شہر میں تین نوں کیلئے آیا ہوں روٹی پہنچ کر میں نے

ذریعہ پبلسٹ 3.....0.....267

محبوس کیا اگر انسان کے پاس دماغِ محنت اور حوصلہ ہو تو دوریت کے ٹیلوں کو سونا بنا سکتا ہے، میری گاڑی میں دوغنی کے بارے میں ایک کتابچہ پڑا تھا، میں نے اس کی دورتی گردانی شروع کر دی، اس کتابچے میں شیخ محمد بن راشد الختموم کا ایک قول درج تھا 'شیخ' نے فرمایا تھا 'ترقی کیلئے انصاف اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا جائدادوں کیلئے آکسیجن' میں نے شیشے سے باہر دیکھا، باہر حد نظر تک ترقی ہی ترقی، خوشحالی ہی خوشحالی تھی، میں نے پرہہ کھینچ دیا، آنکھیں بند کیں، اور دل میں سوچا کاش یہ بات کوئی شخص ہمارے ان حکمرانوں کو سمجھا دے جو انصاف کے بغیر ملک کو ترقی دینا چاہتے ہیں جو دیگر کے ہنگاموں میں کہاں بونا چاہتے ہیں جو جیلوں کی کالی پر جتنا سنگ کھیلنا چاہتے ہیں کاش کوئی ہمارے حکمرانوں کو یہ سمجھا دے انصاف اور قانون کے بغیر معاشرے اس طرح ہوتے ہیں جس طرح پانی کے بغیر دریا، جس طرح چاندنی کے بغیر چاند۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

اکیسویں صدی کے شیخ چلی

شیخ محمد بن راشد الغنوم نے 1976ء میں بیسن کوئی کی جی 'دہلی 2000' تک دنیا کی چالیس اور مشیخہ طرز میں دیا۔ جسے برکاتی اور پوری دنیا سے لوگ دیکھیں اور ان کے دل کو جیت لیا۔

بیان اس وقت برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اور جس شخص نے بھی یہ بیان پڑھا تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی یہ مسکراہٹ بجا تھی اس وقت دہلی دنیا کی پوساغہ ترین ریاست تھی پورے شہر کا رقبہ 20 مربع کلومیٹر تھا شہر میں صرف ایک قحری سٹار ہوٹل اور ایک بڑی سڑک تھی لوگ اونٹوں اور گدھا گاڑیوں پر سفر کرتے تھے اور شہر میں پینے کا پانی تک دستیاب نہیں تھا لہذا اس وقت ایک ایسے شہر کے بارے میں یہ دعویٰ اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھا برطانیہ کے ایک اخبار کے رپورٹر نے شیخ سے اس خدشے کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے جواب میں شیخ محمد نے جو واقعہ سنایا اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا شیخ نے فرمایا "ہم نے دہلی میں نئی پولیس تشکیل دی ہے کل میں اپنی گاڑی چلا تا ہوا اپنی ہمشیرہ کے گھر گیا" میں نے غلطی سے نو پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی" میں جب واپس آیا تو میری گاڑی کے باہر پر پولیس کا "کلب" پڑھا تھا میں نے آگے پیچھے دیکھا 'دور سائے میں ایک پولیس کا ٹیبیل کھڑا تھا' میں نے اشارے سے اسے بلایا وہ آیا اور اس نے مجھے سلوٹ کیا میں نے اس سے پوچھا میری گاڑی پر کلب تم نے لگایا ہے اس نے انہات میں سر جلا دیا میں نے اس سے کہا "تم مجھے نہیں جانتے" اس نے ہاں میں سر ہلا کر جواب دیا "آپ

ہمارے شیخ ہیں، میں نے کہا، تم میری گاڑی نہیں پہچانتے تھے اس نے ہاں میں گردن ہلائی اور احترام سے بولا، میں پہچانتا ہوں، میں نے پوچھا، پھر تم نے میری گاڑی پر کلپ کیوں لگایا، اس نے سینہ تان کر جواب دیا، آپ کی گاڑی نلکا جگہ پر پارک تھی اور دعویٰ میں شیخ ہو یا کوئی دیگر قانون سب کے لئے برابر ہے، مجھے اس کی بات بہت اچھی لگی لہذا میں آج اس پولیس کانسٹیبل کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتا ہوں، ہمارے ملک کا کل بہت روشن ہے اور اگر ہمارے ملک میں اس طرح قانون کی حکمرانی رہی تو اگلے 25 برسوں میں دعویٰ دنیا کی جدید ترین ریاست ہوگا، شیخ کا جواب سن کر وہ صحافی ناخوش ہو گیا، شیخ محمد کی دشمنی کوئی سچ ثابت ہوئی اور ٹھیک 25 برس بعد دعویٰ یورپین سائل کا پہلا ایشین شہر بن گیا، آج آپ دعویٰ جائیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نیویارک، لندن یا ٹوکیو میں محسوس رہے ہیں اور جیسے آپ جدید دنیا کے کسی جدید ترین شہر میں آگئے ہیں آج جب بھی کوئی شخص شیخ محمد بن راشد انٹھوم کے سامنے دعویٰ کی تعریف کرتا ہے تو در 1976ء کے اس پولیس کانسٹیبل کا نام لیتے ہیں اور اس کے بعد فخر سے کہتے ہیں، دعویٰ کو دعویٰ اس کانسٹیبل نے بنا یا تھا۔

KashmiriAzad.com

انسان کی دل بہادر سارا تاریخ اس نظریے پر مشتمل ہے، جب تک کسی شہر کی معاشی ترقی نہ ہوگی کسی ملک میں قانون اور اس کے بعد انصاف قائم نہیں ہوتا، اس وقت تک وہ ملک ترقی نہیں کرتا، آپ دنیا کے کسی جدید اور ترقی یافتہ ملک کو دیکھ لیں، آپ کو اس ملک کی ترقی کے پیچھے پولیس کا مضبوط نظام اور فوری اور غیر جانبدارانہ عدالتی سسٹم ملے گا، اسی طرح آپ تمام تباہ شدہ برادار اور انحطاط پذیر معاشرہ کا تجزیہ کر لیں، آپ کو ان تمام معاشرہ میں ایک بات مشترک نظر آئے گی اور وہ بات قانون اور انصاف کا کمزور اور بے بس نظام ہوگا، آپ کو معلوم ہوگا ان تمام ملکوں کی عدالتیں بے بس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کرپٹ ہیں، ان ملکوں کے بااختیار لوگ قانون کو کھیل اور عدالتوں کو کھلوتا سمجھتے ہیں اور وہاں کی پولیس اور عدالتیں حکمران کلاس کی اتا اور مفادات کی حفاظت کر رہی ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ دنلڈ ریگن کے دور میں امریکہ میں ایک بڑی سٹی کا سردے ہوا تھا، اس سردے میں لوگوں سے پوچھا گیا تھا، ہم سپر پاور کیوں ہیں، اس وقت نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی فوج، سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیار، سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج، سب سے بڑا میڈیا، سب سے زیادہ مالیاتی ذخائر، سب سے بڑی اینڈ سٹریٹیجی، سب سے زیادہ ڈیجیٹل سب سے زیادہ ڈاکٹر، سب سے زیادہ سائنس دان اور سب سے زیادہ پونڈ سٹیلین امریکہ میں تھیں بلکہ اس وقت امریکہ نے سوویت یونین کو تازہ ہٹا کر شکست بھی دی تھی، لیکن جب سردے کے

نتیجہ آئے تو امریکہ کے 81 فیصد لوگوں کی مستند رائے تھی 'امریکہ کو اس کے قانون اور انصاف نے سپر پارہ رہے گا' لیکن کا یہ بیان پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا میں اس وقت تک امریکہ دنیا کی طالب علم تھا میرے لئے لیکن کی بات حیران کن اور ناقابل یقین تھی لیکن جب آنے والے دنوں میں مجھے دنیا میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا اور میں نے قوموں کے عروج و زوال کا تجزیہ کیا تو مجھے معلوم ہوا جب کسی قوم میں قانون محترم ہوتا ہے 'جب کسی ملک میں لوگوں کو فوری اور غیر جانبدار انصاف ملتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس ملک کو ترقی کرنے سے نہیں روک سکتی اور جب کسی ملک میں قانون اور انصاف کا مذاق شروع ہو جاتا ہے 'جب کسی معاشرے میں قانون سیاستدانوں 'حکمرانوں اور مافیا لارڈز کے دروازے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جب انصاف حکمرانوں کے گھر کی لونیڈی بن جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرے کو برباد کرنے سے ہند رہنے سے نہیں بچا سکتی مجھے معلوم ہوا قانون اور انصاف وہ بنیادی پتھر ہوتے ہیں جن پر معاشروں کی دیواریں اچھتیں گنبد اور مینار تعمیر ہوتے ہیں یہ بنیاد کے وہ پتھر ہوتے ہیں جن پر عروج اور ترقی کے قبیلے تعمیر ہوتے ہیں یہ وہ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو قوموں کے آنے والے سورج تراشتے ہیں اور یہ وہ کھیت ہوتے ہیں جن میں معاشروں کے مستقبل کا شت ہوتے ہیں۔

آپ بنیاد کے ان پتھروں اور ترقی کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں ذرا سوچئے جس ملک میں کانسٹیبل سے لے کر آئی جی تک کی زندگی کا مقصد حکمران طبقے کی حفاظت ہو اور جس کی کسی عدالت میں انصاف نہ ملتا ہو اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا 'ذرا سوچئے جس ملک میں قانون بنانے والے ارکان اسہلی قانون نافذ کرنے والوں کو سزاؤں پر لانا کر ٹھنڈے مار رہے ہوں اور عدالتیں اس واقعہ پر خاموش چلیں ہوں اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا 'اس ملک کا کیا کل ہوگا؟ میں جب بھی ایسے واقعات دیکھا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم لوگ گارے کی دیوار پر چڑھ کر چاند کو چومنے کی کوشش کر رہے ہیں 'ہم لوگ جو ہڑ کے کنارے بیٹھ کر بنسوں کا انتظار کر رہے ہیں 'ہم روزیوں میں لعل تلاش کر رہے ہیں اور ہم لوگ ایک لاقانون اور بے انصاف معاشرے میں رہ کر اللہ کی لعنت اور اللہ کے کرم کی دعائیں مانگ رہے ہیں 'مجھے محسوس ہوتا ہے ہم ایک ۲۰۰۰ء کے شیخ علی۔ ج۔

ڈیڈ لائن

1775ء میں امریکہ میں ہولناک شہر شروع ہوئی یہ امریکہ کی ریاستوں کا برطانوی سامراج کے خلاف جنگ تھی اس حادثہ تھی کے دوران امریکہ کی فوج نے "ایڈریٹس" میں کئی قیدیوں کی ایک کھلی جیل بنائی یہ جیل میدان کی شکل میں تھی امریکہ کے فوجی برطانوی قیدیوں کو دبا لاتے اور انہیں اس میدان میں چھوڑ دیتے امریکہ کی فوج نے اس میدان کے گرد ایک سفید لائن کھینچ دی تھی یہ سفید لائن موت کی لکیر تھی جب کوئی قیدی اس لکیر کو عبور کرنے کی کوشش کرتا تھا تو امریکی فوج اسے گولی مار دیتی تھی یہ لکیر ایک غیر مرئی دیوار تھی اور اس کھلی جیل میں بند ہر قیدی جانتا تھا اگر اس کا قدم اس لکیر پر آ گیا تو وہ زندگی کی حد پار کر جائے گا امریکی اس لکیر کو "ڈیڈ لائن" کہتے تھے۔ 1800ء میں جب دنیا میں کرشل جرتوم کا دور شروع ہوا تو "ڈیڈ لائن" کا لفظ ایڈریٹس ویل سے نکل کر مصافحت میں داخل ہو گیا 'مصافحت میں "ڈیڈ لائن" کا مطلب کسی خبر کسی رپورٹ کسی سنوری یا کسی کام کو اخبار ریزیو یا نیلی ریڈین کے ہنتر پہنچانے کا آخری وقت ہوتا ہے پاکستان کے زیادہ تر اخبارات کی آخری کاپی رات دو بجے پر پس جاتی ہے لہذا رات ایک ڈیڑھ بجے کے بعد آنے والی خبر اخبار میں شائع نہیں ہوتی چنانچہ اخبارات کی ڈیڈ لائن ایک یا ڈیڑھ بجے رات ہے جسے ریڈین اور ریڈیو ہر باسے ہات دیکھ کر اپنا ڈیڈ لائن سے کہتے ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں مصافحت میں یہ لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا اس کثرت استعمال سے یہ لفظ میڈیا سے نکل کر عام

زندگی میں شامل ہو گیا اور عملی زندگی کے تقریباً تمام شعبے بھی ڈیڈ این کے شبیے میں آ گئے، پچھلے دس چند برسوں میں ڈیڈ این ہماری سیاست کا بھی باقاعدہ حصہ بن گیا، 1992ء سے صحافت سے وابستہ ہوں اور اس حوالے سے میرا سیاست کے ساتھ بھی رابطہ رہتا ہے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے میں قریباً روزانہ یہ لفظ سنتا ہوں اور بڑی حد تک اسے بھگتتا بھی ہوں۔ ان 14 برسوں میں مجھے محسوس ہوا سیاست کی ڈیڈ این صحافت کی ڈیڈ این کے مقابلے میں کہیں خطرناک اور مشکل ہے، صحافت کی ڈیڈ این کے ڈسے تو شاید بیچ جاتے ہیں لیکن سیاست کی ڈیڈ این کی لپیٹ میں آنے والے لائقہ اور کی قربانی دینے بغیر اس سے باہر نہیں نکلتے۔

جون کے وسط میں میرے ایک دوست نے میرے کان میں سرگوشی کی، "حکومت مشکل کا شکار ہو گئی ہے" میں نے اسے کہا، "مجھے بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا" قومی اور بین الاقوامی امور صدر صاحب کی عمل گرفت میں ہیں اور وزیراعظم صاحب معیشت کو ترقی کی ہلکی ہلکی لے آتے ہیں اور ریلوے کی کمرہ کاروں کے "شیریں" اور "دکن" اور سڑکوں کی تعمیراتی کاموں کی ترقی کر رہے ہیں، اس سے انکار نہیں کر سکتا اور پورے ممالک میں "گولڈن ڈیڈ این" ہے، تم دیکھنا جو لائی کے حالات زیر دست طریقے سے چلا کھائیں گے اور حکومت کیلئے حالات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، میں نے اس کی بات مذاق میں ازادی لیکن آنے والے چند دنوں میں حکومت حقیقتاً ڈیڈ این کا شکار دکھائی دینے لگی، حکومت کی ایم ایم اے کے ساتھ ذیل کمزور پڑی ہے، نظریہ کے ساتھ خفیہ مذاکرات کی واپسی شروع ہوئی، بھارت کے ساتھ تعلقات سرد مہری کا شکار ہوئے، سناک ایکسچینج اور سٹیل ملز کے ایڈیٹرز کی چونچیں ریت سے باہر آنے لگیں اور ایڈیشن کی صفوں میں اتحاد کے آثار دکھائی دینے لگے، چنانچہ مجھے اپنے دوست کی بات میں وزن محسوس ہونے لگا، ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ جولاہی کے آخر میں اچانک ایم کیو ایم کا "کنا" نکل گیا اور حکومت کیلئے اسے باندھنا مشکل ہو گیا، ایم کیو ایم سندھ حکومت کا مرکزی ستون ہے، سندھ میں "ستھ حکومت" ہے جس میں مسلم لیگ ق، نیشنلسٹس اور ایم کیو ایم شامل ہیں، وفاقی حکومت نے 2002ء میں ایم کیو ایم کو حمایت کے بدلے گورنر شپ، 7 صوبائی وزارتیں، 4 مشاورتیں اور سیکرٹریٹس کی چار نشستیں دی تھیں۔ 9 جون 2004ء میں جب ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے حکومت بنائی تو ایم کیو ایم نے وفاقی حکومت کے سامنے چند "مطالبات" رکھے، ان مطالبات میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کیلئے نوکریاں ایم کیو ایم کے حلقوں کیلئے قائم کرنا، فنانسنگ، صحت، تعلیم، اور دیگر امور۔" حکومت نے

یک جنبش قدم یہ سارے مطالبات مان لئے لیکن جب یہ مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا یہ مطالبے اتنے بھی سادہ نہیں ہیں اس کے بعد وفاقی حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان کھینچا تالی شروع ہوئی یہ کھینچا تالی مئی 2006ء میں اپنی آخری حدوں کو چھوئے لگی یہاں تک کہ جنت سے پہلے ایم کیو ایم نے سندھ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اس بائیکاٹ سے سندھ حکومت اور وفاقی حکومت دونوں کو شدید جھجکا لگا صدر کی ہدایت پر وزیر اعظم شوکت عزیز اور طارق عزیز نے ایم کیو ایم کے ساتھ مذاکرات کئے ان مذاکرات میں 31 جولائی کی "ڈیڈ لائن" طے ہوئی دونوں عزیزوں نے ایم کیو ایم سے وعدہ کیا سندھ حکومت 31 جولائی تک ان کے سارے "مطالبات" پورے کر دے گی ایم کیو ایم کے بعض حقوق کے مطابق ان "مطالبات" میں وزیر اعلیٰ سندھ کے ساتھ ساتھ ڈائریکٹر جنرل ہسٹ آفس آغا مسعود نیازی ڈیوڈی کے ڈی پی بریگیڈیئر چیمرا اور نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے چیئر مین مہجر جنرل فرخ جاوید کی تبدیلی بھی شامل تھی ان دو ماہ میں آغا مسعود اور بریگیڈیئر چیمرا کے سلسلے میں ایم کیو ایم کی خواہش پوری ہو گئی لیکن چیف منسٹر سندھ اور جنرل فرخ جاوید کا مسئلہ لگا رہا اور دوران چیف منسٹر ٹرس میں ایم کیو ایم کے وزراء کی الزحمانی سوانحیں جمع ہو گئیں ایم کیو ایم کے وزراء جب یہ لائحہ عمل کا مطالبہ کرتے تھے تو آراب غلام رحیم وفاقی حکومت پر ذمہ داری عائد کر دیتے اور کہتے تھے جب تک مجھے اسلام آباد سے حکم نہیں آئے گا میں آپ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتا ایم کیو ایم کی ان فیکوں میں 50 ہزار نوکریاں بھی شامل تھیں 31 جولائی کی ڈیڈ لائن آہستہ آہستہ قریب آنے لگی جولائی کے آخری ہفتے میں صدر کراچی تشریف لے گئے ایم کیو ایم کا خیال تھا صدر کراچی میں چیف منسٹر کی تبدیلی کا فیصلہ کریں گے لیکن صدر صاحب نے ایم کیو ایم کی توقعات کے برعکس جلسہ عام میں آراب غلام رحیم پر اعتماد کا اظہار کر دیا جس سے ایم کیو ایم کے جذبات کو شدید دھچکا پہنچا لہذا اس کے وزراء نے اگلے دن سندھ اور وفاق میں استھنے دے دیئے۔ اس رات صدر نے ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین سے ٹیلی فون پر 55 منٹ گفتگو کی جس میں بڑی حد تک معاملات طے پا گئے اس گفتگو کے دوران ایم کیو ایم اور حکومتی نمائندوں میں یکم اگست کو میٹنگ طے ہوئی خیال تھا یکم اگست کو ایم کیو ایم استھنے واپس لے لے گی لیکن عین اہم وقت پر ایم کیو ایم نے چیف منسٹر کے ایک بیان کو ایسا بتایا اور مذاکرات میں شامل ہونے سے انکار کر دیا جس کے بعد حکومت "ڈیڈ لائن" کا شکار ہو گئی رات میری عمران خان سے بات ہو رہی تھی خان صاحب نے پوچھا "اس سارے (مرا سے) کا کیا نتیجہ نکلے گا" میں

نے عرض کیا "ایم کیو ایم کے سارے مطالبے مان لئے جائیں گے" عمران خان نے قبضہ لگا کر میری بات کی تائید کی میں نے ان سے عرض کیا "وزیر اعلیٰ سندھ سے جو بیان منسوب کیا جا رہا ہے اس میں انہوں نے کہا تھا وہ گمبھڑ کی سوسائٹی زندگی سے شہر کی ایک دن کی زندگی پسند کریں گے قبضہ میرا خیال ہے انہیں غیر کی ایک دن کی زندگی دے دی جائے گی" عمران خان نے پوچھا "اور اگر یہ نہ ہوا تو!" میں نے عرض کیا "سندھ کا گورنر تبدیل ہو گا جس کے بعد وہاں گورنر راج نافذ ہو گا اور ایم کیو ایم ایگزیکٹو کے ساتھ شامل ہو جائے گی" عمران خان نے دوسری بار قبضہ لگا دیا۔

سندھ حکومت کا بحران کس کروٹ بیٹھتا ہے اس کے بارے میں سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا طے ہے ہماری حکومت اس وقت بے شمار "ذیل لائنوں" میں گھر چکی ہے اے آر ڈی اور ایم کیو ایم کی ذیل لائن ختم ہو چکی ہے بے نظیر بھٹو کی ذیل لائن ختم ہونے والی ہے مولانا فضل الرحمن کی ذیل لائن دست کر ملک سے باہر جا چکے ہیں قاضی حسین احمد اپنے ہاتھ سے اینڈرسن ویل کے گرو منیجر لیکر کھینچ رہے ہیں اور امریکہ اور بھارت کی ذیل لائنیں سر پر ٹھڑی ہیں یہ تمام ذیل لائنیں کسی بھی وقت بھٹ سکتی ہیں اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ تو صرف مشاہدہ نہیں جاسکتے ہیں!

Kashmir Azad@OneOrTwo.com



چند ماہ کی بات ہے

شاہ ایران محمد رضا پہلوی 1941ء میں تختہ نشین ہوا۔ وہ خادم مغرب کہلاتا تھا۔ وہ امریکی بندو کو اپنا پاس کبھی تھا اور وہ مسکین کو ایران کا لازماً کھوکھلا ساپ اس کی امریکہ ٹرانڈی کی ایسا دیکھنے شاہ ایران نے بیک جنبش قلم ایران میں موجود تمام امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی اس وقت ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں جوامر کی شہری قدم رکھتا تھا اسے ایئر پورٹ پر سفارتکار کا شنس مل جاتا تھا۔ دنیا میں امریکہ سے باہر کیلینفورنیا یونیورسٹی کی صرف ایک شاخ تھی اور وہ شاخ ایران میں تھی شاہ ایران کا خیال تھا امریکہ اس کا دوست ہے لہذا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن جب 1979ء میں انقلاب آیا تو امریکہ دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے شاہ ایران کو پناہ دینے سے انکار کیا شاہ ایران پوری دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن امریکہ نے اسے علاج تک کے لئے نئے یارک نہ اتارنے دیا یہاں تک کہ جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اس کی نشانی اٹھا اٹھا کر بھرتے رہے مگر امریکہ کے خوف سے کوئی ملک شاہ کی میت کو چھ ہائی ڈونٹ جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر مرحوم پادشاہ کو قاہرہ میں قبر نصیب ہوئی۔ "اناس تاسیو سو ہزار" نکارا گوا میں امریکہ کا دوست تھا وہ اور اس کا والد برسوں امریکہ کے سپاہی بن کر کیوزم کے خلاف لڑتے رہے۔ اناس تاسیو کا بی بی جیل جیل تھا اس کی پارٹی کی اس نے اسے بی سین جب اسے نارا گوا سے بھارت چڑھو امریکہ نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا یہ اناس تاسیو سو ہزار بھی انوکھے شہر "مسن" میں

انتہائی سمجھ بھری کی حالت میں مراٹھاپائسن کافرڈی ہینڈ ماہ کو سبھی امریکہ کا دوست تھا دو نظائسن میں 20 سال تک امریکی دوستی کا حق ادا کرتا رہا۔ اس نے امریکہ کے ایما پر ہزاروں کمپنٹس ذبح کر دیے لیکن وہ 1986ء میں ہونولولو میں امریکہ کی بے وفائیوں کے شکار ہو کر تے مر ڈاگولا کے ہائی لیڈر جوٹاس سینسی نے 1992ء میں امریکہ کی ایما، پریکٹسوں سے امن معاہدہ کیا تھا وہ بھی اس خدمت کے بعد یہ سمجھتا تھا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن ہی آئی اسے نے جوٹاس کی لدا اور وک لی جس کے بعد کیونٹسوں کی تنظیم ایم پی ایل اسے نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ امریکہ کی مدد کا انتظار کرتا ہوا ہلاک ہو گیا پانامہ کے جنرل ٹوریکا نے 25 سال امریکہ کی خدمت کی لیکن امریکہ نے پانامہ پر فوج کشی فرمادی۔ ٹوریکا کو گرفتار کیا اس پر خبیثات کا کس بنایا اور اسے عدالت سے سزا دلایا کر جیل میں ڈال دیا۔ امریکہ نے 1979ء میں روسویشیا کے بشپ اہل ضرور پواکو موعابے اور ٹوریکو کے خلاف بلا شیری دی بعد ازاں یہی بشپ امریکی دوستی کے ٹیکل مہرت کا نشان بن گیا۔ چلی کے ارگٹو پوٹے نے ملک کو خانہ جنگی اور کمونزم سے بچایا 17 سال امریکہ کی خدمت کی، وہ امریکہ کا ایما تھا اور تھا کہ اس نے 1990ء میں امریکہ کے حکم پر حکومت چھوڑ دی اور لندن میں پناہ لے لی امریکہ کے اشارے پر لندن میں اسے نظر بند کر دیا گیا وہ امریکہ کو بدد کے لئے دہائی دینا رہا لیکن پوٹے کی باری آچکی تھی۔

آپ امریکہ کے دوست ملکوں کی مثال بھی لیجئے دوسری جنگ عظیم کے بعد 29 ممالک کا خیال تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" لیکن امریکہ نے ان ممالک پر 97 فوجی حملے کئے آپ تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے چین ہو، کوریا ہو یا پھر گوئے مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کنگو، برونڈو، لاؤس، ویت نام، کیمبوڈیا، گریٹینڈا، لبنان، لیبیا، ایل سلواڈور، ٹکاراگوا، پانامہ، سوڈان، پورٹوریکو، یوگوسلاویہ، یوراگوئے، البانیہ، زائیر، یمنی، بوسنیا، صومالیہ، لائبیریا، بولیویا، افغانستان یا پھر عراق ہر وہ ملک جو امریکہ کا دوست تھا، جس نے خود کو امریکہ سے محفوظ سمجھا اور جو یہ کہتا تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" اس ملک پر امریکی فوج ضرور اتری۔ اس ملک میں امریکی بارود ضرور پھٹا اور اس ملک پر امریکی طیاروں نے ضرور بم برسائے۔ یہ امریکہ کی 1890ء سے اپریل 2003ء تک کی فوجی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں افغانستان اور عراق جیسے دو سوں ملک آئے ہیں۔ امریکہ سے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے ایک بار کہا تھا "آپ امریکہ کی مخالفت کریں تو امریکہ آپ کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لے گا لیکن اگر آپ اس کے دوست بن جائیں تو وہ آپ کو سستے داموں بیچ

دے گا۔" ہم بھی امریکہ کے دوست ہیں لہذا بھارت ہمیں گرم تعاقب کی دھمکی دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کو اپنا دوست سمجھ کر مطمئن بیٹھ جاتے ہیں رچ ڈباؤ چر بھارت میں پاکستان کے خلاف بیان دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کی دوستی پر اعتماد کر کے چپ چاپ بیٹھے جاتے ہیں اور ہم سے ڈاکٹر قذافی، جنوبی وزیرستان اور گوادرنالکتا ہے لیکن ہم اسے ایک دوست کا "لاڈ" سمجھ کر سسکا دیتے ہیں اور امریکہ کے تھکنک نینک ہمیں دہشت گرد قرار دیتے ہیں لیکن ہم سوچتے ہیں 'ہماری باری کبھی نہیں آئے گی' ہم خود کو عراق، پانامہ اور غلباکن کے مقابلے میں امریکہ کا کتیں زیادہ دوست سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں۔ ہم پنڈتے 'ہشپ ہسبل' نوریکا، مارکوس، جوناس سیوسا، تاسیو اور رضا پہلوی کے مقابلے میں امریکہ کے کتیں زیادہ وفادار ہیں لہذا ہماری باری کبھی نہیں آئے گی لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں ہاتھی کتہا ہی مہذب کیوں نہ ہو جائے وہ سونٹا بلائے بغیر نہیں رہ سکتا اور کچھ خواہ سجدہ میں جنم لے وہ ڈسے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں جس امریکہ نے غیر نیوکلیائی ملک عراق کو نہیں بخشا تھا وہ جوہری اسلامی طاقتوں کو کیوں معاف کرے گا! ہم یہ بھول جاتے ہیں ہم امریکہ کے دوست ہیں لہذا ہمیں کبھی نہ کبھی اس دوستی کا تادان ضرور ادا کرنا پڑے گا! ہم کبھی نہ کبھی ہاتھی سونٹا کی پینت میں سرور ڈالیں گے لیکن ہم ایک خوش ہنم قوم ہیں، ہم اور ہمارے نظریات کبھی تک یہ سمجھ رہے ہیں ان کی باری کبھی نہیں آئے گی، ہم لوگ بلوچستان میں کبھی آگ کا نظارہ کر رہے ہیں، ہم اپنی سرحدوں پر ہونے والی تبدیلیاں بھی دیکھ رہے ہیں اور ہم بھارت اور افغانستان کی آنکھوں کی سرفی بھی دیکھ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھ رہے ہیں، ہماری باری نہیں آئے گی، ہم کتنے خوش فہم ہیں! ہم یہ سمجھ رہے ہیں دودھ میں گرنے کے بعد چھپکلی کا زہر ختم ہو جائے گا اور پاکستان تک پہنچ کر کچھ اپنی فطرت بدل لے گا! ہم حقیقتاً بہت بے ذوق ہیں ہمیں یہ نظر نہیں آ رہا ہماری باری آچکی ہے اب بس چند ماہ کی بات ہے!



نائین الیون

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ نئی دہلی سے نکلا، راستے میں ایک گاڑی کا آئل اور فلٹرز تبدیل کرنے کے لیے ایک ڈریم سٹور پر پہنچا اور وہاں پر ایک گھنٹہ تک ڈرکشاپ پر اس وقت چھ کارکن تھے، ہم نے جو بھی گاڑی کھڑی کی، دو لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے گاڑی "ڈیک" پر لگائی۔ ہائیڈراک سکونوں کے ذریعے گاڑی اوپر اٹھائی اور تقریباً گھنٹہ لگا کر انہوں نے گنڈا آئل نکالا، پرائیفلٹر الگ کیا، نیا فلٹرز اور تازہ آئل بھرا اور پھر اس کے بعد ڈیک پر ہی گاڑی سٹارٹ کر کے انجن کے فلٹرز کا جائزہ لینے لگے، اس جائزے کا دورانہ بھی تقریباً ایک گھنٹے پر محیط تھا، اس جائزے کے دوران انہوں نے دیکھا آئل تو ایک نہیں کر رہا فلٹرز تو نہیں دس رہا، نیا آئل انجن کو پریشان تو نہیں کر رہا اور آئل اور فلٹرز تبدیل ہونے سے گاڑی کی رفتار اور کارکردگی پر بڑے اثرات مرتب تو نہیں ہوئے۔ اس سارے عمل کے دوران ان لوگوں نے نئے آنے والے گاڑیوں کو "وی آر بری" کا ٹیٹو لگا کر بھگا دیا، جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو یہ لوگ ڈرکشاپ کی صفائی پر جت گئے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرکشاپ یوں ہو گئی جیسے برسوں سے وہاں کوئی گاڑی نہیں آئی۔ میں یہ صورت حال دیکھ کر پریشان ہو گیا کیونکہ ہمارے ملک میں عام فٹ پاتھوں پر جیسے "پھوسے" یہ کام کی آئے اور ڈرکشاپ کے پھیر چند منوں میں کر دیے ہیں۔ سوڑے پر پہنچ کر میں نے اپنے دوست سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ ہنس کر بولے "اسے

امریکن وے آف ڈوننگ تھمکو کہتے ہیں :-

اس واقعے کے بعد میں نے ایک نئے زاویے کے ساتھ امریکی معاشرے کا جائزہ لیا تو مجھے پوری امریکی "سوسائٹی امریکن وے آف ڈوننگ تھمکو پر کاربند نظر آئی۔ امریکہ میں جب کوئی شخص کام شروع کرتا ہے تو وہ چار چیزوں کا خیال رکھتا ہے ایک، ایک سوئی، دو مہارت، تین بعد از خدمت مشاہدہ اور چار ماحول یا جگہ کی صفائی۔ اس سارے سلسلے کو آپ یوں دیکھ سکتے ہیں فرض کریں آپ امریکہ میں ہاتھ روم ٹھیک کرانے کیلئے پلیمبر بلواتے ہیں۔ اول وہ پلیمبر اس قدر ایک سوئی سے کام کرے گا کہ اس دوران دنیا سے اس کا رابطہ تک منقطع ہو جائے گا۔ وہ کسی دوسری چیز، کسی دوسرے کام کے بارے میں سچے سچے گا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھے گا، وہ سووم وہ کام مکمل کرنے کیلئے اپنی پوری مہارت صرف کرے گا۔ سووم کام مکمل ہونے کے بعد وہ ایک کونے میں بیٹھ کر اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ کیا کام واقعی اس معیار، اس بول کو "سچ" کر رہا ہے جس کی ضرورت تھی اور آخر میں پلیمبر وہ جگہ صاف کرنے کا جہاں اس نے کام کیا تھا یوں وہ پلیمبر وہاں سے واپس جائے گا

اور کوئی شخص ہاتھ روم میں داخل ہونے کے بعد اندازاً تین منٹ کے گا کہ یہاں کام وہاں تھا جہاں

سے ابھی ابھی کوئی پلیمبر گیا ہے۔ اس "امریکن وے آف ڈوننگ تھمکو" کی دو بڑی وجوہات ہیں اول امریکہ میں زیادہ تر کام گارنٹی یافتہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی سے کام کرانا ہے تو یہ نئے ہوتا ہے اگر سروس کے بعد ذرا ہی اور نہ ہوئی یا چند دنوں بعد وہی مسئلہ دوبارہ پیدا ہو گیا تو وہ مسٹری یا کارٹن واپس آکر اسی او اشدہ رقم میں وہ کام دوبارہ کرے گا۔ دوام اگر اس مرمت کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو وہ کارکن یا کینی اس کی تلافی کرے گی لہذا یہ وہ خوف ہیں جن کے باعث امریکہ میں کوئی شخص رسک لینے کیلئے تیار نہیں ہونا چاہتا ہے وے آف ڈوننگ تھمکو کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سائیکسی، ان لوگوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

اب دیکھتے ایک طرف تو یہ حالت ہے امریکہ کا ایک عام مکینک، ایک عام پلیمبر گاڑی کا آئیل بدلنے یا ایک معمولی سی نوٹی ٹھیک کرنے میں پورا پورا دل لگا دیتا ہے جبکہ دوسری طرف امریکی سیاست ہے اور امریکی حکومت کا وہے آف ڈوننگ تھمکو ہے امریکہ نے دس سال تک افغانستان میں روس کے خلاف جنگ لڑی، ان دس سالوں میں امریکہ نے ان قوانوں کو بے تحاشا استور یا نہیں حملہ کرنے، چھاپہ مارنے، بیٹوں کے بغیر دشمن کے ٹھکانے تباہ کرنے، جان لینے اور جان دینے کی فریڈنگ دی۔ انہیں بیرونی جانے اور یورپ اور امریکہ پہنچانے کا طریقہ سکھایا۔

انہیں میزائل دیئے، انہیں توپیں اور ٹینک دیئے اور انہیں بم بنانے اور چلانے کے طریقے بتائے گئے۔ لیکن جب افغانوں کی تین سلیبس مرنے اور مارنے میں حلاق ہو گئیں تو امریکہ یہ سارا گند چھوڑ کر واپس چلا گیا اور اس نے یہ نیک نہ سوچا یہ بلکہ ترین اسلحہ، یہ نریز لوگ اور یہ مرنے مارنے کی فضا کس کس کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے ملن سے کون کون سی تحریکیں جنم لیں گی اور اس کے اثروں سے کیا کیا خوف، کیا کیا ڈر پیدا ہوں گے۔ افغانستان ایک ایسا آپریشن تھا جس کے اختتام پر امریکہ نے اپنا دے آف ڈونگ ٹھنکو کا فلسفہ فراموش کر دیا تھا۔ اس نے آپریشن کے بعد جگہ کی صفائی کا اصول بھلا دیا تھا اور وہ افغانستان کو افغانوں پر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس بے وفائی، اس کھٹور پن کا پیمانہ نقصان پاکستان نے اٹھایا، پاکستان شدید ترین وبہشت گردوں کا شکار ہو گیا، افغانستان سے کھائو نہیں آئیں اور پاکستان کی گلی گلی مکھلے مکھلے میں ریز میوں اور ٹھیلوں پر کھینے لگیں۔ بم، راکٹ، لائچر اور ٹرینڈ آئے، تراجی پیپے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کو آگ لگ گئی۔ یورپ اور امریکہ نے بیرونی جہز اور ایون گے راستے بند کئے تو پاکستان ان مہلک

خشبات کی منفی بھائی کیا ہے پاکستان میں فرقہ پرستی شریعت شکنی اور افغانستان کے ذریعہ شریعت شکنی

سجھوں، اہام بارگاہوں اور قبرستانوں میں استعمال جوئے لگا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ بارود کی یہ بوجھیر عرب سے نکل کر میڈی ٹیرن سی اور انڈیا تک اڑھن تک جا پہنچی افغانستان کے بارود کی چشم امریکہ کے پاؤں تک آگئی اور دنیا ایک خوفناک جنگ کے دہانے پر آنکھری ہوئی جس کے بارے میں آئین سٹائن نے کہا تھا تیسری جنگ کے بعد دنیا میں جو لوگ بچ جائیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے۔ اس سارے کھیل میں کون تصور دار ہے؟ یہ کس کی خالی کس کی غلطی تھی؟ اگر ورلڈ لڈریٹ سنٹرز کی تباہی کا کھر اوقافی افغانستان جاتا ہے تو بھی مجرم افغان یا اسامہ بن لادن نہیں بلکہ خود امریکہ ہے امریکہ 1990ء میں افغانستان کی آگ بجھائے بغیر واپس چلا گیا تھا اور وہ یہ بھول گیا تھا امریکی قانون کے مطابق، اگر کسی جگہ مرمت کے بعد کوئی خرابی رہ جائے یا کوئی چیز نوٹ جائے تو اس کا تادان ملینک، مسٹری کارگن یا کبھی کو اڈا کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ بھول گیا تھا چنگاری چنگاری رہے تو اسے بجھانا آسان ہوتا ہے لیکن اگر وہ بجھانے نہ جائے تو اس پر قابو پانا آسان نہیں رہتا وہ بھول گیا تھا لادانوں میں رہے تو وہ پانی ہوتا ہے۔ من وہ ہارا جائے تو اس کی پھیلائی تباہی کا سلسلہ سمندروں تک جاتا ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا سٹی ہوئی آگ ہو تو بجوا بند قیامت ہوتا ہے۔

ذریعہ پبلسٹک 3.....0.....281

کل ٹائم لین تھا، امریکہ نے کل تاریخ کے سب سے بڑے سامنے کی پانچویں برسی منائی۔ میں بھی کل امریکہ کے مہام کے ساتھ اداں تھا لیکن میں ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا امریکہ نے جو فصل 1990ء میں افغانستان میں ہوئی تھی اسے وہ فصل 2001ء میں کاٹا پڑی تھی لیکن اس نے جو کاٹنے 2003ء میں ہوئے ہیں اس فصل کے کٹنے کا وقت کب آئے گا۔ یہ آگ امریکہ کے پاؤں تک کب پہنچے گی۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

محبت اور امن

اسرائیلی کا پناہ گزینوں کی صورت میں رہنے والے اور اسامی (Assisi) کے ایک چھوٹے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ 1228ء میں پیدا ہوئے۔

میں بنا تھا اور آج تک اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے۔ پوری دنیا سے ہر سال لاکھوں سیاح اسامی آتے ہیں۔ یہ جگہ دیکھنے میں اور اس کی شان کے قیامت پرستے ہیں۔ 80ء کی دہائی تک اساتذہ مجلس عیسائیوں کے لئے ایک مقدس اور سیاحوں کے لئے ایک سیاحتی مرکز تھا لیکن 1986ء میں پوپ جان پال نے اسے ایک نئی حیثیت دے دی۔ 1986ء میں نروے جنگ اپنے عروج پر تھی، افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں اور افغانوں، پوری دنیا کے مسلمان مجاہدین امریکہ اور اس کے عیسائی اتحادیوں کے مابین جنگ جاری تھی، بیت المقدس میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان لڑائی، یورپی تھی اداؤں کے مسئلے پر چین کے سوشلسٹ اور جمہوریت ہندو ایک دوسرے کے مخالف ہر سر پر پکڑتے تھے، تبت کی وجہ سے چینی حکومت اور یہودیوں کے درمیان کشمکش ہائی جاتی تھی، بوسنیا، سریب اور کروشیا میں نذرتوں نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کر دیا تھا، بنگالی ریاستوں میں بون کے عیسائی اور ترک مسلمان لڑ رہے تھے، دارالمنظم امریکہ میں کیو باؤ مارکیہ کے درمیان میزائلوں کی دوز جاری تھی، اٹلی اور باجنو کی گوریا کے ساتھ دست ڈر بیان تھا اور برلن کے عیسائی دو حصوں میں تقسیم تھے اس وقت محسوس ہوتا تھا پوری دنیا ہارو کے زخیر پر چمکی ہے اور

بس ایک دیاسلائی دکھانے کی دیر ہے اور پوری دنیا بھگ سے از جائے گی اس وقت پوپ جان پال سامنے آئے اور انہوں نے ستمبر 1986ء میں اساسی میں مذاہب عالم کی پہلی امن کانفرنس منعقد کرائی۔ یہ ایک دعائیہ کانفرنس تھی جس میں تمام مذاہب کے بڑے رہنما اکٹھے ہوئے انہوں نے آپس میں ڈائیلاگ کی ضرورت پر زور دیا اور آخر میں سب نے مل کر اللہ تعالیٰ سے امن کی دعا کی۔

یہ کانفرنس 1986ء کے بعد ایک روایت بن گئی اور پچھلے میں برس سے ہر سال ستمبر میں دنیا بھر کے مذہبی رہنما اور وفد اساسی میں جمع ہوتے ہیں اور امن کیلئے اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ اس سال بھی اساسی میں امن کانفرنس ہوئی کانفرنس کا میزبان دینی کنونشن تھا اور اس کا افتتاح اٹلی کے صدر نے کیا تھا جبکہ اس میں اٹلی کے 5 بڑے وزراء کے علاوہ بریکو فاسو کے صدر آرتھوڈوکس چرچ کے سربراہ یوہو یوں کے رہنما دینی کنونشن کے کارڈینل نیپلز کے کارڈینل اور بودھوں کے روحانی پیشوا نے شرکت کی 'اسلامی دنیا سے اس کانفرنس میں جہاد المذاہر کے ریگنر احمد طیب' کاہرہ یونیورسٹی سے حسن خٹمی الجزائر سے محمد السلیمان اور ایران سے محمد علی کسرائی نے شریک ہونے

کاہرہ یونیورسٹی سے حسن خٹمی الجزائر سے محمد السلیمان اور ایران سے محمد علی کسرائی نے شریک ہونے

کے سربراہی کارڈینل اور یورپ کے نامور پاکستانی برنس میں طارق بھٹی نے کی تھی۔ طارق بھٹی کے ساتھ پاکستانی صحافی اور یورپ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو اخبار "جذیبہ" کے چیف ایڈیٹر اعجاز احمد بیارا بھی شامل تھے وفد میں ایک پاکستانی سکریٹری کلر پروفیسر مبین شاہد بھی شامل تھے پروفیسر مبین شاہد کا تعلق جہلم سے ہے وہ دینی کنونشن میں پروفیسر ہیں اور وہ پاکستان کے ان چند سیکھوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے ٹیلنٹ اور محنت کے زور پر دینی کنونشن کی ٹیکٹی میں شامل ہوئے ہیں 'برادر طارق بھٹی کا تعلق گوجر خان سے ہے وہ آج سے پچیس برس پہلے روزگار کے سلسلے میں فرانس گئے تھے یورپ جا کر انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی وہ ٹیلی کیوٹیکیشن کے برنس سے وابستہ ہیں ان کی کھٹی کائیت ورک اس وقت پورے یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔ اٹلی کی حکومت انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ اس وقت اطالوی اور

پاکستان حکومتوں کے درمیان لین دین کا کام لے رہے ہیں پاکستان میں وہ صدر صاحب کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں اٹلی میں موجود پاکستانیوں نے اس سال اپنے طور پر امن کانفرنس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا انہوں نے وفد تشکیل دیا اور طارق بھٹی کو اس وفد کا سربراہ بنا دیا یہ اساسی امن کانفرنس میں پاکستانیوں کی پہلی نمائندگی تھی یہ لوگ جب کانفرنس میں پہنچے تو دوسرے تمام وفد نے

بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا، انہی کے صدر ذور ذریہ اعلیٰ کے بڑھ کر پاکستانی وفد سے ملنے اور پاکستان اور صدر پر دین مشرف کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔

اس کانفرنس میں جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب نے بڑی خوبصورت بات کہی، انہوں نے کہا "دنیا مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو امن اور سلامتی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے، ہمارے مذہب میں دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں السلام علیکم کہہ کر ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں لہذا جو مذہب امن اور سلامتی پر اتنا یقین رکھتا ہو اس سے دنیا کے امن کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے" پر فیسر بین شاہد نے کانفرنس میں پاکستان کا مقدمہ پیش کیا انہوں نے بتایا "میں ایک عیسائی پاکستانی ہوں، میں دیکھتا کننٹی میں پڑھا تھا ہوں لہذا آپ مجھے ایک ذمہ دار عیسائی کہہ سکتے ہیں، میں آج دعوتی سے کہتا ہوں پاکستان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، ہم سب پاکستان میں امن اور اطمینان سے رہ رہے ہیں" پر فیسر بین شاہد اور جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب کی گفتگو تمام شرکاء نے سراہی، انہوں نے کہا "جب تک دنیا کی منہاجوب قوموں میں سلامتی کا لگن نہیں ہوتا اس وقت تک امن قائم کس ہو سکتا، ہم نے اس کانفرنس میں شریک ہو کر ڈائیلاگ کا آغاز کر دیا اب آپ لوگ آگے بڑھیں تاکہ دنیا جنگوں اور نفرتوں سے باہر آسکے۔" اس کانفرنس کے آخر میں تمام مذاہب کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے عبادت کی، اساسی شہر میں امن مارچ کیا اس کیلئے شمعیں جلائیں، ایک دوسرے کو پھول پیش کئے اور امن کیلئے اجماعی دعا کی۔

اساسی کی امن کانفرنس ایک اچھی روایت ہے لیکن اس کے پلیٹ فارم اور دائرہ کار کو مزید وسعت ملنی چاہیے، دینی کنٹری کو اسے صدارتی سطح تک لے جانا چاہیے اور اس میں پوپ اور امام کب کو بھی شریک ہونا چاہئے، پاکستان امن کے معاملے میں فرنٹ لائن منیت ہے لہذا پاکستان کو اس کانفرنس میں سرکاری طور پر شریک ہونا چاہیے، میں پچھلے دنوں اٹلی گیا تو وہاں پاکستان کے چند مقامی لیڈروں نے بتایا وہ کوشش کر رہے ہیں اگلے سال دینی کنٹری سید شاہد حسین کو سردارن طور پر دعوت دے، ان کا ہوا دعوتی کنٹری میں سید شاہد حسین سے بارے میں بڑی اچھی رائے پائی جاتی ہے، دینی کنٹری کی قیادت انہیں سکالر اور معتدل پاکستانی لیڈر سمجھتی ہے پوپ تک ان کے نام سے واقف ہیں لہذا پاکستانیوں کی خواہش ہے اگلے سال سید شاہد حسین پاکستان

ذیروہاگت 3.....0.....285

کا دھڑلے کر اساسی آئیں، مجھے ان لوگوں نے مشاہدہ حسین کو یہ پیغام دینے کی ذمہ داری سونپی، میں نے وائیس آکر شاہ صاحب سے رابطے کی کوشش کی لیکن شادی آج کل سیاسی جوتوڑ میں مصروف ہیں لہذا ان سے ملاقات نہ ہو سکی تاہم مجھے یقین ہے شاہ جی اگلے سال تک فارغ ہو چکے ہوں گے اور ان کے پاس امن اور اساسی دونوں کیلئے بڑا وقت ہوگا۔ میں وائیس اساسی کانفرنس کی طرف آتا ہوں۔ یہ حقیقتاً ایک بڑا چیلنج فارم ہے لہذا پاکستان کو اس پر توجہ دینی چاہئے، طارق جمالی دینی کن سٹی اور اعلیٰ حکومت کے قریب ہیں چنانچہ ہماری حکومت ان کی مدد سے پوپ کے خلیفے تک پہنچ سکتی ہے جس کے نتیجے میں پاکستان کا بین الاقوامی امیج بہتر ہوگا۔

دنیا کے تمام مذاہب میں دو چیزیں مشترک ہیں، ایک محبت اور دوسری امن، ہم سب لوگ اگر ان دو چیزوں کو عالمی اصول بنالیں تو مجھے یقین ہے دنیا کی تمام توپوں کے دھانوں میں پھول اگ آئیں اور ساری چھاؤنیاں زرسریوں کی شکل اختیار کر جائیں اور دنیا حقیقت میں رہنے کے قابل ہو جائے گی لیکن سب سے اس زمین کے لوگوں کے پاس محبت کے لئے وقت ہے اور مذہب

Kashmir Azad@OneUrdu.com



ملک بھی ہکتو ہوتے ہیں

بھٹو اندرون و خلیج کے بڑے دلچسپ کردار ہوتے ہیں یہ لوگ مہمان کی خانمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کا اہم مقصد چودھریوں کے جرائم کی سزا بھگتنا ہوتا ہے پنجاب کے وزیر نے سردار اور چودھری اپنے کیوں میں سے مضبوط تہ کاٹنے کے نو جوان الگ کر لیتے ہیں اور انہیں بھٹو کا عہدہ دے کر اپنا قرب مناسبت کر دیتے ہیں جس کے بعد یہ لوگ خصوصی سلوک کے مستحق ہو جاتے ہیں پنجاب کے چودھری سردار اور وزیر سے موما عالم ہوتے ہیں یہ لوگ کمزوروں کے ساتھ زیادتی کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں آج سے سو پچاس برس پہلے تک ان کی تریاد تیاں بے لگام ہوتی تھیں اور یہ لوگ اگر دس میں بند سے قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی ان کے سامنے آ نہیں کرتا تھا لیکن جب انسانی حقوق کا دور شروع ہوا اور قانون نے پھیل کر چوہنے فرعونوں کو اپنے دائرے میں لے لیا تو یہ لوگ بھٹو کا ہاتھ "حکومت" بنانے پر مجبور ہو گئے اب یہ لوگ ظلم کرتے ہیں عورتوں کو اغوا کرتے ہیں ان کی آبروریزی کرتے ہیں دشمنوں پر تشدد کرتے ہیں اور گاؤں کے گاؤں قتل کر دیتے ہیں لیکن جب پولیس آتی ہے تو ان کا کوئی نہ کوئی بھٹو آگے بڑھ کر چودھری صاحب کا جرم اپنے سر لے لیتا ہے جس کے بعد بھٹو پولیس کچھریوں اور جیلوں میں چودھری صاحب کے حصے کی سزا بھگتتا ہے چودھری صاحبان اس کی غیر موجودگی میں اس کے خاندان کا خیال رکھتے ہیں اور جب بھٹو "سزا" کاٹ کر واپس آتے ہیں تو چودھری اس کے اعزاز میں بہت

بڑی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جس میں ان کی قربانیاں اور خدمات یوں خاصیت سے تذکرہ کیا جاتا ہے۔

میں نے خود ایک بار اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو بھٹو بننے دیکھا میں ڈی جی خان کے ایک سردار صاحب کے ساتھ سفر کر رہا تھا سردار صاحب میرے ساتھ گفتگو بھی فرما رہے تھے اور ڈرائیونگ بھی کر رہے تھے یہ رات کا وقت تھا، دوران سفر ہماری لینڈ کروزر ایک چھوٹی ایف ایکس کے ساتھ ٹکرائی، حادثہ شدید تھا ہم لوگ بڑی گاڑی میں ہونے کی وجہ سے صاف بچ گئے لیکن ایف ایکس کے مسافر شدید زخمی ہو گئے سردار صاحب نیچے اترے انہوں نے ایف ایکس کا جائزہ لیا، اپنے گاڑی زمین سے ایک لمبے ترانے لہو جان کو قریب پایا لینڈ کروزر کی چابی اس کے حوالے کی اور مجھے دوسری گاڑی میں بٹھا کر آگے روانہ ہو گئے میرے لئے یہ انتہائی خوفناک صورتحال تھی میں حادثے میں کا شکار ہونے والوں کیلئے سوگوار تھا جبکہ سردار صاحب ڈرائیونگ اور میوزک سے لطف اندوز ہو رہے تھے سردار صاحب نے میری طرف دیکھا مجھے تسلی دی اور دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو گئے میرے اوسان ڈرا سے بھال ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا "خداوند کا شکار ہونے والوں کا کیا ہے گل انہوں نے فرمایا "سردار بندہ ایک سردار ہے گاڑی میں نے پوچھا "اگر پولیس تیس بن گیا تو؟" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرا بندہ یہ جرم اپنے سر لے لے گا اور میری جگہ لڑائی ہو جائے گا" میں نے حیران ہو کر پوچھا "اس کے بعد کیا ہوگا؟" وہ نے "اس کے بعد میں اپنے بندے کو چھڑانے کی کوشش کروں گا سفارش اور رشوت کا سہارا لوں گا اگر کامیابی نہ ہوئی تو میں اچھے سے اچھے وکیل کا بندوبست کروں گا" میں نے پوچھا "اور اگر اس کے بعد بھی وہ رہا نہ ہوا تو؟" انہوں نے قہقہہ لگایا "تو پھر کوئی بات نہیں وہ میری جگہ پولیس کی مار کھائے گا اور جیل میں رہے گا یہ میرا محسو ہے اور یہ اس کی جانب ہے" میں نے زندگی میں پہلی بار اس نوعیت کی جانب سے سنی تھی۔

یہ ہوتے ہیں بھٹو! آپ نے اکثر اخبارات میں خبریں پڑھی ہوں گی فلاں ڈیرے نے اتنے بار یوں کے ساتھ مل کر فلاں خاتون کی آبروریزی کی میں جب شروع شروع اس قسم کی خبریں پڑھا تھا تو سوچتا تھا دوڑیے ال ٹیل - ہم میں سے ہاریوں کو یوں سانس کر لیتے ہیں میں نے سردار صاحب جیسے لوگوں سے اس بارے میں پوچھا تو پتہ چلا یہ باری بھٹو ہوتے ہیں اور ڈیرے خود کو قانون سے بچانے کیلئے انہیں استعمال کرتے ہیں! پتہ چلا جب ڈیرے کسی خاتون

کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو وہ بعد ازاں خاتون کو اپنے ہتھیاروں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ اگر "خدا نخواستہ" پولیس کیس بن جائے اور طبی معائنے بہت دیر وار صاحب سچ جائیں اور سزا کا پھندا اس ہتھیار کے نیچے میں آ پڑے جس نے آخری سر تہ خاتون کے ساتھ زیادتی کی تھی اسی طرح ڈائریس میڈیسی سے پہلے اپنی ہدف عورتوں کو ہتھیاروں کے نکاح میں دے دیتے ہیں یہ نکتہ کانگریسی ہونے میں یہ خواتین ڈائریس کے حرم سراؤں میں رہتی ہیں لیکن ان کے زوجہ کے خانے میں کسی ہتھیار کا نام ہوتا ہے اگر اس دوران خاتون ماں بن جائے تو ڈائریس خاتون کو ہتھیار کے حوالے کرتے ہیں اور اس کا وظیفہ لگا دیتے ہیں یہ ہندو بست بھی قانون کی مداخلت سے بچنے کیلئے کیا جاتا ہے ہتھیار اپنے اس کردار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لہذا وہ چپ چاپ چند دھریوں سرداروں اور ڈائریس کے جرموں کی جھنجھکیاں نہیں لیتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں اگر انہوں نے اس نظام میں زندگی گزارنا ہے تو انہیں سرداروں کے نفسیاتی امراض کا ایندھن بننا پڑے گا انہیں اپنے ناکرد و جرائم کی سزا اٹھانا پڑے گی چنانچہ جب بھی کوئی چند دھری کسی ہتھیار کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ چپ چاپ آگے بڑھتا ہے اپنا کان بچھری کے منہ کے قریب لگاتا ہے اور اپنی کھوپڑی دھری کے منہ سے دھرتا ہے ہتھیار سے اذیت کر کے پولیس کے سامنے نہیں آتا جاتا ہے ہمارے دیہات کے ڈائریس اپنے ہتھیاروں کی تعداد پر فخر بھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے دوست ڈائریس کو "اومار" بھی دیتے رہتے ہیں۔

میں 30 اکتوبر 2006 تک یہ سمجھتا تھا یہ روایت صرف ہمارے دیہات تک محدود ہے لیکن جب بھری کی سچ باجوڑ ایجنسی کے علاقے ڈسڈولا میں امریکی طیاروں نے ایک دیہی مدرسے پر بمباری کی اور اس حملے میں 83 طالب علم اور اساتذہ شہید ہو گئے اور ہماری حکومت نے اس کا معلوم حملے کا جرم اپنے سر لے لیا تو مجھے محسوس ہوا ہتھیاروں کے دیہات تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ قومیں اور ملک بھی ہو سکتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم نے صرف امریکہ کے ہتھیاروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں بلکہ چند دھریوں کے صاحب کے تمام جرائم اپنے سر لیتا ہماری قومی اور ملی ڈسڈواری ہے آج اس حملے کو چار دن گزر چکے ہیں ان چار دنوں میں ثابت ہو چکا ہے مولا تالیقات کے اس مدرسے میں صرف غریب طالب علم پڑھتے تھے اور مدرسے میں کوئی شریک نہیں تھا امریکہ کے ذرائع ابلاغ اعتراف کر رہے ہیں اس مدرسے پر امریکی طیاروں نے ٹھنٹک کی بنیاد پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں 83 بے گناہ اور معصوم بچے شہید ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود ہم لوگ

رضا کارازہ سمجھو میں چکے ہیں! ہم یہ جرم اپنے سر لے رہے ہیں! کون؟ میرا خیال ہے ہم لوگ اقوام عالم میں اپنے لئے سمجھو کا کردار پسند فرما چکے ہیں اور ہم غلامی کی اس سطح تک پہنچ چکے ہیں جہاں غلام اپنی غلامی پر فخر کرنے لگتے ہیں! میں جب بھی اس صورتحال پر غور کرتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں امریکہ کا شکر یہ ادا کروں کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے یہ امریکہ کی خاص مہربانی ہے اس نے ابھی تک پاکستان کی تمام مسجدوں اور مدرسوں پر حملوں کا فیصلہ نہیں کیا! اس نے ابھی تک بیس کلمہ پڑھنے، دوازمی رکھنے اور ٹوپی پہننے کی اجازت دے رکھی ہے ورنہ ہماری حکومت نہ صرف اس امر کی اقدام کی بھی حمایت کر دیتی بلکہ وہ سمجھو میں کر یہ "کار خیر" بھی اپنے ذمے لے لیتی! میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں و اللہ کر بلا ہمارے دور میں پیش نہیں آیا ورنہ ہم خدا نخواستہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کو بھی اپنا کارنامہ قرار دے دیتے اور ہم اس معاملے میں بھی سمجھو بن جاتے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا

موشے کاتساؤ اسرائیل کے صدر ہیں۔ کاتساؤ کا پس منظر بہت دلچسپ تھا وہ 1945ء میں امریکہ کے شہر نیو یارک میں پیدا ہوئے ان کے والدین کمزیر یہودی تھے 1948ء میں ان کے والدین تہران منتقل ہوئے اور 1951ء میں یہ لوگ اسرائیل چلے گئے کاتساؤ نے 24 سال کی عمر میں سیاست شروع کی اور دہلی خود پارٹی کے کنگ پر اسرائیل کے چھوٹے سے قصبہ قیریاہ کے میئر منتخب ہو گئے وہ اسرائیل کے کم عمر ترین میئر تھے وہ 1969ء میں ہیکل پار پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے 1981ء میں وہ ہاؤسنگ کے نائب وزیر بنے اور اس کے بعد وہ مختلف اداروں میں وزیر بننے چلے گئے جولائی 2000ء میں انہوں نے مشہور سیاستدان اور سابق وزیر اعظم شمعون پیرز کے مقابلے میں صدارتی الیکشن لڑا اور اسرائیل کے صدر منتخب ہو گئے وہ اسرائیل کی تاریخ کے پہلے صدر ہیں جو 7 سال کیلئے منتخب ہوئے ہیں موشے کاتساؤ میں پانچ خوبیاں ہیں وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی اسلامی ملک میں پیدا ہونے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں ان کی مادری زبان فارسی ہے وہ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم کوکلت دے کے صدر بنے ہیں اور وہ ملکی مسائل سے تعلق رکھنے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں۔

موشے کاتساؤ کی زندگی اور سیاست اس وقت شدید بحران کا شکار ہے۔ جولائی 2006ء میں ایک یہودی خاتون نے موشے کاتساؤ کے خلاف زیادتی کا پہلا کیس درج کرایا

پولیس کو ابتدائی تفتیش میں خاتون کی بات سچ محسوس ہوئی لہذا 22 اگست 2006ء کو پولیس نے ایوان صدر پر ریڈ کیا۔ صدر کے تمام کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لئے اور صدر کے خلاف تفتیش شروع کر دی۔ پولیس ریڈ کی خبریں شائع ہوئیں تو بے شمار خواتین نے صدر کے خلاف جنس زیادتیوں کے مقدمے درج کرنا شروع کر دیئے۔ پولیس کو معلوم ہوا موٹے کاٹاؤ، ماضی میں خواتین کو ملازمت دیتے تھے اور اس ملازمت کی آڑ میں ان کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ پولیس نے وہ خواتین کے مقدمے درج کئے اور اعلیٰ سطح پر ان مقدموں کی تفتیش شروع کر دی۔ 23 اگست کو صدر کے خلاف پہلی تفتیش شروع ہوئی اور 7 ستمبر کو چوتھے مقدمے پر کام شروع ہو گیا۔ 13 ستمبر 2006ء کو صدر نے ایوان صدر میں نئی انکیشن کمشنر مس بشیش سے حلف لیا تھا اسرائیل کے آئین کے مطابق یہ حلف صرف صدر لے سکتا ہے لیکن اس دن صدر کی تفتیش تھی، اسرائیلی قانون کے مطابق کوئی زیر تفتیش ملزم پولیس کی اجازت کے بغیر تفتیش سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ موٹے کاٹاؤ نے اس تقریب میں شرکت کیلئے پولیس چیف کو درخواست دی لیکن پولیس چیف نے تفتیش موخر کرنے سے انکار کر دیا۔ صدر نے پارلیمنٹ سے معذرت کر لی جس کے بعد اسرائیلی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ تقریب ایوان صدر کی بجائے پارلیمنٹ میں منعقد ہوئی اور انکیشن کمشنر کا حلف اسرائیل کی پارلیمنٹ میں ادا کیا گیا۔ اس دن پولیس نے صدر موٹے کاٹاؤ سے نو گھنٹے تفتیش کی یہ تفتیش صبح دس بجے شروع ہوئی اور شام سات بجے تک چلتی رہی۔ پولیس کے مطابق جب تک یہ تفتیش جاری رہے گی اس وقت تک صدر موٹے کاٹاؤ کی سرکاری مصروفیات معطل رہیں گی اور وہ پولیس کی اجازت کے بغیر کسی جگہ جا سکیں گے اور نہ ہی کسی تقریب میں شرکت کریں گے۔

یہ عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن کے نظام عدل کی تازہ ترین مثال ہے۔ ہمیں جب اسرائیلی صدر موٹے کاٹاؤ کا کیس پڑھا تھا تو میں نے سوچا، کیا اسلامی دنیا کے 62 ممالک میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا پاکستان سے لے کر ایتھوپیا تک کسی اسلامی ملک کی پولیس برسر اقتدار صدر کے خلاف مقدمہ درج کر سکتی ہے؟ کیا کسی اسلامی ملک کی پولیس ایوان صدر میں داخل ہو سکتی ہے؟ وہ صدر کے کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لے سکتی ہے؟ کیا وہ صدر سے نو گھنٹے تفتیش کر سکتی ہے اور کیا کسی اسلامی ملک کا کوئی صدر سرکاری تقریب میں شرکت کیلئے پولیس سے اجازت لے گا اور کیا کسی اسلامی ملک کا پولیس چیف صدر کی درخواست پر نامتکوار گھنٹے کی جرأت کرے گا؟ میرا جواب الٹا تھا، میرا خیال ہے اگر یہ سوال آپ سے بھی پوچھا جائے تو آپ بھی

انکار میں سر بلا دیں گے، آپ کا یہ انکار بنیادی طور پر ترقی، عروج اور عزت کا نقطہ آغاز ہے یہ
 ”ہمیں“ آگے چل کر قوموں کا عروج و زوال ملے کرتا ہے میرے بے شمار قارئین کیلئے یہ بات نئی
 ہوگی کہ اسرائیل نے انصاف اور عدل کا یہ نظام اسلام سے لیا تھا، آج سے چودہ سو سال پہلے
 یہودیوں اور مسلمانوں کے نظام عدل میں بڑا فرق تھا، یہودی دنیا کی پہلی قوم تھی جس میں بالائی
 اور زیریں طبقہ پایا جاتا تھا، ان کا بالائی طبقہ قانون کی گرفت سے آزاد سمجھا جاتا تھا جبکہ زیریں
 طبقوں پر پورا پورا قانون نافذ کر دیا جاتا تھا، آپ نے میرت کی کتابوں میں بنو مخزوم کی ایک
 خاتون فاطمہ کا واقعہ پڑھا ہوگا، اس خاتون کو نبی اکرمؐ نے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی اور بعض صحابہؓ
 کرام نے اس کی سزا دے دی تھی جس پر نبی اکرمؐ نے بڑے تاریخی الفاظ فرمائے تھے، آپ نے
 فرمایا تھا تم سے پہلی قومیں اس لئے برباد ہو گئیں کہ جب ان کا کوئی معزز شخص جرم کرتا تھا تو اسے
 جھوڑ دیا جاتا تھا لیکن جب کسی عام شخص سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اس کو سزا دے دی جاتی تھی
 آپ نے فرمایا، خدا کی قسم اگر یہ فاطمہ بنت محمدؐ ہوتی تو مجھ میں اسے سب سے زیادتی ہوتی، اس واقعے میں
 نبی اکرمؐ کا اشارہ یہودیوں کی طرف تھا، لیکن اس زمانے کے یہودی بالائی طبقے کے محرموں کو جھوڑ
 دیا کرتے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عدل اجتماعی کی بنیاد
 رکھی، جس میں قاضی کی عدالت میں پہنچ کر ظیفہ اور مسائل ایک ہو جاتے تھے، بڑا مشہور واقعہ ہے
 حضرت عمرؓ کے دسترخوان پر حضرت علیؓ کھانا تناول فرما رہے تھے اور ایک یہودی نے آکر عرض کیا
 حضرت علیؓ میرے لڑم ہیں، حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو اپنے دسترخوان سے اٹھا کر مسائل کے
 ساتھ کھڑا کر دیا اور حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو زنا کے جرم میں اپنے
 ہاتھوں سے کوڑے مارے تھے، یہ واقعہ اس وقت دنیا کی قانون کی تمام کتابوں میں درج ہے
 خلفائے راشدین کے دور میں تمام خلفاء کئی بار قاضیوں کے سامنے پیش ہوئے اور اسلامی عدل
 کے نظام سے گزرے، نیز ایہ اسلام تھا جس نے احتساب اور انصاف کا ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس
 میں ایک عام بددکھڑا ہو کر ظیفہ سے دوسری چادر کا حساب مانگ لیتا تھا اور جس میں گورہ اور کالا
 عربی اور گچی چھوٹا اور بڑا سب برابر تھے، آنے والے اژدار میں دنیا کی ہر اس قوم نے اسلام کے
 اس نظام کو اپنے لئے شتمل راہ بنالیا جو ترقی کرنا چاہتی تھی، جو اقوام عالم میں آگے بڑھنا چاہتی تھی
 آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے، دنیا کی جس قوم نے اسلام کے اس نظام عدل سے استفادہ کیا وہ
 چند برسوں میں ہر پارہ بن گئی، اس نے دنیا پر بھرائی کی یہاں تک کہ یہودی تک اسرائیل میں عدل

زیر پبلیکیشن 3.....0.....293

کا اسلامی نظام نافذ کرنے پر مجبور ہو گئے لہذا آج ان کے سربراہ بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عدل کے اس عمل سے گزرتے ہیں جس سے اسلام کے ابتدائی دنوں میں ہمارے اکابرین کو گزرتا پڑا تھا آج ہمارے دشمنوں کے ملک میں بھی وہ نظام نافذ ہے جس پر کبھی ہم فخر کیا کرتے تھے۔

میں نے جب کاتساؤ کا کیس پڑھا تو میرے دل سے آؤٹلی اور میں نے اپنے آپ سے کہا 'کاش یہ واقعہ کسی اسلامی ملک میں پیش آیا ہوتا' کاش مویشے کاتساؤ کی جگہ کسی اسلامی ملک کا صدر ہوتا تو آج ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوم ہوتے آج ہم بھی عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوتے اور آج ہمیں آریٹج جیسے لوگوں سے بچنے کیلئے باجوڑ میں اپنے بچے قتل نہ کرنا پڑتے' میں نے سوچا 'کاش مویشے کاتساؤ مسلمان صدر ہوتا' کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے

برطانوی وزیر مہا عظیم ٹونی بلیر نے 20 نومبر 2006ء کو نیشنل مسجد کا دورہ کیا تھا۔ تمہیں
 مجھے کھرب تک سیکورٹی باجٹار لیکن مسجد میں داخل ہونے اور انجیلوں کے گھر کا تمام انتظام

دائیرہ "سنہال نیا مسجد کا لاؤڈ سپیکر قبضے میں لے لیا گیا" مسجد میں موجود تمام زائرین سیاحوں
 اور نمازیوں کو باہر نکال دیا گیا اور مسجد کے چپے چپے کی آٹھٹی شروع ہو گئی اس آٹھٹی کے دوران نماز
 عصر کا وقت ہو گیا، مسجد کے منتظمین نے سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو وقت کی نشاندہی
 کی اہلکاروں نے حکم دیا "نماز عصر مؤخر کر دیں" سننے والوں میں سے ایک شخص نے تڑپ کر جواب
 دیا "نماز مؤخر نہیں ہو سکتی" اہلکاروں نے اسے گھور کر دیکھا لیکن پھر صورتحال کی نزاکت بھانپ کر
 خاموش ہو گئے، مؤذن نے اذان دینے کی اجازت طلب کی انتظامیہ نے منظوری تو دے دی لیکن
 لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہ دی، مؤذن نے لاؤڈ سپیکر کے بغیر اذان دے دی، امام
 صاحب معترضہ وقت پر اپنے حجرے سے نکلے لیکن انتظامیہ نے انہیں مسجد کے احاطے میں داخل نہ
 ہونے دیا وہ تھوڑی بہت عکرا کر کے بعد واپس لوٹ گئے اس وقت مسجد کے احاطے میں کوئی نمازی
 کوئی سیاح اور کوئی زائر نہیں تھا، مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے والے بھی نہیں تھے لہذا وہاں موجود
 تین چار لوگوں نے "جماعت" بنائی اور چپ چاپ نماز ادا کر کے باہر نکل گئے یہ فیصل مسجد کی پہلی
 نماز تھی جس کیلئے باقاعدہ صف بندی ہوئی اور نئی نمازیوں کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے دیا گیا۔

29 نومبر کی صبح اسلام آباد کے ایک صحافی نے اس واقعے کے بارے میں خبر دی وہی اس خبر کی تصدیق برطانیہ کے ایک صحافی نے بھی کی یہ صحافی فیصل مسجد میں ہونے والی ساری کارروائی مانیٹر کر رہا تھا دارالحکومت کی انتظامیہ اسے وزیراعظم ٹونی بلیر کا سیکورٹی ایگراڈجسٹی ری قبضہ اس صحافی نے اپنی آنکھوں سے حکومت کی روشن خیالی اور استدلال پسندی کا مظاہرہ دیکھا اور شام کو مجھے اس کی ساری روداد سنائی یہ منظر بیان کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا "جب اسلامی ممالک کے حکمران یورپ کے چمچے کا دورہ کرتے ہیں تو ہم وہاں انہیں سیکورٹی فراہم نہیں کرتے ہم ان کیلئے چرچوں میں موجود وزیروں کو باہر نہیں نکالتے لیکن یہ آپ لوگوں کا کمال تھا آپ نے ہمارے وزیراعظم کے اعزاز میں نہ صرف مسجد خلی کرائی بلکہ نماز تک نہ ہونے دی" اس کا کہنا تھا "ٹیکس ایون کے بعد یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے ہمارے بعض کٹر شہری مسجدوں کو نشانہ بنانے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں پیچھے پانچ برسوں میں ہمارے بے شمار لوگوں نے مسجدوں میں آقا نہیں بند کرانے کیلئے حکومت کو درخواستیں دی ہیں لیکن ہماری حکومتوں نے کسی مسجد پر پابندی لگائی کسی مسجد میں نماز رکوعی اور نہ ہی اذان کے خلاف کوئی حکم جاری کیا آج بھی یورپ اور امریکہ کی تمام مسجدوں میں اذانیں پڑھتی ہیں اور مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں اس نے کہا "برطانیہ کے جس وزیراعظم کے استقبال کیلئے اذان اور نماز رکوعی کی بھی اس وزیراعظم کے ملک میں تمام مسجدیں آزاد ہیں وہاں دن میں پانچ بار لاؤڈ سپیکر پر اذان ہوتی ہے" میں نے اس سے عرض کیا "تمہارے اور ہمارے ملک کے حالات میں بڑا فرق ہے تمہارے ملک کی سیکورٹی ایجنسیاں اور امن دہان کے ادارے تشکیل ہیں تم لوگ مسندوں کی دیواروں کے پیچھے محفوظ ہو جبکہ ہم لوگ فرزند لائین سٹیٹ ہیں ہمارے ملک میں حملے کرنے والے لوگ موجود ہیں لہذا ہمیں اس قسم کے بندوبست کرنے پڑتے ہیں" اس نے قہقہہ لگایا اور خاموشی سے اپنے لیب ٹاپ کے ساتھ کھینچنے لگا۔

میں نے اسے سمجھائی تھی وہی دل دے کر خاموشی تو کرادیا لیکن میں اندر سے مطمئن نہ ہوا لہذا میں نے اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی 'دو مجھے قرآن مجید سے ایسی آیات نکال کر دے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں اور نمازوں پر پابندی لگانے والوں کے بارے میں وعید سنائی ہو میرے ساتھی ایک عالم دین اور قرآن فہم شخص ہیں ان کی زندگی کا ایک لمبا حصہ مدارس میں تعلیم پاتے اور بعد ازاں تعلیم دیتے گزارا وہ آج کل دین کے بارے میں میری تربیت کر رہے ہیں انہوں نے میرے سامنے سورۃ البقرہ کی ایک آیت رکھ دی یہ سورۃ البقرہ کی 114 نمبر آیت تھی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا "اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے دیران (دمطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا (بلکہ جب جاتے ہیبت اور اب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نقص) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی" یہ حکم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ تھا میں نے جب یہ آیت پڑھی تو میں روح کی گہرائی تک دہل گیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہم جیسے لوگوں کے لئے اتاری تھی اللہ تعالیٰ جانتے تھے پاکستان کے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ آئے گا جو غیر ملکی سربراہان کو خوش کرنے کیلئے مسجدوں کو نمازیوں سے خالی کرائے گا جو مؤذن کو اذان اور امام کو امامت سے روک دے گا جس کی نظر میں دین کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی اور جو شعار اسلام کا کھلم کھلا مذاق اڑائے گا جس کے دور میں اذان نماز و اڑھی اور ایمان مشکوک ہو جائیں گے جس کے عہد میں اہل ایمان کو بائیسوں اور وہشت گنہگاروں کا نام دیا جائے گا جس کا ذکر نہیں ہر لادین ہے ان اور خرب پست شخصیں مطلق اور دشمن خیال سمجھا جائے گا اور جس دور میں لادین خواتین و حضرات مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مسلمان دکھائی دیں گے میں نے جوں جوں اس آیت پر غور کیا مجھے محسوس ہوا خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن ظالموں کا ذکر کیا تھا وہ لوگ ہمارے اوپر موجود ہیں اور ہم نہ صرف ان کے ہاتھوں پر ہیبت کر چکے ہیں بلکہ ان کا ہر ظلم اور ہر زیادتی چپ چاپ سہہ رہے ہیں میں نے محسوس کیا یہ لوگ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اسمے ہر فرمان ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ظالم کا خطاب دینے پر مجبور ہیں میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا اللہ تعالیٰ کی نظر میں ظالم لوگ کون ہوتے ہیں میرے ساتھی نے جواب دیا اللہ تعالیٰ فرعونوں، نمرودوں، شدادوں اور ابو جہلوں کو ظالم سمجھتا ہے میں نے یہ آیت دوسری مرتبہ پڑھی میں جب آیت کے آخر تک پہنچتا تو میں ظالم لوگوں کے انجام سے خوف زدہ ہو گیا اللہ تعالیٰ نے اپنی آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا "ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نقص) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی" میں آیت کے اس حصے کو علامہ کرام پرچھوڑتا ہوں وہ یہ لکھ کریں اللہ تعالیٰ کی نظر میں رسوائی اور سزائے عظیم ہوتی ہے جس کو اس کا جانا ہوں خود اللہ تعالیٰ کی آیت 114 کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے بس آخری حصہ پورا ہونے کی دیر ہے بس اب رسوائی اور سزائے عظیم پاتی ہے۔

پاسپ لائن کی بجائے

موسیٰ حسین شیراز کارہنے والا تھا، وہ امریکہ سے مشینری درآمد کرتا تھا، اسے کاروبار کی

جگہ سے برصغیر اڑکھانا ہرانا تھا، دو تہران سے روٹی جاتا تھا اور وہی لے لے پارک۔ 2005ء

کے آخر میں وہ نیویارک گیا۔ وہ پولٹری فیڈ بنانے والی جدید مشینیں خریدنا چاہتا تھا، وہ سہ ماہی

بجے جان ایف کینڈی ایئر پورٹ پر دفتر اس نے لہا اور بھاری کوٹ بچن رکھا تھا، امریکہ کی سیکورٹی

اجنسیوں نے اسے روکا اور تاشی کیلئے اس کے کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی

جہاں سے بیسیوں مسافر گزر رہے تھے، موسیٰ کو سکی کا شدید احساس ہوا لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا

راستہ نہیں تھا، وہ خاموش کھڑا ہوا، اجنسیاں تاشی کے اس عمل سے مطمئن نہ ہوئیں چنانچہ اسے

تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا، وہاں رات دو بجے تک اس کی تفتیش ہوتی رہی، موسیٰ حسین بلڈ

پریشر اور شوگر کا مریض تھا، اس کا بلڈ پریشر براہ گیا اور اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ انکار گھبرا

گئے چنانچہ وہ اسے ہسپتال لے گئے۔ موسیٰ چار دن ہسپتال میں رہا، ان چار دنوں میں اس کے

خاندان کو شدید پریشانی لاحق رہی، اس کے کاروبار کا بھی حرج ہوا اور اسے ہسپتال کو بھی 18 ہزار

ڈالر ادا کرنے پڑے۔ اسی دوران امریکہ کی اجنسیوں نے موسیٰ حسین کو "رنگینی" بھی قرار دے

دیا، اس کے بعد وہ نئی دہلی میں تاشی اور کرنی شروع کر دی گئی۔ وہی - من دہلی سہراں

چھپا تو اس نے مقامی اخبارات میں اپنی ساری روداد شائع کرادی۔ موسیٰ حسین کا کہنا تھا اگر

امریکی ادارے امریکہ میں ایرانی شہریوں کی تلاش لے سکتے ہیں، اگر امریکہ نے ایرانیوں کیلئے فنکر پرنس اوزم فرار دے دیئے ہیں تو ایران ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ یہ مسئلہ اخبارات سے ہوتا ہوا ایران کی پارلیمنٹ میں گیا۔ 2006ء کے وسط میں اس پر بحث شروع ہوئی اور یہ بحث 19 نومبر کو قانون کی شکل اختیار کر گئی۔ ایران کی پارلیمنٹ نے 26 کے مقابلے میں 135 ووٹوں سے یہ قانون منظور کیا۔ 2007ء سے ایران کی حدود میں داخل ہونے والے تمام امریکی شہریوں کے فنکر پرنس لیے جائیں گے۔ یہ قانون منظور ہو گیا لیکن ایرانی صدر محمود احمدی نژاد اس سے مطمئن نہیں تھے لہذا انہوں نے اس کے خلاف گارڈین کونسل میں اپیل کر دی۔ ایران میں گارڈین کونسل پارلیمنٹ کے کسی بھی قانون کو ویزو کر سکتی ہے۔ یہ کونسل ہر دو ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے چھ سیاسی و مذہبی لیڈر ہوتے ہیں جبکہ 16 ارکان کا تعلق عدالتوں سے ہوتا ہے۔ ایرانی صدر نے اپنی اپیل میں خیال ظاہر کیا "ایران کے اختلافات امریکی حکومت سے ہیں امریکی حوام سے نہیں اور اس قانون سے مسافروں اور سیاحوں کو تکلیف ہوگی جس سے ایران اور امریکہ کے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں گے" ایرانی صدر کا موقف تھا "فنکر پرنس کے عمل سے امریکی شہریوں کے حیزبانوں کو بھی شرمندگی ہوگی چنانچہ ہمیں اس قانون سے پرہیز کرنا چاہیے" گارڈین کونسل نے اس قانون اور ایرانی صدر کی اپیل کا از سر نو جائزہ لیا اور آخر میں صدر کی درخواست مسترد کر دی۔ گارڈین کونسل کے ترجمان عباس علی کا کہنا تھا "امریکہ میں ایرانیوں سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو روز شرمندگی ہوتی ہے اگر امریکی اس شرمندگی کا تھوڑا سا حصہ واپس لے لیں گے تو قیمت نہیں آجائے گی۔ ایرانی پارلیمنٹ قانون پاس کر چکی ہے لہذا کوئی امریکی شہری اب اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔"

ایران دنیا کا دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف اتنا سنگین قانون بنایا۔ امریکہ نے ہائٹ ایلیون کے بعد جب فنکر پرنس اور تلاش کا کام شروع کیا تھا تو برازیل دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے اپنے ایئر پورٹس پر صرف امریکیوں کی تلاش اور فنکر پرنس شروع کر دیئے تھے لہذا دسمبر 2003ء سے آج تک برازیل کے تمام ایئر پورٹوں پر صرف امریکیوں کی تلاش اور فنکر پرنس لیے جاتے ہیں۔ صدر ہش سمیت ساری امریکی انتظامیہ اس امتیازی سلوک پر برازیل سے بار بار احتجاج کر چکی ہے لیکن برازیل حکومت کا کہنا ہے یہ ان کی عدالت کا حکم ہے لہذا حکومت اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ برازیل کے بعد ایران دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف

انتظامیہ ایکشن لیا۔ اگر ہم امریکہ اور ایران کے موجودہ سفارتی تعلقات کو سامنے رکھ کر اس قانون کا جائزہ لیں تو یہ قانون سیدھی سادی خود کشی محسوس ہوتا ہے۔ ایران امریکہ کی ہٹ لسٹ میں شامل ہے۔ امریکہ پچھلے پانچ برس سے ایران پر حملے کیلئے جہان کشاں کر رہا ہے۔ امریکی فوج ترکمانستان، آذربائیجان، ترکی، عراق، قطر، افغانستان اور پاکستان کی طرف سے ایران کا گھیرا ٹھک کر رہی ہے۔ ایران پر دہاؤ ڈالنے کیلئے بلوچستان میں نئے ہوائی اڈے اور چھاؤنیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اتحادی فوجیں ایران کی سرحد تک پہنچنے کیلئے قندھار اور ہرات میں طالبان کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ امریکی فوجیں ترکمانستان، آذربائیجان اور ترکی میں اتر رہی ہیں اور قطر کے امریکی ایئر بیس پر امریکی سرگرمیوں میں اضافہ ہو چکا ہے، امریکہ کے اپنے تجزیہ نگاروں کو خدشہ ہے صدر اہلی صدارتی مدت ختم ہونے سے پہلے ایران اور شام پر حملہ کرے گا۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے ری پبلکن پارٹی اور اہلی خانہ ان پوری دنیا پر عیسائی غلبہ چاہتا ہے، کیونکہ وہ لوگ جانتے ہیں 2008ء کے بعد انہیں یہ موقع نہیں ملے گا چنانچہ وہ اقتدار کے آخری دو برسوں کو ہر صورت میں www.PakSociety.com کا چاہتے ہیں۔ ایران اس صورتحال سے پوری طرح واقف ہے اس لیے ان کے ہر قدم کا سلسلہ بھی تیز کر دیا ہے اور وہ میزائل سازی میں بھی بہت آگے جا رہا ہے۔ ایران امریکی ٹوٹ سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے اگر امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایران پر حملہ کر دیا تو وہ زیادہ دنوں تک امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا چنانچہ ایران سمجھتا ہے وہ جتنی دیر تک اس حملے کو ٹال لے گا یہی اس کی کامیابی ہوگی۔ ایران کی کوشش ہے وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ کو 2008ء کے الیکشن تک ٹالے رکھے۔ جس کے بعد دیموکریٹس اقتدار میں آجائیں گے اور یہ لوگ ری پبلکن کے مقابلے میں جنگ کے مخالف ہیں چنانچہ ایران بیخ جائے گا۔ اس صورتحال میں ایسا خطرناک قانون پاس کرنا تیل کو سرخ کیزا دکھانے کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود ایرانی پارلیمنٹ نے نہ صرف یہ قانون پاس کیا بلکہ اس پر فوری طور پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا۔ یہ حقیقت سفارتی جرأت اور قومی بہادری ہے۔

پانچ فروری 2007ء کو ہمارے صدر جنرل پرویز مشرف ایران اور ترکی کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ ایک دن تہران میں زکے۔ ایران میں انہوں نے صدر محمود احمدی نژاد سے دن نو دن اور 75 منٹ کی طویل میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں ایران پاک گیس پائپ لائن پر عملدرآمد کا فیصلہ ہوا۔ سدر مشرف نے مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنے کا منہ بہ منی پیش کیا اور

ایران نے اس منصوبے کی بھرپور مدد کا یقین بھی دلایا۔ پاکستان نے ایران کو امریکی حملے کے خدشات کے بارے میں بھی بتایا جس پر ایران نے پاکستان کے نیک جذبات پر اطمینان کا اظہار کیا جس کے بعد ہمارے صدر مظہر حسین بھٹو کی روایت ہو گئے۔ یوں یہ دورہ بھی پچھلے دوروں کی طرح کامیاب قرار پایا۔ مجھے یقین ہے ہمارے صدر رواں لوہس کے تو گیس پائپ لائن پر کام شروع ہو جائے گا، مجھے یہ بھی یقین ہے گیس پائپ لائن پاکستان، ایران اور بھارت کی معیشت میں انقلاب برپا کر دے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ملکوں کو صرف معیشت، گیس اور پائپ لائنیں درکار ہوتی ہیں اور کیا ملکوں کیلئے صرف ڈالر زور خوشحالی کافی ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں انسانوں کی زندگی میں روٹی، کپڑا اور مکان بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کو شینیں، ٹیکنریاں اور سڑکیں ترقی یافتہ بناتی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ڈالر قوموں کے مقدر کا فیصلہ کیا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے فرد ہو یا قوم اس کی زندگی کیلئے آگ، ضمیر اور عزت نفس آسجین کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ڈالر جو دوسرے انسان کے لئے چھوڑ کر اپنے لئے ڈال دیتی ہے اس کے لئے انسان کو اپنی عزت نہیں بھلا کر ڈال دینا چاہیے۔ انسان کی گردن میں بے غیرتی کا طوق ہونا یا اس سے بڑا کوئی مذاب نہیں ہوتا، دینا میں اس سے بڑا خسارہ کوئی نہیں ہوتا دینا میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو سمجھتے ہیں وہ زندگی جو انسان کو انسانیت کے شرف سے نیچے گرا دے اس زندگی سے موت اچھی ہے اور جو روٹی انسان کو انسان کے سامنے جھکا دے اس سے بھوک لاکھ رہے اچھی ہے اور جو ڈالر انسان کو اپنی غیرت کے عوض لے اس ڈالر سے غربت کر ڈور ہے بہتر ہوتی ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارا شمار دنیا کی ان قوموں میں ہوتا ہے جو عزت نفس پر سمجھوتہ کرتی چلی آ رہی ہیں اور جن کا ملک دوسری قوموں کی چراگاہ بن چکا ہے میں نے جب اخبارات میں صدر کے دورے کی خبریں پڑھیں تو میں نے سوچا کاش ہم ایران سے پائپ لائن کی بجائے عزت نفس لے آتے، ہم ان سے یہ سیکھ لیتے کہ عزت کے ساتھ کیسے جیا جاتا ہے، کاش ہم ایرانی صدر سے وہ حوصلہ اور وہ جرأت مانگ لیتے جو قوموں کو قومیں، ملکوں کو ملک اور انسان کو انسان بناتی ہے، کاش ہم پائپ لائن کی بجائے ایران سے ضمیر اور استقلال لے لیتے۔



جو لوگ اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے

میرے سامنے امریکہ کے نامیہ صدر ڈک ٹینی کی ایک تصویر پڑی ہے۔ یہ تصویر 27 فروری 2007ء کو افغانستان کے بگرام ایئر بیس پر امریکی اور 28 فروری کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی اس تصویر میں ڈک ٹینی جہاز کی طرف جا رہے ہیں ان کے ایک ہاتھ میں ہزار ڈیزل ہزار صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جبکہ انہوں نے دوسرے ہاتھ میں اپنا بیگ اور ایک بھاری بھر کم فائل اٹھا رکھی ہے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تینوں چیزیں بڑی مشکل سے سنبھال رکھی ہیں یہ بظاہر ایک سادہ سی تصویر ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں امریکہ کے عروج، امریکہ کی ترقی اور امریکہ کے سپر پاور ہونے کی اصل وجوہات چھپی ہیں یہ تصویر امریکہ اور تیسری دنیا کے درمیان ایک ایسی لیکر کھینچی ہے جس کے ایک طرف استحکام، عروج، طاقت اور ترقی ہے جبکہ دوسری طرف پسماندگی، کمزوری، زوال اور عدم استحکام ہے یہ تصویر محض ایک تصویر نہیں بلکہ یہ روایت، تاریخ، نظریہ اور زاویہ نظر بھی ہے دنیا کی تاریخ کبھی مورخ لکھا کرتے تھے اور یہ کتابوں میں محفوظ ہوتی تھی لیکن جب سے کیمرا ایجاد ہوا ہے یہ تاریخ ناب فوٹوگرافر لکھتے اور کیمرا میں بیان کرتے ہیں لہذا اب دنیا کا کوئی شخص تصویروں کے مطالعے کے بغیر کسی قوم کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ تک پہنچ سکتا ہے۔ ڈک ٹینی کی یہ تصویر ہی ایک تاریخی دستاویز ہے اور جب تک ہم اس تصویر کا تجربہ نہیں کرتے ہم امریکہ کی اصل طاقت تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے اور ڈک چینی اس واحد سپر پاور کے نائب صدر امریکی آئین کے مطابق نائب صدر کو بعض ایسے اختیارات بھی حاصل ہیں جو صدر کے پاس نہیں ہیں امریکہ کا نائب صدر عملاً دنیا کا نائب صدر ہوتا ہے لیکن یہ شخص نہ صرف اپنا سامان خود اٹھا کر جہاز میں سوار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنا بیگ اپنی فائل اور اپنی کتاب خود اٹھا کر جہاز سے اترتا ہے حکومت نے اسے سامان اٹھانے کے لئے کوئی اے ڈی سی 'سیکرٹری یا ملازم نہیں دیا' وہ اپنا ذاتی سامان اٹھانے کے لئے اپنے سٹاف کے کسی شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتا شاید یہ بات بے شمار لوگوں کے لئے نئی ہو امریکی حکومت صرف صدر کو سرکاری مصروفیات کے دوران بیگ اٹھانے کے لئے معاون فراہم کرتی ہے یہ سہولت پر دونوں کی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے دی گئی تھی کیونکہ دنیا بھر میں جب کوئی سربراہ اور مملکت کسی دوسرے سربراہ سے ملتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھ خالی ہونے چاہئیں چنانچہ امریکی قانون نے اس مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے صدر کو پروٹوکول کے دوران معاون کی سہولت فراہم کر دی لیکن جو نئی سرکاری مصروفیت ختم ہوتی ہے صدر بھی اپنے سامان کا خود ڈسٹروا کر دیا جاتا ہے آپ نے اکثر امریکی صدر کو تعطیلات کے دوران اپنا بیگ اٹھانے یا کالٹ کھیلتے ہوئے اپنی نرالی خود دھکیلنے دیکھا ہو گا آپ آئندہ غور کیجئے گا اس وقت صدر کے ساتھ سیکورٹی کے علاوہ کوئی معاون نہیں ہوتا امریکی صدر کے علاوہ کسی دوسرے صدر یا رکن سرکاری مصروفیات کے دوران بھی یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی لہذا نائب صدر ہو یا امریکہ کا کوئی وفاقی وزیر وہ اپنی فائلیں اور اپنا بیگ خود اٹھا کر آتے ہیں اور خود اٹھا کر لے جاتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں آپ پاکستان کے سرکاری کچھر پر نظر ڈالیں تو آپ کو سیکشن افسر سے صدر تک نہ صرف سب کے ہاتھ خالی نہیں گئے بلکہ ان کے پیچھے سرکاری ملازموں کی فوج چل رہی ہوگی اور سب ملازموں نے صاحب کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا رکھی ہوگی آپ صبح کے وقت کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیں آپ دیکھیں گے 16 سے 22 گریڈ تک کے ہر افسر کا بیگ اس کی فائلیں اس کا لٹن اس کا لیب ٹاپ اس کی جھٹری اس کا پائپ اور بعض اوقات اس کے جوتے تک اس کے ڈرائیور اس کے چتر اسی یا اس کے کسی جو نیر افسر نے اٹھا رکھے ہوں گے آپ پورے پاکستان میں کسی وزیر کو بیگ اٹھانے نہیں دیکھیں گے جبکہ وزیر اعظم اور صدر کے معاملے میں تو یہ خواہش کھل بے وقوفی ہے۔

میں پچھلے 17 برس سے صحافت میں ہوں میں نے ان 17 برسوں میں ایک ہزار کے قریب وزیر اعظم اور حاکم صدر دیکھے مگر میں نے آج تک کسی کے ہاتھ میں کوئی فائل، کوئی

کتاب یا کوئی بگ نہیں دیکھا ان سب لوگوں کا سامان ان کے سٹاف نے اٹھا رکھا تھا مجھے ایک صدر صاحب کو وضو کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا تھا 'صدر صاحب کو چار ملازم مل کر وضو کر رہے تھے وضو کے بعد ملازموں نے کرسی پر بیٹھا کر ان کے ہاتھ پاؤں اور منہ شگ کیا تھا نماز کے بعد چاندی کی ایک طشتری الائی گئی تھی طشتری کے اوپر سے اٹھکن اٹھا گیا تو میں نے دیکھا طشتری کے اندر تسبیح پڑی تھی تسبیح کے بعد نرس میں صدر صاحب کی جرابیں آئی تھیں اور ایک باوردی ملازم نے صدر صاحب کے پاؤں گود میں رکھ کر انہیں جرابیں پہنائی تھیں یہ ایک پرانے صدر کا قصہ تھا آپ جدید دور کے وزیر اعظم کے معمولات ملاحظہ کیجئے ہمارے وزیر اعظم سرکاری یا ذاتی دورے پر جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بارہ ملازم ہوتے ہیں یہ ملازم ان کے ذاتی کاموں کے لئے ساتھ جاتے ہیں 'وزیر اعظم کی تقریر اور ہنسنے ان کے اے ڈی سی سنبھالتے ہیں جبکہ پرس کی حفاظت سٹاف افسر کرتا ہے 'کپڑوں کی استری اور جوتوں کی پالش کے لئے دو ملازم ہوتے ہیں جبکہ خانہ سالن وزیر اعظم کی خصوصی نمونہ کے لئے ساتھ جاتا ہے جبکہ وزیر اعظم کا سامان اٹھانے کے لئے دو پوراز ہوتے ہیں جہاں سے موجودہ صدر ان سے کہیں زیادہ ترنگ و احتشام کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں ایک باوردی ملازم نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے ان کا بیک اور بریف کیس دو ملازم اٹھاتے ہیں جبکہ موہل فون تین مختلف افسروں کے پاس ہوتے ہیں 'مجھے ان سارے لوگوں میں صرف ڈر ڈر بچا ب قدرے بہتر لگتا ہے۔ لگے ہیں ان کے ساتھ صرف ڈرائیور 'اے ڈی سی اور سامان اٹھانے کے لئے ایک ملازم ہوتا ہے 'صدر وزیر اعظم اور گورنروں کے بعد ڈرائیو اعلیٰ ڈرائیور اور سیکرٹریوں کی باری آتی ہے 'ڈرائیو اعلیٰ پورے اڈا لشکر کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں ان کا سامان بھی اسی طرح مختلف لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے کسی نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے کسی کی جیب میں صاحب کا نوٹھ پیسٹ ہوتا ہے اور کسی نے ان کے لئے مندر کی 'نوٹھ پکس' اٹھا رکھی ہوتی ہیں۔ کوئی ان کے جینس کی حفاظت کر رہا ہوتا ہے کسی نے ان کی جرابوں کا جوزا پکڑ رکھا ہے اور کوئی جیب میں رقم ڈال کر ان کے پیچھے چلتا رہتا ہے اور جہاں صاحب اشارہ کرتے ہیں وہ جیب سے نوٹ نکال کر سامنے پھیلے جھولی میں ڈال دیتا ہے اسی طرح ڈرائیو کے ساتھ بھی سٹاف افسروں 'اوپنی سیکرٹریوں اور ذاتی ملازموں کی فوج چلتی ہے یہ لوگ بھی ان کا سامان اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے ہیں جبکہ صاحب خالی ہاتھ گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور خالی ہاتھ اترتے ہیں 'میں نے ایک بار کراچی انٹریورٹ ریڈیاز لپس منظر دیکھا تھا ایک وزیر صاحب

جہاز میں سوار ہونے کے لئے آئے تو ان کا پورڈنگ کارڈ ان کے سٹاف افسر نے اٹھا رکھا تھا یہ افسر وزیر کے آگے آگے چل رہا تھا جبکہ صاحب چٹون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے وزیر صاحب نے تلاش تک کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

آپ پاکستانی نمائندین کی یہ حرکات ملاحظہ کریں اور اس کے بعد یورپ مشرق بعید اور امریکہ کے حکمرانوں کا لائف سٹائل دیکھیں تو یقین کیجئے شرم سے سر جھک جاتا ہے مجھے ایک دوست نے امریکہ کے نائب وزیر رچرڈ آر میچ کے ساتھ ایک پاکستانی سیکرٹری کی ملاقات کا احوال سنایا تھا یہ سیکرٹری صاحب سرکاری ملاقات کے لئے امریکہ گئے تھے ان کے ساتھ چار لوگوں کا سٹاف تھا رچرڈ آر میچ ملاقات کے بعد سیکرٹری صاحب کوچنگ پر لے گئے آر میچ انہیں پیدل ریستوران تک لے کر گیا تھا اس نے اپنی ٹرے خود اٹھائی تھی کھانا لیا تھا اور میز پر بیٹھ کر کھانے لگا سیکرٹری صاحب اس کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ ان کا سٹاف ریستوران کے باہر ٹھہرا ہوا

کھانے کے بعد سیکرٹری صاحب نے اپنے اپنی سیکرٹری کو اشارہ کیا اس نے ہاتھ میں کھانا پیکٹ سیکرٹری صاحب کو دے دیا سیکرٹری صاحب کے آر میچ سے عرض کیا 'جناب یہ ہماری طرف سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے' آر میچ نے شکر یا ادا کر کے پیکٹ لے لیا دونوں نے ہاتھ ملایا اور آر میچ یہ پیکٹ خود اٹھا کر واپس وٹزر چلا گیا جبکہ سیکرٹری صاحب نے اپنی ٹیک ڈپٹا سیکرٹری کو کچڑا دی اور تینوں میں ہاتھ ڈال کر چار لوگوں کے چلوں میں ہونٹ کی طرف روانہ ہو گئے میں نے جب سے ڈک چینی کی یہ تصویر دیکھی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے یہ تصویر بار بار پوچھ رہی ہے جس ملک کے حکمران اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے وہ قوم کی ذمہ داری کیسے اٹھائیں گے میں بار بار یہ سوال سنا ہوں اور شرم سے سر جھکا لیتا ہوں میرا خیال ہے پوری قوم کو اجتماعی طور پر اپنا سر جھکا لینا چاہیے ہمیں مان لینا چاہیے ہمارے دشمن اخلاقی سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہیں ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے حضرت عمر فاروق ہمارے ظلیف تھے لیکن ان کی سنت پر عمل امر کی اور یورپی حکمرانوں نے کیا ہمیں مان لینا چاہیے اسلام ہمارا مذہب ہے لیکن اس مذہب کی اصل روح غیر مسلموں نے اپنائی اور ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے مذہب ہمارے ہاتھ میں رہ گیا لیکن اس کی روح ہمارے دشمنوں کے پاس چلی گئی ہم کلمہ پڑھتے رہ گئے جبکہ ہمارے دشمن اسلام کی برکتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔



صغیرہ اسلام کے خلاف

عداری کا پرچہ درج کریں

Kashif Azad@OneUrdu.com

میں نے گزشتہ روز اخبارات میں ایک دلچسپ تصویر دیکھی یہ پنجاب اسمبلی کی عمارت تھی اس عمارت کے سامنے ایک رکشہ کھڑا تھا اور رکشے سے ایک خاتون اتر رہی تھی، تصویر کے نیچے کپشن میں لکھا تھا "پنجاب اسمبلی کی خاتون رکن صغیرہ اسلام اجلاس میں شرکت کیلئے رکشے پر اسمبلی آ رہی ہیں" میں نے تم جا رہے تھے یہ تصویر دیکھی اور اتنی ہی مرتبہ کپشن پڑھا لیکن مجھے اپنے پڑھے اور دیکھے پر یقین نہ آیا لہذا میں نے فوراً پنجاب اسمبلی کی ویب سائٹ سے صغیرہ اسلام کا پروفائل نکالا مجھے ویب سائٹ سے معلوم ہوا صغیرہ اسلام شیخوپورہ سے تعلق رکھتی ہیں وہ اکتوبر 1945ء کو بھارت میں پیدا ہوئیں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا وہ 1977ء اور 1988ء میں دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں ان کے خاندان چودھری اسلام صاحب انتقال فرما چکے ہیں وہ 2002ء کے الیکشن میں خواتین کی مخصوص نشست پر تیسری مرتبہ رکن منتخب ہوئی ہیں اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹری کی رکن ہیں ان کے پروفائل کے آخر میں ان کا ایڈریس اور ای میل ایڈریس درج تھا میں نے ان کی ای میل کو لیا میں وہ اس وقت گھر پر سو ہو رہی تھیں چنانچہ میں اس تصویر کے بارے میں تصدیق نہ کر سکا لہذا ہم سروسٹ اس تصویر کی حقیقت کو

تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں یہ تصویر صفیرہ اسلام علی کی تھی اور وہ واقعی 11 جون کی المتی اور کھوئی دو چہرہ کور کئے پر پنجاب اسمبلی کی تھیں۔

میں نے تیسری کلاس سے اخبار پڑھنے شروع کیے تھے اور آج مجھے اخبارات پڑھتے ہوئے پورے نہیں برس ہو چکے ہیں چنانچہ میں بڑے دعوے سے کہتا ہوں میں نے ان میں برسوں میں ایک بھی ایسی تصویر نہیں دیکھی، ہاں البتہ میرے بچپن میں جنرل ضیا المتی کی ایک تصویر ضرور چھپی تھی جس میں وہ فورسٹار جنرل کی دوڑی میں پورے صدارتی اقتدار کے ساتھ سائیکل چلا رہے تھے اس وقت ان کی سائیکل سواری اور عاجزی افساری سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن جب میں باشعور ہوا تو معلوم ہوا جنرل صاحب کی یہ سائیکل سواری ان کے اسلام سے مختلف نہیں تھی چنانچہ جنرل ضیا المتی کی اس تصویر کے علاوہ مجھے کوئی ایسی تصویر یا مثال دیکھنے کا موقع نہیں ملا مجھے اب تک دنیا کی تین بڑی پارلیمنٹس میں جانے کا اتفاق ہو چکا ہے مجھے اس سال ماہج 2007ء میں لندن میں برقی ہاؤس آف کانگریس میں دیکھنے کا موقع ملا۔ برطانیہ کے

پاکستانی برٹش روکن اسمبلی چودھری ہرور نے میرے لئے پورے پارلیمنٹ ہاؤس کی سرکائیڈ بسٹا لیا تھا مجھے ان کے پرنٹنگ میکانکس کے ساری کمالات، سارے ہائر اور سارے گورنر و ڈوٹھانے مجھے امریکی کانگریس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا اور میں فرانس کی پارلیمنٹ کا وزٹ بھی کر چکا ہوں ان کے علاوہ میں ٹیلی ویژن چینلوں پر بھارتی لوک سبھا، جاپان کی پارلیمنٹ ڈائٹ اور چین کے قومی اسمبلی کے اجلاس بھی دیکھ چکا ہوں مجھے ان تمام پارلیمنٹس میں ایک چیز مشترک نظر آئی تھی، جب بھی ان اسمبلیوں کے اجلاس شروع ہوتے ہیں تو درجنوں بلکہ سینکڑوں ارکان اسمبلی ٹیکسیوں، بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے اسمبلی ہاؤس آتے اور جاتے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے برطانوی ارکان اسمبلی کو ٹیکسیوں سے اترتے اور اپنے بیک خود اٹھا کر ہاؤس آف کانگریس آتے جاتے دیکھا امریکی کانگریس کی عمارت کے نیچے زمین ٹرین چلتی ہے، میں نے امریکہ کے بے شمار بین الاقوامی شہرٹ یافتہ سٹیٹز اور کانگریس مین کو اس زمین میں سوا ہوتے اور اترتے ہوئے دیکھا اور فریج پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے بس سٹاپ ہے اور میں نے متعدد فریج ارکان اسمبلی کو اس سٹاپ پر بس کا انتظار کرتے دیکھا اسی طرح میں اکثر ٹیلی ویژن چینلوں پر بھارتی ارکان اسمبلی کو رکشوں سے اترتے اور سوا ہوتے دیکھتا ہوں، چین کی پارلیمنٹ میں بعض ارکان اسمبلی سائیکلوں پر بھی اجلاس میں آتے ہیں اور جاپان کی پارلیمنٹ میں 140 ایسے ارکان ہیں جن کے

پاس ذاتی ذرا تیار نہیں جبکہ 35 چاہنی ارکان کے پاس ذاتی سواری نہیں اور یہ 35 ارکان ہمیشہ بس ٹرین اور ٹیکسی پر سفر کرتے ہیں اس کے مقابلے میں آپ پاکستانی اسمبلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ہماری اسمبلیوں کے سوائے ارکان نہ صرف ذاتی گاڑیوں کے مالک ہیں بلکہ یہ سب لوگ بڑی بڑی گاڑیوں پر اجلاس میں شرکت کرتے ہیں پاکستان میں اب پیجر و لینڈ کروزر، پھاؤ اور لیکسز گاڑیاں سیاستدانوں اور ارکان اسمبلی سے منسوب ہو چکی ہیں اب حالت یہ ہے جب بھی شہر میں کوئی نئی لینڈ کروزر دکھائی دیتی ہے تو پولیس کانسٹیبل اسے فوراً سیلوٹ مار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس میں لازمی کوئی نہ کوئی رکن اسمبلی یا وزیر صاحب کے لواحقین سوار ہوں گے ان گاڑیوں کو ملنے والے اس پروٹوکول کی وجہ سے ملک میں دو نمبر وینڈے کرنے والے تمام لوگوں نے بھی لینڈ کروزر خرید رکھی ہیں آپ جیسی ہاؤسنگ سیموں کے تمام مالکان کو دیکھ لیجئے آپ جیسی ادویات بنانے والوں، ٹیکس چوری جوئے اور شراب فروشی کے دھندوں میں ملوث لوگوں کو دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یہ تمام لوگ ایک ایک دو دو برائے لینڈ کروزر کے مالک ہیں، بگے، پلوٹ آپ کو مزہ دینے والی ایسی چیز ہے جو ہر شخص میں بھی سبز کرتے دکھائی دیتی ہے تو ان کے آگے آگے ایک لینڈ کروزر خرید لی ہوگی یہ لینڈ کروزر انہیں سیاستدان کی "ٹک" دیتی ہے اور اس کی وجہ سے راستے کی سواری رکاوٹیں انہیں سیلوٹ کر کے ایک طرف ہٹ جاتی ہیں آپ لینڈ کروزر کچھ کا اندازہ میرے دوست کی کہانی سے لگا لیجئے میرے دوست 2002ء میں الیکشن لڑنے کیلئے امریکہ سے پاکستان آئے تھے اس وقت تک پاکستان میں ان کا ووٹ تک نہیں بنا تھا لیکن انہوں نے پاکستان میں ووٹ بنانے سے پہلے لینڈ کروزر خریدی تھی میں نے جب پوچھی تو انہوں نے جواب دیا تھا "پاکستان میں ووٹ کے بغیر سیاست ممکن ہے لیکن لینڈ کروزر کے بغیر نہیں"

میں اسلام آباد کا پاسی ہوں اور میں روزانہ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرتا ہوں ہمارا پارلیمنٹ ہاؤس شاہراہ دستور پر واقع ہے اور اس شاہراہ کا شمار دنیا کی دس سبکی ترین سڑکوں میں ہوتا ہے اس سڑک پر ایک کینال زمین کی ایلٹ وں سے ہیں کروڑ روپے ہے لیکن پارلیمنٹ ہاؤس کا پارکنگ ایریا بارہ ایکڑ محیط ہے اور یہ پارلیمنٹ ہاؤس کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ کے علاوہ ہے پارلیمنٹ ہاؤس کی پوری عمارت کے نیچے تہ خانہ ہے اور یہ تہ خانہ بھی پارکنگ کیلئے استعمال ہوتا ہے آپ اجلاس کے دوران پارلیمنٹ کا دورہ کر کے دیکھ لیں آپ کو تہ خانے سے لے کر

اوپن پارٹنگ تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آئیں گی آپ وہاں موجود گاڑیوں کے ماڈل اور میک
 وکیٹ لیں وہاں موجود 90 فیصد گاڑیاں تازہ ترین ماڈل اور انتہائی مہنگے برانڈ کی حامل ہوں گی ہماری
 پارٹس میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو تیرہ تیرہ گاڑیوں کے کارواں کے ساتھ سڑ کرتے ہیں
 آپ یہ گاڑیاں دیکھیں اور اس کے بعد ان ارکان اسٹیبل کا کردار دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا
 ہمارے ارکان اسٹیبل امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین، جاپان اور بھارت کے ارکان سے کبھی صاحب
 ثروت ہیں اور پاکستان دنیا کے ان چھ بڑے ممالک کے مقابلے میں کبھی امیر اور خوشحال ملک ہے
 آپ یہ گاڑیاں دیکھیں اپنے ارکان اسٹیبل اور وزراء کا "لیٹنگ سٹینڈرڈ" دیکھیں اور اس کے بعد
 پاکستان میں غربت کی شرح بے روزگاری اور مہنگائی کا گراف ملاحظہ کریں تو آپ کا سر شرم سے
 جھک جائے گا۔ پاکستان کے اس سیاسی اور پارلیمانی ماحول میں محترمہ صفیرہ اسلام پنجاب اسٹیبل کی
 عمارت کے سامنے رکشے سے اترتی ہیں اور ان کی یہ تصویر اخبارات میں شائع ہوتی ہے تو یقین
 نہیں آتا اور میرے جیسا شخص بھی تصدیق کیلئے بے اختیار صفیرہ اسلام کے گھرنون کرنے پر مجبور

ہو جاتا ہے۔
 محترمہ صفیرہ اسلام کی یہ حرکت ہرگز غلط سے خلاف قانون اور خلاف آئین ہے خود

سوچئے جس ملک کا فریب وزیر اعظم اپنے لئے 8 ارب روپے کا نیا جہاز خریدتا ہو اور جس کا چیف
 منسٹر اپنی عدت کے آخر میں نیا جہاز خرید رہا ہو اور جس کے تمام وزراء کے پاس سیکورٹی کور ہو اور
 جس کے تمام گورنرز وزراء اعلیٰ وزیر اعظم اور صدر چدرہ چدرہ کر دز روپے کی ہم پروف گاڑیوں
 میں سڑ کرتے ہوں اور ان کے آگے پیچھے سیکورٹی کی 21 گاڑیاں ہوں وہاں اگر کوئی رکن رکشے پر
 اسٹیبل آئے گی تو کیا یہ حرکت آئین قانون اور اسٹیبل کے تقدس کی توہین نہیں ہوگی امیر خیال ہے
 صفیرہ اسلام کا ومانی تو ازن ٹھیک نہیں چنانچہ حکومت کو فوری طور پر ان کے اس غیر پارلیمانی فعل پر
 سخت ایکشن لینا چاہیے حکومت کو ان کی روک تھام فوراً معطل کر دینی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ان کے
 خلاف غداری کا پرحہ بھی درج کرا دینا چاہیے کیونکہ صفیرہ اسلام اس ملک اور پارلیمنٹ دونوں کی
 خداری ہیں۔



صغیرہ اسلام جیسے رول ماڈل

میں نے پچھلے دنوں پاکستان چینلز پارٹی کی ایک رکن پنجاب اسمبلی صغیرہ اسلام کے بارے میں کلمہ لکھا تھا یہ کالم لاہور کے اخبارات میں شائع ہونے والی ایک تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا جس میں صغیرہ اسلام پنجاب اسمبلی کے سامنے کھٹے سے اتر رہی تھیں میرے لئے یہ ایک حیران کن واقعہ تھا اور میں نے اپنے کالم میں اسی حیرت کا اظہار کیا تھا محترمہ صغیرہ اسلام نے میری حیرت کے جواب میں مجھے اپنی ساری کہانی بھجوائی یہ کہانی میری پہلی حیرت کے مقابلے میں کہیں زیادہ حیران کن ہے میری خواہش ہے میں اپنی حیرت کے اظہار سے پہلے آپ کو صغیرہ اسلام کی کہانی سناؤں صغیرہ اسلام اس وقت پاکستان چینلز پارٹی پارلیمنٹریں کے نکت پر خواتین کی خصوصی نشست پر پنجاب اسمبلی کی رکن ہیں صغیرہ اسلام کا کہنا ہے "میں نے شادی کے وقت صرف میٹریک کیا ہوا تھا شادی کے بعد میں نے اپنے مرحوم شوہر کے اسپانڈیشن پر ایف اے کیا اس کے بعد بی اے اور بی اے کے بعد ایم اے اے اے بھی میرا ایم اے کا نتیجہ نہیں نکا تھا کہ میری ساری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئیں یہ آخر مارچ 1976ء کا دن تھا میرے شوہر اس دن مجھے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے اور میں جوانی میں بیوہ ہو گئی اس وقت میری گود میں دو برس کی چھٹی تھی یہ چھٹی میرے جینے کا سہارا بھی تھی اور میرے مرحوم خاندان کی نشانی بھی میں نے اس بچی کی تعلیم اور تربیت کو اپنا مقصد بنا لیا میں نے زندگی کے اس مرحلے میں اپنا جو خورواخانے کا فیصلہ کیا میں نے

اپنے ساتھ وعدہ کیا، میں کسی سے کسی قسم کی مدد نہیں لوں گی، اللہ کا کرم ہے میں آج تک اپنے اس وعدے پر قائم ہوں، میں نے اپنی عملی زندگی میں چار چار ٹیوشن پڑھائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنا اور اپنی بیٹی کا بیت پالا، میں نے 1982ء میں اپنا ایک چھوٹا سکول بنا لیا، میں اس سکول میں یتیم بچوں سے فیس نہیں لیتی تھی، اس سکول میں غریب بچوں کی تعلیم بھی مفت تھی، میں خود بھی اس سکول میں پڑھاتی رہی، افسوس پچھلے سال یہ سکول بند ہو گیا۔"

صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنی سیاسی زندگی کے بارے میں بتایا، ان کا کہنا تھا، "میرے والد اور شوہر دونوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا، میرے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے، میں نے ان کے کہنے پر سیاست شروع کی، میں عملی طور پر 1975ء میں سیاست میں آئی، میں ضلع شیخوپورہ پیپلز پارٹی کی خواتین ونگ کی صدر منتخب ہوئی، اپنے شوہر کے انتقال کے بعد مجھے 1977ء میں پہلی بار خواتین کیلئے مخصوص نشست پر ایم پی اے منتخب کیا گیا، میں اس دور میں پنجاب میں پیپلز پارٹی کی جنرل سیکرٹری اور ضلع لاہور کی صدر بھی رہی، میں نے نظریہ بھٹو کے دور میں دوسری مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئی اور 2002ء میں مجھے مسلم لیگ ق کے نظریہ بھٹو نے میری بار پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب کرایا، میری قائد بنے نظریہ بھٹو کا میری جیسی غریب کارکن پر اعتماد تھا، ایم پی اے بننے سے پہلے میں ضلع شیخوپورہ کی واحد خاتون تھی جو زکوٰۃ اور مشرک چیئر پرسن منتخب ہوئی تھی، میں نے پوری ایمانداری اور محنت سے یہ اہم ذمہ داری نبھائی تھی، میں نے پوری کوشش کی تھی، میں حق داروں اور مستحق لوگوں تک زکوٰۃ پہنچاؤں اور اللہ کا کرم ہے میں اس ذمہ داری سے پوری طرح سرخرو ہوئی۔"

محترمہ صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنے لائف سٹائل پر روشنی ڈالی، ان کا فرمانا تھا، "میں حقیقی طور پر ایک غریب خاتون ہوں، میرے گھر میں کوئی ملازم نہیں، میں سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں، میں نے پوری زندگی مارکیٹ سے خود سودا خرید لیا، میں پاکستان کی تمام اسمبلیوں کی واحد رکن ہوں جو مہنگائی سے حقیقی معنوں میں واقف ہے، مجھے معلوم ہے جب چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو گھریلو خواتین کیلئے تھوڑے پیسوں میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، بعد میں ان باتوں کی واحد رکن ہوں، جو غریب کامیابی پر یسوں کو جاتی ہے، جو یہ جانتی ہے اس ملک میں تین چار ہزار روپے ماہانہ کمانے والے لوگ کس طرح گزارہ کرتے ہیں، میرا دعویٰ ہے وہ حکمران کبھی عام آدمی کی مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے، جو ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھے ہیں اور

جنہوں نے زندگی میں کبھی نوکری چکر کر بازار سے آلو بیاز نہیں خریدے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا میں رکشے پر اسبلی کیوں جاتی ہوں جاوید بھائی رکشہ تو بہت بڑی سواری ہے میں تو اکثر اوقات بسوں اور ویکوں میں سڑکرتی ہوں لہذا اس اباہر شہر کی ویکوں اور بسوں کے احوال سے بھی پوری طرح واقف ہوں میں یہ جانتی ہوں ویکوں اور بسوں کے مالکان مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیتے ہیں اور عام شہریوں کیلئے اس گرمی میں ویکوں اور بسوں میں سڑکنا انتہائی مشکل ہوتا ہے میں یہ بھی جانتی ہوں بسوں اور ویکوں کے اکثر مالکان کہہ رہے ہیں اضافہ کر دیتے ہیں اور اس اضافے کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی ہے میں روزانہ اس تجربے سے گزرتی ہوں لہذا میں پنجاب اسبلی کی واحد رکن ہوں جو اسبلی کے ٹکڑے پر کمزری ہو کر وزیر ٹرانسپورٹ سے درخواست کرتی ہے وہ شہر میں ویکوں اور بسوں کے کرائے کم کر آئیں اور وہ شہر میں زیادہ سے زیادہ بسیں اور ویکیں چلوائیں میری بیٹی اکثر مجھے کہتی رہتی ہے اماں آپ کیا چیز ہیں آپ تین بار اسبلی کی رکن منتخب ہوئیں لیکن آپ آج بھی دھوپ میں پیدل چلتی ہیں یا پھر بسوں ویکوں اور رکشوں میں چلنے کے بجائے اپنی گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اپنی گاڑی میں چلتے ہیں اور اپنے اہل خانہ کو اپنے گاڑی کے بارے میں بتاتی ہوں جو اس گرمی میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر پتھر توڑتی ہیں یا چائیس چائیس کلو وزن اٹھا کر پچاس پچاس بیڑھیاں چڑھتی ہیں میں اس کو بتاتی ہوں میں عوام کی حقیقی نمائندہ ہوں اگر میرے عوام کے پاس پانی بجلی اور گاڑی نہیں تو میں بھی بڑی حد تک ان نعمتوں سے محروم ہوں اگر اس ملک کے 90 فیصد لوگ بسوں ویکوں اور رکشوں میں سڑکرتے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ سڑکرتی ہوں میری بیٹی کو میری باتیں پسند نہیں آتیں لہذا وہ مجھے کہتی ہے اماں آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے لیکن جاوید صاحب مجھے اپنی اس "حرکت" پر فخر ہے میں آپ کو یہاں اپنی ذاتی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی بتاتی چلوں جون 2006ء میں واچا کا ایک ہنگامہ توٹنے لے کر میرے گھر آ گیا اس کا کہنا تھا اس پورے محلے میں آپ لوگوں کا کل سب سے کم آرہا ہے ہمارا خیال ہے کسی ایم پی اے کا کل اتنا کم نہیں ہو سکتا چنانچہ ہمیں شک ہے آپ بجلی چوری کر رہی ہیں میں نے اسے کہا تم 70 روپے گھر کی تماشائی لے لو اس نے 50 روپے لی تو وہ حیران رہ گیا تمہارے گھر میں صرف ایک ایسی تھا اور اس پر ہی حاف پر تھا جو تھا وہ اسے استعمال میں نہیں ہوا تھا جبکہ گھر میں بلب بھی نہ ہونے کے برابر تھے اس نے واپس جا کر اپنے ایس ڈی او کو رپورٹ دی یہ کسی بھی طرح کسی ایم پی اے کا گھر محسوس نہیں ہوتا "صغیرہ اسلام کا فرمانا تھا" میں اپنے ساتھیوں

کو اکثر کہتی ہوں اگر ہم لوگ عوامی نمائندے ہیں تو پھر ہمیں عوام جیسا لگنا چاہیے یہ کیا بات ہوگی عوام سڑکوں پر اچھے کھارے ہیں وہ مزگانی میں ہنس رہے ہیں بسوں اور دیکھوں میں بھیڑ مگر یوں کی طرح سڑکرتے ہیں جبکہ عوامی نمائندے سے پچاس پچاس لاکھ کی گاڑیوں میں اسمبلیوں میں آتے ہیں وہ اپنے کتوں تک کو سر بے کھاتے ہیں اور ان کے گھروں کے بجلی کے بل لاکھ لاکھ روپے ماہانہ آتے ہیں یہ اس ملک کی کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ اس ملک کے نمائندے کسی بھی طرح عام لوگ دکھائی نہیں دیتے میرا بس چلے تو اسمبلیوں کے تمام نمائندوں کو بسوں اور دیکھوں میں سڑکراؤں میں قانون پاس کرادوں اسمبلی کا کوئی رکن ہوئی جہاز میں سڑکرتے گا اور وہ بھی گاڑی استعمال کرے گا وہ بس نہیں یا ٹرین پر عوام کی طرح سڑکرتے اور جس عوامی نمائندے کے گھر دوسرا "اسے سی" چلے گا اس کی رکنیت منسوخ ہو جائے گی اور میں قانون بنا دوں تمام عوامی نمائندے بازار سے اپنا سودا سلف خریدیں گے میں قانون بنا دوں جب تک کوئی عوامی نمائندہ روزانہ دو سو عوام لوگوں سے ذاتی طور پر نہیں مل لیتا وہ مگر نہیں جاسکتا مجھے یقین ہے اگر یہ قانون بن جائیں

اور تمام سے نمائندوں اور تمام شہری کے لائف سٹائل میں حاصل کیا ہو جائے تو یہ ملک جنت بن جائے گا

میں نے صغیرہ اسلام کے خیالات پڑھے تو مجھے پہلی بار کسی عوامی نمائندے سے میں نمائندگی اور عوام دونوں نظر آئے اور میرے دل سے دعا نکلی کاش پاکستان کے تمام ارکان اسمبلی صغیرہ اسلام کی طرح ہو جائیں آپ یقین کیجئے صغیرہ اسلام جیسے لوگ عوامی مسائل معاشروں کے رول ماڈل ہوتے ہیں اور معاشروں کو اس قسم کے رول ماڈلز اور ایسے لوگوں کو پرموٹ کرنا چاہیے کاش ہماری حکومت صغیرہ اسلام کی طرح سونے کاش ہم لوگ صرف اور صرف صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو منتخب کریں اور کاش ہم صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو سامنے لائیں اور انہیں رول ماڈل بنا کر اپنے بچوں کو بتائیں جیسا عوامی نمائندے اس قسم کے ہوتے ہیں اور اگر تم بڑے ہو کر سیاست میں آئے تو تمہیں بھی صغیرہ اسلام جیسا بننا چاہیے تمہیں بھی شکل ملے گی کروار اور لائف سٹائل سے عوامی نظر آنا چاہیے۔



ہم نے چین سے کیا پایا

Kushinik Anshor.com

لوگ نرین کے ذریعے بیجنگ سے شکسائی جا رہے تھے۔ دوران سفر ایک دانشور نے مترجم کی مدد سے ایک مسافر بچی کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ گفتگو کے دوران بچی نے اچانک پاکستانی دانشور سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں" دانشور نے مسکرا کر جواب دیا "میں کام کرتا ہوں" بچی معصومیت سے بولی "آپ مجھے اپنے ہاتھ دکھائیں" دانشور نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، بچی نے اس کے زوم اور ملائم ہاتھوں پر ہاتھ پھیرا اور معصومیت سے کہا "اگر آپ کام کرتے ہیں تو پھر آپ کے ہاتھوں پر بھول کیوں نہیں ہیں" دانشور کے لیے یہ بات عجیب تھی، اس نے بچی سے وضاحت چاہی، بچی نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں کی جلد سخت اور کھردری تھی اور اس پر جگہ جگہ زخم بنے ہوئے تھے۔ بچی نے ان "زخموں" پر انگلی پھیر کر بتایا "جو شخص کام کرتا ہے اس کے ہاتھوں پر ایسے بھول ہوتے ہیں" دانشور جیسے جھپٹیں، رونے لگا تو مترجم نے مداخلت کی اور مذرت خواہانہ لہجے میں: "اگر اصل ہمارے چین میں کام کا مطلب جسمانی سخت ہونا ہے، ہمارے ہاں نرم ہاتھوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا" دانشور نے حیران ہو کر پوچھا "لکھنا، پڑھنا اور میز گرمی پر بیٹھ کر حساب کتاب کرنا بھی تو کام ہوتا ہے" مترجم نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کی بات درست ہے لیکن چین میں میز گرمی پر بیٹھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں بھی زخم

ہوتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص اپنی روٹین جاب کے ساتھ بساں مشقت کرتا ہے، ہمارے
 وائٹور اور گھاری نینے کے بعد سڑکوں پر روزنی کو لے جین کھتوں میں گوانی کرتے ہیں اور گلیوں
 میں اٹھیں لگتے ہیں اور یہ لوگ ان کاسوں کا ساؤفہ بھی نہیں لیتے، مثلاً آپ مجھے دیکھئے، میں دفتر
 خارجہ میں اسٹنٹ ہوں لیکن میں بھی اس پٹی کی طرح کام کرتا ہوں، مترجم نے اتنا کہنے کے بعد
 اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں پر بھی مشقت کے "پھول" بنے ہوئے تھے۔

اہل چین دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے محنت کو فلٹے کی شکل دی۔ جنہوں نے
 خرگوش کی بجائے کچھوے کی رفتار کا انتخاب کیا اور صرف اور صرف اپنی محنت اور ورژن کے بل
 بوتے پر، دنیا کی سب سے بڑی معاش طاقت بن گئے۔ آج چین کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کسی
 ملک میں اس وقت تک تجارت، کاروبار اور صنعت کا عمل مکمل نہیں ہوتا جب تک وہاں چینی ماہرین
 قدم نہیں رکھتے۔ آج دنیا میں کوئی ایسی پراڈکٹ نہیں جس کا مارکیٹ میں چینی ورژن موجود نہ ہو اور
 آج دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس میں جینا ماشہ سے نہ پیچھے ہوں اور انہوں نے وہاں کی معیشت
 سے لیا کران ریول بن گیا ہے۔ اس وقت دنیا کی تمام چینی کی جینا ماشہ کی شکل اور رنگ ہیں اور

چین ایک ایسی معاشی دھڑان بن چکا ہے جس نے دنیا کے تمام، حاشی و ریاضوں کا رخ اپنی طرف
 موڑ لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ محض چینیوں کے ہاتھوں کے پھولوں کا
 کمال ہے، چین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے کام کو عادت کا ورچہ دیا، ماڈرن سے نکل اور چرائن لائی
 نے گھر بے کسی، گینتی اور جھارو کو ہر چینی کی ذات کا حصہ بنا دیا، چین میں 70 لاکھ چینی باشندے
 روز اپنی سانگیوں پر گینتی، جھارو، کسی اور کھرچہ بانہہ کر گھر سے نکلتے تھے اور راستے میں آنے
 والے قریب ترین کھیت میں کام شروع کر دیتے تھے، یہ لوگ گھر سے نکل کر کسی گلی اور کسی سڑک
 کے کسی حصے کی مرمت شروع کر دیتے تھے، یہ کسی وائیز، کسی دکان اور کسی کارخانے میں جھارو دینا
 شروع کر دیتے تھے اور یہ لوگ کام کرتے ہوئے کسی سے نہیں پوچھتے تھے یہ کارخانہ، دکان یا کھیت
 کس کی ملکیت ہے، چین کے لوگ چین کی سرحدوں میں موجود ہر چیز، ہر جگہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے
 اور ملکیت کے ہڈے سے مرٹار ہو کر اسے سوار نے نکلتے تھے، چین کے لوگ چالیس برس تک
 مسلسل اسی پرہت سے کام کرتے رہے ان چالیس برسوں میں چین میں کسی نے چینی نہیں کی
 چین میں ہفت وار چینی کا تصور تک نہیں تھا، یہ لوگ کام کی جتنی بھی نہیں لیتے تھے ان لوگوں کو بس
 حکومت کی طرف سے ملتا تھا، انہیں ملتا تھا، یہ لوگ صبح سات بجے گھر سے نکلتے تھے، بیک بار دو بجے

Kasbi.com

کھانے کا وقفہ کرتے تھے کسی قریب ترین بیکری پر جاتے تھے اور بیکری کے مالکان انہیں حکومت کے کھانے سے لُچا دے دیتے تھے اور یہ لوگ تھوڑا سا قیلو کر کے ایک بیٹے دو بارو کام میں جت جاتے تھے یہ لوگ شام چھ بجے واپس گھر جاتے تھے، راستے سے سرکاری بیکری سے رات کا کھانا لیتے تھے اور آٹھ نو بجے کے درمیان سو جاتے تھے، آج بھی پورے چھن میں بارہ بجے دن لُچا کا وقفہ ہوتا ہے اور چین کے لوگ چھ سے سات بجے کے درمیان زنگ لیتے ہیں میں مارچ 2006ء میں مشاہد حسین سید کے ساتھ چین گیا اور ہمیں بعض جگہوں پر چین کے پرانے "کاسرین" دکھائی دیے یہ لوگ آج بھی اسی طرح سانگیل پر مجاز ذمینی کسی اور کھرپہ بانہہ کر لٹکتے ہیں اور چپ چاپ کام شروع کر دیتے ہیں چین میں کہا جاتا ہے اگر آپ کے پاس دو ہاتھ ہیں تو آپ دو زنگ کو جنت بنا سکتے ہیں چین میں یہ بھی کہا جاتا ہے۔ انسان اور جانور میں صرف ہاتھوں کا فرق ہوتا ہے اور جو انسان اپنے ہاتھوں سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں جانور ہے دنیا میں بے ٹانگوں والوں نے ترقی کی ان میں سے بعض تو مسوں نے ظلم کا سہارا لیا، بعض نے عمل استعمال کی، بعض تمہارت کے

برہے ترقی کی جہتی پر پہنچیں اور بعض نے ہتھیاروں اور فوجوں کی مدد سے ترقی کی اور کچھ کچھ کچھ

دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے سنگ تراشوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ترقی کا بت تراشا جنہوں نے اپنی انگلیوں اور تھیلیوں سے ترقی کا پہاڑ طے کیا شاید یہی وجہ ہے، آج سے تیس ہشتیس برس پہلے امریکی صدر جان ایچ کینڈی نے کہا تھا "اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر انسان کو ہاتھ دیئے ہیں لیکن اس نے ان ہاتھوں کا استعمال صرف چینوں کو سکھایا" یہ چینوں کے ہاتھوں اور ان ہاتھوں کے پھولوں کا کمال تھا۔ آج چین دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت ہے۔ آج اس کے زرمبادلہ کے ذخائر 998 بلین ڈالر ہو چکے ہیں اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دینے والا ملک، بن چکا ہے چین نے پچھلے دنوں دنیا کی سب سے سستی گھڑی گاڑی تک بنائی ہے۔ اس وقت دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جس میں "میڈ ان چائنا" نہ ہو دنیا کے 142 بڑے چھوٹے ممالک میں "چائنا ٹاؤن" آڈ ہو چکے ہیں اور چین دنیا کا واحد ملک ہے جو سوئی سے لے کر جہاز تک بنا رہا ہے، جس نے اپنی سٹی اپریٹ تک کی مارکیٹنگ شروع کر دی ہے اور جس کا دعویٰ ہے اگر دنیا ہم سے کچھ سیکھنا چاہتی ہے تو اسے ہم سے کام کرنا سیکھنا پانا ہے۔

دنیا کی اس حیرت انگیز قوم کے صدر ہو جن تاؤ پچھلے دنوں پاکستان کے دورے پر آئے

دو دو دن اسلام آباد رہے اور نئے کاؤن انہوں نے پاکستان کے فنانس شہر لاہور میں گزارا، صدر

ہو جن تاؤ نے جس دن لاہور کا دورہ کرنا تھا اس دن لاہور کے تمام سکولوں کا لہجوں اور دفتروں میں چھٹی کرا دی گئی تھی اس دن سارا لاہور گھروں میں محسوس رہا ہم نے اس ملک کے صدر کو یہ استقبال پیش کیا جس کے لوگوں نے چالیس سال تک ہفتہ وار چھٹی نہیں منائی تھی جس کے بابائے قوم ماؤزے جگ نے موت سے پہلے چین کے لوگوں سے کہا تھا "تم اگر میرا سوگ منانا چاہو تو تم دو دو گھنٹے مزید کام کرنا میری روح کو آرام اور سکون مل جائے گا" جن کے داسرے بڑے لیڈر جو این لائی کی ہر بری پر چین کے لوگ "اور نام" کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ وصول نہیں کرتے اور جس کے ہر شہری کے ہاتھ پر آج بھی بھول ہیں ہم نے اس ملک کے صدر کی آمد پر لاہور میں چھٹی کرا دی تھی کیا ہم نے چین سے یہ سیکھا تھا! میرا خیال ہے ہم لوگ اپنے رویوں میں بھکاری بن چکے ہیں ہم تو مسوں، ملکوں اور لیڈروں سے سیکھنے کی بجائے ان سے ادا چاہتے ہیں ہم دوستیوں کو انگریزوں سے لے کر اور سفارتکاری کے پیمانوں پر تاپتے ہیں اور ہم یہ دیکھتے ہیں ہم نے کس ملک کی دوستی سے کتنے ڈالر کمائے انہوں نے ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا، ہم نے کس ملک سے کیا کیا ہم نے کس دوستی سے کیا کیا اور ہمیں کسے جھڑکنا ہے اور کسے ہٹانا ہے ان کے استقبال کے لئے چراغاں کیا، ذمہ دار بجائے تصویریں کھینچائیں چھٹی کی اور دو چنڈا انگریزوں پر دھنکا کر کے چلے گئے انہوں نے صدر ہو جن تاؤ کے ہاتھوں کے بھول نہیں دیکھے ہم نے ان سے یہ نہیں پوچھا "جناب صدر کیا آپ بھی ہاتھ سے کام کرتے رہے ہیں" جینی صدر آئے اور چلے گئے لیکن ہم نے ان سے چین کا وہ معاوضہ تک نہیں پوچھا جس میں چین کے کسی دانشور نے کہا تھا "آلوں، انگوٹوں، کاج، انگوٹوں"



دیوار چین

کیونٹ پارٹی آف چائنا (سی پی سی) چین کی واحد سیاسی جماعت ہے، یہ پارٹی 1949ء میں برسرِ اقتدار ہے۔ صدر سے لے کر تمام شہری شعبہ برقی کسی شہری کے لئے سے اس پارٹی کا حصہ ہے۔ سی پی سی نے فردری کے مہینے میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کو اپنا وفد چین بھرانے کی دعوت دی، یہ وفد 26 مارچ 2006ء کو چین روانہ ہوا اور تین اپریل کو واپس آیا۔ مشاہد حسین اس وفد کے سربراہ تھے، اس میں دس افراد شامل تھے، میں اس وفد کا واحد "غیر پارلیمانی" اور غیر مسلم لیگ رہا تھا، ہمارے وفد میں دو مسلم لیگی خواتین بھی شامل تھیں، ہم لوگ 26 مارچ کو اسلام آباد سے بیجنگ پہنچے، وہاں سے شنگھائی گئے، شنگھائی سے ارہنگ آئے اور ارہنگ سے واپس اسلام آباد آئے۔ یہ آٹھ روز ایک انتہائی دلچسپ تجربہ تھا۔

چینی لوگ دیوار چین کو "گریت وال" کہتے ہیں، یہ دنیا کا آٹھواں نمبر ہے اور یہ زمین کی واحد تعمیر ہے جو چاند سے دکھائی دیتی ہے، یہ دیوار چین کے پہلے شہنشاہ ہوانگ نے تعمیر کرائی تھی، اس کی تعمیر 221 قبل مسیح میں شروع ہوئی اور اس دیوار نے چند برسوں میں 6 ہزار 7 سو کلومیٹر پر پھیلی سلطنت کو اپنی پتا میں لے لیا، یہ انسانی ہاتھوں کا سب سے بڑا تعمیراتی معجزہ تھی، یہ ایک بلند اور چوڑی دیوار ہے جس پر دس سے پندرہ لوگ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتے ہیں، دیوار کی ہر دلی سطیوں مضبوط پتھروں سے بنی ہیں جبکہ ان کے اندر پشائیں، بیماری

پتھر اور جوہر بھرا ہے آپ اس دیوار کی مضبوطی کا اندازہ اس کی تاریخ سے لگا لیجئے آج اس دیوار کو بننے اذ حال ہی بزار سال ہو چکے ہیں ان اذ حال ہی بزار برسوں میں دنیا پر بے شمار آفتیں نازل ہوئیں دنیا میں بے شمار سیلاب آئے، اقلتعداد زلزلے، بارشیں اور طوفان آئے، بے شمار تہذیبیں بنیں اور لاقعدا معاشرے اپنا اپنا وقت پورا کر کے ختم ہو گئے لیکن یہ دیوار اپنی بنیادوں پر اسی طرح کھڑی رہی اس نے مٹی سے اپنا رشتہ نہ توٹنے دیا اس دیوار کے راستے میں بے شمار پہاڑیاں اور یا مسخرا اور میدان آتے ہیں لیکن یہ دیوار ایک مضبوط اڑوٹھ کی طرح ان میدانوں، ان صحراؤں، ان دریاؤں اور ان پہاڑوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور نقطہ انجام تک اپنا وقار اپنی عزت اور اپنی تہذیب برقرار رکھتی ہے انسانی تاریخ میں ہر چیز وقت کے سامنے سرنگون ہو گئی لیکن مصر کے احرام اور چین کی دیوار ایسے انسانی معجزے ہیں جو ہزاروں برس سے وقت کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں اور وقت اپنی پوری کوشش اور اپنی پوری قوت کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا یہ وقت کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں۔

بیم لوگ 28 مارچ کو دیوار کے کنارے کیلئے چھک سے نکلے تالی ہونان تو ان ہماری مترجم اور کو آؤ شہر بھی ان کے سامنے جاؤ کیا تک تھے یہ دونوں آٹھ روز تک ہمارے ساتھ رہے دیوار پر شدید سروی تھی پورے وفد نے اپنے سر اور کان؛ جانب رکھے تھے ہماری نظری حد تک مل کھائی ہوئی دیوار تھی اور دیوار کے نیچے بہت دور وقت جینا تھا اور وہ حیرت سے دیوار پر ایسا تادو برجیاں اور مینار دیکھ رہا تھا، یہ ایک دفاعی دیوار تھی، زمانہ قبل مسیح میں چین میں بیرونی حملہ آوروں کا پسندیدہ ملک تھا، یہ فنکاروں، صنعت کاروں اور تاجروں کی سر زمین تھی، یہ لوگ مٹی کو سونے میں ڈھالنے کے فن سے واقف تھے جب دنیا قن و حاپنے کیلئے جنوں کی محتاج تھی اس وقت چین کے کارگر ریشم بناتے اور پہنتے تھے ان لوگوں نے گرم مسالوں کو تجارت کی شکل دی تھی، یہ لوگ روغن بناتے، کاغذ تیار کرتے، بارود بناتے اور مٹی کو پتھر کی شکل دینے کے بھی ماہر تھے، زمانہ قدیم میں چین کے ہر گھر میں پانچ چھ بکریاں ایک دو گائے، سینے دو سینے کاراٹن اور سونے چاندی کے زیورات ہوتے تھے، یہ لوگ بلا کے ستارہ شناس تھے، یہ آسمان دیکھ کر آنے والے زمانوں کا حساب لگا لیتے تھے، اس وقت دنیا بھر کے پاؤں پہرن تھی اس وقت یہ لوگ پردی جوئے پہنے تھے ان کے پاؤں دنیا کی انتہائی حسین عورتیں اور انتہائی تیز رفتار گھوڑے ہوتے تھے اور یہ لوگ اپنے کھیتوں میں ایک کاشت سے دو دو فصلیں حاصل کرتے تھے، ان کی انگوڑی بیلیں سات سات لمبوں تک بھل دیتی

تھیں "چینی لوگ فطرتاً سرمایہ کار ہیں، یہ لوگ دھیلے سے روپیہ بنانے کا فن جانتے تھے کہا جاتا تھا اگر ایک چینی گھر سے پتھر لے کر نکلے تو وہ شام کو سونے کی ڈلی لے کر واپس لوٹے کا چنا چنچ اس دور میں سال میں کئی بار بیرونی حملہ آور چین پر حملہ کرتے تھے اور چین کو اجازت دے دیتے تھے "چینی لوگ فطرتاً صنعت کار ذاتاً براور فن کار تھے لہذا جنگ لڑنا اور ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی لہذا ان لوگوں نے اپنی سلطنت کی حفاظت کیلئے ایک مضبوط دیوار بنانے کا فیصلہ کیا 'اس وقت تک دنیا میں کسی قوم نے بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کیلئے کوئی دیوار نہیں بنائی تھی دنیا کے کسی ایجنڈے کے پاس ایسی نیکنائوٹی بھی موجود نہیں تھی لیکن بادشاہ نے حکم دیا اور چینی عوام نے سات ہزار گلو میٹر لمبی دیوار کھینچ دی اس دیوار نے وقت 'خوف اور حملہ آوروں کو چینی حدود سے باہر پھینک دیا۔ اس نے چین کو محفوظ بنا دیا۔

یہ دیوار بنیادی طور پر چین کی نفسیات 'چین کے فلسفے اور چینی لوگوں کی عادات کی علامت ہے یہ دیوار ثابت کرتی ہے چینی قوم بنیادی طور پر پرامن لوگ ہیں 'یہ لوگ ڈیٹلیو ہیں 'ڈیٹلیو نہیں ان کی پالیسی کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنا دفاع کرنا ہے 'دفاع کا یہ فطری عنصر 'اسی ایک چینی نفسیات کا حصہ ہے اس دیوار کی جیا ڈوں میں پھینچا یہ جذبہ 'ان تک چین کی خارجہ پالیسی ہے 'اس دور کے دوران جب بھی ہمارے کسی ساتھی نے چین کے کسی ذمہ دار شخص سے کہا "ہم سمجھتے ہیں چین مستقبل کی سپر پاور ہے" تو اس نے بڑے آرام سے انکار میں سر بلایا اور مسکرا کر جواب دیا "ہم سپر پاور نہیں بننا چاہتے" اس انکار کے پیچھے دیوار چین کی تاریخ چھپی ہوئی تھی 'چین امریکہ، یورپ اور شرق وسطیٰ کے ممالک پر حملہ نہیں کرنا چاہتا وہ دنیا کا کلچر بدلنے کا بھی خواہاں نہیں ہے وہ بس اپنا دفاع چاہتا ہے 'چینی لوگ حملہ نہیں کرتے لیکن اگر ان پر حملہ کروایا جائے تو یہ دیوار چین من جاتے ہیں 'یہ اس حملے سے چننا جانتے ہیں 'چین کا فلسفہ ہے 'آپ کسی معاملے میں پہل نہ کریں 'یہ دیوار اس فلسفے کی سب سے بڑی علامت ہے 'چینی لوگ بے انتہا گھنٹی ہیں 'یہ لوگ چیلنج قبول کرنے کے بھی ماہر ہیں 'یہ لوگ دنیا سے ہٹ کر کام کرتے ہیں 'جس چیز کو دنیا مانگتی ہے چینی ڈسٹری میں اس چیز کو ٹھنک کہا اور سمجھا جاتا ہے 'دیوار چین ان لوگوں کی اس عادت کا بھی خوبصورت اظہار ہے 'چینی لوگ ہر حال میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں ان کا رجحان اور کامت اتنا منفرد ہے کہ آپ ہزاروں لوگوں میں سے چینی لوگوں کو فوراً پہچان لیں گے 'یہ دیوار چینوں کی اس انفرادیت کو بھی ثابت کرتی ہے 'چینی لوگ 'صنعت کار اور فن کار ہیں اور

ذہری پوائنٹ 3.....0.....320

یہ تینوں چیزیں اسن اور استحکام سے منسلک ہیں یہ حقیقت ہے جس جگہ اسن نہیں ہوتا وہاں اسن امر
 سکتا ہے اور زہی صنعت اور تجارت اور یہ دیوار چین کے اسن استحکام اور دفاع کی گہمی علامت ہے
 لہذا کہنے کا مطلب ہے انرا آپ چین اور چینوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو دیوار چین کو سمجھنا
 ہوگا یہ دیوار وہ دروازہ ہے جس سے ہو کر آپ چین کی ٹارن پالیسی اٹھمن کے نظام اور چینوں کے
 دلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

28 مارچ وہ دن تھا جب ہم دیوار چین پر کھڑے تھے اور چینوں کے دل ہمارے لئے
 کھلے تھے اور ہمیں آواز دے رہے تھے۔ چینی کہات ہے "دنیا میں محبت سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں"
 چینی لوگ یہ ہتھیار لے کر ہمارے سامنے صاف آراء رکھے اور ہم لوگ مقتول ہونے کے لئے تیار
 کھڑے تھے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آگتے“

ہمیں اپنے محاوروں اور کہاوتوں میں بھی دنیا سے بہت آگے ہے، چینی محاورے اپنے اندر معانی، دانش اور خفا لفظ کی اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ جیسوں کتابیں ملیں، مگر کتنی ایک جگہ محاورے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، میں نے بچپن میں جو سپہاچی محاورہ پڑھا تھا اس نے آنے والے دنوں میں میری زندگی کا سارا سٹائل بدل دیا۔ میں زندگی میں جب بھی سچ ہونے لگتا ہوں تو میں یہ محاورہ نکال کر پڑھتا ہوں اور فوراً ریٹیکس ہو جاتا ہوں، وہ محاورہ تھا ”جیسے مسکراتا نہیں آتا اسے دوکان نہیں کھولنی چاہیے“ دوسرا تاریخی محاورہ اس دور سے کے دوران ملا، میں نے اپنے ایک میزبان سے ہمیں کی ترقی کی وجہ پوچھی تو اس نے مسکرا کر ایک چینی محاورہ سنایا وہ محاورہ کچھ یوں تھا ”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آگتے“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا، ہم نے ترقی سے پہلے ترقی کے بارے میں ریسرچ کی تھی، ہم نے اندازہ لگایا تھا آپ جب تک ہاتھی کا بچہ نہیں پالتے آپ اس وقت تک ہاتھی دانت حاصل نہیں کرتے چنانچہ ہم نے انفراسٹرکچر تیار کرنا شروع کر دیا، ہم نے پورے ملک کو سڑکوں کے ساتھ ملایا، ہم نے ریلوے لائنیں بچھائیں، ایئر پورٹس اور بندرگاہیں بنائیں، ہم نے تعلیم اور صحت عام کی، ہم نے دنیا کی سب سے بڑی ورک فورس تیار کی اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھی کے منہ میں دانت نکل آئے اور پوری دنیا ہم سے محبت کرنے لگی۔ ”مجھے اس کی بات اچھی لگی، یہ سچ ہے ترقی سے پہلے ترقی کا

انفراسٹرکچر ضروری ہوتا ہے اور جس ملک کے پاس انفراسٹرکچر نہیں ہوتا وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا اور چین اس کی سب سے بڑی اور تازہ ترین مثال ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر چین میں ہے۔ شنگھائی چین کا دوسرا بڑا شہر اور چین کا ساحلی اور صنعتی دارالحکومت ہے، ہم لوگ 29 مارچ کو شنگھائی پہنچے تھے، شنگھائی کی آبادی اس وقت ایک کروڑ 74 لاکھ ہے، یہ ایک اجنبی خوبصورت، جاندار اور زندہ شہر ہے۔ آپ جوں ہی اس شہر میں داخل ہوتے ہیں آپ کو زندگی کا احساس ہوتا ہے، 30 جولائی کو شنگھائی کے میئر شین ہوگ کوواگ نے ہمارے وفد کو لے دیا تھا، اس لے کے دوران مسلم لیگ کے جوائنٹ میکرز ایقبا ز احمد رانجھانے ان سے بڑا دلچسپ سوال پوچھا، انہوں نے پوچھا، "شنگھائی میں کتنی غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں" میئر کے جواب نے پورے وفد کو حیران کر دیا، انہوں نے بتایا، "اس وقت شنگھائی میں 30 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں" میئر کا یہ جواب چین کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کا منہ بول ہجوت تھا، شنگھائی حقیقتاً ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے، آپ اس کے کمرشل ڈائنامک کا اندازہ اس میں کام کرنے والی ایرونا سازنگ

انجینیریوں سے لگا سکتے ہیں، اس وقت شنگھائی میں 46 ہزار 9 سو انتہاری کمپنیاں کام کر رہی ہیں، ہر ملک میں 79 ہزار ہیں، سو انتہاری کمپنیاں ہیں، ان ایک اور نازک انگ انجینیریوں سے آپ

شنگھائی اور چین کے تجارتی سائز کا اندازہ لگا سکتے ہیں، چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت ہے، چین کا جی ڈی پی 8 ٹریلین اور 158 بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے مالیاتی ذخائر 819 بلین ڈالر ہیں، چین کا گروتھ ریٹ 9 اعشاریہ 5 فیصد ہے، یہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ گروتھ ریٹ ہے، چین کی ذاتی بچتوں کا سائز ایک ٹریلین اور 70 بلین ڈالر ہے، اس وقت پوری دنیا چینی مصنوعات استعمال کر رہی ہے، یورپ چینی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار ہے، وہ ہر سال چین سے 218 بلین ڈالر کی اشیاء خریدتا ہے، امریکہ دوسرا بڑا خریدار ہے، وہ چین سے سالانہ 212 بلین ڈالر کی اشیاء لیتا ہے جبکہ جاپان اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے، وہ ہر سال چین سے 185 بلین ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے، ان ممالک کے بعد یہ فہرست طویل ہوتی چلی جاتی ہے، عالمی ماہرین کا خیال ہے آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں وہاں آپ کو "میڈ ان چائنا" ضرور ملے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے وہ چین جو کل تک دنیا کا پسماندہ ترین ملک تھا اس نے یہ مرحلہ کیسے حاصل کیا، چین نے یہ مقام جنت اور انفراسٹرکچر سے حاصل کیا ہے، اس نے ہاتھی دانت

کے حصول کیلئے ہاتھی پالنے شروع کئے تھے۔ آپ نقل و حرکت کے ذرائع کا اندازہ لگائیے اس وقت چین میں 1472 ایئر پورٹ ہیں، ان میں سے 75 فیصد ایئر پورٹس پر بین الاقوامی پروازیں اترتی ہیں، شنگھائی نے اس سال دنیا کی سب سے بڑی کارگو پورٹ کا مقام حاصل کر لیا ہے، اس پورٹ سے پچھلے سال 443 بلین ٹن سامان دنیا کے بازاروں میں گیا، اس وقت دنیا میں سب سے بڑی ورک فورس چین میں ہے، چین میں 48 کروڑ ہنرمند ہیں، یہ تمام ہنرمند اپنے اپنے کاموں کے ماہر ہیں، چین میں انفراسٹرکچر کو سرعت دینے کا کام ابھی تک جاری ہے، چین پیمانے پر پورے تین بڑے ڈیم بنا رہا ہے، ان ڈیموں پر 22 بلین ڈالر خرچ ہوں گے اور یہ ڈیم چین کو مزید 18 ہزار 2 سو میگا واٹ بجلی دیں گے، یہ دنیا کا سب سے بڑا ہائیڈرو پاور پلانٹ ہوگا، چین 59 بلین ڈالر کی مالیت سے تیرہ سو کلومیٹر لمبی نہریں بھی کھود رہا ہے، چین 18 بلین ڈالر سے چار ہزار کلومیٹر لمبی ٹیس پائپ بھی بچھا رہا ہے، چین 34 بلین ڈالر سے 4480 کلومیٹر لمبے اور 20 کلومیٹر چوڑے جنگلات لگا رہا ہے، چینی اس منصوبے کو "گرین گرین وال پراجیکٹ" کہتے ہیں،

یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگلی ذخیرہ ہوگا، چینیوں کا خیال ہے جب یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو چاند سے صرفہ دہی چینی نظریات کی ایک نئی شکل اور دور درازی کرنے کے لئے شنگھائی میں

دو ایسے منصوبے دیکھے جنہوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں، ہم جن ماڈل اور گئے وہ 468 میٹر اونچی 88 منزلہ عمارت ہے جس پر دنیا کا تیسرا بلند ترین ٹی وی ٹاور قائم ہے وہ ہارور دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے، اس کی لفٹ انتہائی سبک رفتار ہے، ہمارے میزبانوں نے ہمیں حیران کرنے کیلئے لفٹ کے فرش پر ایک سکہ کھڑا کر دیا، ہم 88 ویں منزل سے نیچے آئے لیکن یہ سکہ اسی طرح ایسا دور ہوا، آپ اس بات سے اس لفٹ کے توازن کا اندازہ لگا لیجئے، دوسرا منصوبہ شنگھائی کا "یانگ شان ڈیمپ سی پورٹ" تھی، یہ منصوبہ دس برس پہلے شروع ہوا، 1996ء میں شنگھائی کی حکومت نے گہرے پانیوں کی بندرگاہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے ان لوگوں نے سمندر کے اندر 32 کلومیٹر لمبا پل اور اس پل پر دو دریاہ سڑک بنادی، یہ سڑک پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد منصوبہ ہے۔ آپ جب اس سڑک پر سفر کرتے ہیں تو آپ خود کو گہرے سمندر میں پاتے ہیں، اس سڑک کے آخر میں 30 گودیوں کی ایک نئی بندرگاہ بنا کی جا رہی ہے جس سے سالانہ 8 ہزار 5 سو کنٹینر لائے اور لے جائے جائیں گے۔ ہم لوگ جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں اپنا گواہ بہت یاد آیا، مسلم لیگ کی حردور دہک کے صدر فقیر حسین بخاری نے اس موقع پر بڑا

خوبصورت سمبرہ کیا، انہوں نے کہا " ایک یہ لوگ ہیں جو سمندر کو خشک کر کے بندرگاہیں بنا رہے ہیں اور ایک ہم لوگ ہیں جو قدرت کی دی ہوئی بندرگاہیں تک استعمال نہیں کر رہے۔" مجھے محسوس ہوا اس معاملے میں چین ہم سے بہت آگے بے شاید یہ چین کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے اس وقت دنیا کے تمام سرمایہ کار اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ چین کا رخ کر رہے ہیں۔ صرف 2005ء میں انٹرنیشنل سرمایہ کاروں نے چین میں 60 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی، چین کی یہ فتوحات حقیقتاً اس کے وژن اور اس کے انفراسٹرکچر کا نتیجہ ہیں۔

بات ہو رہی تھی چینی عمارتوں اور کھادوں کی تو مجھے چین کی ایک اور کہادت یاد آگئی، چینی میں کہا جاتا ہے " انسان کو پھول اس وقت توڑنے چاہیے جس وقت وہ توڑے جانے کے قابل ہوں" چین نے اپنے عمل سے یہ محاورہ بھی سچ ثابت کر دیا، اس نے معیشت اور اقتصادیات کے پھول کاشت کئے، انہیں جوان کیا اور آج پوری قوم پھول جن رہی ہے، عمارتوں سے یاد آیا، پنجاب کے کیوئیٹیکیشن اور ورس کے صوبائی وزیر رانا ظہیر الدین بھی ہمارے ساتھ تھے، وہ دلچسپ شخصیت کے مالک انسان ہیں، جو بھی شخص ان کی کہنی میں بیٹھ جاتا ہے وہ ان کا ہو کر رہ جاتا ہے، دورانِ سفر رانا صاحب نے اپنے والد مرحوم کے دو قول منائے، یہ قول بھی سونے لے چکے تھے، تاغی ہیں، رانا صاحب نے بتایا، ان کے والد کہا کرتے تھے، دنیا میں کچھ لوگ دولت مند ہوتے ہیں اور کچھ امیر، ہم ان سے پوچھا کرتے تھے ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے تو وہ کہتے تھے، دولت مند وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو جبکہ امیر وہ ہوتا ہے جو اس دولت کو شہت کاموں میں خرچ کرے لہذا اللہ تعالیٰ سے دولت مند کی بجائے امیر ہونے کی دعا کرنی چاہیے اور وہ فرمایا کرتے تھے انسان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس سے دوستوں کو ہمیشہ آس رہے اور دشمنوں کو خوف، میں رانا صاحب کے والد کے اقوال سے بہت متاثر ہوا اس کی وجہ بھی چینی اقوال ہیں، چینی لوگ کہا کرتے ہیں اگر تم ایک سال کی منسوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم تلخی بوؤ، اگر تم دس سال کی منسوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کیلئے منسوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو، تم انہیں تعلیم دو، رانا صاحب کے والد کے اقوال تیسری کتب شیگرہ میں خال کرتے ہیں لہذا میں نے پاکستان چاہنے والے یہ دونوں فقرے اپنی ڈائری میں لکھ لئے۔



ہم ایک زندہ دل قوم ہیں

سلیمن احمد مصیبن پشگل ڈیٹا میں اینڈر سٹریٹیشن اتھارٹی (ٹاور) کے چیئرمین ہیں جنھیں پندرہ دن پہلے ان کا ایک منظر و میزبان سے کا اتفاق ہوا اس اندر وہیں سلیمن کے انکشافات کیا ہو رہا ہے۔
 دیش کیلئے باقی سکورٹی ڈرائیو تک اسٹنس بنائے گی ٹاور انے یہ کانٹریکٹ کھلی بولی میں حاصل کیا تھا اس سلسلے میں بنگلہ دیش نے بین الاقوامی کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کیے 64 ممالک کی کمپنیوں نے اپنا پی کیا پھر دیش کی حکومت نے بولی کرائی ٹاور انے سب سے کم بولی دی نہیں یہ ٹھیک ٹاور کو مل گیا ٹھیکے کے مطابق ٹاور بنگلہ دیش کو ایک ڈالر اور 80 سینٹ میں ڈرائیو تک اسٹنس بنا کر دے گی اس پراجیکٹ کا سافٹ ویئر پاکستان میں تیار ہو گا جبکہ افرادی قوت بنگلہ دیش سے حاصل کی جائیگی میں نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو میرے تین رد عمل تھے اولیٰ مجھے ٹاور کی پرفارمنس پر خوشی ہوئی ماشاء اللہ اب ہماری (یا شاید ہمارا) ڈرائیو بین الاقوامی کمپنی بن چکی ہے اس کے اختیارات اور قابلیت ملکی سرحد میں عبور کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہو چکی ہے دوم ٹاور اپنی سکورٹی ڈرائیو تک اسٹنس بنانے کی مہارت رکھتی ہے اس کے پاس بین الاقوامی ڈاکومنٹس بنانے کی مہارت بھی آگئی ہے اور سوم ٹاور انے اپنی یہ قابلیت پاکستانوں پر آزمانے کی بجائے پہلے

بنانے بجائے اس کا ہی دار بھنا۔

باقی سکورٹی ڈرائیو تک اسٹنس وہ سرکاری دستاویز ہے جس کی بنیاد پر یورپ امریکہ

مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ نے ترقی کی تھی آج سے بچاس برس پہلے برطانیہ نے سوچا تھا وہ کون سی جگہ وہ کون سا مقام ہے جس پر ملک کے تمام شہری روزانہ آتے ہیں معلوم ہوا وہ مقام یا وہ جگہ سڑک بنے جو بھی شخص اس دنیا میں آ کر کھولتا ہے وہ سڑک پر ضرور آتا ہے ایک اندازے کے مطابق یورپ کا ہر شہری روزانہ اوسطاً 89 مرتبہ سڑک پر قدم رکھتا ہے امریکہ میں یہ تعداد 150 کو چھو رہی ہے جبکہ جاپان اور چین میں اس کی تعداد بالترتیب 121 اور 141 ہے برطانیہ نے محسوس کیا جب ہمارے لوگ اس بڑی تعداد میں روزانہ سڑک پر آتے ہیں تو پھر ہمیں سڑک کو اپنے نظام کا مرکز بنا نا چاہیے چنانچہ 1950ء میں فیصلہ ہوا برطانیہ کی سڑکیں قانون کا مرکز ہوں گی اس وقت برطانیہ کے زیادہ تر حکمران یہ فقرہ بولتے تھے "قانون کا نفاذ سڑک سے شروع ہوتا ہے آپ سڑکوں پر قانون نافذ کریں پورے ملک میں خود بخود قانون نافذ ہو جائے گا" برطانیہ نے اس دور میں ٹریفک پولیس کو عام پولیس سے الگ کیا اسے اختیارات سہولتیں اور بھاری تنخواہیں دیں اور اس کے بعد اپنی سڑکیں اس کے ہاتھ لے کر لیں برطانیہ کی ٹریفک پولیس نے چند ماہ پہلے سڑکوں کو قانون کا محور بنا دیا یہ تجربہ کامیاب ہوا لہذا ان کے بعد فیصلہ ہوا اگر سڑکیں تمام شہریوں کی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہیں تو پھر ذرا نیوٹنگ لائسنس کو بھی اہم ترین دستاویز ہونا چاہیے چنانچہ برطانیہ نے ذرا نیوٹنگ لائسنس کو ہائی سکیورٹی ڈاکومنٹ بنا دیا اور اس کے حصول کو انتہائی پیچیدہ اور مشکل کر دیا اس دور میں کہا جاتا تھا برطانیہ کا وزیر اعظم بنا آسان ہے لیکن ذرا نیوٹنگ لائسنس حاصل کرنا مشکل حکومت نے اس کیلئے بڑا کڑا معیار طے کیا لائسنس کے حصول کیلئے جانچ ہونا شریف ہونا قانون کا اور اک رکھنا اور ذرا نیوٹنگ کا ماہر ہونا ضروری تھا آنے والے دنوں میں یہ معیار مزید مشکل ہو گیا چنانچہ آج یہ حالت ہے برطانیہ میں ذرا نیوٹنگ لائسنس سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے آپ کے پاس اگر یہ کارڈ موجود ہے تو برطانیہ کا ہر سرکاری اور غیر سرکاری روزانہ آپ کیلئے کھلا ہے بھروسہ دے دیا گیا ہے مگر آپ برطانیہ میں شہریت رکھتے ہیں برطانیہ کی دیکھا دیکھی ہائی سکیورٹی ذرا نیوٹنگ لائسنس ٹریفک پولیس اور ٹریفک کے قوانین پر عملدرآمد کا سلسلہ یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا اور اس کے بعد یہ ذرا نیوٹنگ لائسنس ترقی کا سب سے بڑا معیار بن گیا یہ طے ہو گیا ملکوں کی ترقی کا آغاز ان کی سڑکوں، نرناں پورٹ اور ذرا نیوٹنگ کے قوانین سے ہو گا آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا جس ملک کی سڑکیں، ٹریفک اور ٹریفک قوانین بہتر ہیں صرف ان ملک ترقی یافتہ کہلا سکتے آتے اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں صرف امریکا، انگلینڈ اور جرمنی ہیں۔

آپ کو ان تمام ممالک میں ٹریڈ اور ٹریڈ قوانین مشترک ملیں گے جبکہ آپ دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک کی فہرست بھی نکال کر دیکھ لیں آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ان تمام ممالک میں ٹریڈ کے قوانین بہت کمزور اور ٹریڈ کا نظام انتہائی ناقص ہے آپ امریکہ، لاطینی امریکہ، یورپ، مشرق بعید اور اب مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے کریں آپ کو ان تمام ممالک میں ٹریڈ کے قوانین انتہائی مضبوط اور ذرا پیچیدگی انسٹنس ایک مقدس! اکومنٹ نظر آنے ہوگا آپ کو معلوم ہوگا ذرا پیچیدگی انسٹنس ان تمام ممالک کا سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے آپ ذرا سی ریورسنگ کر کے دیکھ لیں اس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں باقی سب ترقی یافتہ ممالک انسٹنس موجود ہیں۔

میں نے جب سلیم معین صاحب کا انٹرویو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا ترقی کے عمل میں بھگت و پیش ہم سے چند قدم آگے ہے جس وقت پاکستان کے نصف سے زائد ذرائعوں کے پاس عام ذرائع تک انسٹنس تک موجود نہیں اس وقت بھگت و پیش باقی سب ترقی یافتہ ممالک انسٹنس کے دور میں داخل ہو رہے ہیں بھگت و پیش کی حکومت اور لوگ یورپ اور امریکہ کی طرح سوچ رہے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہم کو اب آگے نکلنے کے لیے ذرا پیچیدگی انسٹنس لینے کی ضرورت ہے۔

ہماری نادر ای ٹیکنالوجی پہلے پاکستانیوں کو دینے کی بجائے ملک سے باہر بیچ رہی ہے یہ بات ثابت کرتی ہے ہمارا ترقی نظام اس قدر خراب اور سرخ فیتے کا شکار ہو چکا ہے کہ پاکستان میں اس نظام کی گنجائش بھی موجود نہیں ہو بھگت و پیش ہم سے خرید رہا ہے میرا خیال ہے صدر صاحب اور وزیراعظم صاحب کو چاہیے دو سلیم معین کو بلوائیں اور ان سے دو وجوہات جاننے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے ہم اپنی ٹیکنالوجی پاکستان سے پہلے بھگت و پیش کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں ہر چیز آگے کی طرف بڑھتی ہے اگر چیزیں آگے بڑھ رہی ہوں تو ہم ملکوں اور معاشرہ کو ترقی پذیر کہتے ہیں ہمارے ملک میں بھی چیزیں آگے بڑھ رہی ہیں یہ سچ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے ہمارے ملک میں آگے بڑھنے کی دو رفتار نہیں جو اس عمل میں ہونی چاہیے ترقی تو یہ ہے کہ تیار سے ایک ادارے نے ایک ایسا سسٹم بنالیا ہے جس کی عالمی مارکیٹ میں مانگ ہے لیکن دوسری طرف یہ عالم ہے ہمارا اپنا ملک یہ سسٹم خریدنے اور اس سسٹم کو نافذ کرنے کیلئے تیار نہیں یہ عجیب بات نہیں ترقی ہم اپنی تہوں کی ریوڑیاں دوسروں کی تہوں میں ڈال رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس فیاضی کا ہیشن بھی من رہے ہیں۔

ہم حقیقتاً ایک زندہ و دل قوم ہیں۔

نیری اگر یہاں ہوتی

نیری شائع 1963ء میں فلورڈا میں پیدا ہوئی۔ ہجرتی زندگی میں اس نے نائیکہ شائع کے ساتھ شادی کر لی 25 فروری 1990ء کو جب وہ 26 برس کی تھی تو ایک صبح اسے شدید النیاس شروع ہو گئیں اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا ہسپتال میں ڈاکٹر اس کے مرض کی بروقت تشخیص نہ کر سکے نیری کو پارت ایک ہوا اس کے جسم میں آکسیجن ختم ہوئی اسے برین ٹیمبرج ہو گیا اور وہ ایک طویل سکتے میں چلی گئی۔ جس کے بعد ڈاکٹروں نے اس کے منہ میں خوراک کی تالی لگا دی وہ دن ہے اور آج کا ان ہے وہ مسلسل سکتے میں ہے۔ مائیکل شائو نے غلط علاج کرنے پر ڈاکٹروں کے خلاف کیس کر دیا اگست 1992ء میں عدالت نے اس کیس کا فیصلہ سنا دیا جس کے نتیجے میں دو ڈاکٹروں نے نیری کے خاندان کو ساڑھے بارہ لاکھ ڈالروں کا ادائیگی کی تھی امداد کیلئے ایک نرسٹ بنا اور مائیکل نے نادان کی رقم سے ساڑھے سات لاکھ ڈالروں نرسٹ میں جمع کرا دیے جس کے بعد نیری فلورڈا کے ایک ہسپتال کی مستقل مریض بن گئی 1998ء میں مائیکل نے عدالت میں رٹ کی "نیری طبع لحاظ سے مر جی ہے ڈاکٹروں کا کہنا ہے گزشتہ آٹھ برس میں اس کی حالت میں ذرا فرق نہیں پڑا لہذا اسے زبردستی زندہ رکھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے عدالت ہسپتال کی انتظامیہ کو اس کی خوراک کی تالی بنا دینے کا حکم جاری کرانے" عدالت نے ڈاکٹروں کی رائے طلب کی ڈاکٹروں نے مائیکل شائو کی بات سے اتفاق

کیا چنانچہ عدالت نے 2000ء میں نیری کی ٹیوب بنادینے کی اجازت دے دی، یہ حکم سننے ہی نیری کے والدین عدالت میں پیش ہوئے اور انہوں نے عدالت سے درخواست کی "ہماری بیٹی زندہ ہے جب تک سید نیکل سائنس اسے مر: درقرا نہیں دیتی اس کی خوراک کی نالی نہ بنائی جائے" عدالت نے اس درخواست کے فیصلے تک نالی لگانے کی اجازت دے دی، یہ 19 اگست 2003ء کی بات ہے اس کے بعد امریکی محاضرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، قانون، قانون دان اور عدالتیں نیری کو مراد قرار دینے لگیں اور وہ اس کے مطلق سے ہلی بنانے کا مطالبہ کرنے لگیں جب کہ عام لوگ "نیری زندہ ہے" کے نعرے لگانے لگے اور جب تک اس کی سانس چل رہی ہے فیصلے تک نوب برقرار رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

نیری کا مقدمہ 2003ء آگے بڑھنے لگا یہ کیس جمہوری عدالت سے بڑی عدالت 'بڑی عدالت سے فیڈرل کورٹ اور فیڈرل کورٹ سے سپریم کورٹ پہنچ گیا ان تمام عدالتوں نے نیری کو مر: قرار دے دیا اور نوب بنانے کا حکم جاری کر دیا لیکن اکتوبر 2003ء کو نوب بنانے کے حکم کو روک دیا جسٹس بشن نے عدالتوں کا یہ فیصلہ ماسے سے انکار کر دیا، اس کا جواب تھا "نیری زندہ ہے جب تک اس کی زندگی کی حفاظت کریں گے ہم اس کی ٹیوب نہیں اترنے دیں گے" ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ 18 مارچ 2005ء کو فیڈرل عدالت نے حتمی فیصلہ دے دیا اس فیصلے کے بعد ہسپتال کی انتظامیہ نے دن کے ایک بج کر 45 منٹ پر نیری شایو کی فیڈنگ ٹیوب اتار دی لیکن اس مرحلے پر وفاقی حکومت نے نیری کے کیس میں مداخلت کی اور عدالت سے نیری کی ٹیوب بحال کرنے کی درخواست کر دی، عدالت نے فیصلہ دیا "اگر حکومت کا قانون نیری کو زندہ تسلیم نہیں کرتا اگر حکومت نیری کو چھوڑنا چاہتی ہے تو اسے نیا قانون بنانا پڑے گا" حکومت نے نیری کا معاملہ فوراً کانگریس میں پیش کر دیا کانگریس نے نیا بل تیار کیا اس پر بحث کی اور نیری کے حق میں فیصلہ دے دیا جب اس بل پر بحث چل رہی تھی تو صدر بش ٹیلیگراف میں اپنے فارم پوچھنیاں گزار رہے تھے انہوں نے پھنیاں منسوخ نہیں اپنے خصوصی لیبار سے پرہیز اور دانت باز اس واپس آگئے ان کی یہ واپسی میراٹن کی یونٹ پرچہ دو سال سے امریکہ میں یہ روایت بن آ رہی ہے جب وہاں امریکی صدر چننا سنانے جاتے ہیں تو انہیں کسی معاملے میں پریٹن نہیں کیا جاتا ان کی ساری سرکاری اور شایع مصروفیات منسوخ کر دی جاتی ہیں ان کے ٹیلی فون رابطے تک بند ہو کر دے جاتے ہیں لیکن صدر بش نے نہ صرف یہ روایت توڑ دی بلکہ ڈونوری طور پر وائٹ ہاؤس بھی واپس آ گئے اس موقع

پروائٹ باؤس کے ترجمان سکاٹ میفنگلی ان نے صدر کی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا "صدر ہٹتے ہیں ایک مریض کی جان ان کی چیٹیوں سے زیادہ قیمتی ہے" نیری ٹیس کی تازہ ترین صورت حال کے مطابق آج 24 مارچ تک اس کی فیڈنگ ٹھیک ہے اور وہ آہستہ آہستہ موت کی دہلیز کی طرف بڑھ رہی ہے۔ امریکی قانون اس کی موت کا منتظر ہے جبکہ امریکی عوام اور امریکی حکام ایسا قانون بنانے میں مصروف ہیں جو نیری کی اترتی ہوئی فیڈنگ ٹھیک ٹھیک سے جو اس کی زندگی بچائے۔

نیری کا یہ ٹیس ثابت کرتا ہے امریکی حکومت اپنے شہریوں کی زندگی کے بارے میں بہت ہی زیادہ ہے آپ زار دیکھئے امریکہ کے ایک عام شہری کا ٹیس کا ٹکر ٹیس میں 'میا' کا ٹکر ٹیس نے معمول کی کارروائی روک کر یہ کیس بنا قانون میں تبدیلی کا فیصلہ کیا 'قانون سازوں نے قابل تکمیل دیا اور صدر اس میں پروتھا کرنے کیلئے اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے دارالحکومت پہنچ گیا۔

حقیقت ہے نیری زیادہ اور ہلکے وزن ہوئیں رہے گی جو ٹکر ٹیس نکل سانس نیری کے معاملے میں ہے

اب امریکہ سے پاکستان آتے ہیں آپ نیری کے ٹیس کو سامنے رکھیں اور پھر اپنے اسلامی احاطے پر نظر آئیں اور پھر سوچیں "کیا اللہ رسول اور قرآن کے دعوے دار اس احاطے میں بھی انسان کو اتنی ہی وقعت اتنی ہی اہمیت حاصل ہے سوچئے اگر نیری اس ملک میں ہوتی تو کیا ہماری پارلیمنٹ ہمارے وزیر اعظم اور ہمارے صدر کا رول مل بیگی ہوتا سوچئے اگر نیری اس اسلامی احاطے میں ہوتی تو کیا ہمارے حکمران اس کی جان بچانے کیلئے قانون تبدیل کر دیتے کیا یہ بھی اپنی چھٹیاں منسوخ کر دیتے" ہو سکتا ہے آپ کا جواب نفی میں ہوا اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر آپ ایک بات پلے باندھ لیجئے اسلام کے جس اور میں حضرت عمر فرات کے بھوکے کتوں کو ظیفہ کی ذمہ داری قرار دیتے تھے اس وقت مسلمانوں کا اقتدار زمین کی آشنی حدود پر دستک دے رہا تھا لیکن جب حضرت عمر کی اس سوچ تو مسلمانوں نے فراموش کر دیا اور امریکہ نے اسے قانون بنا دیا تو مسلمان اپنے نبی و جو میں سہ کر رہ گئے 'ہوا اپنی ہی ذات میں شرمندہ ہو گئے' ابھی سے جب لوگ پوچھتے ہیں مسلمان امریکہ کا مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے تو میں کہتا ہوں "صرف اس لئے کہ امریکہ کے دل میں اپنے شہریوں کا احترام ہوتی ہے ان میں انسانیت اور انسان دوستی موجود ہے جبکہ مسلمان کا دل رحم اور احترام سے خالی ہو چکا ہے اور انسانیہ خاک لوگوں کو تم نہیں کرتا"

گھائے کا سودا

لین چن کا تعلق چین کے صوبے جیانگ سو (Jiangsu) سے ہے جو صوبہ کئی شہر نان جنگ (Nanjing) سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک گاؤں میں واقع ہے۔ وہ اسی وقت سے وہیں رہیں پہلے نان جنگ میں معاشی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو گاؤں کے زیادہ تر نوجوان صوبائی دارالحکومت میں منتقل ہو گئے لیکن چن بھی ان کی پیروی میں نکل کھڑا ہوا اس نے شہر کی ایک ٹیکسٹائل میں کام شروع کر دیا۔ کام دلچسپ تھا اور لین چن بخوبی جہذاہو آتی کہ انے انکا آنے والے برسوں میں وہ مزہور سے افسر بن گیا اس کی تنخواہ میں تین گنا اضافہ ہو گیا لیکن چن کی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزرنے لگی تین برس پہلے لین چن نے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی کر لی شادی کے بعد لین چن ایک نئے مسئلے کا شکار ہو گیا اس کی بیوی گاؤں میں رہتی تھی جبکہ وہ اس سے چھ سو کلومیٹر دور نان جنگ میں مقیم تھا وہ اپنی تنگ سے سال میں ایک بار ملتا تھا لیکن میں تمام درکروں کو بغیر پارک ایک ماہ چھٹی ملتی ہے انگریزی میں ان چینیوں کو پورے گاؤں یا ایک گاؤں کے کھانے سے لے کر انہوں سے ایک دو روز پہلے قراں کر کے انہوں کو گھلے گھلے جاتے ہیں اور 29 جنوری تک چینیوں پر رہتے ہیں لیکن چن بھی لاٹک بانی ڈیزا پر مجبوزں جاتا تھا اور ایک مہینہ اپنی تنگ کے ساتھ گزار کر واپس آ جاتا تھا اس سال وہ گاؤں گیا تو وہ بیٹے کا پاپن چکا تھا وہ بہت خوش تھا لیکن اس کی ماں نے اسے ایک عجیب و غریب میں ڈال دیا اس نے اس سے کہا تمہارا بیٹا

تاک ہمارے خاندان سے نہیں ملتی، لیکن جی نے غور کیا تو بچے کی تاک واقعی خاندان سے مختلف تھی، اس نے بچہ اٹھایا اور اسے جبر علی سنٹر لے گیا اسنٹر میں بچے کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوا اور ہسپتال نے بچے کو لیمن جی کی اولاد ڈیکلیئر کر دیا، لیمن جی بچے کو لے کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

چھین میں اس وقت لیمن جی جیسے 14 کروڑ لوگ ہیں، یہ تمام لوگ اپنے گھروں سے دور کام کرتے ہیں اور سال میں صرف ایک بار گھر لوٹتے ہیں، گھروں سے اس دوری کے دوران جب یہ لوگ صاحب اولاد ہوتے ہیں تو یہ لیمن جی کی طرح شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی عائلی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے، شروع شروع میں یہ شکوک و شبہات طلاق پر جا کر ختم ہوتے تھے لیکن حکومت نے جلد ہی اس مسئلے کی گھنٹی کا اندازہ لگایا لہذا اس نے مختلف علاقوں میں جبر علی سنٹر بنادے، اس کے بعد اب مزدور نیاں پر گھر لوٹتے ہیں تو وہ اپنے اپنے نوسالوں بچے اٹھا کر جبر علی سنٹر پہنچ جاتے ہیں اسنٹروں میں ان کا ڈی این اے ٹیسٹ ہونا

سے اور اس ٹیسٹ کے بعد ہسپتال ان بچوں کی ولدیت کا تعین کرتے ہیں، ان قسم کے سنٹروں کے دوران 20 فیصد نوسالوں کے خدشات صحیح ثابت ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ہسپتال میں لے آتی ہوئی اور طلاق بھگا دیتے ہیں، "انگ ہالی اینڈ" کے دوران ان سنٹروں میں بے تما اشارش ہوتا ہے، سینکڑوں ہزاروں لوگ روزانہ جہاں آتے ہیں ان کی گود میں بچے ہوتے ہیں اور وہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنے اپنے نامقدر کے فیصلے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، یہ چین کا پہلا سماجی مسئلہ ہے۔

چین کا دوسرا سماجی مسئلہ رشتے ہیں، آج سے پچاس برس پہلے چین کی آبادی میں بے تما اشارش اور اضافہ ہوا تھا، چین کی حکومت نے آبادی کا باڈروکنے کا فیصلہ کیا، جس کے نتیجے میں چین میں "سبز ستارہ" قسم کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں لیکن جب اس میں خاص کامیابی نہ ہوئی تو حکومت نے دو او کے سلسلے میں قانون بنا دیا، اس قانون کو سنگل چائلڈ لاء کہا جاتا ہے، اس قانون کی رو سے چین میں ایک جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے، تاہم چین کے بعض اضلاع اور اضلاع اور صوبوں میں دو بچوں کی اجازت بھی ہے لیکن یہ اجازت صرف 12 فیصد رقبے تک محدود ہے، باقی چین میں سنگل چائلڈ کا قانون نافذ ہے۔ اب اس قانون پر عملدرآمد شروع ہوا تو حاملہ خواتین ابتدائی مہینوں میں انٹراسائزمنڈ کے ذریعے بچے کی جنس معلوم کر لیتی تھیں، اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ بیٹی کی ماں بننے والی ہیں تو وہ اپنا کارڈ تیس اس کے نتیجے میں چین میں مرد بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور حکومت افسوس ہوا، یہ عمل اسی طرح جاری رہا، 2000 تک چین میں صرف مرد ہی مرد بچوں

Kashif Azad@OnlineLibrary.com

مگے چنانچہ حکومت نے پیرائٹس سے پہلے بچے کی جنس معلوم کرنے پر بھی پابندی لگا دی اور بلاوجہ استعفا کو بھی مخالف قانون قرار دے دیا لیکن اس قانون کے بعد نئے مسائل پیدا ہو گئے ان مسائل میں چین میں رشتوں کا بحران بھی شامل ہے مثلاً اس وقت چین میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں ان کا کوئی بھائی، کوئی بہن نہیں ان کا کوئی چاچا، چاچھی، تایا، تائی، ماسوں، ممانی، خالہ، خالو اور پھوپھا پھوپھی نہیں جنہیں میں انکس کا لفظ تک ختم ہو چکا ہے اور چینی ماہرین کا خیال ہے یہ صورت حال جاری رہی تو دس برسوں بعد ڈکٹیٹری سے بھائی، بہن، چاچا، چاچھی، تایا، تائی، خالہ، خالو اور پھوپھا پھوپھی کے الفاظ تک ختم ہو جائیں گے چنانچہ چینی حکومت کی کوشش ہے چین میں کسی نہ کسی طرح یہ رشتے برقرار رکھے جائیں حکومت اب چین میں ایسے قوانین بنا رہی ہے جن کے ذریعے بچوں کو بہن بھائی اور کزن کے مصنوعی رشتوں میں پروایا جاسکے اس قانون کے بعد بچوں کو مجبور کیا جائے گا وہ سکول میں کسی بچی کو اپنی منہ بولی بہن یا منہ بولا بھائی بنائیں وہ کسی کو اپنا چچا زاد بھائی، خالہ زاد بہن اور تایا زاد بھائی، بہن ذمہ لکھ کر کریں اور باقی زندگی ان کے ساتھ رابطے میں رہیں چین میں کارڈر جمائے والے بے شمار کمپانیاں اس وقت مالی صورت اچھی رہی ہیں اور ان کے بڑے بڑے سسٹمز کے کارڈر پھاپ رہی ہیں حکومت کی کوشش ہے چین میں ایک ایسا پھر پروان چڑھایا جائے جس میں بچے یہ کارڈر اپنے مصنوعی رشتے داروں کو دینا شروع کریں اور اس کے بعد پوری زندگی ان کارڈروں کا جالہ جاری رکھیں۔

چین اس وقت دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹریل اینیٹ سب سے بڑا شاہجگ مال اور دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت ہے یہ بحران اسی معاشی طاقت اس شاہجگ مال اور ہی انڈسٹری کا نتیجہ ہے دنیا میں پانچ سو سال سے ایک فقر و بھکرالی کر رہا ہے ”کچھ پانے کیلئے کچھ کھونا پڑتا ہے“ چین نے پہلی تین دہائیوں میں معاشی اور مالیاتی استحکام کے بدلے یہ سارے رشتے کھوئے ہیں وہ دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت سب سے بڑا شاہجگ مال اور سب سے بڑی انڈسٹریل اینیٹ تو بن گیا لیکن اس نے اپنے سارے رشتے کھو دیئے اس نے والدین کا اولاد پریتیں متزلزل کر دیا، چینی سوسائٹی سے چاچے، مامے، تائے اور چوپھے ختم ہو گئے، چین کے معاشرے سے چاچیاں، ممانیاں، تایاں اور پھوپھیاں ختم ہو گئیں وہاں بہن بھائی اور کزن کا رشتہ ختم ہو گیا، آج جب چین میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا باپ سب سے پہلے اسے بیرونی سنٹر لے جاتا ہے اس کی ولدیت کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے بعد اسے چین یا اپنی کہتا ہے جب یہ بچہ

ذرا سا بڑا ہوتا ہے تو پوری دنیا میں ماں کے سوا اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا وہ رشتوں کے ایک دستِ ظلم کے ساتھ پر دان چڑھتا ہے اور جب یہ بچہ جوان ہوتا ہے تو یہ جین کی معاشی اور صنعتی ترقی کا تاوان دینا شروع کر دیتا ہے لہذا جین اس وقت ایک ارب 20 کروڑ تباہ لوگوں کا ملک ہے۔

میں نے کل پاکستان کے ایک پالیسی میکر کا بیان پڑھا، انہوں نے فرمایا ہم پاکستان کو جین بنا دیں گے، میں ان کا یہ بیان پڑھ کر پریشان ہو گیا اور میں نے فوراً سوچا پاکستان کو جین بنانے کیلئے حکومت کو پھر فنی منسٹر بھی بنانے پڑیں گے اسے اس معاشرے سے رشتوں کی خوشبو رشتوں کے سارے رنگ بھی اڑانے ہوں گے اسے اس معاشرے کی ساری خوبصورتی بھی مٹانا ہوگی، میں نے سوچا "کیا ہم ایک فیکٹری، ایک دکان اور ایک شاپنگ مال کے بدلے اپنے سارے رشتوں کی قربانی دے سکتے ہیں؟" میں نے پھر سوچا "میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، ہمارے جیسے ملک میں عام شخص کی عام سی سوچ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی، ایسے ملک میں وہی ہوتا ہے جو کرنے والے کرتا چاہے جین ہو پالیسی ساز، نھان لیتے جین میں نے پھر سوچا جین نے رشتوں کی قربانی دے کر ترقی کر لی تھی لیکن کہیں ایسا نہ ہو ہم قربانی بھی دے دیں اور ترقی بھی نہ کر سکیں کیونکہ ہمارا بڑے بڑے جے ایم گلوبل کی تقصیر کاٹنے میں جب یہ تقصیر پورے فنی ہیں اور ان چودوں پر پھول تلنے کا موسم آتا ہے تو ہم کاٹنے تو ڈر کر گھرتے آتے ہیں، ہم لوگ کھانے کا سوا کرنے میں ماہر ہیں۔"



بٹ آئی لائیک یوسوچ

بعض اوقات آپ کو یونہی بیٹھے بیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کے بعد اس کہانی کے تمام کردار آپ کے ذہن سے نکل کر رو جاتے ہیں آپ اس کہانی اور اس کہانی کے کرداروں سے جان چمڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کردار اور وہ کہانی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی بلکہ اور جارج کی داستان بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس نے یہ کہانی یہ سوں پہلے کسی ڈائجسٹ میں پڑھی تھی اور یہ بھی بے شمار دوسری کہانوں کی طرح میرے دماغ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھی اور جارج اور ولسن دونوں کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے اچانک یہ کہانی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد آئی اور اس کے تمام کردار میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئے میں نے ان سے جان چمڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن ولسن اور جارج میرا پیچھا چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے یہ دونوں کردار اب ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں یہ ہر وقت میرے ساتھ ٹھٹھکو کرتے ہیں اور میں انہیں اپنے آگے پیچھے چلا پھرتا دیکھتا ہوں۔

ولسن امریکی ریاست ٹیکساس کا مافیا لارڈ تھا اس کے دو ہی شوق تھے جانور پالنا اور دھنسیاں بنانا اس کا کہنا تھا کہ میں آپ کی طاقت کا ثبوت ہوتے ہیں آپ کے جتنے زیادہ دشمن ہوں گے آپ اتنے ہی طاقتور ہوں گے لہذا وہ دشمن بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن اس کا دشمنوں کے ساتھ نبھنے کا طریقہ بہت دلچسپ تھا وہ جب بھی کسی شخص کو اپنا دشمن

بناتا تھا تو اس دشمن کے مقابلے میں ایک دوست بھی شہنشاہی کرتا تھا یہ دوست اس کے دشمن کا دشمن ہوتا تھا وہ اس 'دوست' کو اٹھ دیتا تھا پیسہ اور حوصلہ دیتا تھا اسے دشمن سے لڑا دیتا تھا اور خود دور بیٹھ کر اس لڑائی کو انجوائے کرتا تھا اس جنگ کے دوران عموماً اس کا دشمن مارا جاتا تھا جس کے بعد وہ دشمن کی میت پر آتا تھا دشمن کی نعش پر پاؤں رکھتا تھا اپنے شارات نرم دوست کو تھکن دیتا تھا اور اس کے بعد اسے بھی گولی مار دیتا تھا اس کا فلسفہ تھا جب آپ کا کوئی دوست آپ کے دشمن کو شکست دے دیتا ہے تو وہ آپ کا دوست نہیں رہتا چنانچہ آپ کو چاہیے پہلی فرصت میں اپنے اس دوست سے جان چھڑالیں ایل۔ ڈین اس کا ایک ایسا ہی دوست تھا ایل۔ ڈین نے دشمن کے کہنے پر اس کے سب سے بڑے دشمن مان سے گھرنی تھی مان دشمن سے بہت بڑا اور مضبوط مانیا تھا اس کا خیال تھا ایل۔ ڈین مان کو شکست نہیں دے سکے گا لیکن ایل۔ ڈین نے مان کے گلے نکلے کر دینے دشمن کو محسوس ہوا ایل۔ ڈین یہ جنگ جیت کر مان کی جگہ لے چکا ہے چنانچہ اب اسے ایل۔ ڈین سے بھی جان چھڑالینی چاہیے اس لیے ایل۔ ڈین کی طرف بڑھا لیکن اس وقت تک ایل۔

ڈین دشمن کی نسبت بخیر چکا تھا چنانچہ ایل۔ ڈین وہاں سے بھاگا اور اس نے نکلے مان سے باہر جا کر اپنا ایک گنگ بڑا مانیا بنالیا ایل۔ ڈین جرات مند بھی تھا ہوشیار بھی اور وقت مند بھی لہذا اس کا مانیا جڑ پکڑنے لگا اور لوگوں کو محسوس ہونے لگا ایل۔ ڈین دشمن کو برباد کر دے گا اس وقت دشمن کو ایک ایسے شارات نرم دوست کی ضرورت پڑی جو ایل۔ ڈین کا مقابلہ کر سکے جارح اس وقت مانیا ابھر رہا تھا اس میں جرات بھی تھی اور آگے بڑھنے کی خواہش بھی چنانچہ دشمن نے جارح کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جارح ایل۔ ڈین کے سامنے اٹ گیا جس کے بعد جارح ایل۔ ڈین کے نھکانوں کا اندازہ لگا تا اور دشمن جارح کی آڑ میں ان نھکانوں پر حملہ کر دیتا ان حملوں میں ایل۔ ڈین کے بے شمار ساتھی مارے گئے اور اس کے زیادہ تر ہتھیار اس کے ہاتھ سے نکل گئے حتیٰ کہ وہ جنگوں میں ہٹاؤ گزین ہو گیا دشمن نے اس کے ہتھیار اور پرائیوٹ جینٹ بھادوا جارح اس کا سیانی پر پھولے نہیں مانتا تھا اس کا خیال تھا اب دشمن اسے اپنی ریاست کا جنوبی حصہ دے گا ایک دن دشمن نے جارح کو اپنے فارم ہاؤس پر بلایا جارح نے اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا یہاں سے کہاں کا تھا کس شہر کا ہے۔

دشمن نے ایل۔ ڈین کے بدوق اٹھائی جارح کو ساتھ لیا اور اپنے فارم ہاؤس کی سیر کیلئے نکل کھڑا ہوا سامنے دشمن کا عزیز ترین کتا کھڑا تھا کتے نے دشمن کو دیکھا تو وہ اس کے قدموں میں

لوٹنے لگا، دُسن نے کتے کے سر پر ہاتھ بھیرا، اسے چارنیا چند قدم پیچھے بنا کتہے سے بندوں اتاری، کتے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی، کتے کے چیخنے سے اڑ گئے، جارح یہ منظر دیکھ کر کہم گیا، دُسن مسکرا کر بولا، "یہ میرا عزیز ترین کتا تھا، لیکن افسوس اس کے دانت کمزور ہو گئے تھے، یہ اب شکار کو پوری طرح دبوچ نہ سکتا تھا، بت آئی، ایک یوسوچ" اس کے بعد دُسن نے جارح کے کتہے پر ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑا، سامنے اس کا تیش ترین گھوڑا کھڑا تھا، دُسن نے اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ بھیرا، اسے تیش دی، چند قدم پیچھے بنا اور گھوڑے کو بھی گولی مادی، جارح کے ہاتھ پر پسینہ آ گیا، دُسن نے "سکر" اس کی طرف دیکھا، "پورے امریکہ میں اس جیسا کوئی گھوڑا نہیں تھا، لیکن افسوس اب اس کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا، بت آئی، ایک یوسوچ" دُسن نے جارح کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھا گیا، سامنے اس کی پسندیدہ گاڑی کھڑی تھی، اس نے گاڑی کی طرف پیار سے دیکھا، ڈکی سے پٹرول کا کین نکالا، گاڑی پر پٹرول چھڑکا، چند قدم پیچھے بنا اور گاڑی پر فائر کر دیا، ایک شعلہ سا پکا اور گاڑی کو آگ لگ گئی، جارح کے چٹکے چھوٹ گئے، دُسن اس کی طرف مڑا

تھکا لگا، یہ پھر ہی سب سے بڑا کاروبار تھی، لیکن اسے چلنے پھرنے کے لیے کھالی تھی، آئی، ایک یوسوچ

سوچ، دُسن آگے چل پڑا، جارح اس کے پیچھے چلنے لگا، سامنے زعفران کا کھیت تھا، دُسن کھیت کے پاس پہنچا، کھیت کو چند لمحے پیار سے دیکھا، پٹرول کا کین اٹھایا، کھیت کے چاروں طرف پٹرول چھڑکا اور پٹرول پر دیا، سلامتی چھیک دی، پورا کھیت جل کر اکھ ہو گیا، دُسن نے قہقہہ لگایا، "یہ میرے فارم کا سب سے قیمتی کھیت تھا، پچھلے سال میں نے اس سے دو سو زعفران حاصل کی تھی، لیکن اس سال اس نے صرف ڈیڑھ من فصل دی، میں کارکردگی میں کمی برداشت نہیں کر سکتا، بت آئی، ایک یوسوچ" دُسن تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا، اس نے بندوں میں ہاتھی مارنے والا بڑا کارٹوس بھرا اور جارح کی طرف دیکھ کر بولا، "تم نے وعدہ کیا تھا، تم اپریل تک ایل۔ ڈی کو پکڑ لو گے، ذرا حساب لگا کر بناؤ، اپریل میں کتنے دن باقی ہیں، جارح کا پورا جسم پیسے میں بھیک گیا، اس نے جیب سے دو مال نکالا، ہاتھ پر بھیرا اور لرزتی آواز میں بولا، "مائی لارڈ، آئی ایم ٹرائیٹنگ، بت ہی از سو گلڈرز" دُسن نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا، اس کے کتہے پر چھگی دی اور مسکرا کر بولا، "ڈونٹ دری آئی، ایک یوسوچ" اس کے بعد بڑی دیر تک وہاں سناٹا رہا، جارح نے ڈرتے ڈرتے دُسن سے پوچھا، "مے آئی گونا ڈسز" دُسن نے "سکر" کہا، اس میں گردن ہلا دی، جارح اٹھا سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا، دُسن اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا اور منہ ہی منہ میں بڑا اتار رہا، "میں آئی

لائیک ہم سوچ آئی لائیک ہم سوچتے ہیں..... میں اپنی نظرت سے بہت تنگ ہوں کام ختم ہونے کے بعد مجھے اپنے دوستوں سے نفرت ہو جاتی ہے مجھے لوگ اچھے نہیں لگتے یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عام سی کہانی تھی، دنیا بھر کے ڈائجسٹوں میں روزانہ ایسی بے شمار کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں چند روزوں سے مجھے یہ کہانی بہت یاد آ رہی ہے اور میں دلن کو اپنے سامنے چلا پھرتا، باتیں کرتا، قہقہے لگاتا اور ہدوتی میں کارتوس بھرتا ہوا دیکھتا ہوں مجھے دلن کے فارم ہاؤس کے تمام مناظر یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا دنیا میں واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک دوستی ایک شارٹ نرم تعلق ہوتا ہے جن کی دوستیاں صرف ایک ٹاسک تک محدود ہوتی ہیں جو صرف پراجیکٹ ٹو پراجیکٹ تعلق رکھتے ہیں مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا میں پھر سوچتا ہوں بعض اوقات ہمیں یونگی ٹیٹھے ٹیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کہانی کے تمام کردار ہمارے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور ہم لوگ پوری کوشش کے باوجود اس کہانی

www.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا تعلق بھی دلن اور جارج جیسا نہ ہو کہیں صدر بٹلر دلن اور صدر پرویز مشرف دلن اور صدر پرویز مشرف جارج نہ ہو میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میں فوراً انکار میں سر ہلاتا ہوں اور اپنے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہانیاں محض کہانیاں ہوتی ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔



معمول کی کارروائی

جان سمٹھ کا تعلق برازیل کے شہر ریو ڈی جنیرو سے تھا وہ امریکہ سے پھولنی شوگر میس
 اور آئی ٹی تھا اس کا شہر برازیل کے جڑے شہروں میں سے تھا اور وہ ہر نئے امریکہ آتا تھا
 اکتوبر 2001ء میں وہ نیویارک ایئر پورٹ پر اترا تو اس نے وہاں عجیب صورت حال دیکھی اس
 نے دیکھا ایئر لائن کے کاؤنٹرز کے سامنے طویل قطار لگی ہے اور جو بھی مسافر ایئر لائن کے
 پاس پہنچتا ہے وہ اپنی ٹائی ٹیو پی جوتے اور پرس نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد
 سکیورٹی کے دو اہلکار بڑی باریک بینی سے اس کی تلاش لیتے ہیں جان سمٹھ کیلئے یہ صورت حال
 حیران کن تھی وہ پچھلے 20 برس سے امریکہ آ رہا تھا اور اس نے کبھی یہ منظر نہیں دیکھا تھا جب اس
 کی باری آئی تو ایئر لائن کے آفسر نے اسے بھی جوتے اتارنے کا حکم دیا اس نے یہ آرڈر ماننے سے
 انکار کر دیا ایئر لائن کے آفسر نے اس کا پاسپورٹ لیا اور اس پر ڈی پورٹ کی مہر لگا دی جان سمٹھ اگلی
 فلائٹ سے واپس برازیل چلا گیا اس نے ریو ڈی جنیرو جاتے ہی پریس کانفرنس بلائی اور صحافیوں
 کو یہ سارا قصہ سنایا پریس نے اگلے دن طوفان برپا کر دیا حکومت نے امریکی سفیر کو طلب
 کر لیا لیکن امریکی حکومت نے اسے "معمول کی کارروائی" قرار دے دیا برازیلی حکومت نے یہ
 معاملہ پارلیمنٹ میں لے کر دیا پارلیمنٹ کے فیصلے یا اس سے ذرا سی سرکاری برائیاں کی سرورس پر
 قدم رکھے گا اس کی تفسیلی تلاش ہوگی اگلے دن اس قانون پر عملدرآمد شروع ہو گیا امریکی حکومت

نے اسے ڈس کریمنیشن قرار دیا اور اس پر شدید احتجاج کیا برازیل حکومت نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا اس نے کہا "یہ ہماری معمول کی کارروائی ہے" لہذا 2002ء سے 2006ء تک برازیل دنیا کا واحد ملک تھا جس کے ایئر پورٹس پر صرف ایک ملک کے شہریوں کی تلاشی ہوتی تھی اور وہ ملک تھا امریکہ۔

معمول کی کارروائی کا دوسرا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بھارت کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈس 2002ء میں امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے تھے وہاں ایئر پورٹ پر ان کی وصولی اور کرتے کی تلاشی ہوئی انہوں نے تلاشی دی اور اپنا دورہ منسوخ کر کے بھارت واپس آ گئے بھارت نے اس معاملے پر بھی امریکہ سے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہ کیا 2003ء میں فرنانڈس برازیل کے دورے پر گئے ان کی فلائٹ امریکہ سے ہو کر برازیل جانی تھی راستے میں وہ وہاں ایئر پورٹ پر اتارے تو ایک بار بھارت کی تلاشی ہوئی بھارتی حکومت اس بار بھی خاموش رہی بھارت نے اس معاملے پر امریکہ سے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا بھارت میں حکومت بدل گئی لی بے

نی کی جگہ کا ٹھہریں گئے من سونگہ وز سہما مظہم بن گئے جولائی 2004ء میں امریکہ کے ایئر پورٹ پر خارجہ رجنڈ آرنج سرکاری دورے پر بھارت آئے وہ تین دنوں کی تلاشی کے ایئر پورٹ پر اتارے بھارتی حکومت نے ان کی تلاشی کا حکم جاری کر دیا امریکہ کے سفارتی عملے کے لئے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی امریکی ایجنسی نے اعتراض کیا تو بھارت نے اس وقت اپنے سابق وزیر دفاع کے ساتھ ہونے والے سلوک پر سرکاری احتجاج کیا یہ احتجاج اس قدر شدید اور قطعی تھا کہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے نہ صرف وطنی ایئر پورٹ پر بھارتی حکومت سے معافی مانگی بلکہ وہ معافی مانگنے کیلئے بی جے پی کے لیڈر ایل کے ایڈی والی کی رہائش گاہ پر بھی گئے۔

ہم اگر بھارت اور برازیل کی سیاسی اور سفارتی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا ان دونوں ممالک کا امریکہ کے ساتھ کوئی ورینہ تعلق نہیں تھا بھارت 1990ء تک نہ صرف امریکہ کا مخالف رہا تھا بلکہ وہ اس کے تریف سوویت یونین کا گہرا دوست بھی تھا اسی طرح برازیل دنیا کا سب سے بڑا مشروض ملک ہے اور اس نے آج تک کسی عالمی مسئلے پر امریکہ کی حمایت نہیں کی جبکہ ان دونوں ممالک کے مقابلے میں پاکستان کا شمار امریکہ کے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے ہم لوگ امریکہ کی دوستی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں سے خود کشی کی حدود شروع ہوتی ہیں آپ افغانستان کے دونوں جہاد کو دیکھ لیجئے 1980ء میں ہم دنیا کی واحد قوم تھے جو امریکی مفادات کے

لئے افغانستان میں سوویت یونین سے دست و نریبان تھے 2002ء میں بھی ہم نے امریکہ کے دہکے تنور میں چھلانگ لگادی تھی ہم اس وقت پوری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے سب سے بڑے حلیف ہیں لیکن اس کے باوجود 2008ء میں جب ہمارے وزیراعظم وائٹ ہاؤس کی دعوت پر امریکہ گئے تو سرکاری وفد میں شامل وزراء کے ساتھ اسلوب کیا گیا جس کا تصور تک خیال ہے ہمارے وزراء کو قطار میں کھڑا کر کے ان کی تلاشی لی گئی ان کے جوتے اتروائے گئے ان کی ٹائیاں کھولی گئیں اور ان کی ٹوچیاں جھاڑی گئیں ہم نے جب ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا اور میں نے خود سے پوچھا "کیا امریکہ میں بھارت اور برطانیہ کے وزراء کے ساتھ بھی یہ سلوک ہوتا ہے؟" میرا جواب نفی میں تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذبح ہے کہ 2005ء میں امریکہ نے "معمول کی اس کارروائی" کا سائل تبدیل کر دیا تھا امریکی حکومت اب سرکاری دوسرے پر آنے والے وزراء کو وزیراعظم اور ان کے وفد میں شامل لوگوں کی تلاشی نہیں لیتی ہاں البتہ دو وزراء اور دو سینئر حکام جو فوجی دوزخوں پر امریکہ آتے ہیں انہیں معمول کی اس کارروائی سے گزرنا پڑتا ہے لیکن جب پاکستان جیسے عزیز ترین دوست کی باری آتی ہے تو امریکہ اسے ایجنڈا پورس پر 2002ء کے قواعد میں نافذ کر دیتا ہے وہ پاکستان کے سرکاری وفد کو گھونک اور سچاویں تحریر لکھنا شروع کر دیتا ہے آپ ایک اور دلچسپ امر بھی ملاحظہ کیجئے جب اخبارات میں اس سلوک پر خبریں شائع ہوئیں اور ایک ٹیلی ویژن چینل نے اس سلوک کی فلم دکھادی تو امریکی حکومت تو اس پر خاموش رہی لیکن ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز ہمارے وزیر داخلہ اناب احمد شیر پاؤ اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر جنرل جہانگیر کرامت نے اسے معمول کی کارروائی قرار دے دیا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر یہ معمولی واقعہ ہے تو خاص واقعہ کیا ہوگا؟ خاص کارروائی اور خاص سلوک کیا ہوگا؟

ہم اگر پچھلے پانچ سال کے واقعات جمع کریں تو معلوم ہوتا ہے امریکہ اور یورپ میں ہمارے وزراء اور اعلیٰ سیاستدانوں کی توہین معمول بن چکی ہے پچھلے سال صدر کے دوسرے کے دوران جناب خورشید محمود قصوری کی نہ صرف خوفناک تلاشی ہوئی تھی بلکہ ان کا سامان تک ایئر پورٹ پر روک لیا گیا تھا اور دونوں نے اس پاکستان کے سفارتی عملے پر برسرے اور یہ کہہ سنا تھا "میں کل کون سے کپڑے پہنوں گا" اسی طرح آئی ایس پی آر کے سابق ڈی جی صدر کے پریس سیکرٹری اور سرکاری ترجمان میجر جنرل راشد قویٹی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا امریکی

سنارنگانہ اکثر ہمارے سیاستدانوں کے ویزے مسترد کرنا رہا ہے۔ اپریل 2005ء میں پاکستان کا ایک B گنی سرکاری وفد یورپی یونین کے دورے پر گیا تھا جب یہ وفد برسلو پہنچا تھا تو تنظیم حکام نے وفد میں شامل بزرگ سیاستدان مولانا سخی الحق کو انٹری دینے سے انکار کر دیا تھا یہ ایٹو بعد ازاں پوری دنیا میں مشہور ہوا اور نیل کے ساحلوں سے لے کر تاجک کاشغر ہزاری تک اور بے عزتی ہوئی مولانا سخی الحق نے لندن کے ذریعے واپس آنا تھا جب وہ پتھرو ایئر پورٹ پر پہنچے تو سیکورٹی اہلکاروں نے وہاں بھی سوا گھنٹہ ان کی تلاش کی تھی۔ اپریل 2005ء ہی میں بلوچستان کے اذیر بلدیات حافظ حسین احمد شردوی کو ماٹھسٹرا ایئر پورٹ پر روکا گیا تھا اور چار گھنٹے تک ان کی تلاش کی گئی تھی لیکن یہ ہمارا کمال ہے ہم نے معمول کی ان تمام کارروائیوں پر آج تک سرکاری سطح پر احتجاج کیا اور نہ ہی کوئی ایسی پالیسی بنائی جس کے ذریعے ایسے واقعات کا تذکرہ ہو سکے یہ حقائق بتاتے ہیں اگر ہم نے قومی سطح پر کوئی پالیسی نہ بنائی تو معمول کی یہ کارروائیاں آگے چلتی رہیں گی اور ہم لوگ اسی طرح ایئر پورٹوں پر بے عزت ہوتے رہیں گے حکومت کو چاہیے وہ پاکستان میں موجود امریکہ اور یورپ کے سفیروں کو بلائے اور انہیں دو لوگ الفاظ میں کہہ دے اور انہیں گارنٹی دیا جائے کہ ان کی کارروائی کی کوئی توجیہ نہ صرف ایسے دورے منع کر دیں گے بلکہ آپ سے سفارتی تعلقات بھی منقطع کر دیں گے اگر یہ ممکن نہیں تو ہم کم از کم پاکستان میں بھی یہ "معمول کی کارروائی" شروع کر دیں ہم آج سے یہ قانون بنا دیں ہمارے ایئر پورٹوں پر جو بھی امریکی یا یورپی باشندہ اترے گا ہم اس کی جامہ کشائی لیں گے خواہ وہ رچرڈ آرٹس ہو یا کوئٹہ ولینڈرز اس خدا کی پناہ ہمارا سرکاری وفد امریکہ جاتا ہے تو ان کے جوتے ٹوٹی اور کوٹ تک اترنا کر تلاش کی جاتی ہے جبکہ سمندر پار آباد گورنر کاؤنٹری پاکستان آتا ہے تو اسے ریسیور کرنے کیلئے سرخ نمبر پلیٹ کی گاڑی دن وے پر بھیجی جاتی ہے کیوں؟ اس کیوں کا جواب ایک امریکی کہادت میں چھپا ہے امریکی معاہدہ ہے جس سطح کی جو چیز نہیں ہوتی ہے اس کے گلے میں دی بانہ دیتے ہیں نمبر اخیال ہے وہ وقت آچکا ہے جب ہمیں اپنی چونچ باہر نکال لینا چاہیے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو امریکی بچے ہمارے گلے میں دی بانہ ہمیں کے اور ہمیں گلی گلی گھسیٹنا شروع کر دیں گے۔



اپنے بچے

Kashif Azad@OneUrdu.com

یہ 2001ء کی بات ہے، اسی امریکہ میں ٹائن لیون کا واقعہ پیش آیا تھا، عبدالرزاق داؤد پاکستان میں انٹرنیٹ ایڈ کاسٹ کے وفاقی وزیر تھے، عبدالرزاق داؤد نے جاپان کے چند بڑے سرمایہ کاروں کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی، سرمایہ کار پاکستان آئے تو حکومت نے انہیں کوئٹہ کراچی، لاہور، فیصل آباد، سیالکوٹ اور اسلام آباد کا دورہ کرایا، وزٹ کے آخری مرحلے پر وفد کی وفاقی سیکرٹریوں، سرکاری اداروں کے چیئرمینوں، ڈائریکٹرز جنرلوں اور وزراء کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ ملاقات کا اہتمام پٹانگ کمیشن میں کیا گیا تھا، اس میٹنگ میں عبدالرزاق داؤد ان کے ساتھی وزراء اور اعلیٰ سول افسروں نے جاپانی وفد کو پاکستان کے بارے میں بریکنگ وی، پاکستانی حکام کا کہنا تھا پاکستان جغرافیائی لحاظ سے بڑا آئیڈیل ملک ہے، یہ ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، اس میں کم معاوضے پر بنجر ملدہ دستیاب ہیں، یہاں کے لوگ گنتی ہیں اور اس ملک میں چاروں موسموں پائے جاتے ہیں لہذا پاکستان سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک آئیڈیل ملک ہے، جاپانی وفد بڑے غور سے یہ باتیں سن رہا، جب پاکستانی حکام اپنی تعریفیں کر کے تھک گئے تو جاپانی وفد کا لیڈر کہتا ہوا، اس نے اپنے ساتھیوں سے اجازت لی اور پاکستانی

سرمایہ کاروں میں ہوتا ہے انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا "حکومت کو سمجھائیں کوئی امریکائی ایوریٹی جاپانی اور چینی سرمایہ کار پاکستان نہیں آئے گا ان سرمایہ کاروں کو سینیٹیکو سے لے کر ہائی ٹیک وینا جو سروسز آفر کر رہی ہے پاکستان کبھی انہیں یہ سروسز فراہم نہیں کر سکتا یہ لوگ یورپ جیسا لہرل ماحول چاہتے ہیں انہیں شراب خانے، جوا خانے، ڈسکو کلب اور پیجز چائے نہیں، یہ ٹیکس فری سسٹم اور سرمایہ کاری کا دوستانہ ماحول چاہتے ہیں جبکہ ہمارا معاشرہ ہماری روایات اور ہماری ثقافت ان لوگوں کی توقعات سے قطعاً مختلف ہے ہم لوگ ان کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکتے لہذا یہ لوگ کبھی پاکستان میں چین، 'دعویٰ' ہانگ کانگ، تھائی لینڈ اور سیکسیکو جتنی سرمایہ کاری نہیں کریں گے چنانچہ پاکستان کے پاس صرف اور سبز پاکستانیوں کا آپشن رہ جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایسے بے شمار پاکستانی ہیں جو انتہائی خوشحال ہیں، جو یورپ، امریکہ اور مشرق بعید میں بڑی بڑی کمپنیاں چلا رہے ہیں، یہ لوگ پاکستان بھی آنا چاہتے ہیں، مگر حکومت ان پاکستانیوں کو بہتر ماحول، تحفظ اور اچھا نظام دے تو یہ لوگ پاکستان میں اربوں ڈالرنگادیں گے، یہ پاکستان کا مقدر بدل دیں گے" میں نے ان سے لایا تھا "حکومت کو اور سبز پاکستانیوں کا اجماع بحال کر کے رکھنے کی کیا کمرتا چاہیے" طارق جمالی نے جواب دیا "یہ لوگ حکومت کی ذرا سی سپورٹ، ذرا سی توجہ اور ذرا سی پیسہ چاہتے ہیں، ہم لوگ جب دو تین لاکھ ڈالر لے کر دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو وہاں کی حکومت ہمیں ریڈ کارپٹ اسٹیمبل دی جی ہیں لیکن جب ہم لوگ اپنے ملک میں اربوں ڈالر لے کر آتے ہیں تو انٹرپورٹ سے لے کر گھر تک لنبرے ہمارا پیچھا کرتے ہیں، ہم کسی سرکاری دفتر جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے، عدالتیں ہماری آواز نہیں سنتیں اور حکومت ہمارے ساتھ ہاتھ نہیں ملاتی، آپ حد ملا رکھ سکتے ہیں، ہماری کمپنیوں کا کوئی گورنر ملازم پاکستان جاتا ہے تو اس کے لئے نیچے سے لے کر اوپر تک سارے دروازے کھل جاتے ہیں اسے سرکاری سطح پر رکھنے تک ملتے ہیں لیکن جب ہم لوگ چیک بکس کے بریف کیس لے کر پاکستان آتے ہیں تو ہمیں تھانے کا ایس ایچ او تک ملنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، ہم رجسٹریشن اور لائسنس کیلئے اپلائی کرتے ہیں تو وہی دس سال تک ہمیں جواب نہیں ملتا، ہم زمین خرید لیتے ہیں تو اس پر حق خندہ ہو جاتا ہے، بینک ہمارے اکاؤنٹس میں گوسے نہیں دیتا، سڑک اور پانی کیلئے کروڑوں روپے رشوت دینا پڑتی ہے اور ہم لوگ گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے، اسی طرح اگر خدہ خدہ اسٹیم ٹیکریٹری گٹھنیں تو 60 قسم کے ٹیکے ہمارے پیچھے لگ جاتے ہیں ہر شخص ہم سے پیسہ مانگتا ہے"

ہمیں ناظم سے لے کر چیف منسٹر تک سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے اور ہم لوگ اگر پورا انگلیں دے دیں تو مجرم ہیں، نہ دیں تو بھی مجرم ہیں لہذا پھر ہم سوچتے ہیں جب ہمارے ملک کو ہماری ضرورت نہیں تو ہمیں اس بھول اس خاک اور اس حقارت میں زندگی گزارنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کیوں نہ اس معاشرے، اس ملک میں رہیں جہاں ہمارا پیسہ اور ہم دونوں محفوظ ہیں۔

میں نے طارق یحییٰ سے اتفاق کیا، میرے ایک دوسرے دوست برائو پر ویز نے برطانیہ سے آٹھ سو ملین پاؤنڈ لاکر پاکستان میں سرمایہ کاری کی تھی وہ جب بھی پاکستان آتے ہیں تو انہیں شدید مایوسی ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے انہوں نے جتنے مسائل پھیلے چند برسوں میں دیکھے ہیں اتنے انہوں نے چالیس برس میں مجموعی طور پر نہیں دیکھے ان کی بات درست ہے یہ عام مشاہدہ ہے پاکستان میں جو بھی اور ویز پاکستانی سرمایہ لے کر آتا ہے وہ ملت لٹا کر واپس جاتا ہے اور اس کے بعد واپس آنے کا نام نہیں لیتا، بے شمار پاکستانی اس ملک آ کر جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھے جنہا آج ہمارے اور ویز پاکستانی ہمارے نظام پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ عجیب بات ہے ہم پوری دنیا کو سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کے پاس سرمایہ بھی ہے اور جو پاکستان میں سرمایہ کاری بھی کرنا چاہتے ہیں ہم وہیں ملت لٹا دیتے، ہم انہیں دعوت اور ماحول فراہم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، ہم نے پھیلے پانچ برسوں میں بے شمار سرمایہ کاروں کی سبج کاری کی، ہم نے یہ ادارے کوزیوں کے سول غیر ملکیوں کو سبج دیئے، ہم اگر یہ پوتس اور ویز پاکستانیوں کو دے دیتے تو ذرا سوچنے ان لوگوں کا کس قدر اعتماد بحال ہوتا۔ یہ لوگ اس ملک پر کتنا اعتبار کرتے اور ان کا یہ اعتبار آگے چل کر باہر سے کتنا سرمایہ لاتا۔

صدر پرویز شرف نے 17 اپریل 2006ء کو کراچی میں 'پاک امریکن بزنس کونسل' کی ایک کانفرنس سے خطاب کیا تھا، اس خطاب میں بھی صدر نے امریکہ میں آباد پاکستانیوں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی دعوت دی، صدر نے فرمایا ہم آپ لوگوں کو سرمایہ کاری کے لئے سازگار ماحول اور تحفظ فراہم کریں گے، ہو سکتا ہے صدر اس معاملے میں ٹیک نیت ہوں لیکن جب ہم اپنے نظام کا تجربہ کرتے ہیں تو جو بے دکھ ہے کہنا پڑتا ہے پاکستان دنیا میں سرمایہ کاری کے حوالے سے ایک انتہائی ناموافق اور غیر محفوظ ملک ہے اور سرمایہ کار صرف لاروں، پلوں پر کسی ملک میں سرمایہ کاری نہیں کیا کرتے، انہیں مضبوط اور عملی یقین دہانیاں چاہیے ہوتی ہیں، یہ لوگ تو اس قدر مجتہد رہتے ہیں کہ یہ اس بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھولتے جس کے کارڈز کا قند چھفٹ سے کم

ذیروچوانٹ 3.....0...347

ہوادریاس گاڑی میں نہیں بیٹھے جس کے نائروں میں ہوا 28 کعبنت سے کم ہولہذا ہمیں ان کا
 اعتماد بحال کرنے کے لئے اور ویز پاکستانوں کا سہارا لینا پڑے گا ہمیں ان لوگوں کو ملک کی ترقی
 کیلئے پاکستان آنے کی دعوت دینا پڑے گی جو ہمارے اپنے لوگ ہیں جو اپنے ملک واپس آنا
 چاہتے ہیں پنجابی کی کھادت ہے جو ماں اپنے بچے سے عداوتیں کرتی وہ دوسروں کے بچوں سے کیا
 محبت کرے گی ہمارے اپنے بچے ہماری محبت کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ ہمیں حق دینے کا سلسلہ
 اپنے بچوں سے شروع کرنا چاہیے ہمیں پاکستان کی ترقی کا عمل پاکستانوں سے شروع کرنا
 چاہیے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

پہلا پڑاؤ

میرے ایک دوست انسٹریڈیم میں رہتے ہیں وہ آج سے 20 برس پہلے ہالینڈ گئے تھے شہریت کی درخواست کی اور ان کو بھی وہاں ملا لیا ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہیں چار بچے ہیں۔ پڑھے لکھے اور وہ ہیں جہاں ہوئے میرے یہ دوست سال میں ایک مہینے کیلئے پاکستان آتے ہیں ان کے بچے بھی مومبا ان کے ساتھ ہوتے ہیں وہ پچھلے مہینے شہریت ائے تو میری ان سے طویل گپ شب ہوئی ان کا کہنا تھا مجھے پاکستان چھوڑے میں سال ہو چکے ہیں اس عرصے میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میں نے پاکستان کو یاد نہ کیا ہو میں نے ان سے عرض کیا "آپ پھر پاکستان کیوں نہیں آ جاتے" انہوں نے میرے سوال کا برا عجیب جواب دیا انہوں نے فرمایا "میں نے کئی بار سوچا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں میری دو جہاں بچیاں ہیں ان میں پاکستان میں ان کی حفاظت کیسے کروں گا" میرے لئے ان کی یہ منطق انوکھی تھی کیونکہ میں نے تو یہ دیکھا تھا ہارے اکثر تارکین وطن اپنے بچوں بالخصوص بچیوں کیلئے کروڑوں ڈالر کا کاروبار چھوڑ کر امریکہ اور یورپ سے پاکستان آ جاتے ہیں لیکن وہ ایک مختلف کہانی مختلف دلیل پیش کر رہے تھے۔

میں نے وضاحت کی درخواست کی میرے دوست بولے "ہالینڈ میں میری بچیاں آزادانہ پھرتی ہیں اور رات کو دو دو بجے ٹرینوں اور بسوں پر سڑ کرتی ہیں سنسان گیوں اور ویران سڑکوں پر چہل قدمی کرتی ہوئی گھردا ہوا آتی ہیں مگر ہمیں کوئی خوف نہیں ہوتا ہم جانتے ہیں اس

ملک میں کسی میں اتنی عزت نہیں وہ ان کی طرف 'بڑھی آنکھ سے دیکھے اس غیر اسلامی ملک میں ہماری بچیوں کی عزت آبرو اور انساب کچھ محفوظ ہے جبکہ اس اسلامی ملک میں دن کی روشنی میں بھی اگر کسی بچی نے ہمسائے کے گھر جانا ہوتا ہے اسے گلی میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے بھائی والد یا خاندان کی ضرورت پڑتی ہے، ہم چار بھائی ہیں، ہم چاروں لاہور کی ایک تہ گلی میں رہتے ہیں، میں جب پاکستان آتا ہوں اور میری بچیوں نے اپنے بچا کے گھر جانا ہوتا ہے انہیں چھوڑنے کیلئے ساتھ جاتا ہوں، میری بچیاں مجھ سے کہتی ہیں، 'پاپا ہم ایسٹرنڈیم میں روزانہ رات کو 11 بجے آتی ہیں آپ وہاں پریشان نہیں ہوتے لیکن اپنے ملک میں آپ ہمیں اکیلے 11 سو گز دور نہیں جانے دیتے' میں انہیں کیا بتاؤں ان کے اپنے وطن پاکستان میں ان کی عزت کتنی غیر محفوظ ہے، ان کی بات سن کر مجھے خندے سے پسینے آگئے، میں نے غمت مٹانے کیلئے کہا، 'پاکستان کی صورت حال اتنی بھی خراب نہیں یہاں.....' انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بڑے یقین سے بولے، "ہالینڈ میں آبرو دہریزی کی آخری واردات 18 سال پہلے ہوئی تھی اس کے بعد اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی لیکن تم اپنے آج کے اختراعات اٹھا کر دیکھو، تمہیں اس میں آبرو دہریزی، پھینکنا، چھوڑنا اور نفسی طور پر ہراساں کرنے کے بیسیوں واقعات ملیں گے، تم کل کی خبر پڑھ لو، کل لیاقت حمزیم میں موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا وہاں نوجوان لڑکوں نے لڑکیوں کا کیا شہ کیا، تم مجھے اس معاشرے میں واپس آنے کی دعوت دے رہے ہو، میں برقعے والیاں محفوظ ہیں اور نہ ہی جینز والیاں اور جس میں بچیاں اگلی سکول نہیں جا سکتیں، تم میرے ایک دوست کی مثال لاؤ، اس نے اپنی بیٹی کو کالج سے اٹھایا، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا، میرے بیٹے نے جاب کر لی ہے اور میں بنا رہنے لگا ہوں لہذا ہمارے لئے بچی کو کالج چھوڑنا ممکن نہیں رہا، میں نے کہا، تم اسے وین یا ٹیکسی لگوا دینے، اس نے بتایا، 'بچی پہلے بھی وین پر ہی کالج جاتی تھی لیکن اسے چھوڑنے اور لینے کیلئے میرا بیٹا ساتھ جاتا تھا، اب ظاہر ہے یہ ممکن نہیں، ہم بچی کو اکیلے بیچنے کا رسک نہیں لے سکتے، وقت بہت خراب ہے چنانچہ تم جواب دو، جس ملک میں یہ صورت حال ہو، تم مجھے وہاں آنے کی دعوت دے رہے ہو، میرا دوست خاموش ہو گیا، میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پاکستان میں ایک طرف یہ صورت حال ہے، جبکہ دوسری طرف ہم روشن خیالی اور اصلاحی پسندی کا دارگاہ الپ رہے ہیں، حکومت میرا تھن کے بھانے بچیوں کو سڑکوں پر لانے کی کوشش کر رہی ہے اور مذہبی رہنماؤں کے زور میں انہیں واپس گھروں میں رکھیں رہے ہیں، پسلافریق

دوسرے فریق کو اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا مخالف قرار دے رہا ہے اور دوسرا فریق پہلے فریق کو فاشی 'مشریاتی اور بد اخلاقی کا مجرم گردان رہا ہے جبکہ اصل مسئلے کی طرف پہلا فریق توجہ دے رہا ہے اور نہ ہی دوسرا سوچنے کی بات ہے جس معاشرے میں عورت کی آبرو غیر محفوظ ہو گیا وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے 'میرا خیال ہے اسلامی تو رہا ایک طرف 'وہ معاشرہ معاشرہ نہیں کہلا سکتا 'جس ملک میں مارکیٹ بازار اسکول اور کالج میں 'جس ملک میں بسوں 'دینوں اور رکشوں میں بیوی بیویوں کے آچل کھینچے جاتے ہوں 'جس ملک میں چھٹی کے وقت زنانہ کالجوں کے سامنے اور باش نوجوانوں کا تھمکھا ٹنگ جانا اور جس معاشرے میں ہر نگاہ دعوت دہنی اور ہر نظر گھورتی پائی جاتی ہو وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اعتدال پسند 'جس معاشرے میں آج بھی کارکردگی 'دنی اور عورتوں کی خرید و فروخت جاری ہو 'جس میں مختار مائی کو انصاف کیلئے وزیر اعظم کے دروازے پر دستک دینی پڑے اور جس معاشرے کی 95 فیصد گالیاں میں ماؤں بہنوں کا ذکر آتا ہو 'اس معاشرے کو ہند مت معاشرہ نہیں کہہ سکتے 'تم یقین کر اور روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی جگہوں میں تہذیب اور شاہکی پہلا پراڈ ہوتی ہے 'لیکن ہم لوگ ہمیں پراڈ پر کے ہمیر یہ جنگ جیتنا چاہتے ہیں 'ہم لوگ اپنی گلیوں اپنے بازاروں میں تہذیب اور قانون نافذ کئے ہمیر اپنی بچیوں کو گھروں سے باہر لانا چاہتے ہیں 'ہم ایک ہار پھر ٹیکر کے درختوں پر مل سکتا ہے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرے اسی دوست نے مجھ سے پوچھا تھا 'تم میرا تھن ریس کے حامی ہو یا مخالف 'میں نے جواب دیا 'میں حامی ہوں 'میرا خیال ہے 'یہ چیزیں جس دم کے شکار اس معاشرے کا سینہ کھول دیں گی 'لوگوں میں دعت اور اعتدال آئے گا 'میرے دوست نے ہنس کر پوچھا 'تمہارا کیا خیال ہے 'پاکستان کی روشن خیالی اور اعتدال پسند قوتیں اپنی اس کوشش میں عظیم ہیں 'میں نے جواب دیا 'میرا خیال ہے یہ لوگ عظیم ہیں 'میرے دوست نے تہنہ لگایا 'اگر یہ لوگ عظیم ہیں تو پھر ان لوگوں کی اپنی بچیاں میرا تھن ریس میں کیوں نہیں آتیں 'تم بتاؤ وہ پولیس جو ڈنڈے کے لیے ریس میں حائل رکاد نہیں دور کر رہی ہے 'وہ انتظامیہ وہ سیاستدان جو روشن خیالی کی حمایت میں بیان دے رہے ہیں ان کی اپنی بچیاں گھروں میں کیوں بیٹھی ہیں 'میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔



کاغذ کا گلاس

امریکہ میں کاغذ کا پہلا گلاس 1918ء میں ڈاکٹر ایڈولف ہولمز نے نکالی گئی۔ یہ گلاس بنانے والی کیمنی کا کہنا تھا کہ لوگوں کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا ہے لہذا ہمیں اب نئے حالات کو سامنے رکھ کر برتن بنانے چاہئیں، کیمنی کا کہنا تھا چند برسوں میں دھات اور شیشے کے گلاس ناپید ہو جائیں گے اور ان کی جگہ کاغذ کے یہ گلاس لے لیں گے، لوگوں نے شروع شروع میں اس تصور کو پسند نہ کیا لیکن 1925ء تک کاغذ کے یہ گلاس 1925ء تک ڈیسوز ہیل کلچر میں تبدیل ہو گئے، گلاس کے بعد کاغذ کی پلیٹیں آئیں، ان پلیٹوں کیلئے ہاسٹک کے پیچھے چھریاں اور کانٹے بنے اور پھر اس ڈیسوز ہیل کراکری کیلئے "ٹیک اسے و سن" ریستوران بن گئے، کھانے کی جگہ برگر سینڈویچ اور گولڈ ڈرنک کلچر آیا، بریک فاسٹ باکس، لچ باکس اور ڈزرباکس بنے، آئس کریم کے کپ اور پانی کی ڈیسوز ہیل بوتلیں، فروٹ کا ک نیل، فٹش اینڈ جیمس، سلاڈیک اور کافی کے ڈیسوز ہیل گگ بنے، چھس کے لگانے، ٹمکو، بسکٹ اور ٹیک میں کے پیکٹ بنے، مٹھائیوں اور سویت ڈشز کے پیالے بنے اور شروبات کی ڈیسوز ہیل بوتلیں بنیں، یہاں تک کہ امریکہ کا پورا پورا پریمی خانہ فٹ پاتھ اور سڑک پر آ گیا، لوگ دفتر جاتے ہوئے راستے میں رکٹے، کسی سنور سے ناشتے کے چند پیکٹ خریدتے اور بس ٹیکس یا ٹرین میں بیٹھ بیٹھ ناشتہ شروع کر لیتے، لچ کے وقت لوگ دفنوں سے چلتے، قریب ترین سنور سے چند پیکٹ اٹھاتے اور کھڑے کھڑے لچ کر لیتے، اسی طرح ڈز کے وقت "ڈزرباکس" لیتے

اور بس سناپ پریس کا انتظار کرتے تھے۔ اس ضرورت سے بھی فارغ ہو جاتے۔

کھانا: انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا آئیف نام شخص روزانہ تین سے چار کھٹے کھانے پر صرف کرتا ہے۔ امر آپ اس میں سبزی کی خریداری، مسٹائی، کھنٹی اور پکائی بھی شامل کر لیں تو یہ دورانیہ مزید بڑھ جاتا ہے۔ جب امریکہ نے کھانے کے عمل کو ڈیپوزیبل شکل دی تو امریکی معاشرے کی زندگی آسان ہوئی، لوگوں کیلئے کھانے کا حصول اور کھانا کھانا مشکل نہ رہا۔ آپ کی جیب میں ڈالر ہونے چاہئیں اور آپ کسی بھی جگہ رکھیں اور ہر ایک فاسٹ فوڈ اور ڈیز کے مسئلے سے فارغ ہو جائیں، کھانے کے بعد یہ ڈیپوزیبل پتھر آگے بڑھا۔ اب شیوا امریکہ آپ اس کا دوسرا نمونہ تھا۔ مردوں کیلئے شیوٹنگ کا ایسا سامان تیار ہوا جسے وہ قبیلے میں رکھتے ہیں اور زمین میں بیٹھے اپنے منہ پر گیلا ہاتھ پھرتے، ہیزی سیلوں کی ایک چھوٹی سی مشین منہ پر رکھتے اور ان کا چہرہ روز بروز ہونا اسی طرح عورتیں ہستر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ جاتیں، یہ پتھر آگے بڑھا اور بال پوائنٹ نے سرخی پاؤور کی شیشیاں لگائیں اور چند سینکڑوں میں تیار ہوا تھیں، یہ پتھر آگے بڑھا اور بال پوائنٹ نے

تصور بدل گیا، فرزند نہ ملنے اور بچنے گئے آپ صرف اپنا بیگ اٹھائیں اور نئے گھر میں داخل ہو جائیں آپ کی ضرورت کی تمام اشیاء وہاں موجود ہوں گی آپ جب تک اس میں رہنا چاہیں رہیں جب دل بھر جائے تو چاہنی مالک مکان کے حوالے کریں اور نئے گھر میں منتقل ہو جائیں، کراچیوں کا تصور مینے سے پہلے پر آ گیا، لوگ اب پہلی ہریج کی بجائے بنتے کے بنتے کرایہ دینے اور لینے گئے نوکریاں بھی ویک نو ویک ہو گئیں، تمام کمپنیاں اپنے ملازمین کو جس کے دن نکوا ہیں دینے لگیں، ملازمت سمٹھوں میں تصور ہونے لگی، لوگ ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی بجائے پینتیس اور چالیس مہینوں کے ملازم ہو گئے، وہ جنسی ویر کام پر آنا چاہیں آئیں اور ان مہینوں کی تنخواہ لیں اس دوران آہ، انہیں اچھی نوکری مل جائے تو وہ چپ چاپ نئی جگہ شفٹ ہو جائیں، یہ پتھر آگے بڑھا اور میاں بیوی کا رشتہ بھی ڈیپوزیبل ہو گیا، آپ کو چلنے پھرتے کوئی پسند آ گیا تو وہ آپ کا خاوند بن گیا، اس کے ساتھ رہیں مگر کھانا اپنا کھائیں، نوکری اپنی کریں، اگر ول کرے تو ایک آدمی بچ بھی پیدا کر لیں اور کسی دن بوٹی چلنے پھرتے دوسرے نکیٹ میں منتقل ہو جائیں، اس پتھر میں بیوی بیوی نہ رہی، وہ پانڈر اور گرل فرینڈ بن گئی، جتنے دن دوستی کی حرارت رہی تعلق قائم رہا، حرارت ختم ہوئی تو کانڈ کے کپ کی طرح ڈس جن میں پھینک دی گئی اور اس کی جگہ نیا گلاس نیا کپ آ گیا۔

www.paksociety.com

پاکستان ان کا دوست تھا 1990ء سے 2000 تک یہی پاکستان ان کا دشمن ہو گیا اور 2001ء سے 2007 تک پاکستان ایک بار پھر ان کا دوست بن گیا ہم سب امریکہ کے اس طرز عمل پر اسے کالی دیتے ہیں ہم اس کے پرچم ہلاتے ہیں اس کے خلاف سڑکوں اور گلیوں میں بائے بائے کے نعروں لگاتے ہیں لیکن ہم کبھی اس کی اس "بے وفائی" کی وجہ تلاش نہیں کرتے ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں اس میں امریکہ کا کوئی قصور نہیں ان کے کلچر اور ہمارے کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم شہرگ تک ملکیت کے احساس اور وفاداری کے جذبات میں ڈاڑھے ہوئے لوگ ہیں جبکہ امریکی لوگ اپنی ضرورت کو اولیت دیتے ہیں یہ یوزر تھرو اینڈ فارگٹ کے قائل ہیں جبنا جب ہم اپنے مقام سے امریکہ کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں برا لگتا ہے لیکن اگر ہم امریکہ کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھیں تو مجھے یقین ہے ہمیں اپنا آپ برا لگے گا آپ خود سوچئے کیا کوئی شخص کاغذ کے ٹکڑے سے محبت کر سکتا ہے کوئی شخص کاغذ کے ٹکڑے کو اتنی دیر اٹھائے اٹھائے پھرے گا امریکی ہاتھوں اور کاغذ کے ٹکڑے میں اتنی دیر اٹھ سکتا رہ سکتا ہے جتنی دیر کوئی ڈسٹ بین نہیں آتی یہ جون کا مہینہ اور 2007ء سے اور اس وقت پوری دنیا جانتی ہے مٹی کے گدا سڑے ہوئے اور ایک ڈسٹ بین کی موجود ہے کاغذ کا ٹکڑا جسے میں چورا امریکی کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیزی سے ڈسٹ بین کی طرف بڑھ رہا ہے اس حقیقت سے پوری دنیا واقف ہے اگر کوئی ناواقف ہے تو وہ کاغذ کا ٹکڑا اس سے پوری دنیا ہمارے انجام سے واقف ہے لیکن ہم کبوتر کی طرح آنکھ بند کر کے بھومدہ ہے ہیں۔



حرص کی مٹی

دو جہانیں بگلی جہان کا ایک عجیب کردار تھا تاریخ اسے نسل انسانی کا سب سے ۱۲
 شخص تھا اس کے پاس ایک کتا تھا یہ کتا اس کا ساتھی بھی تھا اور راہبر اور رہنما بھی اس کتے کی نسبت
 سے لوگ اسے "بگلی" کہتے تھے دو جہانیں بگلی ارسطو اور سکندر اعظم کے دور میں تھا اور اس کے
 بارے میں عجیب اور دلچسپ واقعات مشہور تھے مثلاً کہا جاتا ہے وہ ایک دن دو پہر کے وقت ہاتھ
 میں چراغ لے کر اتھننز کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کسی نے اس سے پوچھا "دو جہانیں تم چراغ لے کر
 کیا تلاش کر رہے ہو؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں آدمیوں کے جہوم میں انسان تلاش کر رہا
 ہوں" اس زمانے میں ارسطو نے انسان کے بارے میں اپنا مشہور فلسفہ دیا تھا "ارسطو کا کہنا تھا"
 انسان ایک ایسا جانور ہے جو دو ناکوں پر چلتا ہے اور اس کی تاست سیدھی ہوتی ہے" یہ فلسفیوں
 'عالموں اور علم پرستوں کا دور تھا چنانچہ ارسطو کا یہ فلسفہ گلی گلی پھیلنے پھیلنے دہرایا جانے لگا جہاں دو لوگ جمع
 ہو جاتے وہ آپس میں "ارسطو کے انسان" کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے تھے ایک دن ارسطو
 اپنے شاگردوں میں گھرا بیٹھا تھا دو جہانیں بگلی وہاں آیا اس نے شاگردوں کو ناز و دہشچ کرنے کا
 تم دیا ان کے درمیان بیٹھا اس سے ایک سرسٹا ناسرٹا اور دین پر گھڑا گیا ایک ہاتھ سے سرسٹا
 کی ناک میں زمین کے ساتھ لگا میں دوسرے ہاتھ سے سرسٹا کی چونچ پکڑی اور چونچ کو کھینچ کر آسمان

کی طرف اٹھا دیا، مہرغ سیدھا کھڑا ہو گیا اس کے بعد دیو جانسن کبھی نے اسطو کے شاکر دوں کی طرف دیکھا اور قبضہ لگا کر ہوا "یہ ہے تمہارے استاد کا انسان" اسطو کے منہ سے بھی قبضہ نکل گیا دیو جانسن کبھی کی وردیٹی اور ساوگی پور سے یونان میں مشہور تھی اور مونا شہر سے باہر رہتا تھا اگر اسے کھانے کیلئے کچھ مل جاتا تھا تو وہ کھا لیتا تھا بصورت دیگر قاتلے کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا "وہ کسی حد تک توحید پرست بھی تھا اس کا کہنا تھا اس کا نکات کی تمام چیزیں دیوتاؤں نے بنائی ہیں لیکن دیو جانسن کو کس نے بنایا ہے! وہ کہتا تھا جس طاقت نے دیو بنائے ہیں وہی طاقت دراصل اس کا نکات کا مالک ہے اور میں اس مالک کو ماننے والا ہوں اس کا کہنا تھا دنیا کا سامان و اسباب انسان کو اصل خوشی سے محروم کر دیتا ہے اگر انسان زندگی میں حقیقی خوشی پاتا چاہتا ہے تو اسے دنیا کے ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے اس کا کہنا تھا ہمارا گھر بار ہمارے بیوی بچے شہر لوگ عزیز رشتے دار زاریات تو انہیں اور ضابطے ہماری آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں انسان اس وقت تک پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا داری سے رہائی نہیں پالیتا اور اس کا کہنا تھا انسان کی ضروریات انتہائی مختصر ہیں لیکن انسان

ضروریات کے دائرے کو اتنا بھلا دیتا ہے کہ بڑی زندگی کے سفر کے باوجود وہ دائرہ اختیار میں ہوتا ہے اس کا کہنا تھا بہادر شخص وہ ہے جو اپنے اندر کے خوف کو شکست دے۔

دیو جانسن کبھی زندگی کے آخری حصے میں شہر سے نکل کر جنگل میں آباد ہو گیا تھا کسی نے اس سے پوچھا "تمہیں جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا" اس نے مسکرا کر جواب دیا "انسان کا دشمن انسان ہے جانور نہیں" ایک اور جگہ لکھا ہے "انسان کو جانوروں سے نہیں انسان سے خطرہ ہے" وہ کہا کرتا تھا "انسان سے بچو انسان کی دردنگی ہزار دردوں پر بھاری ہے" بڑا مشہور واقعہ ہے سکندر اعظم اس کی تلاش میں شہر سے باہر نکلا دیو جانسن کبھی ایک بیابان میں بیٹھا دھوپ تاب رہا تھا سکندر حاضر ہوا اور نہایت عاجزی انکساری سے عرض کیا "یا استاد میرا نام سکندر ہے اور میں آپ کی خدمت کرتا چاہتا ہوں" دیو جانسن نے مسکرا کر جواب دیا "خواتین کا غلام بادشاہ ایک آزاد شخص کی کیا خدمت کر سکتا ہے" سکندر اعظم نے اصرار جاری رکھا جب وہ تنگ آ گیا تو اس نے قبضہ لگا لیا اور سکندر سے کہا "بادشاہ سلامت آپ میری دھوپ روک کر کھڑے ہیں مہربانی فرما کر میرے اگے سے ہٹ جائیں مجھے سورج کی مہربانیوں سے صاف اندر ہونے دیں دیو جانسن کبھی آخری عمر میں توکل اور قناعت کی انتہائی میزجی پر چڑھ گیا اس کے پاس مٹی کا ایک پیالہ ہوتا تھا وہ اس سے پانی بھی پیتا تھا اور اس پیالے سے پلٹ کا کام بھی لیتا تھا ایک دن وہ پانی پینے کیلئے نڈی پر گیا

اس کا ایک شاگرد بھی ساتھ تھا شاکر، وہ نے ایک جانور دیکھا جانور ٹھٹھا ہوا جنگل سے نکلا امدی کے کنارے پہنچا پانی پر جمکا پانی پیا اور نہلتا ہوا جنگل میں واپس چلا گیا شاکر نے استاد کو جانور کی حرکات و سکنات بتائیں تو دیو جانسن نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "تم پرتک ہر ایک جانور بھی تو کل میں تم سے کتنا آگے ہے تم ابھی تک پیالے کی محتاجی سے آزاد نہیں ہو سکتے" اس نے اسی وقت یہاں چھر پر مدالور کر جیسا اٹھا کر مذی میں پھینک دیں اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پیالے کی محتاجی سے بھی آزاد ہو گیا۔

دیو جانسن کلبی ساراؤں، نگلیوں اور دیرانوں میں مارا مارا بھرتا تھا اور شام کو واپس اپنے ٹھکانے پر آ جاتا تھا یہ ٹھکانہ کچی مٹی کا ایک چھوٹا سا ب تھا وہ ب میں لیٹتا ناگس باہر لٹکا تا اور سو جتا سو پتا سو جاتا یہ ب اس کی کل کا نکات تھا ایک دن سرویوں کی سنہری دوپہر تھی دیو جانسن کلبی ب میں لیٹا تھا اتنے تھکا ایک ہر کارہ اس کے پاس آیا اور اسے آ کر خوشخبری سنائی "مبارک ہو سکندر اعظم پوری دنیا فتح کر کے واپس ایتھنز آ رہا ہے" دیو جانسن کلبی نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد وہ تاریخی شہرہ کہا جو آنے والے زمانوں میں دیو جانسن کی بیجان بن گیا جس نے پانچ ہزار

برس بعد بھی دیو جانسن کلبی کو زندہ رکھا اس نے کہا "ان انسان قبائلیت سے لڑتا ہے تو وہ دنیا کے اس حصے میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ لڑے ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کیلئے بھونکی ہے" دیو

جانسن کلبی کا یہ فقرہ مجھے کل سے یاد آ رہا ہے کل میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تھا جب انسان تیلے ایک گاڑی پانچ سے آٹھ مرلے کا ایک -کان پچاس ہزار روپے ماہانہ اور ایک ٹیلی فون کافی ہوتا ہے تو وہ اس کے باوجود کرپشن کیوں کرتا ہے اس نے پوچھا ہمارے حکمران پچاس پچاس گاڑیاں چار چار جہاز سوسائیز کے محلات اور چالیس چالیس کروڑ کے سیکرٹ فنڈ کیوں چاہتے ہیں ان کے دل کیوں نہیں بھرتے میں نے اسے دیو جانسن کلبی کا یہ فقرہ سنایا اور اس کے بعد عرض کیا "انسان اگر مہلک ہو، سیکھ لے تو وہ کچی مٹی کے ب میں بھی خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے لیکن اگر اس کی آنکھوں میں حرص آ جائے تو ساری دنیا کی گاڑیاں ساری دنیا کے جہاز ساری دنیا کے محلات ساری دنیا کا سونا چاندی، لہ اور ساری دنیا کا اقتدار اس کی ہموک نہیں ملا سکتا تو وہ اپنی پوری زندگی مزید سے مزید اور زیادہ سے زیادہ کی تلاش میں گزار دیتا ہے" میں نے اس سے عرض کیا "بد قسمتی سے ہمارے حکمرانوں ہماری دولتوں کا اس کا تعلق لوگوں کے اس گروہ سے ہے جن کی آنکھیں اور جن کے معدے جس کی مٹی سے بنے ہیں جیسا کہ آج بھی یہ نہیں ہوں گے یہ لوگ اپنے کفن تک پھینچیں تو انہیں اور یہ دوزخ میں بھی اتنا پانی مانگیں گے"

آدھا گلاس

شیخ صاحب پیرے ایک بزرگ اور ست جہاں کیڑے کی صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں کئی عہدوں کا عہدہ کیا ہے۔ ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی گزرا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی گزرا ہے۔

کرم نیا اور ان کا کاروبار چل نکاڑو آج کل ارب پی ہیں ان کی کئی ٹیکنیکل ٹیس اور شورڈر ہیں آج سے اس برس پہلے انہیں بلڈ پریشر ہوا پھر شوگر ہوئی پھر دل کا اور شروع ہوا پھر نیند کم ہوئی اور پھر وہ شدید قسم کے چہ چہ سے پن کا شکار ہو گئے ان کے مزاج کی ترشی نے اثر دکھایا اور وہ تنہا ہوتے پہلے گئے جب وہ دفتر جاتے تو تمام لوگ مختلف جیلے بہانوں سے آگے پیچھے ہو جاتے مگر میں بھی سب لوگ ان سے اور اور رہتے ان کے چوکیدار گارڈز اور ارایحہ رنگ تیزی سے بدلنے لگے پھر بھی ذرا تھوڑا ان کے ساتھ ایک دن نہ کری کر لیتا تھا وہ شام کو انہیں سلام کر کے رخصت ہو جاتا تھا اس تہائی اور چہ چہ سے پن نے اثر دکھایا اور وہ بری طرح اعصابی مریض بن گئے ان کے کندھوں، گمروں اور کمر میں مسلسل درد رہنے لگا اور اس قدر شدت اختیار کر لیتا تھا کہ وہ اپنی ٹانگوں پر دریاں پینے پر مجبور ہو جاتے تھے انہوں نے دنیا جہاں کے ڈاکٹروں سے مشورے کئے، ایجا کی قسمی مزین، وہ انہیں کھائیں، ٹیکسوں اور منیاسیوں تک سے علاج کرایا لیکن انہیں افاتہ درد اور آسہر تبا کر کے تھے اس پر آخر میں است آ گیا ہے کہ رنے ہاڑوں میں آسہر تبا ہے تو یہ کہ میرے جنازے میں کوئی شخص شامل نہیں ہوگا میں انہیں تسلی دیتا تھا لیکن وہ میری تسلی سے

مزید بڑھ جاتے تھے میں خود ان کی حالت سے مایوس ہو گیا تھا مگر پھر ایک روز نجیب مجھ سے ہوا شیخ صاحب ٹھیک دن شروع ہو گئے ان کا چڑچڑاپن ختم ہو گیا ان کا غصہ دور ہو گیا وہ ایک دم بزدل سنج اور بزم آراء ہو گئے وہ مارا مارا رہنے لگے اور قہقہے لگاتے رہتے اس کے نتیجے میں ساری دنیا ایک ہار پھران کی گریہ ہو گئی مگر میں دو 'موسٹ ولفیڈ' شخص ہو گئے ہفتہ میں ٹوٹ ان کا انتظار کرتے رہے اور ملازم ان کی خدمت کرنے ان کے ساتھ اپنی ذیوقی لگوانے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگتے ہمارے میں سب سے پہلے ان کی فینڈ کا مسئلہ حل ہوا وہ ساری رات ابھیر کر ڈٹ بدلے آرام سے سونے لگے پھر دل کا مسئلہ حل ہوا پھر لہڈ پریش ہارڈ اور آخر میں شوگر ٹھیک ہو گئی وہ جوانوں کی طرح بھاگنے دوڑنے لگے ایک طویل عرصے بعد میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا وہ وہی نہیں جانتے تھے انہوں نے بڑی خوبصورت امپورٹڈ جینز پہن رکھی تھی ان کی شرٹ بھی آج کے فیشن کے مطابق تھی آنکھوں پر جوانوں والی عینک تھی اور پاؤں میں گوبنی کے جوتے تھے ان کا چہرہ سرفی مائل تھا اور ہاتھ کی کونٹ میں ٹری تھی وہ بات بے بات قہقہے لگا رہے تھے۔

میں نے ان سے اس کا کیا مطلب پوچھا تو میں جیسے حیران رہ گیا ان کی بات بہت عجیب و غریب تھی انہوں نے بتایا ایک روز میں نے ان کا ٹو میز پر پورے ختم میں اور ہور ہا تھا میرا دلہ پائینر زیادہ تھا شوگر بھی داخل نہیں تھی میں ڈانٹک ٹیبل پر ناشتے کیلئے بیٹھا تو ایک ایک کہنے کے ساتھ ملازم وہاں سے بھاگ گئے یہاں تک کہ میری پیش تک بہانہ بنا کر باہر چلی گئی میں بالکل اکیلا رہ گیا میں نے نوکر کو آواز دی میری آواز پر کسی نے جواب نہ دیا اس وقت مجھے محسوس ہوا میں پورنی دنیا میں اکیلا ہوں میں نے وہیں اس میز پر تیشے تیشے اپنے آپ سے سوال کیا میری ان تہائی ان اسکیلے جن کی وجہ کیا ہے ان کا ذمہ دار کون ہے! مجھے محسوس ہوا اپنے تمام تر مسائل کا ذمہ دار میں خود ہوں میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا کبھی دیا جہاں کی رانٹیں میری نااش میں نہ رہاں رہتی تھیں میں جہاں بیٹھا تھا وہاں لوگوں کے میلے لگ جاتے تھے میں نے اپنے آپ سے پوچھا پھر وہ شخص اکیلا کیسے ہو گیا وہ کون سی چیز ہے جس نے اس شخص کو تنہا کر دیا میں نے سوچنا شروع کیا تو سوچنا ہی چلا گیا میں نے اپنے ذہن میں اپنی تمام پائی عادتوں کو برائیاں اور تمام پوسٹو کے جو میں ماننی میں کیا کرتا تھا میں یاد کر رہا تھا تو برتا گیا یہاں تک کہ میرے دماغ میں ایک پنک نی بائی اور لگنے پاؤ آ گیا میں آج سے وہی پندرہ برس قبل ایک مثبت روح کا حامل شخص تھا میں ایک ہا امید اور روشن خیال شخص تھا حالات کچھ بھی ہوتے لگتے بات اور پریشیاں خواہ مخواہ ہی نہ ہوتیں اور کچھ نہیں

کبھی امید کا دامن نہ چھوڑتا میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بہتری کی توقع کرتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے اپنی یہ عادت ترک کر دی میں اپنا یہ اصول بھلا جیسا لہذا میں آہستہ آہستہ بیمار ہوتا چلا گیا میں تباہ اور ادا اس بہتہ گیا میں نے اسی میز پر بیٹھے بیٹھے اپنی خامی چکرائی میں نے اپنی کوتاہی کا انداز دلگایا اور جب میں وہاں سے اٹھا تو میں ایک تبدیل شدہ انسان تھا۔ میں نے پازٹیو ٹھنک لگ یعنی مثبت سوچ کو اپنا شعار بنا لیا اب میں دنیا کے افسوسناک ترین واقعات سے بھی اچھی چیز دریافت کر لیتا ہوں مثلاً چھپے ہونے والی اس سانچے میں دو سے تین لاکھ لوگ مارے گئے اس سانچے پر ساری دنیا ماتم کر رہی تھی جس کو دیکھو وہ غمناک اور پریشان تھا لیکن میرا رویہ اس کے بارے میں بالکل مختلف تھا میں نے دیکھا اس حادثے کے بعد عالمی ہر اداری حرکت میں آگئی ہے 45 ممالک نے سوہمی سے ستا کر ہونے والے ممالک میں امدادی نہیں سمجھا دی ہیں 112 ممالک میں ادا کاروں کی لڑائیوں سمیت انہیں اور دوسرے طبقات نے سوہمی کے ستارہ لوگوں کیلئے امدادی شوق کئے دنیا کے چار ب لوگوں نے اپنے ستارہ دہائیوں اور بہنوں کیلئے چند سے جمع کئے دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں ان لوگوں کیلئے نرم اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں انہیں دنیا کیلئے لوگ ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر کے انڈونیشیا، سری لنکا اور فلپائن گئے اور انہوں نے لمبے صاف کرنے کیلئے وہاں کے لوگوں کی مدد کی پوری دنیا نے ان لوگوں کو کھیل خیسے، کپڑے اور خود رک سمجھائی میں لوگوں کی یہ کوششیں دیکھ کر خوش ہونا ہر لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جو جذبات موجزن تھے میں انہیں محسوس کر کے خوش ہوتا رہا میں نے دیکھا نیشنوں کے عین درمیان ایک بچی گیند کے ساتھ کھیل رہی تھی لوگ نیشنوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے لیکن میں اس بچی کی افسوسیت پر خوش ہو رہا تھا میں موت کے درمیان موجود زندگی کے اس احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا میرے لئے خوشی کی دوسری بات یہ تھی کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے اس سانچے کے رد عمل میں ایسے آلات ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا جو سوہمی سے پہلے لوگوں کو اس کی اطلاع دے دینا میرے لئے خوشی کی تیسری بات یہ تھی کہ جہاز کے مرحلوں سے چند ہزار میل دور اتنا بڑا سانچہ چل آیا لیکن اللہ نے ہم پر رحم فرمایا ہم لوگ ایسی جہاز سے بچ گئے ہیں بڑی بات تھی میں اللہ کے اس رحم پر خوش تھا میں نے اس کا شکر ادا کیا میں یوں ہی تمام بڑی ٹیموں کو تمام حصوں نے بڑے بڑے حادثوں اور سانحوں سے بہتری اور چھائی دریافت کر لیا ہوں انہیں جگہ کوئی غارت نہ بنائے یا لیں ٹوٹ جائے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوں ہوں اس جگہ پہلے سے کسی گمنامیہ، خود بصیرت اور شاندار نجات سب کی کوئی بندہ ناست ہو جائے تو میں یہ

سوچتا ہوں یہ کتنا خوش نصیب ہے یہ اب ان ہستیوں کو دیکھ سکتا ہے جن کو ہماری مادی نظریں نہیں دیکھ سکتیں اچھے اُنکر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو میں سوچتا ہوں وہ تم جو مجھے ملتی تھی وہ کسی دوسرے کی جیب میں چلی گئی ہو سکتا ہے وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہو جس سال مندو ہو یا ہمارا منافع کم ہو جائے تو میں سوچتا ہوں اس سال لوگوں کو سستا کپڑا ملے گا ہمارے دھسے کے منافع سے سینکڑوں ہزاروں لوگ فائدہ اٹھائیں گے میرے سامنے کوئی ایسا حادثہ کبھی ایسا سا نہ پیش ہو جائے جس میں سے مجھے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں اس میں میرے اندک کی رعنا شامل تھی اور میرا رب بھی غلط فیصلہ نہیں کرتا میری اس عادت میری اس پازریٹھ تنگ لے مجھے دوبارہ دنیا میں لائے گا کیا میں دوبارہ زندہ ہو گیا میں آج سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں آج سے دو تین مہینے پہلے چوتیس گھنٹے کا شامی تھا مجھے دنیا کی ہر چیز ہر شخص ہر سوچ سے شکایت تھی اختلاف تھا یہ اختلاف یہ شکایت مجھے ہر وقت چار رکھتی تھی میں نے شکایت کرنے مجھ پر دنیا میں اختلاف کو سمیٹ کر نظر اور رائے تک لے آیا مجھے جب کوئی اعتراض ہوتا ہے تو میں بڑے آرام سے کہتا ہوں "میرا یہ خیال سے اور یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے میرا یہ خیال سے میرا اختلاف میرا اعتراض میں میری رائے میں جانا ہے وہ میرا اختلاف نہیں

ہو جاتا ہے لہذا اس سے نیکو لوگ ناراض ہوتے ہیں اور نہ ہی میں تجرچے سے پون کا ٹیکہ ہوتا ہوں"

شیخ صاحب خاموش ہو گئے میں نے پوچھا "اور بیاریاں" وہ مسکرا کر بولے "میرا خیال ہے ہمارے 80 فیصد بیاریاں ہماری اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں یہ ہمارے منجی رویوں کا رد عمل ہوتی ہیں اگر ہم مثبت طرز فکر اپنائیں تو ہم سدا سلامت مند رہیں ہم پوری زندگی خوش اور تندرست رہیں" میں نے شیخ صاحب سے ہاتھ ملایا اور خوش خوش دانیس آ گیا میں نے محسوس کیا شیخ صاحب نے ہنسا ہوا گلاس اٹھانا شروع کر دیا ہے جبکہ ہم اوٹ آدھے گلاس کر رہے تھے ہیں۔

خوشی

یہ 1640ء تھا۔ اس وقت نیو یارک بائینڈ میں تقسیم تھا۔ شمالی حصے پر ہالینڈ کا قبضہ تھا۔ ہالینڈ کے ہائیڈرگارتھ نے اسے غلام کرنے اور انہیں اپنے کھیتوں میں بچا کر لانا دیکھا۔

اس وقت شمالی نیو یارک کے ارد گرد جنگل تھے۔ یہ غلام بعض اوقات پہرے داروں کی ٹھنڈت کا فائدہ اٹھاتے تھے اور کھیتوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپ جاتے تھے۔ یہ ایک مسئلہ تھا۔ ہالینڈ کے جائیدادوں کا دوسرا مسئلہ اس سے بھی گھمبیر تھا۔ اس دور میں انگلینڈ سے قونج آئی اور اس نے ہالینڈ کے قابضین سے لانا شروع کر دیا۔ برخانوی قونج اسلے اور تعداد میں ڈیج لوگوں سے بڑی تھی۔ چنانچہ ڈیج جاگیردار خوف کا شکار ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنے بچاؤ کیلئے شمالی نیو یارک میں ایک دیوار بنائی اور اس دیوار کے پیچھے پناہ گزین ہو گئے۔ یہ دیوار 1652ء میں مکمل ہوئی اور یہ 1699ء تک برقرار رہی۔ 1698ء میں انگلینڈ کی قونج نے شمالی نیو یارک پر قبضہ کر لیا اور ڈیج سرداروں کو دباؤ سے بھانگنے پر مجبور کر دیا جس کے بعد یہ دیوار گرا دی گئی۔ ڈیجوں کے دور میں اس دیوار کے ساتھ ایک شہنشاہی کھلی ہوئی تھی۔ لوگ اس کھلی کو "وال سٹریٹ" کہتے تھے۔ یہ دیوار 1699ء میں ختم ہو گئی لیکن وال سٹریٹ آج تک قائم ہے۔ وال سٹریٹ آج دنیا کی سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج مارکیٹ ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب نیو یارک میں بلند عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی تو دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں نے آسمان کو ہاتھ لگانے کیلئے اسی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

ذریعہ پوائنٹ 3.....0.....363

یہ جگہ اس وقت دنیا کا سماشی ادارہ حکومت بھی کہلاتی ہے اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کی تمام بڑی کمپنیاں اور تمام بڑے سرمایہ کاروں کے دفاتر موجود ہیں کہا جاتا ہے دنیا میں سرمائے کا سورج روزانہ وال سٹریٹ سے طلوع ہوتا ہے اور جس دن یہ سورج طلوع نہیں ہوگا اس دن دنیا پوالیہ ہو جائے گی اس وقت وال سٹریٹ میں 3124 امریکی 93 کینیڈین 195 ہونگی 181 ایشیائی 59 کرہیں 189 ملینی امریکہ اور 10 ملین ایسٹ اور افریقہ کی کمپنیاں رجسٹر ہیں اور اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کے 21 ٹریڈین ڈالرڈن ہیں آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو اس وقت دنیا کی کل دولت 33 ٹریڈین ڈالر ہے اور ان 33 ٹریڈین ڈالر میں سے 21 ٹریڈین ڈالر اس وقت وال سٹریٹ میں ہیں جبکہ باقی 12 ٹریڈین ڈالر سے دنیا پانا کاروبار حیات چا رہی ہے۔

اگر ہم وال سٹریٹ کی کمپنیوں اور ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ لوگوں کا جائزہ لیں تو یہ دنیا کے امیر اور خوشحال ترین لوگ ہیں ان میں سے ہر شخص اور ہر کمپنی کا کاروبار سو سے زائد ممالک

تک پھیلا ہوا ہے اور ہر لوگ ہرگزرنے والے سینڈ میں امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں مجھے ایک بار وال سٹریٹ کے ایک ملازمی کا انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا انٹرویو کرنے والے کے کہنے

سے سوال کیا "اس وقت آپ کے اکاؤنٹس میں کتنی رقم ہے" اس نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کے سوال کرنے سے پہلے میرے پاس بارہ ٹریڈین ڈالر نو سو ہیں؛ اللہ تھے لیکن میرے جواب دینے کے بعد اس رقم میں تین ٹریڈین ڈالر اضافہ ہو جائے گا" یہ لوگ زندگی کو اس طرح دیکھتے اور سوچتے ہیں "ہائم ڈرنس" (دقت دولت ہے) کے حوالہ سے نے بھی اسی "قلی" میں جنم لیا تھا وال سٹریٹ میں حقیقتاً ہر سینڈ سونے کے بھاؤ تولد اور پائینیم کی قیمت میں بھجا جاتا ہے لہذا اظہار یوں محسوس ہوتا ہے وال سٹریٹ تے لوگوں تک زندگی کی گرم ہوا بھی نہیں پہنچتی یہ لوگ ان تمام تقنیوں اور مسائل سے آزاد ہوتے ہیں جن سے اس دنیا کے سوا چاروں لوگوں کا روزانہ پالا پڑتا ہے یہ لوگ حقیقتاً خوش اور خوشحال ہیں اور انہوں نے زندگی میں کبھی ان صحیح حقائق کی کراہت محسوس نہیں کی جو روزانہ ہمارے حلق کو زہر بناتے ہیں لیکن چند روز پہلے مجھے وال سٹریٹ میں ہونے والے ایک مردے رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا اس رپورٹ نے مجھے حیران کر دیا امریکہ کی ایک کمپنی نے وال سٹریٹ کے ہسپتال سے پوچھا "تم لوگوں نے کبھی خوشی کو محسوس کیا" ان تاجروں کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو اور برادران کا جواب بہت دلچسپ تھا ان میں سے 91 فیصد لوگوں کا کہنا تھا انہوں نے زندگی میں کبھی خوشی کو محسوس نہیں کیا انہوں نے یہ معلوم نہیں کیا کہ انہوں نے

اس کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے، کہنی نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا ادا ل طریقے کے زیادہ تر لوگ مسکراتا ہجو لگا اور ہنستا بھول چکے ہیں اور اس "بازار" میں اگر کبھی کسی کے منہ سے قہقہہ نکل جائے تو سب لوگ مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں میرے لئے یہ تحقیق حیران کن تھی، میں بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح دولت اور خوشحالی کو خوشی کا جو ہر بھگتا تھا، میرا خیال تھا جب تک کسی شخص کی جیب میں ایک اوگر دو روپے نہ ہوں اس وقت تک اسے خوشی نصیب نہیں ہوتی، دو اس وقت تک خوشی کو پوری طرح محسوس نہیں کر پاتا لیکن وال طریقے کے اس سروے نے اس سارے فلسفے کو حیرتوں سے ہلا دیا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا خوشی دولت اور خوشحالی سے ماوراء کوئی چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق جذباتوں کے کسی دوسرے ماخذ سے ہوتا ہے مجھے معلوم ہوا ایک چھوٹا بچہ روزانہ چار سو بار ہنستا ہے جبکہ ایک ناراض بالغ شخص کے چہرے پر صرف چند مرتبہ مسکراہٹ آتی ہے اور جوں جوں یہ بالغ شخص خوشحالی کی تاش میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے چہرے سے ہنسی اور خوشی غائب ہوتی چلی جاتی ہے، مجھے معلوم ہوا دولت دنیا میں بے شمار خوبیاں لے کر آتی ہے، یہ

رضوان کے لئے شمار تھے اور ان کا نام بھی دینی نہیں کیا ہے ساتھ میں خوشی اور ہنسنے کی بات ہے۔

اس شام میرے پاس اللہ کے ایک ولی تشریف آئے، میں نے ان سے سوال کیا "حضور خوشی کیا ہوتی ہے" انہوں نے قہقہہ لگایا اور بڑے یقین سے بولے "دنیا میں لوگ دولت دس کر کوئی نہ کوئی جنس خریدتے ہیں آپ روپیہ دے کر آنا دالیں، جینٹی جو تے اور کپڑے لیتے ہیں، ہم اس خرید و فروخت کو کاروبار کہتے ہیں انسان جب جنس کے بدلے روپیہ اور روپے کے بدلے جنس لیتا ہے تو اسے خوشی حاصل نہیں ہوتی، خوشی صرف اس خرید و فروخت میں حاصل ہوتی ہے جس میں آپ روپے ادا کرتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں آپ کوئی جنس نہیں خریدتے، آپ کو اس کے عوض کوئی چیز نہیں ملتی، میں نے پوچھا "مثلاً" "او مسکرائے" مثلاً آپ کسی ضرورت مند طالب علم کی فیس ادا کر دیتے ہیں، کسی مریض کا مارن کر دیتے ہیں یا آپ کسی یتیم کو جوتا خرید دیتے ہیں، ان کا فرمانا تھا "خوشی صرف خوش نصیب لوگوں کو ملتی ہے اور خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جو اپنے نصیب پاؤں ہوتے ہیں، جو اللہ کی رضا کو اپنا قدر بنا لیتے ہیں، لیکن ان کی بات ابھی تک لیکن ساتھ ہی میں نے سوچا "مگر کیوں کو تو نصیب کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی خوشی کا او دو پھر روزانہ چار چار سو بار کیوں مسکراتے ہیں" مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے "ہم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ہم زندگی میں جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں ہم "اوریت" سے اتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں، ہم

زیر پبائٹ 3.....0.....365

جوں جوں چالاک، ہوشیار اور مجھ دار ہوتے جاتے ہیں، ہم توئی توں خوشی سے دور ہوتے جاتے ہیں، ہم توں توں مسرت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔“ مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے توکل اور مصمصویت دونوں ضروری ہوتی ہیں اور قدرت سرمائے دار کو سرمایہ دے کر یہ دونوں انعام چھینا لیتی ہے وہ اسے چالاک اور پرکٹیکل بنا دیتی ہے اور پرکٹیکل اور چالاک لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے وہ کبھی دجود کی چیزوں تک خوش نہیں ہو سکتے۔“



Kashif Azad@OneUrdu.com

21 گرام

ڈاکٹر ایل جان نے وہ سال قبل تجربات شروع کئے تھے، انسانی روح کا وزن معلوم کرنا چاہتا تھا اس کے لیے یو یو ایس کے چند ڈاکٹروں کو ساتھ لایا اور مختلف طریقے وضع کرنا شروع کیا۔

دیئے، یہ لوگ بالآخر ایک طریقے پر متفق ہو گئے۔ ڈاکٹر زرع کے حکار لوگوں کو ششے کے باکس میں رکھ دیتے تھے، مریض کی ناک میں آکسیجن کی چھوٹی سی ٹنگی لگا دی جاتی تھی اور باکس کو انتہائی حساس ترازو پر رکھ دیا جاتا تھا، ڈاکٹر باکس پر نظر میں جما کر کمزے ہو جاتے تھے، مریض آخری رنگی لینا تھا اس کی جان نکلتی تھی اور ترازو کے ہندسوں میں تھوڑی سی کمی آ جاتی تھی، ڈاکٹر یہ کمی نوٹ کر لیتے تھے ان لوگوں نے پانچ سال میں بارہ سو تجربے کئے، 2004ء کے آخر میں ڈاکٹر ایل جان کی ٹیم نے اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے" ڈاکٹر جان نے اپنی تھوڑی سی کے جواز میں 12 سو مردوں کی ہسٹری بیان کی، اس کا کہنا تھا ان کے باکس میں رکھا شخص جوں ہی فوت ہوتا تھا اس کا وزن 67 گرام کم ہو جاتا تھا لہذا وہ بارہ سو تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے۔ اسی قسم کے تجربات لاس اینجلس کے ایک ڈاکٹر ابراہام نے بھی کئے تھے، اس نے انتہائی حساس ترازو بنایا، وہ مریض کو اس ترازو پر لانا، مریض کے پیچھے ہروں کی آکسیجن کا وزن کرنا اور اس کے مرنے کا انتظار کرنا، ڈاکٹر ابراہام نے سینکڑوں تجربات کے بعد اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 21 گرام ہے" ابراہام کا کہنا تھا انسانی روح اس

21 گرام آکسیجن کا نام ہے جو پھپھروں کے کوٹوں، کھدروں، اور زوں اور لکڑوں میں چھپی رہتی ہے۔ سوت، لکڑی کی صورت میں انسانی جسم پر وارد کرتی ہے اور پھپھروں کی تہوں میں چھپی اس 21 گرام آکسیجن کو باہر نکال دیتی ہے اس کے بعد انسانی جسم کے سارے تیل مر جاتے ہیں اور انسان فوت ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایل جان کا تخمینہ درست ہے، ایذا کز ابراہام کی تحقیق یہ فیصلہ بھی اپنی ہے تاہم یہ طے ہو چکا ہے انسانی روح کا وزن گراموں میں ہوتا ہے اور ہمارے جسم سے 21 یا 67 گرام زندگی خارج ہوتی ہے اور ہم فوت ہو جاتے ہیں، میں نے پچھلے دنوں ہالی وڈ کی ایک فلم دیکھی تھی، یہ فلم ڈاکٹر ابراہام کی تصویر پر مبنی تھی اور اس میں بھی انسانی روح کو 21 گرام قرار دیا گیا تھا لہذا اگر ہم فرض کر لیں ہمارے جسم میں بھاگنے، دوڑنے والی زندگی کا وزن محض 21 گرام ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے ان 21 گراموں میں ہماری خواہشوں کا وزن کتنا ہے اس میں ہماری نظریں ہمارے

ارادے، ہمارے منصوبے، ہماری ہیرا پھیر، ہمارے سمجھوتے، ہماری چالاکیاں، ہمارے لالچ، ہماری سازشیں اور ہماری اہمیت دیکھ رہے ہیں، انسانی زندگی ہے ان 21 گراموں میں ہماری

یونین، ہمارے ایل ایف، او، ہماری ذہن، ہمارے اقتدار، ہمارے انجین، ہماری لبرل ازم، ہماری آزاد خیالی، دور ہماری بہادری کا کتنا وزن ہے، ان 21 گراموں میں ہمارے حوصلے، ہماری قوت برداشت، ہماری جرأت، ہماری خوشامد، ہماری پھرتیوں، ہماری عقل اور ہماری فہم کا کتنا حصہ ہے، ان 21 گراموں میں ہماری ساری ساری اہمیت، ہماری فائز، ہماری پالیسی اور ہماری امریکہ نوازی کا بوجھ کتنا ہے اور ہم چودھری صاحب کی طرح لاہور کے سارے پلاٹ اٹھایا جاتے ہیں، ہم اپنی وطنی نسل کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں، ہم اپنی ساری دولت ہمیں شفقت کرتا چاہے ہیں اور ہم اگلے جیسا بچیس برس تک کرسی پر جلوہ افروز رہنا چاہتے ہیں، ہم نے خوشامد کو آرت کی شکل دے دی ہے، ہم روزانہ بیسیوں لوگوں کو بے وقوف بنا دیتے ہیں، ہم ایک مسئلہ میں دس دس مرتبہ اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں اور ہم صرف اپنا اقتدار بچانے کیلئے چھ چھ سو بے گناہوں کو ظالموں کے حوالے کر دیتے ہیں، ہم دماغی اور نماز کو خوف کی شکل دے رہے ہیں اور ہم ظالم سے نفرت کرنے والے ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے ہماری ان ساری سوچوں، ہمارے ان سارے خیالات اور ہماری ان ساری خواہشوں کا وزن کتنا ہے اور ان 21 گراموں میں ہماری گردن کی اکڑ، ہمارے لہجے کے ٹکڑے اور ہماری نظریں کے غرور کا بوجھ کتنا ہے اور ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کا کتنی دیر

تک مقابلہ کر سکتے ہیں 'ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کے فیصلوں سے کتنی دیر تک بچ سکتے ہیں' یہ 21 گرام ہمیں کتنی دیر تک وقت کی آٹھ سے بچا سکتے ہیں' یہ 21 گرام کب تک ہمارے فرد کی حفاظت کر سکتے ہیں اور یہ 21 گرام ہمارے منصوبوں اور ہماری خواہشوں کی کتنی دیر قہبانی کر سکتے ہیں۔

میں نے کسی جگہ پڑھا تھا تب تب کے لوگ 21 گراموں کی اس زندگی کو موم سمجھتے ہیں لہذا یہ لوگ صبح کے وقت موم کے دس جس جسے بناتے ہیں اور یہ جسے اپنی دلہیز پر رکھ دیتے ہیں ان میں سے ہر جسم ان کی کسی نہ کسی خواہش کی نمائندگی کرتا ہے 'دن کو سورج کی تپش میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ جسے کھیلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ شام تک ان کی دلہیز پر موم کے چند آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں چپتا' یہ لوگ ان آنسوؤں کو دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں 'کیا یہ تھیں میری ساری خیرائیں' اور اس کے بعد ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور وہ کائنات کی اس طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں جو ان کے 21 گرام کی اصل مالک ہے جس کے حکم سے ان کی سانسیں

چلیں اور ان کے ہر دم ٹھہرے ہیں۔ کئی جگہ پڑھا تھا کہ ہر دن میں ایک بار سانس میں 87

کر دڑا کرتیں ہوتی ہیں اور ہمارے ذہن میں ایک منٹ میں اربوں خیال آتے ہیں اور ہم ایک منٹ میں ایک لاکھ دس ہزار منصوبے بناتے ہیں لیکن اگلے منٹ یہ سارے خیال 'یہ سارے منصوبے اور یہ ساری کردہاں ہمارے ذہن کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہیں ہم اپنے خیال بھول جاتے ہیں۔ ہمارے یہ سارے خیال ہمارے یہ سارے منصوبے اور ہماری یہ ساری حرکتیں بھی انہیں 21 گراموں کی مرہون منت ہیں اور یہ 21 گرام آگے چل کر موم کے پتلے ثابت ہوتے ہیں لیکن آپ انسان کا کمال دیکھنے کے لیے سو گرام گندم 8 اونس شراب اور کسی ایک سیلر کی خوشامد اس کے 21 گراموں کو خدا بنا دیتی ہے۔ یہ خدا کے لہجے میں بولنا شروع کر دیتا ہے 'اپنی ذات کو ملک کی بنا قرار دے دیتا ہے اور یہ خود کو نائز دیکھنے لگتا ہے ہم سب کیا ہیں' محض 21 گرام محض ایک سانس، محض ایک بھگی، محض ایک چھینک، محض ایک جھٹکا، محض ایک بریک، محض دماغ کا ایک شارٹ سرکٹ اور محض دل کے اندر اٹھتی ہوئی ایک لہر اور بس! ہم نے کبھی سوچا 21 گرام کتنے ہوتے ہیں 21 گرام لوہے کے 14 دانے ہوتے ہیں ایک ٹماٹر پانچ دانے کی ایک پرت اور یہ کی چو چکیاں اور پانچ نشوونما ہوتے ہیں یہ ہم اور یہ ہے ہماری اوقات لیکن ہم بھی کیا لوگ ہیں ہم 21 گرام کے انسان خود کو کھریوں دن روزنی کائنات کے خدا سمجھتے ہیں ہم 21 گرام کے انسان

ذریعہ پبلسٹ 3.....0.....369

خود کو 21 گرام کے کر دوز انسانوں کا عکس مان بھتے ہیں ہم وقت کو اپنا غلام اور زمانے کو اپنا ملازم بھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں بس ذرا سی پیش کی دیر ہے اور ہمارے سارے اختیار ہمارے سارے اقتدار کی موسم کھل جائے گی ہم شام تک موسم کا آنسو بن جائیں گے ہمارے 21 گرام سنوں سنی میں مل جائیں گے ہم تاریخ کی سطوں تلے دفن ہو جائیں گے اور 21 گرام کا کوئی دوسرا خدا ہماری جگہ لے لے گا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

کفن چور

اس کی ناک پر سنہری رنگ کی خوبصورت ٹینک، دھری تھی اور گود میں لیب ٹاپ تھا۔
 اگلے روز صبح بخیر کے لیے اس نے سیرنگھولی لیب ٹاپ اس پر لگا اور کام شروع کر دیا۔ اس میں جہاز نہیں
 دستیاب ہو سکی اور اخبارات پڑھنے لگا۔ کئی گھنٹے گزر گئے لیکن وہ کام کرتا رہا۔ کھانے کے دوران
 اس نے ذرا دیر کیلئے وقفہ کیا جس نے موقع قیمت جانا اور اس کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ وہ
 سٹج پور کار ہنے والا تھا۔ وہ پچھلے سال یونیورسٹی سے فارغ ہوا اور اس نے سرکاری ملازمت اختیار
 کر لی۔ وہ چھٹیاں گزارنے امریکہ جا رہا تھا، اس کے تعارف میں جینوں والی بات حیران کن تھی
 ہمارے ملک میں پٹنری اور ایس ایچ او کے سوا کوئی سرکاری ملازم پہلے سال چھٹیاں گزارنے
 امریکہ نہیں جاسکتا، میں نے اسے کہہ دیا شروع کر دیا اس نے بتایا یہ دورہ خالصتاً ذاتی تھا اور اس
 کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا اس کا کہنا تھا وہ خاندانی لحاظ سے بھی کوئی خوشحال
 شخص نہیں اور پچھلے پانچ برسوں میں اس کے والدین نے اسے ایک پائی نہیں دی جس نے آخر میں
 اس سے دہشت کے اخراجات کے بارے میں پوچھ لیا، یہاں سے کہانی نے ٹرن لیا اس نے بتایا
 سٹج پور کی بیورو کرسی ایچ بی سی اور ڈیوری میں دنیا میں پہلے نمبر پر ہے سٹج پور کے اس اعزاز کی دو
 بڑی وجوہات ہیں پہلے نمبر پر ٹیلنٹ آتا ہے سٹج پور کی حکومت یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہترین
 طالب علموں کو ڈگری کی پیش کش کرتی ہے اور دوسرے نمبر پر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا پتہ ہے

سنگاپور میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں نجی شعبے کو سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہیں اگر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اسٹنٹ کو پانچ ہزار ڈالر تنخواہ دیتی ہیں تو حکومت بھی اس گریڈ کے ملازمین کی تنخواہ اور مراعات پانچ ہزار ڈالر کر دیتی ہے سنگاپور میں سرکاری اور نجی شعبے کے ڈائریکٹریکٹوریٹس اور ایگزیکٹو آفیسرز، منیجر، کلرک اور چیف ایگزیکٹوز کے تنج یکساں ہوتے ہیں لہذا سنگاپور دنیا کا واحد ملک ہے جس میں نوکری نجی شعبوں سے نوٹ کر سرکاری محکموں میں آتے ہیں اس نے بتایا سنگاپور کے سرکاری افسران قدر خوشحال ہیں کہ وہ اپنی جیب سے اسریک میں چھٹیاں گزار سکتے ہیں ان کی اس خوشحالی کے نتیجے میں سنگاپور نے "ہیٹ پیورڈ کریک سسٹم" کا اعزاز حاصل کیا ہے اس نے بتایا سنگاپور میں بڑے سے بڑا فیملی اور مشکل سے مشکل ترین فائل بھی سمجھل کیلئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیتی کسی سال کو اپنے کام کیلئے انتظار نہیں کرنا پڑتا اور کوئی شخص کسی سرکاری محکمے کی شکایت نہیں کرتا وہ جان ایف کیڈی ایئر پورٹ پر اترا اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا لیکن مجھے ایک نیا راستہ ایک نئی سوچ دے گیا۔

بیورو کریسی کیا ہوتی ہے؟ بیورو کریسی کو عوام تک پہنچانے کا نظام ہوتا ہے لوگوں کو انصاف چاہیے لوگوں تک یہ انصاف بیورو کریسی پہنچانے کی لوگوں کو دروازہ، تعلیم، خوراک اور صاف ستھرا ماحول چاہیے اور عوام کی یہ ساری ضرورتیں بیورو کریسی پوری کرے گی بیورو کریسی بنیادی طور پر وہ دروازہ ہوتا ہے جس سے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے لہذا جب تک بیورو کریسی کا نظام ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک ملک ٹھیک پر کارآمد نہیں کرتا یہ حقیقت ہے بیورو کریسی کا نظام سے اچھے نتائج لینے کیلئے بیورو کریسی کا ماسٹرن ڈیٹا اور ریٹیکس رہنا ضروری ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن کا سرکاری ملازم غیر مطمئن بھی ہے اور بد حال بھی لہذا ہمارے ملک میں دنیا کا انتہائی ست اذیت ناک اور شرم انگیز سرکاری نظام پایا جاتا ہے اس نظام میں آپ کو آکسیجن لینے کیلئے چرہ ہی سے دزیرا عظیم تک کا سفر کرنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود آپ کو ایک گھنٹہ آکسیجن نہیں ملتی پاکستان کے انتہائی قابل اور پڑھے لکھے نوجوان ای، ایس، ایس اور ای پی ای ایس کے امتحان دیتے ہیں لیکن جب یہ نوجوان بیورو کریسی کا حصہ بنتے ہیں تو یہ اس نظام کا ایک ادھ پرزہ مزید لڑتے ہیں اس لیے بعد اس کی رفتار میں مزید کمی واقع ہو جاتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے اور وہ وہ ان لوگوں کا تنج ہے ایک سرکاری ملازم اور پرائیویٹ ملازم کی تنخواہ میں اتنا واضح فرق ہے کہ سرکاری ملازم

کیلئے رشوت کے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا آپ کو یقین نہ آئے تو آپ پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان میں پہلی دس پوزیشنیں حاصل کرنے والے نوجوانوں کا بیج دیکھ لیں آپ کو معلوم ہوگا ان کے مقابلے میں کم صلاحیت کے نوجوان پرانے سیکرٹریٹ میں دو لاکھ روپے تنخواہ لے رہے ہیں جبکہ سی ایس ایس میں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو دس ہزار روپے سیکریٹریٹ میں ہی بنے ذرا خود سوچئے اس تنخواہ میں یہ لوگ کام کا جذبہ کہاں سے لائیں گے چیف سیکرٹری صوبے کا سب سے بڑا افسر ہوتا ہے وہ پورے صوبے کا ذمہ دار ہے ایک نظام چلاتا ہے فیڈرل شریعت کورٹ کے رجسٹرار میرے دوست ہیں وہ گزشتہ روز مجھے پنجاب کے چیف سیکرٹری سلیمان صدیق کے بارے میں بتا رہے تھے ان کا کہنا تھا سلیمان صدیق صبح آٹھ بجے دفتر آتے ہیں اور رات دس گیارہ بجے تک دفتر میں کام کرتے ہیں جبکہ ان کا بیج صرف 45 ہزار روپے ہے یہ تنخواہ شیل کھنی یونی لیورڈ پاکستان نو بیکو کھنی یا عربیہ ماڈرن کے کسی جو نیوز افسر کے بیج سے بھی کم ہے پاکستان میں نرک چلانے والے ادگ بھی مہینے میں اس سے زیادہ پیسے کمالیتے ہیں آپ 45 ہزار روپے ماہانہ میں اپنے ایک بیجے کو کسی

میں نے کسی ادارے میں نقل تھیں وہے کئے جتنا خود بتائے ہے کیا اس بیج کے چیف سیکرٹری کی

کارکردگی متاثر نہیں ہوگی آپ چیف سیکرٹری کے بیج کو سامنے رکھ کر ڈی سی اور اسسٹنٹ کمشنر کی تنخواہوں کا اندازہ بھی کر لیجئے حکومت ڈائریکٹرز جرنل ہیلتھ کو جتنی تنخواہ دیتی ہے اتنی رقم ایک درمیانے درجے کا ڈاکٹر پرائیوٹ پریکٹس سے ایک دن میں کمالیتا ہے اور ایک درمیانے درجے کی کھنی کا سیکورٹی افسر شہر کے ایس ایس پی سے زیادہ تنخواہ لیتا ہے چنانچہ یہ تقاضا وہ بنیادی خالی ہے جس کی وجہ سے ہمارے سرکاری نظام کی کارکردگی شرمناک شکل اختیار کر چکی ہے۔

حکومت نے اس ظلم پر ایک اور ظلم "ایم پی گریڈون" سکیم کی شکل میں کیا حکومت مختلف اقداریوں، کشتوں اور کارپوریٹوں کی سربراہی کیلئے مارکیٹ سے فیئر ہارڈ کر رہی ہے اور ان لوگوں کو تین ساڑھے تین لاکھ روپے تنخواہ دی جاتی ہے یہ لوگ آگے چل کر ایک ایسے سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کی "قیادت" میں کام کرتے ہیں جس کا بیج چالیس ہینڈ لیس ہزار روپے ہوتا ہے آپ خود فیصلہ کیجئے سیکرٹری ساڑھے تین لاکھ کے جیسر میں کے ساتھ کام کرتے ہوئے کیا محسوس کرتا ہوگا اس کے اہلکاروں پر پڑھ رہا تھا حکومت نے ان لاکھ پی ہینڈ لیسوں کی تنخواہ میں مزید 60 ہزار روپے اضافہ کرویا ان لوگوں کو اس کے علاوہ 50 فیصد اضافی ہاؤس رینٹ اور پینشنی بلز کی مدد میں مزید 20 ہزار روپے بھی ملیں گے یہ سیدھی ساڈھی زیادتی ہے میرا خیال ہے حکومت اگر

تمام سرکاری شعبوں کے انتظامی افسروں کو ایم پی ٹی ون دے دے اور ان کے پیسے کو ان کی کارکردگی سے منسلک کر دے تو بڑی حد تک پاکستان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے حکومت اس معاملے میں نڈر کاروبار کرنے کی لیکن اس کا حل بھی موجود ہے۔ حکومت اگر ایک سال تک صدر اور وزیر اعظم کے شاہانہ دوروں پر پابندی لگا دے، کابینہ کا سائز کم کر دے، صدر اور وزیر اعظم سمیت ملک کی دس بڑی شخصیات کی سرکاری گاڑیوں کی تعداد آدھی کر دے یا پھر پانچ بڑے شہروں کے پلائوں کی آمدنی کا صرف ایک فیصد ان لوگوں کی تنخواہوں کیلئے مختص کر دے تو یہ مسئلہ دو دن میں حل ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر نظر جیسی پیرٹ کا مظاہرہ کرنا ہوگا، نظر نے سرکاری ملازموں کو ان کی مرضی کا پکیج دیا تھا لیکن ان سے کام اپنی مرضی کے مطابق لیا تھا، ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ یہ سچ ہے جب آپ بھوکے کہ منھائی سے کھیاں اڑانے کی ذمہ داری سونپیں گے تو آپ کی منھائی کا تول کبھی پورا نہیں ہوگا، فرانسسی کہات ہے ننگے ہمیشہ کفن چور ہوتے ہیں، ہماری بیوروکریسی پیٹ سے بھوک اور تن سے نگی ہے لہذا اس ملک میں ہمارے کفن محفوظ ہیں اور ذی منھائی۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

کاشف آزاد
ممبر

وی آرسوری

میں نے جاز سے اترتے ہوئے اخبار اٹھایا یہ گلف ٹیڈز کا دو مارچ 2007ء کا شمارہ

یہ اخبار ہے امریکی صحافت پر اٹھایا وپسپ تصور یعنی صحیحی تصور کے اوپر مارچ بولٹوں کی

سرخی لگی تھی اور تصویر میں مختلف مردوں کی خواتین اور حضرات فٹ پاتھ پر مارچ کر رہے تھے ان سب کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے تھے اور ان کے گلے میں ٹیلی ٹرانسکریپٹیاں تھیں تصور کے نیچے کپٹن میں لکھا تھا "مل شہر کے سینکڑوں شہری غلامی پر پابندی کے دو سال پورے ہونے پر لندن تک مارچ کر رہے ہیں یہ لوگ شدید بادش کے باوجود چار سو گلو سز تک مارچ کریں گے اور 25 مارچ کو لندن پہنچیں گے اس مارچ کے دو مقصد ہیں ان تمام لوگوں کی تسلیوں سے معافی مانگنا جنہیں دو سو سال پہلے برطانوی باشندوں نے غلام بنا کر امریکہ میں بچا دیا تھا اور دوسرا مل شہر کے عقیم بیوت ولیم ویلر فورس کو سلام عقیدت پیش کرنا جس کی بیس سالہ کوشش کی بدولت ہاؤس آف کامنز نے غلامی پر پابندی لگا دی" یہ اخبار پچھلے ایک ماہ دو دن سے میرے پاس پڑا ہے میں روزانہ یہ تمہیر دیکھتا ہوں اور اس کے بعد خود سے دو سوال پوچھتا ہوں ولیم ویلر فورس کون تھا اور کیا اللہ تعالیٰ نتے دنیا کے تمام اچھے کام پوری لوگوں کے نصیب میں لکھ دیتے ہیں؟

ولیم ویلر فورس برطانیہ کے خوبصورت شہر مل کے ایک امیر خاندان کا فرد تھا اس کا والد رابرٹ ویلر فورس شہر کا سب سے بڑا تاجر تھا ولیم 24 اگست 1759ء کو پیدا ہوا اور اس نے

1788ء میں ایم اے کی ڈگری لی لیکن دو ایم اے سے آٹھ سال پہلے ہاؤس آف کامنز کا رکن بن چکا تھا۔ دو دارالعوام کا کم سن ترین رکن تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 21 برس تھی۔ اس میں ولیم ویلر فورس کی کہانی کو ذرا دیر کیلئے روکوں گا اور آپ کو اس سے تین سو سال پہلے لے جانے کی کوشش کروں گا۔ کرسٹوفر کولمبس نے 1492ء میں امریکہ دریافت کیا تھا اور 1500ء میں یورپی تاجروں نے اس نئی دنیا پر یلغار کر دی تھی۔ شمالی اور جنوبی امریکہ اس وقت ہیچٹا سونے کی کان کنی پر اور براعظم جنگلی جھینسوں سے انا پڑا تھا۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے کو نئے تک جنگل ہی جنگل تھے اور جنگلات کے بعد سونے چاندی اور بیروں کی ہزاروں کانیں تھیں۔ امریکہ کی زمین گنے سے لے کر کھیتی اور سونج بکھی سے لے کر تمباکو تک ہر قسم کی فصل کیلئے انتہائی سود مند تھی۔ چنانچہ یورپی تاجر امریکہ دور لاٹینی امریکہ پہنچے انہوں نے بندوق کے زور پر مقامی آبادی کو غلام بنایا اور انہیں کانوں سے سونا نکالنے اور زمین پر گناہ کنی اور تمباکو کاشت کرنے پر لگا دیا۔ یورپی تاجر غلام اور بے رحم تھے لہذا یہ مقامی لوگوں سے غیر انسانی سلط پر کام لیتے تھے اس زیادتی کے نتیجے میں مقامی آبادی تیزی سے کم ہونے لگی۔ آپ اس کی مثال امریکہ کے 1500ء میں کیو کا آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ 1511ء میں ہسپانوی فوجیوں نے کیو ہاس کالونی قائم کی۔ کیو کا لوگوں کو غلام بنایا اور انہیں سونا نکالنے پر لگا دیا۔ کیو ہاس کے لوگ شدید غذائی قلت بیماریوں اور منظم کاشتکار ہونے لگے یہاں تک کہ 1517ء میں محض چھ برس بعد کیو ہاس کی آبادی صرف دو ہزار رہ گئی۔ یہی حالت برازیل، میکسیکو اور جینائن، یوٹیو یا کولمبیا، ونیزویلا اور چلی کی تھی جبکہ شمالی امریکہ میں نیگاسا، کیلیفورنیا اور نیویارک کی حالت اس سے بھی تھیں تھی۔ اور جینیا کے ذبح حکمران تمباکو کی فصل بولتے تھے تو انہیں تمباکو کھانے اور سینے والے لوگ نہیں ملتے تھے۔ پر تھکانی حالت و زما طور پلا کے جنگلوں میں دو دو سو جھینسے مار لیتے تھے لیکن انہیں جھینسوں کی کھال اتارنے والے نہیں ملتے تھے اسی طرح مین بیٹن میں کماؤ کی فصل کھڑی کھڑی سوکھ جاتی تھی لیکن وینڈیزی اور برطانوی زمینداروں کو فصل کاٹنے والے نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ امریکہ کے تمام یورپی آبادی افزائی قوت کے شدید بحران کاشتکار ہو گئے۔ ہسپانوی، وینڈیزی اور پرتگیزی تاجروں نے جلد ہی اس کا حل نکال لیا۔ یہ لوگ بحری جہاز سے لے کر افریقہ پہنچنے، سیاہ فاسوں کا پورا پورا قبیلہ انخواہ کرتے اور انہیں امریکہ لاکر کھیتوں، جنگلوں اور کانوں پر لگا دیتے۔ یہ سلسلہ چل پڑا تو سیاہ فام لوگوں کا انخواہ اور انہیں امریکہ پہنچانے کا کام باقاعدہ تجارت کی شکل اختیار کر گیا۔ بارسلونا، اسٹروڈیم، نیپلز اور اینڈورہن میں

زمرد پبلشرز 3.....0.....377

انسان ہونے کا فخر واپس کر دیا لہذا وہ دن ہے اور آج کا دن مل کے لوگ ہر سال مارچ کے مہینے میں ولیم ویلیئم فورس کی یاد میں بے شمار تقریبات کرتے ہیں۔

مارچ 2007ء میں برطانیہ میں غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہو گئے تھے لہذا

مل کے لوگوں نے اس دن کو منانے کیلئے خصوصی اجترام کا فیصلہ کیا انہوں نے مل سے لندن تک 400 کلومیٹر لمبا مارچ کرنے کا اعلان کیا یہ معافی کا مارچ تھا اس مارچ کے ذریعے مل کے لوگوں

نے ان تمام سیاہ فاسوں کی روجوں اور لسٹوں سے معافی مانگ لی جنہیں برطانوی تاجروں نے امریکہ میں بیچ دیا تھا میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے میں اس وقت سے اپنے آپ سے یہ

سوال پوچھ رہا ہوں "کیا اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیے ہیں" مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا میں روز سوچتا ہوں کیا ہمارے ملک میں بھی کسی کروہ کسی

طبقہ لکڑ کو قوم سے معافی مانگنے کی جرأت ہوگی کیا غلامی سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک وہ تمام حکمران قوم سے اجتماعی معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے اس ملک کے اقتدار پر شب خون مارا

تھا کیا ہمارے رہنے والے ایسا جہان قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے اس ملک میں آجروں کے پاؤں اور ہاتھ مضبوط بنائے تھے کیا کبھی یہ لوگ بھی کسی ایک شہر میں اکٹھے ہو کر اپنی سیاسی بد

دیہانتوں اپنی سیاسی مصلحتوں اور اپنی ضمیر فریبیوں کا اعتراف کر سکتے ہیں اور اس کے بعد قوم سے اتنا کہہ سکتے ہیں "دی آر سوری" کیا پی سی او کے تحت حلف لینے والے تمام سابق اور موجودہ چیف

قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں کیا اس ملک کے تمام دانشور ادیب شاعر اور صحافی اپنی مصلحتوں اپنے سمجھوتوں اور اپنی ضمیر فریبیوں پر قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں اور کیا وہ تمام سابق فوجی افسر

قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے صدر ایوب سے لے کر یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک جرنیلوں کو اقتدار تک پہنچایا تھا اور جو اس ملک کے آئین کا قانون

دستور اور جمہوریت کو نقصان پہنچانے میں برابر کے شریک رہے تھے اور کیا اس ملک کے وہ تمام تاجرانہ استاذ وکیل اور ڈاکٹر بھی قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جو ہر ظلم چپ چاپ سہتے رہے جو ہر

زیادتی برداشت کر گئے اور جو میں ایک ایسا ملک دے کر دینا تر ہو گئے جس میں انصاف بنے روزگار ہے اور نہ ہی میرٹ کیا اس ملک کے کسی طبقے میں اپنی جرأت اپنی ہمت موجود ہے یقین

کیجئے میں اس دن اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو مسلمان سمجھوں گا جب جنرل سوارخان سے

زیر پبلاکٹ 3.....0.....378

لے کر جنرل حمید گل اور جنس شیخ ریاض سے لے کر سولانا فضل الرحمن اور اعجاز الحق سے لے کر
چودھری شجاعت تک اس ملک کے تمام زعمہ اکابرین ملک پر مارشل لاء لگانے پی سی او کے تحت
حلف اٹھانے قریب بنانے اور یونیفارم کے حق میں ووٹ دینے پر قوم سے معافی مانگیں گئے
جب یہ سب لوگ گلے میں دی آسوری کی تختیاں لٹکا کر سڑکوں پر مارچ کریں گئے کاش میری
زندگی میں وہ دن آجائے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

سیلی بریشن

میں 2001ء میں آخری مرتبہ امریکہ گیا تھا۔ یہ دورہ امریکی حکومت کی طرف سے تھا اور اس کے تمام تر اعضاء اور اہلکاروں کی ایک فاؤنڈیشن کے اہلکاروں کے ساتھ تھا۔ یہ فاؤنڈیشن امریکہ کے

ایک سرمایہ دار خاندان نے قائم کی تھی اور یہ تیسری دنیا کے لوہان صحافیوں کو امریکہ کی دس ریاستوں کی سیر کرائی تھی۔ مجھے 2001ء میں اس فاؤنڈیشن کا مہمان بننے کا موقع ملا، فاؤنڈیشن کا دفتر سرمایہ دار خاندان کے محل میں قائم تھا، یہ محل واشنگٹن کے مین گلب میں واقع تھا اور علیحدہ کردوں ڈائریکٹ کا ہوگا۔ ہمیں دورے کے پہلے دن اس محل میں لے جایا گیا اور فاؤنڈیشن کے بارے میں بریفنگ دی گئی۔ یہ بریفنگ ایک نیم سیاہ فام امریکی ڈاکٹر فلپ وے رہا تھا۔ بریفنگ کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں باہر نکلی ہوا میں آ گیا۔ یہ محل کا خوبصورت گارڈن تھا، باغ میں بلند وہلا درخت تھے اور دور دور تک پھیلی کھجوریں میں پھول لہرا رہے تھے۔ میں بیچ پر بیٹھ گیا، ڈاکٹر فلپ بھی باہر آ گیا، امریکہ میں غارتوں کے اندر سگریٹ پینے پر پابندی ہے لہذا ڈاکٹر فلپ سگریٹ پینے کے لیے باہر آیا تھا۔ میں بیچ سے اٹھا اور ڈاکٹر فلپ کے ساتھ کپ شپ شروع کر دی۔ وہ کیلیفورنیا کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین سات نسل پہلے افریقہ سے آئے تھے، اس کا والد سیاہ فام جبکہ ماں سفید تھی لہذا اس کا رنگ سیاہ سے نیم سیاہ ہو گیا تھا، وہ یونیورسٹی میں ریسرچ پڑھتا تھا اور 80ء کی دہائی میں ایک سال کراچی رہا تھا، پاکستان کا ذکر آیا تو اس نے کراچی کی

باتیں چھیڑویں۔ اسے کراچی کلبڈنگ اور لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے بتایا کراچی میں اسے ایک حکیم صاحب ملے تھے۔ وہ بہت حلیم الطبع اور شائستہ انسان تھے، فلپ اکثر ان کے کلینک چلا جاتا تھا۔ وہ حکیم صاحب بعد ازاں کراچی کے گورنر بھی بنے تھے فلپ پارلیمان کام نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اسے ان کا نام یاد نہیں آرہا تھا، میں نے اسے بتایا ان کا نام حکیم سعید تھا اور وہ ہستسٹی سے 1997ء میں شہید ہو گئے ہیں" اس کے منہ سے آہ نکلی اور وہ چند لمحوں کے لیے اداس ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا میں نے حکیم سعید کی شہادت پر کالم لکھا تھا جس پر مجھے 1997ء کے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی، اس نے فوراً سگریٹ بجھایا۔ سگریٹ کا ٹوٹا ٹوکڑا زلی کی باؤڈھری والی پر رکھا اور سگریٹ نکالیاں بجانے لگا۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ تالیاں بجانے کے بعد اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے بڑی گرم جوشی سے مبارکباد پیش کی۔ میں نے تب تک کراس کا شکریہ ادا کیا اس نے سگریٹ کا ٹوٹا ٹوکڑا پارہ جلا یا، تین چار لمبے کش لیے، نوٹا "ڈسٹ مین میں پھینکا اور اندر چلا گیا لیکن میں ڈاکٹر فلپ کے رد عمل کے بارے میں سوچتا رہا، مجھے محسوس ہوا میں نے جب اپنے ایوارڈ کے بارے میں بتایا تھا اس نے کہا کہ یہ لگایا یہ میری زندگی کی ایک بڑی اچیومنٹ ہے اور اسے میری اچیومنٹ کو "سٹی برینٹ" کرنا چاہیے چنانچہ اس نے سگریٹ بجھایا اور تمنا میں کھڑے ہو کر میرے لیے تالیاں بجانا شروع کر دیں اس کی یہ ادا نہ لو اور وہ گارڈن ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری یادداشت کا حصہ بن گیا۔

ڈاکٹر فلپ کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دس منٹ مجھے زندگی بھر کے لیے ایک نیا سبق دے گئے۔ وہ سبق "سٹی برینٹ" تھا۔ ڈاکٹر فلپ نے مجھے سکھایا، ہمارے دوست، ہمارے عزیز رشتے دار، مین، بھائی، ہمسائے اور ساتھی اپنی کامیابیوں پر ہم سے مبارکباد کی توقع رکھتے ہیں۔ کسی نے اچھی تصویر بنائی ہے، کسی کی آواز اچھی ہے اور اس اچھی آواز کی وجہ سے اسے کوئی ایوارڈ ملا ہے۔ کسی نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ کسی نے اچھی تقریر کی ہے، کسی نے امتحان میں اچھے نمبر لیے ہیں، کسی کی تنخواہ میں دو سو روپے اضافہ ہو گیا، کسی نے گالف کھیلنا شروع کر دی، کسی نے گھر بنایا، کسی نے شادی کی، کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا، کسی کے بچے نے سکول میں انعام لیا، کسی کی بیوی نے اچھا اجارہ بنایا، کوئی اچھی ٹائی لگا کر آیا اور کسی کا عزیز رشتے دار جرنیل بن گیا یہ سب لوگ اپنی کامیابیوں کی "سٹی برینٹ" چاہتے ہیں۔ ان کے دل کے کسی گوشے میں مبارکباد کی خواہش اجڑاتی رہتی ہے اور جو شخص ان کی یہ خواہش پوری کر دیتا ہے وہ ڈاکٹر فلپ کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے ان کے دل میں جگہ پالیتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا "سٹی بریشن" ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو انسان کے حوصلے میں دس گنا اضافہ کرتی ہے جو لوگوں کا ٹینٹ بڑھاتی ہے اور جو لوگوں کی کامیابیوں میں اضافہ کرتی ہے مجھے محسوس ہوا مغربی معاشروں اور ہمارے ملکوں میں ایک فرق سٹی بریشن بھی ہے۔ وہ لوگ دوسروں کی خوشیوں اور کامیابیوں کو سٹی بریت کرتے ہیں، وہ لوگ ایک دوسرے کو کارڈ اور پھول بھجواتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں اور وہ لوگوں کو مستوجہ کر کے اعلان کرتے ہیں "خواتین و حضرات میرے اس دوست سے ملنے، اس کے کھیت میں ایک کھوکھو کا نمائشہ ہوا تھا یا کل اس کی لمبی نے چھ بچے دیئے تھے" اور لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہیں، مجھے یاد آ یا میں ایک بار ہالینڈ کی ایک ٹیلی کامپنیاں جاتا تھا، ان دنوں میزبان کے بچے نے زندگی کی پہلی ڈرائنگ بنائی تھی، میرا میزبان گھر آنے والے بر ملا تائی کو بچے کا کارنامہ بتاتا تھا اور بچے اور ڈرائنگ دونوں کو ملا تائی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ ملا تائی جی بھر کر بچے کے ٹینٹ اور ڈرائنگ کی تعریف کرتا تھا، میزبان نے مجھے بھی ڈرائنگ دکھائی، وہ ایک انتہائی فضول اور بھدی ڈرائنگ تھی، میں نے محسوس کیا لوگ صرف بچے کی حوصلہ افزائی کیلئے اس ڈرائنگ کی تعریف کر رہے ہیں۔ مجھے اس وقت یہ بات عجیب لگی لیکن بعد ازاں معلوم ہوا اورپ میں لوگ دوسروں کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھتے ہیں، وہاں لوگ دوسروں کی خوشیوں کو سٹی بریت کرتے ہیں۔ یورپ میں لوگ ایک دوسرے کو ملنے کے فوراً بعد "ٹانکس ٹائی یا ٹانکس سوٹ" کا نفرہ لگاتے ہیں اور پھول اور کارڈ سے دوسروں کا استقبال کرتے ہیں اور یہ عادت یورپ کی کامیابی کی بڑی وجہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر ظہر کے بعد مغربی سوسائٹی اور پاکستانی معاشرے کا تقابلی کیا تو معلوم ہوا ہم لوگ سٹی بریشن کے معاملے میں بہت کچھ نہیں ہیں۔ ہم دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے یا دوسروں کے حق میں تالیاں بجاتے ہوئے شرمناک جاتے ہیں، ہم دوسروں سے دس ہزار گلے کر لیں گے لیکن ان کی خوشی میں شریک ہونے سے گریز کریں گے۔ ہم لوگوں کو خوش ہونا اور خوشی منانا نہیں آتا، آپ پاکستان کی شادیوں کو دیکھ لیجئے پاکستان کی ہر شادی کا آغاز ناراضی سے ہوتا ہے، عین شادی کے دن سارا خاندان ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہارات آنے پر پتہ چلتا ہے دو لہجے کی بھابھی راستے سے داپس چلی گئی تھی یا بہن نے ناشتہ نہ ملنے پر رو رو کر ہشتر کر دیا تھا، پاکستان کی تمام پھول بھیاں، چاچے اور ماسوں شادی پر ضرور

ناراض ہوتے ہیں، اسی طرح بچے کا نام رکھنے پر اکثر گھروں میں فساد ہو جاتا ہے۔ نئی گاڑی لینے، ملک سے باہر جانے یا سرسرا ل کو نقد دینے پر بھی آدھا خاندان ناراض ہو جاتا ہے، میں نے اکثر پر دوشن پانے والے لوگوں کے بارے میں کوئی کہتے سنا، یہ خوشامدی تھا، صاحب کا سال تھا یا سازشی تھا، لہذا اسے پر دوشن مل گئی، میں نے ہمیشہ امتحانوں میں زیادہ نمبر لینے والے طالب علموں پر نقل کا الزام لگتے دیکھا، میں نے لوگوں کو نوکری پانے والے امیدواروں کو ہمیشہ سفارشی کہتے پایا اور میں نے ہمیشہ ناکام سیاستدانوں کے منہ سے وہاں عدلی کا الزام سنا، میں نے آج تک پاکستان کے کسی والد کو اپنے بیٹے یا بیٹی کی آواز، ڈرائنگ یا کھیل کی تعریف کرتے نہیں دیکھا اور میں نے آج تک کسی شخص کے منہ سے کسی سیلف میڈ کی اچھائی نہیں سنی۔ میں نے آج تک ہر شخص کی کامیابی پر دوسروں کو کڑھے اور پتلے ہوئے دیکھا۔ میرے ایک دوست کل دوسرے دوست پر رشوت خوردی کا الزام لگا رہے تھے، میں نے وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر بولے، "اس نے ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنالیا" میں نے کہا، "ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنانے کا مطلب رشوت تو نہیں کھانی؟" میں نے کہا، "میرے دوست جیسے رشوت لینے دیکھا ہی نہیں تھا، کیا آج تک اس کے خلاف رشوت ستانی کا کوئی کیس درج ہوا؟" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں دوسرے دوست کو بھی جانتا تھا مجھے معلوم تھا اس نے بے شمار لوگوں سے قرض لے کر مکان بنایا تھا لیکن میرا دوست میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، یہ ایک مجلس رو یہ تھا ہمارا پورا معاشرہ اس مجلس رو یہ کا شکار ہے، ہم دوسروں کی کامیابیوں میں خامیاں تلاش کرتے ہیں شاید یہی وجہ ہے ہمارے ہاں ٹیلنٹ پروان نہیں چڑھ رہا، ہم لوگ دوسرے کی خوشی پر خوش نہیں ہوتے شاید یہی وجہ ہے ہم سب میں خوشی ختم ہوتی جا رہی ہے، ہم لوگ بھول گئے ہیں خوشی ہمیشہ دوسرے لوگوں کو خوش دیکھ کر ملتی ہے اور جب تک آپ دوسروں کی کامیابی کو تسلیم نہیں کرتے آپ خود بھی کامیاب نہیں ہوتے، ہم لوگ بھول گئے ہیں خوشی کی نسل ہمیشہ مسائے کے سخن میں لگتی ہے اور وہاں سے ہوتی ہوئی ہمارے سخن میں سایہ کرتی ہے اور ہم بھول گئے ہیں اگر مسایہ خوش نہیں ہوگا تو ہم تک بھی خوشی نہیں پہنچے گی اور اگر ہم دوسروں کی خوشی کو سلی برت نہیں کریں گے تو دوسرے بھی ہماری کامیابیوں کو سلی بریشن کی کھا نہیں دیں گے۔



ترتیب

خواجہ صاحب نے فرمایا "بنیادی طور پر ہماری ترتیب غلط ہے ہماری ترجیحات درست نہیں۔ مثلاً آپ اور امی کو الٹ لے کر پاکستان میں بھیجیں۔ جس کو جسے بھیجیں اور کون کون سے لے کر گئے ہیں؟" وہ حاسوس ہوئے اور میری طرف دیکھنے لگے "میں نے جواب دیا 'وہ ایف ایس سی میں داخلہ لیتے ہیں وہ میڈیکل میں چلے جاتے ہیں یا انجینئرنگ کا شعبہ اختیار کر لیتے ہیں' وہ سکرائے 'بالکل ٹھیک یہ سچ سائنس کا شعبہ منتخب کرتے ہیں' یہاں تک کہ ہن جاتے ہیں یا انجینئرنگ جبکہ کم نمبر لینے والے بچے ایف اے کرتے ہیں اور اس کے بعد بی اے کر لیتے ہیں' بی اے میں زیادہ نمبر لینے والے بچے ایم اے یا ایم ایس سی کرتے ہیں کسی کالج میں ہنگامہ بھرتی ہوتے ہیں یا پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں جبکہ کم نمبر والے ہی ایس ایس کرتے ہیں اور بیورو کریش من جاتے ہیں' تعلیم کے اس کھیل میں پیچھے رہ جانے والے بچے سیدھے سیاست کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں یہ لوگ کونٹر بننے ہیں، 'عظم منتخب ہوتے ہیں' ایم پی اے ایم این اے اور سینئر بننے ہیں' مشیر اور وزیر بن جاتے ہیں اور پھر پورا ملک چلاتے ہیں' وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور اس کے بعد بولے "تم اس سارے ٹیل کا جائزہ لؤ کلاس میں سب سے لائق پچھو اکثر بنا اس سے کم لائق پچھو جو درمیانی میں آیا اور سب سے لائق بچے کا پاس بن گیا اور کلاس کا سب سے لائق بچہ سیاست میں گیا اور پورے صوبے یا پورے ملک کے ڈاکٹروں اور بیورو کریش کا انفرین گیا اور اس کے ہاتھ میں

پورے لاپرواہی کی مثال آگنی میں ہنس پڑا ان کی بات واقعی دلچسپ تھی۔

وہ مسکرائے اور اسی نرم آواز میں بولے "یہ پورے معاشرے کا المیہ ہے تم غور کرو ہمارے معاشرے کا ناکام شاگرد بڑا ہو کر کیا بنتا ہے وہ استاد بن جاتا ہے ناکام استاد وہ کس چائلڈ ہو جاتا ہے ناکام ڈاکٹر وادوں کی ٹیکری لگا لیتا ہے یا ہسپتال کا مالک بن جاتا ہے نالائق انجینئر چند برسوں میں چیف انجینئر بن جاتا ہے ناکام وکیل جج مہرتی ہو جاتا ہے بے ایمان اور چور شخص زکوٰۃ کسب کی کا جیسرٹین بن جاتا ہے ناکام کرکٹرز پاکستان کرکٹ بورڈ کا چیئر مین ہو جاتا ہے ناکام خاندان اور ماہیوں باپ سفیر بنا دیا جاتا ہے نوکری کے اعتراضوں میں قیل ہونے والا نوجوان کسبوں کا مالک بن جاتا ہے سکول میں بچوں کے لٹچ باکس چوری کرنے والا شخص بیک بن جاتا ہے اور سکول اور کالج کے ہر امتحان میں قیل ہونے والا بچہ وزیر تعلیم بن جاتا ہے اور وہ مہینے کے لئے ر کے اور لہا سانس بھر کر بولے "تم وکیلوں زندگی کے ہر شعبے میں ہماری ترتیب الٹ ہے ہم میں سے ہر شخص کا پاس ہم سے نالائق ہے معاشرے میں ہر باصلاحیت شخص کے اوپر ایک نالائق اور تم

K صلاحیت کا شخص بچھا ہے تم ایسا نہ کرنا دیکھو جو سیاست ملک کا سب سے اہم شعبہ ہے لیکن تم

یونین کونسل سے پارلیمنٹ تک تمام سیاستدانوں کو دیکھو جس میں ان میں دنیا جہاں کی خرابیاں اور خامیاں ملیں گی استاد معاشروں کے معیار ہوتے ہیں تم اپنے استادوں کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو بیورو کریسی سسٹم کی مائیں ہوتے ہیں تم ان کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو کاروباری لوگ معاشروں کا خون ہوتے ہیں تم ان لوگوں کی ذہنیت اور خیالات دیکھ لو پروفیشنل لوگ معاشروں کا جسم ہوتے ہیں تم ان کو دیکھ لو اور دانشور سماجی اور ادیب قوموں کی روح ہوتے ہیں یہ لوگ تو اس کی کردار سازی کرتے ہیں تم ان لوگوں کا معیار دیکھ لو تمہیں شرم آئے گی وہ ر کے اور وہ بارہ بولے "تم مجھے بتاؤ کیا ہم نے پچھلے ساٹھ برسوں میں عالمی سطح کا کوئی دانشور ادیب اور صحافی پیدا کیا؟ کیا ہم نے عالمی سطح کی کوئی ایک کھینی بنائی؟ کیا ہم نے عالمی سطح کا کوئی ایک چیف ایگزیکٹو کوئی ایک انجینئر کوئی ایک ڈاکٹر کوئی ایک وکیل اور کوئی ایک سیاستدان پیدا کیا؟ کیا ہم اپنے کسما ایک سیاستدان کا تقابل یورپ امریکہ اور جاپان کے سیاستدانوں سے کر سکتے ہیں انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا میں نے انکار میں سر ہلا دیا وہ مسکرائے "یہی وجہ ہے ہم ایک سو برسوں میں یونین پارلیمنٹ کا دفاع کر رہے ہیں ہمارے وزیر اعلیٰ پنجاب جناب چودھری پرویز الہی جلد عام میں اعلان کرتے ہیں وہ جنرل پرویز مشرف کو یونین پارلیمنٹ کے ساتھ وی مرتبہ صدر منتخب کریں گے اور

ہماری اسمبلیاں وردی کے حق میں قراردادیں پاس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے بیورو کرچک مسلم کو دنیا کا اتنا اہم ترین نظام قرار دیا جاتا ہے، ہمارے ڈاکٹروں کو تصاکی کا خطاب ملتا ہے، دنیا ہماری عدالتوں کو "کننگڈوم آف لٹ" کہتی ہے اور ہماری انٹرنیٹ کو "جنگلی صنعت" کہا جاتا ہے "وہ رک گئے، میں ان کی بات غور سے سن رہا تھا۔

دوبولے "ہم اب آتے ہیں دین کی طرف" دین کی حالت اس سے بھی خراب ہے تم اپنے علماء کرام کی حالت دیکھ لو، یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ہم لوگ خاندان کے معذور کنڈومین اور بیمار بچے کو مولوی نہیں بنا دیتے؟ کیا یہ بچے بعد ازاں پورے ملک کی امامت نہیں کرتے، کیا یہ لوگ بعد ازاں ہم لوگوں کا اسلام سیدھا اور معاشرے کی دینی تربیت نہیں کرتے؟ "دور کے اور دوبارہ بولے" حقیقت تو یہ ہے ہمارے دینی طبقے کے نوے فیصد لوگ انگریزی نہیں جانتے، یہ لوگ ہوائی جہاز پر نہیں بیٹھتے، انہیں کمپیوٹر چلانا نہیں آتا اور یہ پاکستان کا جغرافیہ نہیں بتا سکتے، تم خود دیکھو ہم دین کو کس قسم کا "سٹف" دے رہے ہیں، کیا آج تک پاکستان میں میٹرک، ایف اے، بی اے اور

ایم اے کے امتحانات میں انگریزی پوزیشن حاصل کرنے والے کوئی نوجوان مولوی بنا؟ کیا بی اے، ایم اے اور سی ایس ایس میں اول پوزیشن حاصل کرنے والے کوئی افسر ہمارا امام بنا؟ کیا ہمارے ملک میں ہارورڈ، کیمبرج، آکسفورڈ اور ہائیڈل برگ کا کوئی ڈگری ہولڈر شخص عالم دین بنا، کیا آج تک ہمارے کسی عالم دین نے مذاہب میں پی ایچ ڈی کی اور اس کی ڈگری کو دنیا کی دس بڑی یونیورسٹیوں نے تسلیم کیا؟ کیا ہم نے آج تک پاکستان میں عالمی سطح کی کوئی دینی یونیورسٹی قائم کی؟ کیا آج تک پاکستان کے کسی بڑے سیاسی گھرانے کا کوئی فارن کوالی فائینڈ پچھدر سے میں بھرتی ہوا اور کیا آج تک ہمارے علماء کرام نے ملک میں کوئی سینیٹنگ کالج، کوئی انجینئرنگ یونیورسٹی، کوئی ٹیکنیشن اسٹینڈیٹ اور کوئی ریسرچ لیبارٹری بنائی "دو خاموش ہو گئے، میں نے اشارہ میں سر ہلایا۔

وہ مسکرائے "یہاں مسلمان کی زندگی کی سب سے بڑی ترجیح ہوتی ہے لیکن ہم اس ترجیح کو سب سے کم اہمیت دیتے ہیں۔ ہم معاشرے کا سب سے محروم اور معذور ترین شخص اس شعبے کے حوالے کرتے ہیں لہذا آج ہمارے دین کی بھی وہی حالت ہے جو سیاست، کاروبار، تجارت اور تعلیم کی ہے" میں خاموش رہا، وہ بولے "ہم امریکہ، اسرائیل اور یورپ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب تک ہم اپنے معاشرے میں ان جیسی ترجیح قائم نہیں کریں گے اس وقت تک ہم ان

کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، امریکہ میں اس وقت 25 ہزار بی ایچ ڈی پادری ہیں، امریکہ میں چرچ 55 ہزار ہسپتال اور سینے ٹیکس کا بج چلا رہا ہے۔ امریکہ میں ہر سال ہارورڈ، شین فورڈ کولمبیا اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے دو ہزار پادری ڈگری لیتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کی کابینہ کے 70 اےسڈ انکان پروفیسر ہیں اور یورپ کے 82 فیصد سیاستدان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسرائیلی تاجر دنیا میں سب سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ "پڑھا کوز" سیاستدان برطانیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسرائیل نے 1965ء میں فارمولہ بنایا تھا ان کے سب سے زیادہ ذہین شخص کو مذہب میں جانا چاہیے۔ اس سے کم صلاحیت کے شخص کو تعلیم میں آنا چاہیے۔ اس سے کم کو سیاست میں، اس سے کم کو کاروبار میں، اس سے کم بیوروکریسی میں اور اس سے کم صلاحیت کے لوگوں کو فنی اور ٹیکنیکی شعبوں کا رخ کرنا چاہیے۔ اسرائیل میں آج کوئی طلاق یافتہ کوئی کنوارا اور کوئی ناکام باپ حج نہیں من سکتا۔ دو برس پہلے اسرائیل کے ایک حج کا بیٹا چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ حج صاحب اسی دن مستعفی ہو گئے تھے، کیوں؟ کیونکہ یہودی سمجھتے ہیں جو شخص اپنی بیوی کو راضی نہیں رکھ سکتا اور جو اپنے کو مجرم سمجھنے سے نہیں روک سکتا وہ معاشرے کو انصاف فراہم نہیں کر سکتا لہذا وہ لوگ دنیا میں بھی ترقی کر رہے ہیں اور ان کا مذہب بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، جب تک ہم لوگ بھی ایسی ترتیب قائم نہیں کرتے، ہم اپنی ترقیات ٹھیک نہیں کرتے، ہم لوگ آگے نہیں بڑھیں گے، ہم لوگ اس طرح مار کھاتے رہیں گے۔"



جاب اور کام

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے پکوں پر نشور دکھایا، ہم سب چند لمحوں کے لیے خاموش رہ گئے، اس کی ٹھکانہ کوئی بھی نہ تھا، اس کی ساری سورتھال ہوتی، آپ ایک لمحے مجھے اپنے خود سے بچنے لگے، اگر آپ نے ابھی پوزیشن کے ساتھ ایم بی اے کیا ہو، اگر آپ ایک صحت مند اور خوبصورت جوان ہوں لیکن آپ نوکری کے لیے جہاں بھی درخواست دیتے ہوں، آپ کو وہاں سے صاف جواب مل جاتا ہوتا ہے، آپ پر کیا گزرے گی، آپ کا رد عمل کیا ہوگا، لہذا یہ نوجوان بری طرح داخلی ٹوٹ بھوٹ کا شکار تھا۔

میں نے اس سے کہا "میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں" اس نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھیر اور بے بسی تھی، میں نے عرض کیا۔ "کیپ ٹاؤن کی میڈیکل یونیورسٹی کو طبی دنیا میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کا پہلا بائی پاس آپریشن اسی یونیورسٹی میں ہوا تھا، اس یونیورسٹی نے تین سال پہلے ایک ایسے سیاہ فام شخص کو "ماسٹر آف میڈیسن" کی اعزازی ڈگری دی جس نے زندگی میں کبھی سکول کا مدرس نہیں دیکھا تھا۔ جوائنٹ میڈیکل کالج کے ایک لفظ پڑھ سکتا تھا اور یہی لکھ سکتا تھا لیکن 2003ء کی ایک صبح دنیا کے مشہور سرجن پروفیسر ڈیوڈ ڈینٹ نے یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں اعلان کیا، ہم آج ایک ایسے شخص کو میڈیسن کی اعزازی ڈگری دے رہے ہیں جس نے دنیا میں سب سے زیادہ مہرمن پیدا کیے، جڑا ایک نیر سوی اسٹار اور ایک حیران کن سرجن ہے اور جس نے میڈیکل سائنس اور انسانی دماغ کو حیران کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پروفیسر

نے تھمٹلن کا نام لیا اور پود سے ایڈیٹو ویمن نے کفر نے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ یہ اس یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے بڑا استقبال تھا۔ "نوجوان چپ چاپ سنتا رہا۔ میں نے عرض کیا "تھمٹلن کیپ ناؤن کے ایک دور دراز گاؤں منجالی میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین چاہے تھے، وہ بھرتی کی کھال پہنتا تھا اور پہاڑوں پر سارا سارا دن ننگے پاؤں پھرتا تھا، بچپن میں اس کا والد بیمار ہو گیا لہذا وہ بھیڑ بھریاں چھوڑ کر کیپ ناؤن آ گیا۔ ان دنوں کیپ ناؤن یونیورسٹی میں تعمیرات جاوی تھیں۔ وہ یونیورسٹی میں مزدور بھرتی ہو گیا۔ اسے دن بھر کی محنت مشقت کے بعد جتنے پیسے ملنے تھے، وہ یہ پیسے گھر بھیجا دیتا تھا اور وہو چنے چھا کر کھلے گراؤنڈ میں سو جاتا تھا۔ وہ برسوں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ تعمیرات کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ یونیورسٹی میں مالی بھرتی ہو گیا۔ اسے نینس کوٹ کی گھاس کاٹنے کا کام ملا، وہ روز نینس کوٹ پہنچتا اور گھاس کاٹنا شروع کر دیتا، وہ تین برس تک یہ کام کرتا رہا پھر اس کی زندگی میں ایک عجیب سوڈ آیا اور وہ میڈیکل سائنس کے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں آج تک کوئی دوسرا شخص نہیں زیادہ کم از کم کر رہا تھا۔"

نوجوان سوچا، جو کچھ کیا، میں نے عرض کیا، "زیرو پوائنٹ اور تین روزہ پرنٹنگ

کر رہے تھے، وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے جب زرافہ پانی پینے کے لیے گرون جھکتا ہے تو اسے فٹی کا دوہ کیوں نہیں پڑتا، انہوں نے آپریشن منجلی پر ایک زرافہ لایا، اسے بے ہوش کیا لیکن جوں ہی آپریشن شروع ہوا زرافے نے گردن ہلا دی چنانچہ انہیں ایک ایسے مضبوط ٹھنڈ کی ضرورت پڑ گئی جو آپریشن کے دوران زرافے کی گردن بکڑ کر رکھے۔ پروفیسر تھمیر سے باہر آئے، سامنے تھمٹلن گھاس کاٹ رہا تھا، پروفیسر نے دیکھا اور ایک مضبوط تھکے کاٹھ کا صحت مند جوان ہے۔ انہوں نے اسے اشارے سے بلایا اور اسے زرافے کی گردن بکڑنے کا حکم دے دیا۔ تھمٹلن نے گردن بکڑ لی، یہ آپریشن آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ڈاکٹر چائے اور کافی کے وقفے کرتے رہے لیکن تھمٹلن زرافے کی گردن تمام کر کھڑا رہا۔ آپریشن ختم ہوا تو وہ چپ چاپ باہر نکلا اور جا کر گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ دوسرے دن پروفیسر نے اسے دوبارہ بلایا، وہ آیا اور زرافے کی گردن بکڑ کر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد یہ اس کی دو ٹین ہو گئی وہ یونیورسٹی آتا آٹھ دن گھنٹے آپریشن تھمیر میں جانوروں کو بکڑتا اور اس کے بعد نینس کوٹ کی گھاس کاٹنے لگا، وہ کئی مہینے دو ہرا کام کرتا رہا اور اس نے اس ڈیوٹی کا کسی قسم کا انسانی معاوضہ طلب کیا اور نہ ہی شکایت کی۔ پروفیسر رابرٹ نے جو اس کی استقامت اور اخلاص سے متاثر ہو گیا اور اس نے اسے مالی سے "لیب اسٹنٹ" بنا

دیا۔ ہیملٹن کی پردہ پوشی زندگی۔ وہ اب یونیورسٹی آف آپریشن تھیز پینٹا اور سرجنوں کی مدد کرتا۔ یہ سلسلہ بھی برسوں جاری رہا۔ 1958ء میں اس کی زندگی میں دوسرا اہم سوز آیا۔ اس سال ڈاکٹر برنارڈ یونیورسٹی آف انہیوں نے دل کی منتقلی کے آپریشن شروع کر دیے۔ ہیملٹن ان کا اسٹنٹ بن گیا، وہ ڈاکٹر برنارڈ کے کام کو غور سے دیکھتا رہتا، ان آپریشنوں کے دوران وہ اسٹنٹ سے ایڈیٹل سرجن بن گیا۔ اب ڈاکٹر آپریشن کرتے اور آپریشن کے بعد اسے تاکے لگانے کا فریضہ سونپ دیتے وہ انتہائی شاندار ناکے لگاتا تھا، اس کی انگلیوں میں صفائی اور تیزی تھی اس نے ایک ایک دن مہا پچاس پچاس لوگوں کے ناکے لگائے۔ وہ آپریشن تھیز میں کام کرتے ہوئے سرجنوں سے زیادہ انسانی جسم کو سمجھنے لگا چنانچہ بڑے ڈاکٹروں نے اسے جونیئر ڈاکٹروں کو سکھانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ اب جونیئر ڈاکٹروں کو آپریشن کی تکنیکس سکھانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ وہ میڈیکل سائنس کی اصطلاحات سے ناواقف تھا لیکن وہ دنیا کے بڑے سے بڑے سرجن سے بہتر سرجن تھا۔ 1970ء میں اس کی زندگی میں تیسرا سوز آیا، اس سال جگر پر تحقیق شروع ہوئی تو اس نے آپریشن کے دوران جگر کی ایک ٹکڑی سربان کی شاندرنی کر دی، جس کی وجہ سے جگر کی منتقلی آسان ہوئی۔ اس ٹکڑی اس شاندرنی سے میڈیکل سائنس کے بڑے دماغوں کو حیران کر دیا، آج جب دنیا کے کسی کونے میں کسی شخص کے جگر کا آپریشن ہوتا ہے اور مرعش آکھ کھول کر روشنی دیکھتا ہے تو اس کا سیلاب آپریشن کا ثواب براہ راست ہیملٹن کو چلا جاتا ہے اس کا مہمن ہیملٹن ہوتا ہے اسے اسے خاصا شہ ہو گیا۔

نوجوان ستارہ ہا، میں نے عرض کیا "ہیملٹن نے یہ مقام اخلاص اور استقامت سے حاصل کیا۔ وہ 50 برس کیپ ناؤن یونیورسٹی سے وابستہ رہا، ان 50 برسوں میں اس نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ دورات تین بجے گھر سے اٹھتا تھا، 14 میل پیدل چلتا ہوا یونیورسٹی پہنچتا اور ٹھیک چھ بجے تھیز میں داخل ہو جاتا۔ لوگ اس کی آمدورفت سے اپنی گھڑیاں ٹھیک کرتے تھے، ان پچاس برسوں میں اس نے کبھی تنخواہ میں انسانے کامیاب نہیں کیا، اس نے کبھی اوقات کار کی طوالت اور سہولتوں میں کمی کا شکوہ نہیں کیا لہذا پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا جب اس کی تنخواہ اور مراعات یونیورسٹی کے دس چائٹلر سے زیادہ تھیں اور اسے وہ اعزاز ملا جو آج تک میڈیکل سائنس کے کسی شخص کو نہیں ملا۔ وہ میڈیکل ہسٹری کا پہلا ان پڑھ استاد تھا۔ وہ پہلا ان پڑھ سرجن تھا جس نے زندگی میں تیس ہزار سرجنوں کو بڑی ٹنگ ہی 2005ء میں نوٹ ہوا تو اسے یونیورسٹی

میں ڈفن کیا گیا اور اس کے بعد یونہی سے پاس آؤت ہونے والے سر جنوں کے لیے لازم قرار دے دیا گیا وہ ڈگری لینے کے بعد اس کی قبر پر جائیں، تصویر بنائیں اور اس کے بعد عملی زندگی میں داخل ہو جائیں" میں رکا اور اس کے بعد نو جوانوں سے پوچھا "تم جانتے ہو اس نے یہ مقام کیسے حاصل کیا" نو جوان خاموش رہا، میں نے عرض کیا "صرف ایک ہاں سے" جس دن اسے زرانے کی گردن پکڑنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں بلایا گیا تھا اگر وہ اس دن انکار کرتا، اگر وہ اس دن یہ کہہ دیتا میں مافی ہوں میرا کام زرافوں کی گردنیں پکڑنا نہیں تو دوسرے دن تک مافی رہتا یہ اس کی ایک ہاں اور آٹھ گھنٹے کی اضافی مشقت تھی جس نے اس کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیے اور دوسرے سر جنوں کا سر جن بن گیا۔"

نو جوان خاموش رہا، میں نے اس سے عرض کیا "ہم میں سے زیادہ تر لوگ زندگی بھر جاب تلاش کرتے رہتے ہیں جبکہ ہمیں کام تلاش کرنا چاہیے" نو جوان نے غور سے میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "دنیا کی ہر جاب کا کوئی نہ کوئی کرائی لیر یا ہوتا ہے اور یہ جاب صرف اس شخص کو ملتی ہے جو اس کرائی لیر یا ہر پورا کرتا ہے جبکہ کام کوئی کرائی لیر یا نہیں ہوتا۔ میں اگر آج جا بولا تو میں چند منٹوں میں دنیا کا کوئی بھی کام شروع کر سکتا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کام سے باز نہیں رکھ سکتی۔ سیمپلسن اس راز کو پا گیا تھا لہذا اس نے جاب کی بجائے کام کو فرویت دی یوں اس نے میڈیکل سائنس کی تاریخ بدل دی۔ زرا سوچو اگر وہ سر جن کی جاب کیلئے اپنائی کرتا تو کیا وہ سر جن بن سکتا تھا؟ کبھی نہیں، لیکن اس نے کھر پہ بیٹھے رکھا، زرانے کی گردن تھامی اور سر جنوں کا سر جن بن گیا" میں رکا اور ہنس کر بولا "تم اس لیے بے روزگار ہو، کام ہو کہ تم جاب تلاش کر رہے ہو، کام نہیں، جس دن تم نے سیمپلسن کی طرح کام شروع کر دیا تم نوٹل پرائز حاصل کر لو گے، تم بڑے بڑے اور کامیاب انسان بن جاؤ گے۔"



ون میں شو

حاجی صاحب چینی کے بیوہ بڑی تھے، انہوں نے زندگی کا آغاز پانڈی (لوڈر) کی حیثیت سے کیا، جس میں بڑے بڑے لوگوں نے چینی کی دکانیں کھولیں، ایک بھروسے پر چینی اور پانڈی سے دوکاندار بن گئے، ان کا کاروبار چل نکلا اور وہ 80ء کی دہائی میں پاکستان میں چینی کے سب سے بڑے بیوپاری سمجھے جانے لگے، حاجی صاحب کی دوکان سے جس قیمت پر کھلی بوری نکلتی تھی وہ اس دن پورے ملک میں چینی کا ریٹ ہوتا تھا، ان کا شیئر بورڈ میں نوٹ بھر کر بینک لے جاتا تھا، حاجی صاحب 1990ء میں انتقال کر گئے، ان کے چار بیٹے تھے وہ اپنے بیٹوں کیلئے بے تحاشا جائیداد اور دولت چھوڑ کر گئے لیکن آج 16 برس بعد ان کے چاروں بیٹے فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں، ان کی جیب میں راولپنڈی سے اسلام آباد تک کا کریم نہیں ہوتا اور وہ قطار میں لگ کر پولیس سٹور سے سستی چینی خریدتے ہیں۔

حاجی صاحب اور ان کی اولاد پاکستان کے "جینک پراہلز" کی ایک ذہنی سی مثال ہیں۔ ہم لوگوں میں ایک جینیاتی خامی ہے ہماری ایک نسل کا ہنر تو کہہ دوں گا اور تجربہ دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوتا ہے، ہماری ایک نسل بے تحاشا دولت کماتی ہے جب یہ دولت دوسری یا تیسری نسل تک جاتی ہے تو وہ اسے سانس کر لیتی ہے وہ فقیر ہو جاتی ہے، ایک نسل دیوانی، عسکریت کا رن بزنس میں، مصور، موسیقار، تھوکار اور دانشور ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بانجھ، ان پڑھ، عیاش اور

نکلھو ہوتی ہے، ہماری ایک نسل ہادشاہوں کی طرح زندگی گزارتی ہے جبکہ دوسری نسل جٹانوں پر
 سوتی ہے، ہماری ایک نسل مرنے کے نواسے لکھاتی ہے جبکہ دوسری نسل ایک ایک لئے کوترس جاتی
 ہے۔ ہماری ایک نسل فنکار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بے ہنر اور بے ٹن ہوتی ہے، ہماری ایک نسل
 زمیندار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل فیکٹریوں میں مزدوری کرتی ہے، ہماری ایک نسل جہازوں میں
 سفر کرتی ہے جبکہ دوسری نسل ونگوں میں رکھنے لکھاتی ہے اور ہماری ایک نسل علامہ محمد اقبال ہوتی
 ہے جبکہ دوسری نسل جاوید اقبال ہوتی ہے؟ کیوں؟ یہ "کیوں" اس ملک کا اصل مسئلہ ہے اور اس
 کیوں میں اس خطے کے تمام مسائل کی جڑیں چوست ہیں، ہم لوگ بنیادی طور پر انفرادیت پسند اور
 انفرادیت پرست ہیں، ہم لوگ اپنا ہنر اپنی کامیابی، اپنی انجوسٹ اور اپنا تجربہ دوسری نسل میں
 منتقل نہیں کر پاتے، ہم لوگ ادارہ بنانے کی قابلیت یا اہلیت پیدا نہیں کر پاتے، ہم لوگ اپنی کامیابی
 کو کبھی کسی ہنگامہ نہیں دے پاتے، ہم لوگ "دن میں شو" ہیں، ہمارے تمام ادارے، تمام دفتر، تمام
 فیکٹریاں اور تمام کاروبار کسی ایک شخص کی ذات کے ارد گرد گھومتے ہیں، جس دن وہ شخص چھٹی

کر جاتا ہے، ملک سے باہر چلا جاتا ہے، وہ ادارہ جو اس سے بننا تھا اسے انتقال کر جاتا ہے، اس دن وہ
 پورا ادارہ اور پوری کامیابی چلی جاتی ہے اور وہ سارا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں

یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے ایجنٹ اپنی کامیابی، اپنا ہنر، اپنی قابلیت، اپنی دولت اور اپنا تجربہ
 دوسرے لوگوں کو منتقل کرتے ہیں اور اپنی اگلی نسل کو دولت کے ساتھ ساتھ تجربہ، اعتماد اور ہنر بھی
 دیتے ہیں، وہ ایسے ادارے بناتے ہیں جو ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں، آپ آج مل
 گئیں گے کو ماٹیکروسافٹ سے نکال دیں یقین کیجئے اس سے مائیکروسافٹ کے کاروبار پر کوئی فرق
 نہیں پڑے گا، یہ ادارہ سو پچاس سال تک اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہے گا جبکہ اس کے مقابلے
 میں آپ میاں فٹا کو نکال دیں، آپ دیوان ضیاء یا فٹیل ڈیلری کو الگ کر دیں، آپ دیکھیں گے
 پوری ہیمپائر کی جڑیں تک مل جائیں گی، گورے اور پاکستانی میں یہی فرق ہے، یہ بنیادی طور پر
 اپروچ کا فرق ہے۔ یہ زاویہ نظر اور طریقہ کار کا فرق ہے، مغرب کے لوگ مل کر ادارہ بناتے ہیں،
 وہاں شخص کی بجائے اداروں کی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے، وہاں لوگ نظام یا سسٹم پر توجہ دیتے
 ہیں جبکہ ہمارے ہاں لوگ ہزار ہزار ملازمین کے اداروں کو اپنی ہاں اور تان پر چلانے کی کوشش
 کرتے ہیں اور پورے پورے مہلے کو اپنا نظام بنا دیتے ہیں اور پورے ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ
 مزارعوں جیسا سلوک کرتے ہیں لہذا ہمارے زیادہ تر ادارے "دن میں شو" ہوتے ہیں اور جس دن

"دن میں" ختم ہو جاتا ہے اسی دن سارے "شو" کی بنیاں بچھ جاتی ہیں آپ پر ارجح کا فرق ملاحظہ کیجئے پوری دنیا میں مالکان اپنے اداروں کیلئے ماہر اور "کی فینٹ" لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ اپنے گرد ہمیشہ خوشامد یوں، چالیسوں اور منٹوں کی فوج جمع کرتے ہیں، ہمارے معاشرے میں خوشامد سب سے بڑی اہلیت اور قابلیت سمجھی جاتی ہے، ہم ہمیشہ کمزور، نالائق اور غلامانہ ہیت کے فیصل کو ملازم رکھتے ہیں اور ہم اپنے ملازم منتخب کرتے ہیں جو ہمارے ادارے میں بچیس مہینے تک کام کرتے رہیں، ہمارا دوسرا کھیل اس سے بھی خطرناک ہوتا ہے ہم اپنی زندگی میں اپنے بچوں کو اپنے کام، اپنے ہنر اور اپنے تجربے سے دور رکھتے ہیں، ہم انہیں بڑی گازیوں اور بھاری کریڈٹ کارڈ دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں "جا بچہ پیش کر" اور بچہ پیش کرنا شروع کر دیتا ہے لہذا اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے جس دن ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اسی دن ہمارا شو ختم ہو جاتا ہے، اسی دن ہماری ساری ایمپائر دھرا ام ہو جاتی ہے۔

ہمارا یہ مسئلہ صرف کاروبار اور کارپوریٹ سیکٹر تک محدود نہیں، ہماری حکومتیں اور نظام بھی

ان میں شو ہوتے ہیں، ہمارے گھر ان ایک نظام تکمیل کو دیتے ہیں اور جب تک اقتدار انہیں ہوتے

ہیں ان کا نظام دنیا کا بہترین سمجھا جاتا ہے لیکن جوں جی وہ ان اقتدار سے باہر نکلے جاتے ہیں ان کا نظام، ان کی اصلاحات اور بعض اوقات ان کا آئین بھی رخصت ہو جاتا ہے، آپ صدر ایوب خان کو لیجئے ایوب خان نے پاکستان میں جمہوریت، خوشحالی، صنعت کاری اور پرائیویٹائزیشن کا دس سالہ جشن منایا تھا لیکن جب وہ رخصت ہوئے تو ان کا بی ڈی سسٹم، ان کی خوشحالی اور ان کے پانچ پانچ سالہ منصوبے بھی گھر چلے گئے، ان کا آئین بھی ختم ہو گیا اور ان کا دن یونٹ بھی ٹوٹ گیا، بھٹو اپنے ساتھ نیشنلائزیشن اور اسلامی سوشلزم لائے تھے ان کی یہ دونوں پالیسیاں ضیاء الحق کے دور میں پھانسی چڑھ گئیں اور جنرل ضیاء الحق کی اسلامی اصلاحات 1988ء میں دوامی پھنٹ گئیں، اس کے بعد بے نظیر بھٹو کی پالیسیوں کو جناب نواز شریف نے روند دیا اور نواز شریف کے فارمولے 12 اکتوبر 1999ء کو فارغ ہو گئے لہذا آپ ہماری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ہماری کسی حکومت کی کوئی خوبی دوسری حکومت تک نہ پاس ہوئی، ہماری حکومتوں کا بیٹا کوئی منصوبہ دوسری حکومت تک نہیں پہنچا یہاں حالت یہ ہے بے نظیر بھٹو کے دور میں بجلی کے تحویل یونٹ خوشحالی اور کامیابی ہوتے ہیں لیکن نواز شریف کے دور میں وہ ہنداری اور کرپشن بن جاتے ہیں آئیے دور میں مونروے کا نام دہو رہے ہیں اور دوسرے دور میں وہ بی مونروے سفید ہنسی کا درجہ پا

جاتی ہے کیوں؟ یہ کیوں ہماری جینیاتی خرابی ہمارا دن میں شو ہے ہماری ساری کامیابیاں صرف ہماری ذات تک محدود رہتی ہیں، ہم انہیں آگے ٹرانسفر کرنے میں ناکام رہتے ہیں آپ سوچو وہ حکومت کو سمجھنے آج جب حکومت اپنے نظام کے بارے میں دھوے کرتی ہے، جب یہ خوشحالی اور اعتماد پسندی کے نعرے لگاتی ہے تو مجھے ہنس آ جاتی ہے کیونکہ میں اس ملک، اس خطے کی تاریخ سے واقف ہوں، میں جانتا ہوں جس دن ان گھرانوں کے پاؤں دلیوز سے نیچے اتریں گے اسی دن ان کی اعتماد پسندی اور ان کی خوشحالی کا فہارہ پھٹ جائے گا، اسی دن ان کا دل میں شو بھی ختم ہو جائے گا۔ ہم لوگوں کے جینز میں خرابی ہے، ہم میں سے ہر نسل اپنے لئے نیا گھر بناتی ہے ہمارے ملک میں باپ کی سوچ بیٹے کو منتقل نہیں ہوتی اور بیٹا اپنا تجربہ اپنا ہنر اپنی صلاحیت اور اپنی کامیابی اپنے بیٹے کو منتقل کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے چنانچہ ہماری ہر نسل اپنے لئے نئی بنیادیں کھودتی ہے اور ہماری ہر نسل اپنے لئے نیا سسٹم بناتی ہے!

ہم جب تک اپنی اس خرابی کو نہیں سمجھیں گے اور ہم جب تک اسے دور کرنے کی پیمائشیں نہیں کریں گے ہم آگے نہیں بڑھیں گے ہم اس وقت تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے چلتے رہیں گے ہم اس وقت تک دائروں میں سفر کرتے رہیں گے۔



وقادار

جوزف رائٹل سے میری ملاقات ایک لائف ٹائم تجربہ تھا۔ جوزف ایسٹرا ایم میں
 ٹاسٹ فو ایکسٹریکٹ سے بڑی کہنی کا مالک تھا۔ ٹھیک اسی کے بعد اس نے زیکو وینسٹون سے وہ
 دن میں آدھ گھنٹہ کیلئے اپنے کسی ریسٹوران پر جانا اپنے کارکنوں سے ملنا ان کے ساتھ کپ شپ
 لگاتا اور اگلے ریسٹوران کی طرف نکل جاتا شام کو وہ "ڈیم سکواٹز" کے ایک ریسٹوران میں بیٹھتا
 کافی پیتا اپنے دوستوں کے ساتھ کپ لگاتا اور گھر چلا جاتا یہ اس کا معمول تھا میرا ایک دوست
 اس کے ریسٹوران میں کام کرتا تھا میرا یہ دوست 1990ء میں ہالینڈ گیا تھا اس نے جوزف کے
 پاس نوکری شروع کی تھی اور اس کے بعد اس نے 16 سال جوزف کے ساتھ گزار دیے میں اس
 کی مستقل مزاجی پر حیران تھا یورپ میں ایک ہی ادارے اور ایک ہی نوکری سے چپکے رہنے کو نفسیاتی
 مرض سمجھا جاتا ہے یورپ کے بارے میں کہا جاتا ہے وہاں نوکری عورت اور موسم کا کوئی اعتبار
 نہیں ہوتا لیکن میرے اس دوست نے یورپ کے اس لٹسے کو بدل دیا اس نے 16 سال ایک ہی
 ریسٹوران کے کاؤنٹر پر گزار دیئے میں نے ایک دن اس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر
 بولا "صرف جوزف کی وجہ سے" مجھے بڑی حیرت ہوئی میرے دوست نے اپنی بات جاری
 رکھی "صرف میں نہیں بلکہ آج تک جس شخص نے بھی جوزف کو جوائن کیا وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا"
 میرے لئے یہ بات بھی حیران کن تھی میں نے اپنے دوست سے وجہ پوچھی وہ مسکرا کر بولا "جوزف ہر

شام ہمارے رہنے ستوران میں آتا ہے کافی پیتا ہے اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے میں آج اس کے ساتھ تمہاری ملاقات طے کر دیتا ہوں تم اس سے خود پوچھ لیں۔ میں نے فوراً حائی بھری۔

جوزف کے ساتھ میری ملاقات طے ہو گئی شام چھ بجے جوزف وہاں آ گیا وہ ایک کٹو بیرونی تھا اس کی ٹاف تک لمبی داڑھی تھی سر پر سیاہ ہیٹ اور گھٹنوں تک لمبا کوٹ تھا اس کے ہاتھ میں قیمتی پتھروں کی جھوٹی سی نیچھی تھی اور دو وقتے و تنے سے عبرانی زبان میں کچھ بڑا اتا تھا میرے دوست نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا میں نے جوزف کا غر سے جائز لیا مجھے اس کی شخصیت میں ایک ان کیٹنی کنٹش محسوس ہوئی وہ وحلا اچھلا یا سا نرم مزاج شخص تھا اس نے میرے ساتھ گپ شپ شروع کر دی وہ مختلف موضوعات پر سوال کرتا اور میرے جوابوں میں سے نئے سوال نکالتا سوال وجوب کے اس سلسلے کے دوران اس نے اس کے ملازمین کا حوالہ دیا اور اس سے پوچھا آپ کے ملازم آپ کو چھوڑتے کیوں نہیں ہیں؟" وہ مسکرایا "میں ملازمین کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرتا ہوں میرا چنا کرنا ٹیڑھا ہے اور جو شخص اس کراڈیٹریا پر پورا نہیں اترتا اس سے ملازم نہیں رکھتا" میں خاموشی سے سنتا رہا وہ پوچھا "جب کوئی شخص میرے پاس نوکری کے لئے آتا ہے تو میں اس سے پوچھتا ہوں کیا تم عبادت سے کٹے ہو یا بڑھوہاں میں جواب دے کر وہ

میرا پہلا امتحان پاس کر جاتا ہے" میں نے اسے ٹوک کر پوچھا "عبادت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے مسکرا کر جواب دیا "اگر وہ مسلمان ہے تو کیا وہ نماز پڑھتا ہے؟ وہ عیسائی ہے تو کیا وہ حج جاتا ہے؟ یہودی ہے تو مینا گوگا ہندو ہے تو مندر اور بڑھ ہے تو کیا وہ ٹھیل جاتا ہے؟ دو کسی مذہب کا ماننے والا ہو میں صرف یہ دیکھتا ہوں کیا اس کا مذہب کے ساتھ تعلق قائم ہے؟" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا وہ بولا "میں اس کے بعد اس سے پوچھتا ہوں وہ اپنے خاندان بیوی اور بچوں کو کتنا وقت دیتا ہے؟ اگر اس کا جواب روزانہ چار گھنٹے اور نینتے میں دو دن ہوتو میں اسے ملازم رکھ لیتا ہوں" میں طلاق یافتہ اور مطلقہ لوگوں کو ملازمت نہیں دیتا "اگر کوئی کٹھنہ شخص میرے ادارے میں ملازم ہو جائے تو وہ سال کے اندر اندر شادی کا پابند ہوتا ہے" میرے لئے یہ شرط بھی عجیب تھی لیکن میں خاموش رہا وہ بولا "میں یہ دیکھتا ہوں کیا وہ سال میں ایک مہینے چھٹیاں لیتا ہے اور کیا وہ یہ چھٹیاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی ایسے مقام پر گزارتا ہے؟ میں یہ دیکھتا ہوں وہ اور نام تو نہیں لگاتا اور وہ نینتے اور اتوار کی چھٹی اپنے خاندان اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا ہے؟ اگر مجھے معلوم ہو وہ سارا سال کام کرتا ہے وہ اور نام لگاتا ہے یا وہ نینتے اور اتوار کے دن بھی کام کرتا ہے تو میں اسے ملازم نہیں رکھتا" میں خاموش رہا وہ بولا "میں اس سے پوچھتا ہوں کیا وہ نینتے میں کم از کم پانچ دن

ایکسرہماز کرتا ہے 'کیا وہ داک' جاگلگ' سائیکلنگ اور ویٹ ٹریینگ کرتا ہے 'اگر اس کا جواب ناں میں ہو تو میں فوراً معذرت کر لیتا ہوں" میں اس کی بات غور سے سنتا رہا 'وہ بولا "اور میں اس سے آخری سوال پوچھتا ہوں 'کیا وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے 'کیا وہ اخبارات 'رسائل یا کتابیں پڑھتا ہے اور کیا اس کے دوستوں میں کوئی پڑھا لکھا شخص موجود ہے 'اگر وہ ہاں کہے تو میں اسے نوکری دے دیتا ہوں' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے جوزف سے کہا "یہ ساری چیزیں تو ذاتی ہیں ان کا کام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ ملازمت کے سربراہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں" اس نے قہقہہ لگایا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا "مجھے معلوم تھا تم مجھ سے یہی کہو گے" وہ تمہاری دہر کا 'اس نے ہیٹ اتار کر سر پر ہاتھ بھیجا اور مسکرا کر بولا "ان تمام چیزوں کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ وفاداری سے ہے" میں سمجھتا ہوں جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ دنیا کے کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا 'جو شخص اپنے رب کی اطاعت نہیں کرتا وہ دنیا کے کسی شخص کی اطاعت نہیں کرتا 'جو شخص اپنے آرام کا خیال نہیں رکھتا وہ کسی شخص کو آرام نہیں پہنچا سکتا 'جو شخص اپنے خاندان کو دولت نہیں دے سکتا وہ دنیا کے کسی شخص کو دولت نہیں دے سکتا 'جو شخص اپنی صحت اور سلاخی کا خیال نہیں رکھتا وہ شخص کی سلاخی اور صحت کا خیال نہیں رکھ سکتا اور جو شخص پڑھتا نہیں وہ شخص زندگی میں سیکھتا نہیں اور جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں رہے کسی اور سے کسی کبھی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا 'میرا فلسفہ ہے جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں رہے کسی اور سے کسی کبھی اور کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا لہذا میں ہمیشہ اپنے لئے وفادار لوگوں کا انتخاب کرتا ہوں" اس کی بات میرے لئے بالکل نئی تھی 'میں نے سوچا "داعی وفاداری کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے جو شخص اپنے ساتھ بے وفا ہو وہ دوسروں کے ساتھ کیسے وفاداری کر سکتا ہے 'جو شخص اپنے اللہ کے ساتھ دھوکا کر رہا ہو 'جو اپنی ذات کے ساتھ دھوکا کر رہا ہو جس نے اپنے خاندان اپنے وجود اور اپنے ذہن کو محروم کر رکھا ہو وہ دوسروں کے ذہن اور وجود اور خاندان کو کیسے نواز سکتا ہے 'وہ ان کا بھلا کیسے سوچ سکتا ہے" میں نے اس یہودی کا ہاتھ تھاما "اسے سلوٹ کیا اور باہر آ گیا اور فٹ پاٹھ پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا "میں بھی ان لوگوں میں شمار ہوتا ہوں جو روز اپنے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں 'جو اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور انہوں نے اس دھوکے کو پروفیشن 'جلب اور مصروفیت کا نام دے رکھا ہے" میں نے اسی وقت اپنا تھیلہ کندھے پر رکھا اور فٹ پاٹھ پر جو گلگ شروع کر دی 'میں نے وفاداری کے میدان میں پہلا قدم رکھ دیا۔



بس ایک قدم

”تم جانتے ہو دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ کون سا ہے؟“ ان کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے پانچ سات ایئر پورٹوں کا نام لیا لیکن ہر نام پر انہوں نے قہقہے میں سر ہلکا دیا۔ میں نے تھک کر عرض کیا ”سر آپ ہی بنا دیجئے“ وہ جینھے لہجے میں بولے ”فکا گو کا او۔ ہیر (O, HARE) دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ ہے اس ایئر پورٹ سے روزانہ 60 انٹرنیشنل فلائٹس اڑتی ہیں یہ دنیا میں یونائیٹڈ ایئر لائنز کا سب سے بڑا اور امریکن ایئر لائنز کا دوسرا بڑا مرکز ہے اس نے 2003ء میں شمالی امریکہ کے بہترین ایئر پورٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا اس کے 4 ٹرمینل اور چھ پرائمری ایئر کیئر بیزرن ویز ہیں۔“

میں نے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھا وہ مسکرا کر بولے ”لیکن کہانی یہ نہیں کہانی اس ایئر پورٹ کا نام ہے ”میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولے ”او۔ ہیر ایک چھوٹا سا سرکاری ملازم تھا او۔ ہیر کا پورا نام بچ او۔ ہیر (BUTCH-O HARE) تھا وہ امریکی فوج میں فائیر پائلٹ تھا دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کی ڈیوٹی ایئر کرافٹ کیئر لیکسٹون پر لگ گئی یہ ایئر کرافٹ کیئر بیزر چیک آؤٹ میں کھڑا تھا او۔ ہیر اور اس کے دوسرے فائیر پائلٹس بحری جہاز سے حیارے اڑانے سے چابکوں پر سے سر سے نچے اور وہیں اچانک سے 1944ء میں ایک شام او۔ ہیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اڑا یہ لوگ ابھی چند میل دور گئے تھے کہ او۔ ہیر نے

اپنے منگنل انجن "مرورومین ایف 4 ایف" طیارے کے فول کی سوئی دیکھی اس کے طیارے میں چرول بہت کم تھا او۔ ہیر نے اپنے چیف کو اپنی پوزیشن بتا دی چیف نے اسے فوری طور پر واپس جانے کا حکم دے دیا او۔ ہیر ائیر کرافٹ کیریئر کی طرف واپس مڑ گیا جب وہ کیریئر کے قریب پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا اس نے دیکھا 9 جاپانی طیارے کیریئر پر حملہ آور ہیں اور کیریئر کی حفاظت کیلئے وہاں کوئی طیارہ موجود نہیں اس صورتحال میں او۔ ہیر کے پاس دو راستے تھے دو اکیلا ان تمام جاپانی طیاروں کا مقابلہ کرنا یا پھر وہ اپنی جان بچا کر فرار ہو جاتا او۔ ہیر ایک دلیر شخص تھا لہذا اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جاپانی طیاروں پر چل پڑا اور لٹا میں طیاروں پر جھپٹا ان پر گولے پھینکا اور دوسری طرف نکل جاتا وہاں سے واپس پلٹتا اور دشمن طیاروں پر گولیوں کی برچھاد کر دیتا اس نے آدمے گھٹے میں دشمن کے 5 طیارے مار گرائے اس دوران اس کا بارو ختم ہو گیا اس نے نئی تکنیک سے لڑنا شروع کر دیا وہ دشمن طیارے پر جھپٹتا اور اسے اپنے طیارے کے پر سے چھینتا اور دوسری طرف نکل جاتا اس تکنیک کے نتیجے میں دشمن کے مزید تین طیارے تباہ ہو گئے جبکہ دشمن کا آخری طیارہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ سمندر میں گر گیا او۔ ہیر کیریئر پر آ کر اسی اثناء میں اس کے ساتھی پائلٹ واپس آئے او۔ ہیر نے انہیں سزا دی رو داؤ سنائی لیکن لوگوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا اس زمانے میں امریکی نطائے کے تمام طیاروں میں کمرے نصب ہوتے تھے یہ کمرے آپریشنز کے دوران تصویریں اتارتے رہتے تھے او۔ ہیر اپنے طیارے سے کمرہ اتار کر لے آیا جب تصویریں بن کر آئیں تو پورے امریکہ میں شور ہو گیا امریکہ کا بچہ بچہ او۔ ہیر زندہ باد کے نعروں لگانے لگا حکومت نے فروری 1942ء میں او ہیر کو دوسری جنگ عظیم کا پہلا بخوی ایس (ACE) ایوارڈ دیا جبکہ 1943ء میں اسے امریکن آرمی کے انتہائی شاندار ایوارڈ فلائنگ کراس سے بھی نوازا گیا او۔ ہیر 26 نومبر 1943ء میں ایک جنگی مہم پر نکلا اس کا طیارہ دشمن کا نشانہ بنا وہ سمندر میں گر اور ہمیشہ کیلئے لاپتہ ہو گیا اس کی موت کے بعد امریکی حکومت نے اپنا سب سے بڑا تیر پورٹ اس کے نام منسوب کر دیا وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے جذباتی لہجے میں کہا "سر ویل ڈن یہ تو واقعی لاجواب کہانی ہے" وہ مسکرائے "میں میں جہیں اس سے بھی اچھی کہانی سنانا چاہتا ہوں" میں ہمتن گوش ہو گیا وہ بولے "شکاگو میں ویزی ایڈی نام کا ایک وکیل رہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے بے تحاشا ذہانت سے نوازا رکھا تھا"

اسے امریکہ کا سارا قانون از بر تھا، نوٹیکا کو کا سب سے اچھا مقرر بھی تھا، کیریئر کے آغاز میں اس کی ملاقات الگپن نام کے ایک بد معاش سے ہو گئی، الگپن شیکاگو کا مافیا لارڈ تھا، پورا شہر اس سے ڈرتا تھا، الگپن نے ایزی ایزی کو اپنا وکیل نامزد کر دیا، پولیس جب بھی الگپن کو پکارتی ایزی ایزی اسے بڑی مہارت سے چھڑا لیتا، اس زمانے میں لوگ کہتے تھے اگر الگپن کو ایزی ایزی کا تعاون حاصل نہ ہوتا، اس کا سارا مافیا ایک مہینے میں بکھر جائے، ایزی ایزی نے الگپن سے بے تحاشا مالی فوائد حاصل کیے، جس کے نتیجے میں اس کا شمار کاگو کے امرا میں ہوتا تھا، اس کے پاس شہر کا سب سے بڑا فارم ہاؤس تھا، وہ بیسیوں گاڑیوں اور بے چوزے بینک بیلنس کا مالک تھا، ایزی ایزی کا ایک ہی بیٹا تھا، اس نے اسے دنیا کی ہر نعمت دے رکھی تھی، ایک دن یہ بیٹا گھرا آیا اور اپنے باپ کا دامن پکڑ کر بڑا ایزی میں جب بھی باہر جاتا ہوں تو بچے مجھے الگپن، الگپن کہہ کر بھیجتے ہیں، بیٹے کی یہ بات باپ کے دل پر گئی، وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر سونے پر بیٹھ گیا اور اس نے سوچا میں نے اپنے بیٹے کو دنیا کی تمام سہولتیں دے دی ہیں لیکن میں اسے ایک اچھی شناخت ایک اچھا نام

دینا چاہتا ہوں، اسے سکا ایزی ایزی نے اسی وقت الگپن کا ہاتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، نوٹیکا گھرتے نکلا تو وہ جانتا تھا، وہ اب بھی گھر واپس نہیں آسکے گا کیونکہ الگپن کے کاغذوں میں ضروری کی سر اسوت ہوتی

ہے لیکن اس کے باوجود ایزی ایزی سیدھا ہاتھ لگا کر لیا اور اس نے الگپن کے خلاف وعدہ صحاف گواہ بننے کا اعلان کر دیا، پولیس نے اسی وقت الگپن کو گرفتار کر لیا، ایزی ایزی گھر کی طرف رخصت ہوا تو اسے راستے میں کسی نے گولی سے اڑا دیا، "وہ رے کے اور میری طرف دیکھ کر سکرے" یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے، "میں نے حیران ہو کر عرض کیا، "سر یہ تو ایک نہایت ہی فضول اور عجیب سی کہانی ہے، "ہاؤس نادل اور ڈائجسٹ ایسی کہانیوں سے مجھ سے بڑے ہیں، "انہوں نے قہقہہ لگایا، "میں ابھی ایک نعرہ بولوں گا اور یہ دنیا کی بہترین اور انتہائی قیمتی کہانی ہو جائے گی، "انہوں نے سرکس کے جادوگروں کی طرح میری طرف دیکھا اور سکر کر بولے، "ہماری پہلی کہانی کا ہیرو دا۔ میرا ایزی ایزی کا بیٹا تھا، "مجھے جھکا لگا اور میں شدت حیرت سے کھڑا ہوں گا۔

وہ سکرے، "میرے بچے بعض فیصلے بعض نیکیاں سمجھو کے روختوں کی طرح ہوتی ہیں، ایک نسل انہیں کا شت کرتی ہے، ان کی آبیاری کرتی ہے، انہیں جوان کرتی ہے اور اس کے بعد قبر میں اتر جاتی ہے اور دوسری نسل اس نیکی اس فیصلے کا پھل کھاتی ہے، اگر ایزی ایزی اس لمحے یہ فیصلہ نہ کرتا تو اس کا بیٹا بڑا ہو کر کسی مافیا کا حصہ بن جاتا، وہ کسی پولیس مقابلے میں مارا جاتا اور تاریخ

زیر پبلکٹ 3... 0... 401

اس کا نام تک فراموش کر دیتی لیکن ایزی ایڈی نے اپنے بیٹے کو اچھا نام دینے کا فیصلہ کیا وہ خود مر گیا لیکن اپنے بیٹے کو نسکی اور بیج کے راستے پر کھڑا کر گیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا اد۔ میرا اس راستے پر چلا چلا امریکہ کا قومی ہیرو بن گیا وہ اپنے باپ کو ایک ایسی شناخت دے گیا جو قیامت تک برقرار رہے گی "آج بھی جب کوئی طیارہ اد۔ میرا ٹیر پورٹ پر اترتا ہے " ٹیر ہوسٹس خواتین و حضرات ہم چند لمحوں میں اد۔ میرا ٹیر پورٹ پر اترنے والے ہیں " کا اعلان کرتی ہے تو سب لوگ سر سے نوچی اتار کر ایزی ایڈی کی عظمت کو سلام کرتے ہیں وہ سر خم کر کے اسے زندہ باد کا نذرانہ پیش کرتے ہیں ایزی ایڈی اور اس کے بیٹے اد۔ میر کی کہانی بتاتی ہے اچھے فیصلے و رحمت کی قلم کی طرح ہوتے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں آپ کی اولاد گرنی تپش اور بارش سے محفوظ رہے تو آپ کو ایزی ایڈی کی طرح اپنے عقلمن میں کسی اچھے فیصلے کی قلم بونا پڑتی ہے آپ کو اپنی نسل اپنی اولاد کو اچھا نام دینے کیلئے اپنی جان اپنی ذات کی قربانی دینا پڑتی ہے میں چاہتا ہوں اس ملک کا ہر صاحب اولاد اپنی بہتر ایزی ایڈی کا نام لگا کر نگاہ سے اور ہر فیصلہ کرنے سے پہلے ایک منٹ کیلئے سنا لے کہ کیا میرا فیصلہ میرے بیٹے کو اد۔ میر بنا دے گا اگر اس کا جواب ہاں ہو تو اسی وقت فیصلے کی طرف اٹھ کر آؤ فیصلہ کیا یہ ایک قدم اسے تاریخ کا سنگ میل بنا دے گا۔"



ایڈجسٹمنٹ

لو جوان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بار بار انگلی کی نوک سے آنسو صاف کر رہا تھا اور شرمندگی سے دائیں بائیں دیکھتا تھا میں اسے پچھلے پندرہ منٹ سے دیکھ رہا تھا اس کی زندگی طوفانوں میں گھری تھی وہ تین سال کا تھا تو اس کی والدہ انتقال کر گئی والد نے دوسری شادی کرنی سوتیلی ماں سوتیلی زیادہ تھی اور ماں کم ہنڈا جوانی تک گھر اس کیلئے گھر نہیں تھا اس کا سارا بچپن سارا لڑکپن اور جوانی کا ایک لہسا بھد محرومیوں میں گزرا وہ معمولی معمولی خواہشوں کیلئے ترستا رہا اسکول میں اسے اچھے استاد اور بھرپور دوست نہ ملے اس نے ایف ایس سی کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گیا ایف اے میں اس کے نمبر اچھے نہ آئے اس نے سپورٹس میں بیٹے کی کوشش کی لیکن نہ بن سکا اس نے اداکاری، صداکاری اور مصوری کی کوشش کی لیکن ٹھیل ہو گیا اس نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی آگے نہ بڑھ سکا بی ایس میں وہ معمولی نمبروں سے پاس ہوا اس نے ایم اے کیا تو اس میں بھی اس کی کوئی پوزیشن نہ تھی وہ نوکریاں تلاش کرتا رہا ہر جگہ درخواست دی ہر ٹیسٹ میں جینٹا ہر جگہ اظہار ہو دیا لیکن ناکام رہا اس نے اپنا کاروبار شروع کیا وہ بھی نہ چل سکا وہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کسی ناکام شخص کے حوالے کرنے کیلئے تیار نہیں تھے لہذا 2451 ممالک پر پھیلی اس دنیا میں اس کا کوئی دوست نہ تھا وہ کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن آدمی سے زیادہ کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا وہ آدمی فلم دیکھ کر اٹھ جاتا تھا اور کوئی گانا پورا

نہیں بن سکتا تھا وہ تبلیغی جماعت میں شامل ہوا لیکن راستے سے بھاگ آیا وہ کبھی سگریٹ پینا شروع کر دیتا تھا اور کبھی سگریٹ نوشی ترک کر دیتا تھا وہ کبھی مولوی بن جاتا تھا اور کبھی ڈانسروں کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا اور وہ کبھی درگاہ پر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی رندوں اور جوار یوں کی مجلس کا حصہ بن جاتا تھا اسے سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیا ہے وہ کیوں ہے اور اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ اس کا کہنا تھا وہ دنیا کا ناکام ترین شخص ہے!

میں بڑے غور سے اس کی کہانی سنتا رہا دو بول بول کر تھک گیا تو میں نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا اور اس سے پوچھا "تم جانتے ہو دنیا میں کتنے موسم ہیں" وہ ذرا سوچ کر بولا "سردی، گرمی، بہار اور خزاں چار موسم ہیں" میں نے پوچھا "سردیوں میں کیا ہوتا ہے؟" اس نے غصے سے سیری طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں بولا "سردیوں میں سردی ہوتی ہے!" میں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور اس سے سوال کیا "ہم سردیوں میں سردی سے بچنے کیلئے کیا کرتے ہیں" وہ حیرت سے

سیری طرف دیکھنے لگا میں نے عرض کیا "ہم کونوں کی انٹیکشنی جلا لیتے ہیں ہم ہلکا بندو بستہ کرتے ہیں ہم گرم کپڑے پہنتے ہیں سویٹر جرسیاں، گولٹ اور جینس پہنتے ہیں ہارن کے گرد سکر

پینٹ لیتے ہیں ٹیڈ سر پر ادنیٰ ٹوپی پہن لیتے ہیں ہم پاؤں میں گرم جرابیں اور بند جوتے پہنتے ہیں اور کم سے کم باہر نکلتے ہیں ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟" میں اس کی طرف دیکھنے لگا وہ ذرا دیر تک بولا "ہم سردی سے بچنے کیلئے کرتے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "نہیں ہم جانتے ہیں سردیاں چند دنوں کی بات ہے اگر ہم نے یہ دو تین ماہ گزار لئے تو موسم کھل جائے گا اور ہم گرم کپڑوں کے بغیر باہر نکل سکیں گے" وہ خاموش رہا میں نے عرض کیا "مگر میں

میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہوتی ہے ہم ٹھنڈے کپڑے پہنتے ہیں کمروں میں پھینے زوم کولر اور ایئر کنڈیشنر لگالیتے ہیں اور خستوں کے نیچے بیٹھتے ہیں اور سایوں میں چلتے ہیں ہم دن میں دو دو تین تین بار غسل کرتے ہیں شربت پیتے ہیں اور گرم دوپہروں میں باہر نہیں نکلتے کیوں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں وہ خاموشی سے سیری طرف دیکھتا رہا میں نے دوبارہ عرض کیا "موسم خزاں میں پودوں کے پتے گر جاتے ہیں ساری گھاس چل جاتی ہے اور درخت ٹنڈ ہو جاتے

ہیں اور اس کے بعد بہار آتی ہے گھاس کی کونٹیلیں نکلتی ہیں شاخیں ہری ہوتی ہیں ان پر پتے نکلتے ہیں اور پتوں کے ساتھ پھول پھلتے ہیں" میں خاموش ہو گیا اس نے کروٹ بدلی اور گرم آواز میں بولا "لیکن میراں موسموں کا سردی کا ناکامی کے ساتھ کس قسط کا حساب، آج، آکھ، نا، اور فضول۔"

بات کر رہے ہیں اس آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں اور آپ کچھ جواب دے رہے ہیں مجھے آپ کی ہانگ بھ نہیں آ رہی

میں نے قبضہ لگایا اور نوجوان سے عرض کیا "میں دو ہاتھ ثابت کرنا چاہتا ہوں ہم لوگ موسم کی سختیاں اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے یہ سرویاں یہ گرمیاں اور یہ خزاں چاندروں کی بات ہے اور اس کے بعد وقت بدل جائے گا اگر ہم اس حقیقت سے واقف نہ ہوں تو تم یقین کر دو ہم لوگ سرویوں میں جم جائیں یا پھر گرمیوں میں پگھل جائیں تمہارا پہلا مسئلہ یہ ہے تم وقت کی حقیقت سے واقف نہیں ہو تم یہ نہیں جانتے تبدیلی ہونا وقت کی فطرت ہے جب تک زندگی اور کائنات قائم ہے وقت تبدیلی ہوتا رہے گا سرویاں گرمیوں میں ضرور تبدیلی ہوں گی اور گرمیاں سرویوں میں ضرور پھٹیں گی شام کی صبح ضرور ہوگی اور صبح شام کے پردوں میں ضرور گم ہوگی ناکامی کا سامنا ہی میں ضرور بدلے گی کمال ضرور زوال پذیر ہوگا اور طاقت کمزور طاقت

اور اختیار ہے اختیار ہی میں ضرور تبدیلی ہوگا خوشبو بدبو اور بدبو خوشبو میں ضرور تبدیلی ہوگی اور نوجوان ہم یہ نہیں جانتے دنیا کی کوئی طاقت موسموں کو نہیں بدل سکتی دنیا کے سارے حکمران سارا

اختیارات اور ساری قوتیں مل کر سرویوں کو نہیں روک سکتیں دنیا کا کوئی شخص گرمیوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور دنیا کی کوئی طاقت خزاں اور بہار کو نہیں روک سکتی دنیا کا کوئی شخص ناکامی مشکل غمناکی اور بیماری سے نہیں بچ سکتا اور دنیا کا کوئی شخص سدا کا میاں ہمیشہ خوشحال نامرگ صحت مند اور پوری زندگی کبھی نہیں رہ سکتا وقت اور کیفیت کبھی یکساں نہیں رہتی وہ خاموشی سے سنتا رہا میں نے عرض کیا "ہم لوگ موسموں وقت اور کیفیتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے ہم ان کے ساتھ صرف ایڈجسٹ کر سکتے ہیں آندھی آئے تو ہمیں نیچے بیٹھ جانا چاہیے سرویاں ہوں تو آگ جلا کر سردی گزرنے کا انتظار کریں گرمیاں آئیں تو ٹھنڈی جگہ بیٹھ جائیں اور ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیں خزاں آئے تو ٹنڈے منڈے درختوں کے ساتھ بھرت کر لیں اور بہار آئے تو چند دن کی بہار سے لطف اٹھائیں بہار سے پاس وقت اور موسموں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اسی طرح ہم نے برے وقتوں ناکامیوں خرابیوں بیماریوں اور پریشانیوں کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے اگر ہماری ماں تین سال میں ہمیں چھوڑ گئی تو ہم اسے واپس نہیں لاسکتے چنانچہ ہم نے ماں کی کمی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے ہمیں اچھے سکول اچھے استاد اور اچھے کلاس فیلو نہیں ملے ہم کسی کلاس میں اچھے فیلو نہیں لے سکتے ہمیں نوکری نہیں ملتی ہم بزنس میں ناکام ہو گئے اور ہماری شادی مرضی

کے مطالبے نہیں ہوتی تو ہم نے ان کیوں کے ساتھ بھی ایڈ جسٹ کرنا ہے ہم نے کبھی اپنی خواہشوں پر کبھی دسے دینا ہے اور کبھی اپنی حسرتوں کو سامنے میں لانا دینا ہے ہم نے کبھی اپنی آرزوؤں کو دور دور بار غسل دینا اور کبھی انہیں سیزر کے سامنے بٹھا دینا ہے ہم نے کبھی آنکھوں میں زمین پر لیت کر وقت بدلنے کا انتظار کرتا ہے اور کبھی درختوں پر چڑھ کر صبح کی راہ گئی ہے ہم نے زندگی کے ساتھ ایڈ جسٹ کرنا ہے "میں رکا اور ذرا دیر بعد بولا "ہم میں سے جو لوگ موسموں کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں کرتے وہ تم جاتے ہیں یا کھل جاتے ہیں" میں خاموش ہو گیا اور سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے بولا "لیکن سر میں نے کب تک ایڈ جسٹ کرنا ہے" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کر جواب دیا "جب تک تمہارے مقدر کی آمدگی تم نہیں جانتی یاد رکھو دنیا کی کوئی نئی ساڑھے سات برس سے لمبی نہیں ہوتی اور دنیا کا کوئی شخص جس کیفیت میں پیدا ہوتا ہے اس کیفیت میں فوت نہیں ہوتا اور دنیا کا کوئی ناکام شخص پوری زندگی ناکام نہیں رہتا کیونکہ تبدیلی وقت کا مقدر بھی ہے اور فطرت بھی"

Kashif Azad@OneUrdu.com

بڑے گھروں والے

میں نے ان سے پوچھا "خوبصاحب پورا عالم اسلام زوال کا کیوں شکار ہے، ہم دنیا بھر کی طرح غلطیوں میں گرفتار ہیں، خوبصاحب! شکر ہے اور اللہ سے توفیق ہے بولے"

فرعونیت کی وجہ سے "میں خاصوشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ سوال پسند نہیں کرتے، انہوں نے فرمایا "فرعون کے بے شمار معانی ہیں، ان معنوں میں ایک مطلب بڑے مگرا والا بھی ہوتا ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اس کی اس جسارت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا، جب اللہ تعالیٰ کسی کو ناپسند فرماتے ہیں تو وہ اس شخص کی ہر ادا، ہر عادت کو خراب بنا دیتے ہیں اور آنے والے زمانوں میں جو بھی شخص اللہ کے اس مشرک کی پیروی کرتا ہے، جو بھی اس کی عادات اپناتا ہے، اللہ اسے بھی اس زوال، اس انجام کا شکار بنا دیتا ہے، "میں خاصوشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، انہوں نے فرمایا "فرانس میں مسرکو بلند، ہالا اور وسیع وغیر ایسے عمارتیں بنانے کا شوق تھا، ان کا خیال تھا عمارت اور بارہ قلعے اور دروازے طاقت اور اختیار کی علامت ہوتے ہیں اور اگر انہوں نے خود کو خدا ثابت کرتا ہے، تو انہیں پہاڑوں سے بلند عمارتیں بنانی چاہیں چنانچہ وہ اس خطہ میں ہتکا، جو گئے دو ذرا دیر کیلئے رے کے سنگھیا کر میری طرف دیکھا اور اس کے بعد بولے 'یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے دیا، سب سے بری تقریر یہ کہیں آپ ہر دم سرد کہیں، یہ کیا ہیں یہ وسیع عمارتیں قبریں ہیں، ساتہیں آج تک حیران ہے یہ لوگ اتنے بڑے بڑے ہتھر کہاں سے

اسے انہوں نے یہ پتھر ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جوڑے اور ان لوگوں نے کرنوں کے بغیر یہ پتھر ایک دوسرے کے اوپر کیسے رکھے۔ یہ مقبرے دراصل ان کی سوچ اور فکر کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مقبرے ثابت کرتے ہیں فرعون حقیقتاً بڑے گھروں والے لوگ تھے اور وہ اپنے بڑے بڑے گھروں اقلوں اور قبروں سے خود کو خدا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ نویں صاحب کھل طبرہ پر خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا "لیکن فرعون کے گھروں کا ہمارے زوال کے ساتھ کیا تعلق" وہ مسکرائے "بڑا گہرا تعلق ہے، فرعون اللہ کا دشمن تھا اور اللہ اپنے دشمن کی عادتوں کو پسند نہیں کرتا چنانچہ دنیا کے تمام بڑے گھروں والے لوگ جلد یا بدیر فرعون جیسا انجام کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان کی خدائی اور ان کے بڑے بڑے گھر یا آخر زوال پذیر ہو جاتے ہیں" میں خاموشی سے سنتا رہا، دو بولے "تم دنیا میں ترقی اور بہتری پانے والے لوگوں، معاشروں، قوموں اور ملکوں کا جائزہ لو تو تمہیں چھوٹے گھروں، چھوٹے دفتروں اور چھوٹی گاڑیوں والے لوگ، ملک اور معاشرے ترقی پاتے نظر آئیں گے جبکہ بڑے ملک جس کے بادشاہ، نگران، وزیر، مشیر، بیوروکریٹس اور ججز سے

گھر ہیں، بڑے دفاتر ہیں، بڑے لوگ اور وہ معاشرے زوال پذیر ہو جاتے ہیں" میں خاموشی سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا "پورا عالم اسلام بڑے گھروں کے خط میں مبتلا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا گہرا روٹائی کے سلطان کے پاس ہے، عرب میں سینکڑوں ہزاروں معاملات ہیں اور ان معاملات میں سونے اور چاندی کی دیواریں ہیں اور اسلامی دنیا اس وقت تیزی اور تیزی کا زبوں کی سب سے بڑی مارکینٹ ہے" دو خاموش ہوئے اور دو سوچا اور پھر بولے "تم پاکستان کو دیکھو تم ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس، گورنر ہاؤس اور وفاقی ہاؤس آئی جی، ایف آئی بی، ہاؤس آئی جی، ایف آئی جی ہاؤس اور سرکاری گیٹس ہاؤس کو دیکھو، یہ سب بڑے گھر ہیں، پاکستان کے ایک ضلع میں 18 ویں گریڈ کے ایک سرکاری مہدیہ اور گاؤں 106 کنال پر مشتمل ہے اور اپنڈنٹی کا ایک سابق ایوان صدر اس قدر وسیع تھا کہ اس میں یونیورسٹی بنائی گئی، اسلام آباد کے وزیراعظم ہاؤس کا رقبہ گاندھی ایوان صدر کے مجموعی رقبے سے چار گنا ہے، ایوان صدر، ہاؤس پنجاب یونیورسٹی سے بڑا ہے اور ایوان صدر کا سالانہ خرچ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ یہ یاد ہے، ملک عاقبتی سے سنا رہا تھا کہ اپنے گھروں کے گھر دیکھو، ان کی شان و شوکت دیکھو ان کے اخراجات اور گندہ دیکھو، کیا یہ سب فرعونیت نہیں، کیا اس سارے دور میں ان کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہمارے راضی رہے گا جبکہ اس کے برعکس تم، دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا انٹرنیشنل

دیکھو، بل ٹینس و نیا کا امیر ترین شخص ہے دنیا میں صرف 18 ممالک ایسے ہیں جو دولت میں بل ٹینس سے امیر ہیں باقی 192 ممالک اس سے کہیں غریب ہیں لیکن یہ شخص اپنی گاڑی خود ڈرائیج کرتا ہے، وہ اپنے برتن خود دھوتا ہے، وہ سال میں ایک دو مرتبہ ٹائی لگاتا ہے اور اس کا ہینر مائیکروسافٹ کے کلرکوں سے پڑائیں، دارن ہنٹ و نیا کا دوسرا امیر ترین شخص ہے اس کے پاس 50 ہری پرائیڈ اور جھونا گھر ہے اس کے پاس 1980ء کی گاڑی ہے اور وہ روز کوکاکولا کے بے سنورز پر سپائی کرتا ہے، برطانیہ کے وزیر اعظم کے پاس دو بیڈروم کا گھر ہے، جرمنی کی چانسلر کو سرکاری طور پر ایک بیڈروم اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ملا ہے، اسرائیل کا وزیر اعظم دنیا کے سب سے چھوٹے گھر میں رہ رہا ہے، اس کی بجلی تک کٹ جاتی ہے، بل کلنٹن کو لیبونسکی کیس کے دوران کورٹ فیس ادا کرنے کے لئے دوستوں سے ادھار لینا پڑا تھا، وائٹ ہاؤس کے صرف دو کمرے صدر کے استعمال میں ہیں، اول آفس میں صرف چار کرسیوں کی گنجائش ہے اور جاپان کے وزیر اعظم کو شام چار بجے کے بعد سرکاری گاڑی کی سہولت حاصل نہیں چنانچہ تم دیکھ لو چھوٹے گھروں والے لوگ ہم سے بڑے گھروں والے لوگوں پر سکرانی کہتے ہیں، یہ آگے بڑھے ہیں اور ہم وہی بات پیچھے چارہے ہیں خود خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا "گو کیا آپ کا فرمانا ہے ہم ترقی نہیں کر سکتے؟" انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "ہاں جب تک ہم فرعون کے دربار سے نکل کر موسیٰ کے خاک ساروں میں شامل نہیں ہوتے، جب تک ہم بڑے گھروں سے نقل مکانی کر کے چھوٹے گھروں میں نہیں آتے اور جب تک ہم قلعوں، ایوانوں اور محلوں سے نکل کر مکاناتوں، گھروں اور کلیںوں میں شامل نہیں ہوتے ہم اس وقت تک ترقی نہیں کریں گے، ہم اس وقت تک بڑی قوم نہیں بنیں گے" وہ رکے، انہوں نے کچھ سوچا اور مسکرا کر بولے تم خود بتاؤ "اللہ نے جو قانون اپنے نبیوں کیلئے نہیں بدل تھا وہ یہ بتا دے ہمارے لئے کیوں تبدیل کرے گا۔"



یاد و صنعت کا راز کارخانے دار بن جا؟ ہے تو ہم اسے "اونے" کہہ کر ناراض کر دیتے ہیں اور ہم اس سے فاصلے پر چلے جاتے ہیں، کیا ہمارا رویہ نقلی لحاظ سے درست ہے؟ "میرے دوست نے ٹی میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے کہا "ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں، ہمارا دوست جب ہماری طرح بے بس ہے، اختیار دار غریب تھا تو ہم اس کی عزت کرتے رہے تھے لیکن جب وہ ہماری مدد کرنے کے قابل ہوا تو ہم نے اس کی بے عزتی شروع کر دی، ہم نے اسے ناراض کر دیا" میں خاموش ہو گیا۔

دو بولا "ہمیں کیا کرنا چاہیے" میں نے عرض کیا "ہمیں دوست کی کامیابی کو ذرا تسلیم کر لینا چاہیے، ہمیں اپنے دوستوں کے عروج کے زمانے میں انہیں ماضی کے مقابلے میں زیادہ عزت دینی چاہیے، ہمیں ان کی ترقی کو مان لینا چاہیے" دو خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا "یہ دنیاوی پہلو تھا، اب آتے ہیں اس واقعے کے دینی پہلو کی طرف، میں تم سے ایک

سوال کرنا چاہتا ہوں، لوگو! ہر شے کوش ہو گیا، محمد نے پوچھا: "خبر از فرعون اور ابو جہل کا انجام کیوں برابرا ہوا تھا؟" اس نے تھوڑی دیر سوچا اور مسکرا کہ بولا "یہ لوگ مشرک تھے لہذا یہ اللہ کے عذاب کا

شکار ہوئے" میں نے ہاں میں گروں ہلائی اور اس کے بعد عرض کیا "میرے عزیز یہ فقط ایک پہلو ہے، اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے" اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء، کرام کو عزت بخشی تھی لیکن ان لوگوں نے انبیاء، کرام کی توہین شروع کر دی چنانچہ یہ لوگ اللہ کے عذاب کا شکار ہو گئے، تم دیکھ لو ان انبیاء، کرام کے احوال میں بے شمار ایسے لوگ تھے جو پوری زندگی شرک پر قائم رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قسم کی سزا نہ دینی کیوں؟ کیونکہ یہ لوگ شرک کے ساتھ انبیاء، کرام کی توہین نہیں کرتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں نرود فرعون اور ابو جہل کے انجام سے بچائے رکھا، میرا دعوئی ہے جب قدرت لوگوں کو عزت دیتی ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے ان کے بندے اس کے فیصلے کا امتثال کریں، دو بھی اس شخص کی عزت کریں لیکن جب کوئی شخص ان لوگوں کی توہین کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا، اسے سزا دے گا اور وہ اپنے فیصلے، اپنے کرم اور اپنے ہم نوا توہین آجستہ ہے" میں رکا، میرا دوست خاموشی سے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ تو انسان کی کوئی ایک ادا پسند آجاتی ہے جس کے بدلے میں

ذیروپوائنٹ 3 ... 0 412

وہ اسے ٹیک ٹائی سے نوازتا ہے لہذا میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ مجھے عزت دے ہمیں اس کی توہین کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے ہمیں اس کی برتری تسلیم کر لینی چاہیے بصورت دیگر ہم فرعون کے انجام کا شکار ہو جاتے ہیں 'میرے دوست نے میری بات سنی مجھ سے وزیر صاحب کا ٹیلی فون نمبر لیا اور دفتر سے رخصت ہو گیا۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

آج سے

وہ آگے جھکا اور سرگوشی میں بولا، "سزا میں ملک میں کوئی ایسی بات بھی ہوگی؟" جس سے ہم کو اور کراچی سے لہندی کوئٹہ تک سرکاری نظام بچا ہے اس نظام کا کوئی نہ کوئی پرزہ، کوئی نہ کوئی کارندہ اچھا، ایماندار اور نکلے بھی ہوگا؟ اس ملک میں 16 کروڑ لوگ رہتے ہیں ان 16 کروڑ میں چند اچھے لوگ بھی ہوں گے؟ مسلم لیگ (ق) ملک کی روٹنگ پارٹی ہے اس جماعت میں بھی کوئی نہ کوئی درد دل رکھنے والا باخیر شخص ہوگا اور صدر پر وجہ شرف اور شوکت عزیز میں بے شمار خرابیاں اور خامیاں ہوں گی لیکن ان دونوں نے پچھلے سات برسوں میں کچھا کچھا کام بھی کئے ہوں گے؟ آپ وہ کام، وہ اچھائیاں اور وہ خوبیاں بیان کیوں نہیں کرتے؟ آپ تصویر کے دوسرے رخ پر کیوں نظر رکھتے ہیں؟"

میں غور سے اس کی بات سنتا رہا، وہ خاموش ہوا تو میں نے عرض کیا "اس ملک اور اس ملک کے پاسیوں میں بے شمار خوبیاں اور بے شمار اچھائیاں ہیں دنیا میں اس وقت 140 ممالک میں خیرات، صدقہ اور چیرٹی ہوتی ہے، ان 140 ممالک کی فہرست میں پاکستان پانچویں نمبر پر ہے، ہم پوری دنیا میں فی کس آمدنی کے لحاظ سے سب سے زیادہ خیرات دینے والے لوگ ہیں، پاکستان میں ہر سال 100 سے 140 ارب روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں، پاکستان دنیا میں مفت کھانا کھلانے والے آٹھ ممالک میں شامل ہے، پاکستان میں اس وقت

اڑھائی ہزار کے قریب ایسے حرار ہیں جن پر دن رات نگر چلتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان حزاروں سے کھانا کھاتے ہیں، آپ لاہور کے داتا دربار، اسلام آباد کے بری امام، بہون شریف کے نئی لال شہباز قلندراور کراچی کے شاہ غازی کے دربار پر جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں بچہ میں کھنے نگر چلتا ملے گا، پاکستان کا ہر شہری ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے، لوگ اپنے کپڑے، جوتے، برتن، دوا، کیم اور فرنیچر ضرورت مندوں کو دے دیتے ہیں، پاکستان میں لاکھوں یتیم خانے، یتیم گھر، مسجدیں اور کالین، اور ہار، قبرستان اور سکول اہل ثروت کے پیسوں سے چل رہے ہیں، اس وقت پاکستان میں چھوٹے بڑے دس لاکھ کے قریب مدرسے ہیں یہ تمام مدارس عوام کی معاونت سے چل رہے ہیں اور ان میں تعلیم پانے والے بچوں کو نہ صرف کتابیں دی جاتی ہیں بلکہ انہیں رہائش، کھانا اور لباس تک فراہم کیا جاتا ہے، ہمارے مدارس دنیا کا سب سے بڑا چیرٹی بورڈ تک ستم ہیں، اس وقت پاکستان کے تمام قصبوں اور شہروں میں ایسے سکول، ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود ہیں جن میں تعلیم اور علاج کی سہولت مفت دی جاتی ہے دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایجوکیشن سروس پاکستان میں ہے، ہمارے عبدالستار ایجوکیشنل سروس اور لڈر کارڈ ایجنٹ شامل ہیں، اس وقت دنیا میں کینسر کا سب سے بڑا چیرٹی ہسپتال پاکستان میں ہے، یہ ہسپتال کرکٹ سٹار عمران خان نے بنایا تھا اور پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کا ہر چوتھا شہری فلاح عامہ کا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے اور جس میں رمضان میں ہر گھر میں انفرادی کی دعوت ہوتی ہے اور جس میں سب سے زیادہ خون دیا جاتا ہے اور جس میں بحران، آفت اور حادثے میں لوگ دوسروں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہیں اور پاکستان دنیا کا دوسرا ملک تھا جس نے کچھوں سے چالیس لاکھ غیر ملکیوں کو پناہ دی تھی اور پاکستان کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جس میں لوگ بھوکے نہیں موتے۔

میں کا اور اس کے بعد عرض کیا "رہ گیا ہمارا سرکاری نظام تو آج کے زمانے میں بھی پولیس، محکمہ مال اور کسٹم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ایمانداری کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ہمارے ملک میں ایسے جج بھی موجود ہیں جن کے تمام فیصلے ضمیر کے کعبے سے نکلتے ہیں اور ایسے سیاستدان بھی زندہ ہیں جو برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی کہنے کی جرأت رکھتے ہیں" میں خاموش ہو گیا، اس نے کرسی پر کھول لی اور سگرا کر بولا "پھر آپ ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے" میں نے عرض کیا، اس کی دود جو بات ہیں، اول یہ تمام خرابی اچھائیاں ہیں اور یہ آج

تک اجتماعی شکل اختیار نہیں کر سکیں اور ہمارے ملک میں برائی اچھائی پر غالب آ رہی ہے، ہمارا ہر نیا ون ہمارے کسی نہ کسی ایجنے، بائیسرا اور ایماندار شخص کی نفس سے طلوع ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں ایجنے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برسے بھی، ہم نے دیکھا یہ ہوتا ہے معاشرے میں ایجنے لوگ زیادہ ہیں یا برسے، اگر کسی معاشرے میں عبدالستار یاد می جیسے لوگ زیادہ ہوں تو وہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے اور اگر اس میں بلیک مملوں، بد معاشوں، بدتماشوں، سمجھوتے بازوں، این الوتوں، فراڈیوں، ڈکیتوں، چوروں اور نو سر ہانڈوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ معاشرہ برا ہوتا ہے، بد قسمتی سے ہمارے معاشرے، ہمارے ملک میں پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد کم اور دوسری قسم کے لوگ تعداد اور اثر رسوخ میں زیادہ ہیں۔ اگر مسئلہ صرف یہ ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی لیکن اصل مسئلہ پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد میں آنسنے والی کمی ہے۔ ہمارے ملک سے جب بھی کوئی اچھا شخص رخصت ہوتا ہے تو پورے ملک میں اس کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا اور ہمارے سارے

کھیتوں میں برائی کی پیڑی لگی ہے اس میں کوئی شک نہیں خیرات، چیزیں اور بھروسہ بہت بڑی دولت ہوتی ہے لیکن معاشرے صرف ان سے نہیں چلا کرے، معاشرے کو تعلیم، روزگار، انصاف، جمہوریت، سزائیں اور صاف پانی بھی چاہیے، خوف، ملاح اور ظلم سے پاک ماحول بھی درکار ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے ہماری مسجدوں کے امام تک سیکورٹی گارڈ کے بغیر نماز شروع نہیں کراتے اور ہمارا پانی اور بجلی کا دیر تک منزل و اثر پیتا اور گھر میں جنرل چلاتا ہے، ہمارے وزیر تعلیم کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارا وزیر صحت پرائیویٹ ہسپتالوں میں علاج کراتا ہے۔ ذرا سوچو کیا ان حالات پر ہمارا دل نہ دکھے، ذرا سوچو اگر ہم بھی ان حالات پر خاموش ہو جائیں، اگر ہم بھی ملام کو معاشرے کی مصدوم ہوتی اچھائیوں کا لالی پاپ و بنا شروع کریں اور اگر ہم بھی لوگوں کو خوش فیسوں کی انہوں کھانا شروع کریں تو ظلم کے خلاف آواز کون اٹھائے گا؟ کون بات کرے گا؟ اور لوگوں کو کون چکائے گا؟ میں خاموش ہو گیا۔

اس نے ذرا دیر سوچا اور مسکرا کر بولا "سرہم لوگ بہت دکھی ہیں اوپر سے آپ لوگ ہمارے زخموں پر نمک چھڑک دیتے ہیں جس سے ہماری تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے آپ مہربانی فرما کر کبھی کبھی ان زخموں پر مرہم بھی رکھ دیا کریں، سرمریض کو جو صلے کی ضرورت ہوتی ہے، ہم جانتے ہیں آپ ہمیں شفا نہیں دے سکتے لیکن آپ ہمیں کم از کم تسکین تو دے سکتے ہیں، آپ ہماری بہت توجہ دے سکتے ہیں، آپ کبھی کبھی اسکا ہکا کر دیا کریں، آپ کی مہربانی ہوگی" میں نے قبضہ لگایا

اور آ کے جھٹک کر عرض کیا "سر ایض کو حوصلے اور تھکی سے پہلے دو ای کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کی دس ہزار چھٹیاں مل کر کسی ایک شخص کا ورد نہیں بنا سکتیں، اگر تم چاہتے ہو میں ڈاکٹر کو بلانے کے بجائے سر ایض کے سر ہانے بیٹھ کر بانسری بجانا شروع کر دوں تو میں حاضر ہوں، میں آج سے تصویر کا وہ رخ پیش کرنا شروع کر دیتا ہوں جس نے ابھی جنم نہیں لیا، میں آج سے اس خوشحالی، اس امن، اس سکون، اس انصاف اور اس جمہوریت کے گن گانا شروع کر دیتا ہوں جس کا ابھی پہلا بیج پیدا نہیں ہوا، جس کے تصور تک نے ابھی ہماری روٹنگ کلاس کے وناخ پر دستک نہیں دی، میں آج سے خالی گھاس کو بھرا کبنا شروع کر دیتا ہوں اور میں پتھر میں ڈرل مشین سے سرخ گلاب کی قلم لگا دیتا ہوں، میں آج سے پاکستان کی حکومت، برادارے اور آنے والے ہر حکمران کو پابندہ ہاؤ کبنا شروع کر دیتا ہوں، میں آج سے جو ہز کے کنارے بیٹھ کر امید کے سورجوں کا انتظار شروع کر دیتا ہوں، میں آج سے سرکنڈوں سے زعفران چھڑنے کی امید شروع کر دیتا ہوں اور میں آج سے توڑے کی اور سری پرست کو روشن کرنا شروع کر دیتا ہوں تو میں خود کو تہذیب کہہ لیتا ہوں اسے تم لوگ تہذیب اور تھکی سے اپنے سارے مسائل میں کر لو تم لوگ تھکیوں پر بیٹھ کر انکا تو اور تم تھکیوں کو فیڈر بنا لو۔"





ہم سارا دن بیٹھی کے کھنڈرات میں بچرتے رہے اور شام کو سوز توڑے گئے سوچتے ہیں اس وقت سورج ڈوب رہا تھا ہمارے بول کی کھڑکی سے سمندر کے ٹکڑے لگاتے لگاتے نکلتے تھک سوتے کا ایک سٹیری راستہ بچھا تھا تم نے کہا تھا "مجھے یقین نہیں آتا وہ جانیس ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں سبز پہاڑوں کے قدیموں میں سینڈروہوں" میں خاموش رہا تم نے پوچھا "کیا ہم دوبارہ اس جگہ آ سکتے ہیں" میں نے اثبات میں

ہمیں سر ہلا دیا تب تم نے ناخن سے کھڑکی کے فریم پر تاج لگھوا دیا جس میں پارہوں کا ہمارا اگلی سبز کپڑی میں طلوع ہوتی تھی کپڑی سمندر کے درمیان ایک خوبصورت پہاڑ تھا اور اس پہاڑ پر کپڑی کا شہر آباد تھا بالکل پرستان جیسا شہر کپڑی پہاڑ کے نیچے یا قوت کا غار تھا اور اس غار میں نیلے پانیوں کی آؤروں کو "تمہی ہمارے اطالوی ملانے نے ٹیک میں داخل ہوتے ہی کوئی دھن چھینر ہوتی تھی تب تم نے پانی میں اٹھکیاں ڈالی تھیں اور عمارکی دیوار پر سیرا نام لکھ دیا تھا تم نے دھن کی گرمی سے پڑھی سیرا نام لکھا تھا تم نے مہاتی کارلو کے رائٹل گاؤں کے دوڑتوں کین کے سٹلے

Kashmir Headlines.com

مائل دھن کے گھڑوں کی فوریس کے چارمب گھروں اپنے سنا کے دینا زمیان کے دو سو چھ آٹھ نیر میں لروں سے تصویریں بھی بنائی تھیں تم نے دوک کے نوادوں میں اپنے اور میرے نام کے لکے بھی پھیلے تھے اور تم نے ہاں تم نے بیچوں کے پیکال جڑتی میں ہمارے نام کی موسم ملی بھی جاتی تھی لیکن ان موسم تھیں ان تصویروں ان سکوں اور ریت پر کھینچے ان حرفوں کا نیا تھیں کھلا! جب وقت بڑا تو کوئی حرف کوئی تصویر اور کوئی موسم تھی ہمیں نونے ہمیں کھرنے سے ت بھانگی کوئی دلدل سورج کے کھر تک جانے کی کوئی خواہش اور آخری سانس تک چلنے والے آگے بڑھتے رہتے کا کوئی عمدہ نہیں الگ ہونے سے نہ ہو کہ بکا اور ہم اور جاری خواہشیں ملی بالا خیر ہوں کے ساتھ بڑھیں ہم بھی باہمی کے سب شاندار لوگوں کی طرح باہمی کی دیوار میں جانی دینے لگے۔

میں آج ایک بار پھر سوز توڑی اسی کھڑکی میں کھڑا ہوں اور میرے سامنے سورج کا سٹیری راستہ بچھا ہے لیکن کھڑکی کے فریم پر کپڑی اور کاٹا لکھا ہے میں اوپر آسمان کی طرف نہ دیکھ رہا ہوں اور اپنے خالق سے پوچھ رہا ہوں یا باری تعالیٰ یہ کسی دنیا ہے جس میں کھڑکیوں کا قانون اور لوگوں اور فراروں کی عمریں ہیں اور انسانوں اور ان کے جندوں کی سانسیں چھوٹی ہوتی ہیں جس میں انسان بننے جاتے ہیں لیکن کھڑکیاں رو جاتی ہیں بچھے آسمان سے کوئی تھاب نہیں مل رہا پلٹتے تم بھی اپنی کھڑکی کو یاد اور آسمان سے یہ سوال ضرور پوچھو شاید تمہیں جواب مل جائے۔

علم و سائنس پبشرز

1726122, 4721276

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM